OCTOBER 2010

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

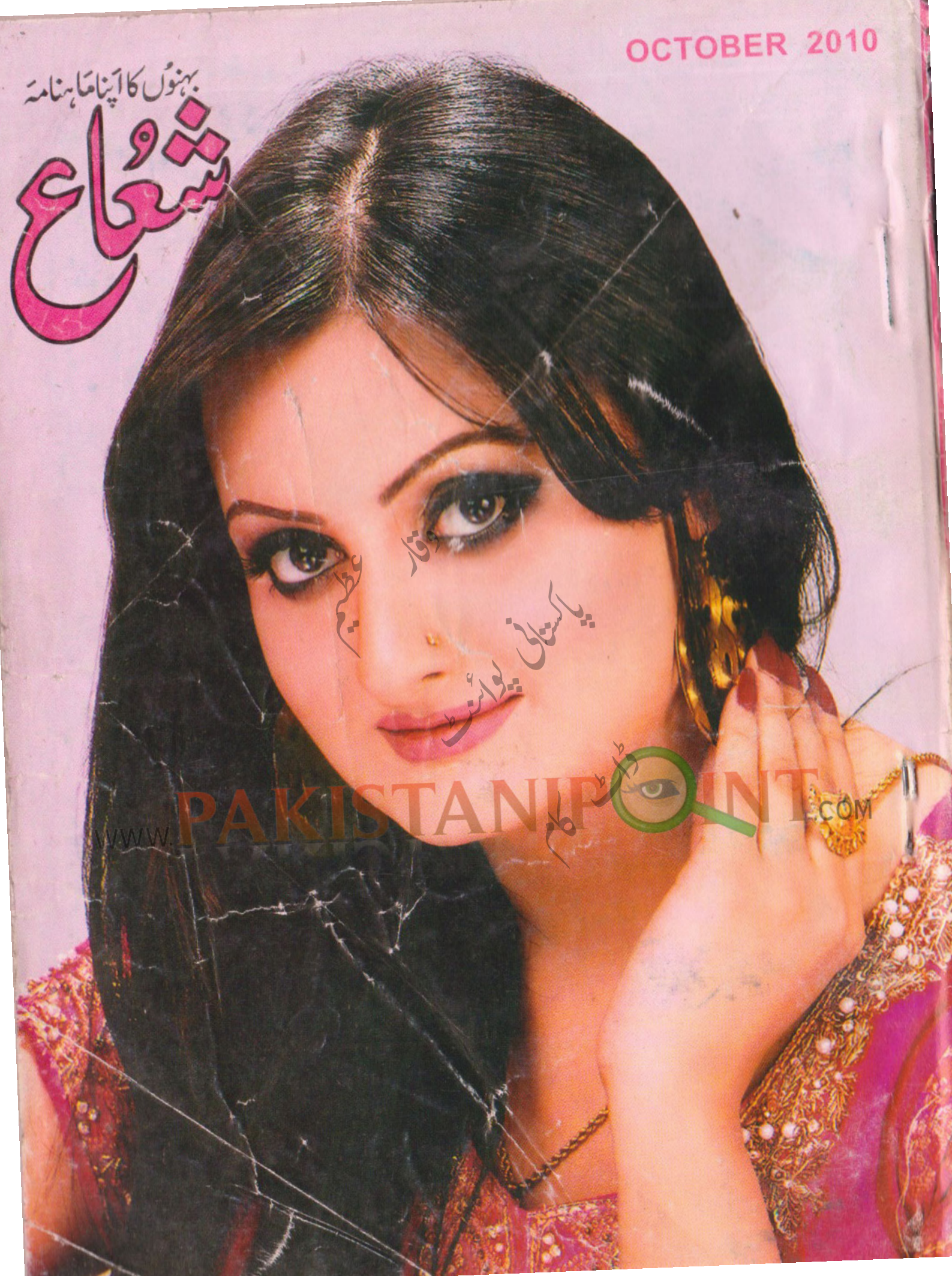

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
www.PAKISTANIPOINT.com
ڈاٹ کام

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیر اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیر منتظم ——— ازر ریاض

مدیرہ اعزازی ——— امتہ الصبور

فلم ٹیلی ویژن ——— شاہین رشید

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 اردو بازار کراچی

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 500 روپے

بیرون ملک ---- 4000 روپے

بیرون براعظم ---- 5000 روپے

وقار عظیم

پاکستانی پوائنٹ

ڈاٹ کام

قرشی

گلا صاف آواز شفاف

- اعلیٰ درجے کے سیاہ توت سے تیار کردہ
- گلے کی خراش، درد، ورم اور آواز بیٹھ جانے میں مؤثر

Noorani

پہلی شعاع — ادارہ — 10
حمد — سولہ جملے — 11
نعت — سولہ جملے — 11
نبیؐ کی باتیں — ادارہ — 12

انٹرویو

یادیں، باتیں — عبدالقادر جونیجو — 278
دستک — شاہین رشید — 17
شعاع کے ساتھ — ادارہ — 271
شادی مبارک ہو — سیدہ شاہ بی بی — 21
شاعری — طاہرہ گلمن — 267

ناول

دیوارِ شب — عالیہ بخاری — 222
ستارۂ شام — آمنہ ریاض — 36

مکمل ناول

معتبر ٹھہرے — نبیلہ ابر راجہ — 152
لمحے بھر کی تھی — ماہا ملک — 62

ناولٹ

کانچ اور ریشم — شاہین ملک — 102
تجھ کو دیکھا ہو — رخسانہ نگار — 120
یہ ایک لمحہ — ناہید حیات — 206

افسانے

پیاری بیٹیاں — رضیہ مہدی — 251
روٹی پکڑ انکان — عطیہ عمر — 244
ایک لمحہ آگہی — سونیہ نوید — 94
روشنی کے ساتھ — ناشر ابعہ — 143
سود و زیاں میں — مصباح گل — 199

نظمیں، غزلیں

غزل — عبدالحمید عدم — 259
غزل — احمد فراز — 258
غزل — طالب انصاری — 258
نظم — ناصر زیدی — 259

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے جزوی شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

MEMBER APNS CPNE

مستقل سلسلے

خط آپ کے — رضیہ جمیل — 26
مسکراہٹیں — سائرہ غلام نبی — 260
آئینہ خانے میں — غزل قمر — 282
پانوں سے خوشبوئے — شگفتہ جاہ — 263
تاریخ کے جھروکے — امت الصبور — 286
کھلتا کسی پہ — خالدہ جیلانی — 269
موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 275
خوبصورت بنیے — ادارہ — 289

اکتوبر 2010
جلد 25 شمارہ 2
قیمت 40 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37- اُردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل فاؤنڈیشن حسن پریس بلڈنگ پر لیس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام اشاعت ادارہ فروغ اردو زبان سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com, shuaamonthly@yahoo.com

www.PAKISTANIPOINT.COM

رضی جلیل

اداریہ

شعاع کا اکتوبر کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

ہر لمحہ کچھ ہو جانے کے خوف میں گھرے ہوئے کرب اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا، ظلم، زیادتی، ناانصافی اور دہشت گردی جس نے ہمیں معاشرتی زوال کی ایک اندوہ ناک کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ سب مسائل تو تھے ہی کہ سیلاب کی آفت ناگہانی اور اس کی تباہ کاری۔

قدرتی آفات اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہیں کہ ہم اپنی اصلاح کریں اور اپنی خرابیوں کو دُور کر کے انصاف اور دیانت کے اصولوں پر زندگی کو استوار کریں لیکن اسے کیا کہیں کہ اتنی بڑی تباہ کاری سے گزرنے کے باوجود کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہی بم دھماکے ہیں۔ دہشت گردی ہے اور ٹارگٹ کلنگ بھی اسی تسلسل سے جاری ہے۔ بلکہ اب اس میں فرقہ واریت کا عنصر بھی شامل کرنے کی شعوری کوشش کی جا رہی ہے۔

جو حالات اس وقت ہمیں درپیش ہیں۔ جن مسائل کا ہمیں سامنا ہے اور جو کچھ ہمارے اردگرد ہو رہا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ہم ان قوتوں کو پہچانیں جو ان حالات کے پس پشت کارفرما ہیں اور یک جہت اور متحد ہو کر ان کا مقابلہ کریں۔

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین)

محمود بابر فیصل کو دُنیا سے رخصت ہوئے سولہ سال بیت گئے لیکن آج بھی ان کی یادیں ذہن پر نقش ہیں۔ ان کی ذہانت، زندہ دلی اور بھرپور شخصیت، ان کا خلوص، ان کی محبت اور دوسروں کا احترام ہمیشہ یاد رہنے والی چیزیں ہیں۔

25۔ اکتوبر کو محمود بابر فیصل کی برسی ہے۔ قارئین سے ان کے لیے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- ہم جو معتبر ٹھہرے۔ نہیلہ ابرراجہ کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- بات مجھ بھر کی تھی۔ ماہا ملک کا مکمل ناول،
- شاہین ملک، رخسانہ نگار عدنان اور ناہید حیات کے ناولٹ،
- قانتہ رابعہ، عطیہ عمر، رضیہ مہدی، سونیا نوید اور مصباح گل کے افسانے،
- آمنہ ریاض اور عالیہ بخاری کے ناول،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"،
- شادی مبارک ہو۔ آپ کی پسندیدہ مصنفہ کنیز نبوی کی شادی کا احوال،
- مشہور ڈراما نگار عبدالقادر جونیجو کی یادیں، باتیں،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ یہ آپ ہمیں خط لکھ کر اور ای میل کر کے بتائیں۔ ہم آپ کی رائے جاننے کے لیے منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

مجھے سرور ملا ہے، تیری ثنا کر کے
سدا قریب ہی پایا تجھے دُعا کر کے

یہ کونپلیں، یہ شگوفے، یہ پھول، برگ و شجر
شگفتہ رہتے ہیں ہر دم تیری ثنا کر کے

تو رحیم ہے تیرا، جو بھی دے دیا مجھ کو
میں دل اُداس کروں کس لیے گلہ کر کے

خدا تو تو ہی ہے کون و مکان کا مالک
میں شعر کہتا ہوں بس تیرا آسرا کر کے

خطا کا پتلا ہوں اور وقت شام ہے مجھ پر
گزار دے میرے ایام دلربا کر کے

تیرے اصول ہیں یکساں یہاں سبھی کے لیے
نجات پائی تھی یونسؑ نے بھی دعا کر کے

یہ پھول حمد و ثنا کے کھلے رہیں سہراب
خدا قبول کرے اپنا واسطہ کر کے!

سہراب جنگ لدھیانوی

رسول مقبول ﷺ

میرا قلم میری سرکارؐ دو جہاں کے لیے
کہے گا نعت اللہ کے رازداں کے لیے

عجب لفظ ہے شیریں محمد عربی
یہی علاج ہے یارو غم نہاں کے لیے

بڑی ہی شان کا رحمت لقب دیا رب نے
جہاں سے تیرے لیے اور تو جہاں کے لیے

درِ حضور کا روز ازل سے شیدا ہوں
بھٹک نہ جاؤں کہیں راہ بے نشاں کے لیے

کرم سے مولا مدینے بلا ہی لیں مجھ کو
یہی ہے حرفِ دُعا روز و شب زباں کے لیے

میرے حروف میرے اشعار کہہ رہے ہیں مجھے
درود پاک کہو دین کے آسماں کے لیے

یہ نعت پاک بھی تکمیل پا گئی سہراب
حقیر تحفہ ہے نعتوں کے گلستاں کے لیے

سہراب جنگ لدھیانوی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں

از قلم

کامیاب

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کامیاب وہ ہے جسے اسلام کی ہدایت مل گئی، ضرورت کے مطابق رزق مل گیا اور وہ اس پر قانع ہو گیا۔"

فوائد و مسائل :

○ اسلام سب سے بڑی دولت ہے کیونکہ اس سے آخرت میں جنت ملتی ہے جس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔

○ "رزق کفاف" کا مطلب اتنی روزی ہے جس سے بنیادی ضروریات، بغیر فضول خرچی کے، پوری ہوتی رہیں اور قرض اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

○ کامیابی دولت کے ڈھیر جمع کرنے کا نام نہیں بلکہ موجود رزق پر قناعت اور شکر اصل دولت اور بڑی کامیابی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یا اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں کو ضروری حاجات کے مطابق رزق عطا فرما۔"

فوائد و مسائل :

○ انسان کو چاہیے کہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی اچھی عادات و خصائل کی خواہش رکھے۔

○ ضرورت کے مطابق رزق کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ ملے جسے جمع کر کے رکھا جائے۔

○ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد و قناعت امت کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

قیامت کے دن

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قیامت کے دن ہر دولت مند اور نادار کی خواہش یہی ہوگی کہ اسے دنیا میں صرف (زندہ رکھنے کے قابل) تھوڑی سی روزی ملی ہوتی۔"

حضرت عبید اللہ بن محصن انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس کی صبح اس حال میں ہوئی کہ اسے بدن میں عافیت، اپنے بارے میں امن اور دن بھر کی خوراک حاصل ہو، اسے گویا پوری دنیا جمع کر کے دے دی گئی ہو۔"

فوائد و مسائل :

○ جسے کوئی بیماری اور خوف نہ ہو اور دن بھر کی ضرورت کا سامان موجود ہو تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

○ ہم زیادہ کی خواہش میں ان نعمتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو ہمارے پاس موجود ہوتی ہیں جس کی وجہ سے دل میں شکر کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

○ جس شخص کے پاس ایک دن کی ضروریات موجود ہیں، اسے اس دن کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ امید رکھنی چاہیے کہ جب کل کا دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات بھی مہیا فرما دے گا۔

نعمت کی قدر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دنیا میں اپنے سے نیچے والے (کم مال) کو دیکھو، اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو، اس سے یہ ہوگا کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔"

فوائد و مسائل :

○ نیچے والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے کم ہے اور اوپر والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے بڑھ کر ہے۔

○ اپنے سے زیادہ نعمت والے کو دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجھے یہ نعمت کم حاصل ہے، اس کمی کو شیطان اس انداز سے پیش کرتا ہے گویا یہ نعمت حاصل ہی نہیں۔ اس طرح محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے جس سے شکر کی بجائے اللہ سے شکوہ کرنے کو جی چاہتا ہے جو ناشکری کے ایک بڑی صورت ہے۔

○ اپنے سے کم تر پر نظر ڈالنے سے حاصل شدہ نعمت کی قدر معلوم ہوتی ہے جس سے شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

○ ہر نعمت کے بارے میں یہ کیفیت ہے کہ ایک فرد کو وہ نعمت کسی سے کم ملی ہے تو وہی نعمت اسے کسی دوسرے سے زیادہ بھی ملی ہے۔ اس معاملے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ایک فرد کو ایک نعمت کسی سے کم ملی ہے تو کوئی دوسری نعمت اسے زیادہ بھی ملی ہے۔ جس طرح ایک شخص کسی سے کم دولت رکھتا ہے اور کسی سے زیادہ دولت مند بھی ہے۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ اس سے دولت میں کم ہے تو صحت یا قوت میں اس سے بڑھ کر ہے۔ اگر حسن صورت میں کم ہے تو علم و فضل یا حسن سیرت میں اس سے زیادہ بھی ہے لہٰذا احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور اللہ سے شکوہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اعمال اور دل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے عملوں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔"

فوائد و مسائل :

○ خوب صورت یا بد صورت ہونا بندے کے ہاتھ میں نہیں بلکہ یہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ عمل اچھے ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کیا جا سکے۔

○ اللہ کے ہاں مال دار اور بے زر برابر ہیں۔ مال دار کو محض دولت مند ہونے کی وجہ سے معافی نہیں مل سکی اور نادار کو محض اس کی مفلسی کی بنا پر مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

○ مال دار ہونا بھی اللہ کی آزمائش ہے اور مفلس ہونا دوسری طرح کی آزمائش۔ اگر مال دار شکر کرے تو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے اور ناشکری کرے تو ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح نادار آدمی صبر کرے تو اللہ کا پیارا ہے اور بے صبری کرے اور حرام کمائی کی کوشش کرے تو اللہ کے قرب سے محروم ہے۔

○ انسان اگر نیکی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کی نیت اور خواہش ضرور رکھنی چاہیے۔ ایسی نیت پر بھی ثواب ملتا ہے۔

آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گزران

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"ہم، آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مہینہ مہینہ اس حال میں گزار دیتے تھے کہ آگ نہیں جلاتے تھے۔ (ہمارا کھانا) صرف کھجوریں اور پانی ہوتا تھا۔"

فوائد و مسائل :

★ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد، استغنا، قناعت اور سادگی کا بیان ہے۔

○ حیات مبارکہ کے آخری سالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سال بھر کے خرچ کے لیے

کھجوریں اور جو وغیرہ اکٹھے دینا شروع کر دیے تھے لیکن امہات المومنین سخاوت سے کام لیتے ہوئے جلد ہی خرچ کر دیتی تھیں' اس لیے اکثر روٹی' سالن اور گوشت وغیرہ کے بغیر گزارا ہوتا تھا۔ بعض اوقات کھجوریں بھی میسر نہیں ہوتی تھیں۔

(راوی حدیث) محمد بن عمرو رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں۔ وہ نو گھر تھے۔

فائدہ : عورتوں کو چاہیے کہ حلال آمدنی میں گزارا کریں اور خاوند کو حرام ذرائع اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قناعت

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"میں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک کی وجہ سے کروٹیں بدلتے دیکھا کیونکہ آپ کو معمولی سی کھجوریں بھی میسر نہ تھیں جن سے پیٹ بھر لیتے۔"

فائدہ : اس میں امت کے لیے سبق ہے کہ وہ تنگ دستی کی حالت میں صبر اختیار کریں' حرام کمائی کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

تنگ دستی

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کے پاس ایک صاع غلہ ہے نہ ایک صاع کھجوریں۔"

ان دنوں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں۔

فائدہ : "صاع" کا مطلب "ٹوپا" ہے جو غلہ ماپنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اہل مدینہ کا صاع تقریباً ڈھائی کلو گرام کا ہوتا تھا۔

غربت

حضرت سلمان بن صرد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے تو (ہماری یہ حالت تھی کہ) ہمیں تین رات تک کھانا میسر نہ ہو سکا۔"

صبر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گرم کھانا حاضر کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول فرمایا۔

جب فارغ ہوئے تو فرمایا۔

"اللہ کا شکر ہے میرے پیٹ میں اتنے دن سے (تازہ اور) گرم کھانا نہیں گیا۔ (کھجور وغیرہ پر گزارہ رہا)"

آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کا بستر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔"

فائدہ :

○ مطلب یہ ہے کہ بستر عمدہ کپڑے کا نہیں تھا جس میں اون یا روئی بھری ہوئی ہو بلکہ چمڑے کا بستر بنا ہوا تھا' اس میں کھجور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی جو سخت اور ناہموار ہوتی ہے۔ لیکن چمڑے کی وجہ سے اس کی سختی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ اہل عرب چمڑے کو سادہ انداز سے تیار کرتے تھے جو نہ زیادہ قیمتی ہوتا تھا' نہ خوب صورت۔ اس لحاظ سے چمڑے کا بستر انتہائی

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سادگی کی مثال ہے۔

دین اور دنیا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوا تو آپ ایک چٹائی پر تشریف فرما تھے۔ میں بیٹھ گیا' میں نے دیکھا کہ آپ نے صرف تہہ بند پہن رکھا ہے' دوسرا کوئی کپڑا زیب تن نہیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے پہلو پر چٹائی سے نشان پڑ گئے ہیں۔ ایک طرف تھوڑے سے جو تھے۔ غالباً ایک صاع ہوں گے۔ کمرے کے کونے میں (جو چمڑے کی دباغت میں کام آتے ہیں' اور بغیر دباغت کھال لٹکی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ابن خطاب! آپ کیوں روتے ہیں؟"

میں نے کہا اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں؟ اس چٹائی سے آپ کے پہلو میں نشان پڑ گئے ہیں (کوئی نرم بستر بھی نہیں) اور آپ کے سامان رکھنے کی جگہ میں کچھ نظر نہیں آتا' سوائے اس (ایک صاع جو) کے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ادھر کسریٰ اور قیصر باغوں اور میووں میں (عیش کر رہے) ہیں۔ آپ اللہ کے نبی اور اس کے برگزیدہ ہیں اور یہ آپ کا توشہ خانہ ہے (جو خالی پڑا ہے۔)"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"خطاب کے بیٹے! کیا تو اس بات سے خوش نہیں کہ ہمیں آخرت مل جائے اور ان (قیصر و کسریٰ) کو دنیا؟"

میں نے کہا۔ "کیوں نہیں! میں خوش ہوں۔"

فوائد و مسائل :

○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کا مال جمع نہیں کیا بلکہ زہد اختیار فرمایا۔

○ گھر میں ایک دو وقت کی خوراک موجود ہونا زہد کی منافی نہیں۔

○ بے تکلف ساتھیوں میں صرف تہہ بند پہن کر' یعنی قمیص پہنے بغیر بیٹھنا جائز ہے۔

○ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت رکھتے تھے۔

○ کافروں کو ان کی نیکیوں کا معاوضہ دنیا ہی میں دنیاوی سامان یا عیش و عشرت کی صورت میں مل جاتا ہے۔

○ مسلمان پر دنیاوی تنگ دستی' آخرت میں درجات کی بلندی کا باعث ہے۔

حضرت فاطمہؓ کا گھر

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) رخصت ہو کر میرے گھر آئیں' اس رات ہمارا بستر صرف ایک مینڈھے کی کھال پر مشتمل تھا۔"

غریبوں کے ساتھ بیٹھنا

حضرت ابو کنود (عبداللہ بن عامر) ازدی رحمتہ اللہ نے حضرت خباب سے روایت کرتے ہوئے اس آیت مبارکہ کہ تفسیر میں یہ حدیث بیان فرمائی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ : ۔

"اور ان لوگوں کو اپنے سے دور مت کریں جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے (اور اس کی عبادت کرتے) ہیں۔ وہ اپنے ربّ کا چہرہ (رضامندی) چاہتے ہیں۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ آپ پر نہیں اور آپ کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ ان پر نہیں، پھر اگر آپ ان کو اپنے سے دور کریں گے تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔"

(حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے) فرمایا۔

" (قبول اسلام سے پہلے) حضرت اقرع بن حابس تمیمی اور حضرت عیینہ بن حصن فزاری رضی اللہ عنہ آئے تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمزور (نادار) مسلمانوں کی جماعت میں حضرت صہیبؓ، حضرت بلالؓ، حضرت عمارؓ اور حضرت خباب رضی اللہ عنہ اور ایسے ہی کچھ دوسرے غریب اور کمزور مومنوں کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ جب انہوں نے ان حضرات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھے دیکھا تو انہیں حقیر جانا۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں بات کی اور کہا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ (الگ سے) تشریف رکھیں تاکہ اہلِ عرب کو ہماری فضیلت (اور بلند مقام) کا پتہ چلے کیونکہ آپ کے پاس عرب (کے مختلف علاقوں) کے وفد آتے ہیں، اور ہمیں اس بات سے شرم محسوس ہوتی ہے کہ عرب کے لوگ ہمیں ان غلاموں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھیں، اس لیے جب ہم آپ کے پاس آیا کریں تو آپ انہیں اپنے پاس سے اٹھوا دیا کریں جب ہم فارغ ہو جائیں تو پھر آپ چاہیں تو ان کے ساتھ بھی تشریف رکھیں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ٹھیک ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "ہمیں (اس معاہدے کی) ایک تحریر لکھ دیجیے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے کا سامان طلب فرمایا اور لکھنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا لیا۔

ہم (غریب مسلمان) ایک طرف بیٹھے تھے۔ اتنے میں جبریل علیہ اسلام اترے اور (وحی کی آیات سناتے ہوئے)

فرمایا۔ ولا تطرد الذین..... الظالمین۔

پھر اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا (جو اس وقت غیر مسلم تھے) اور فرمایا۔

ترجمہ۔

"اور اسی طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ لوگ (انہیں دیکھ کر) کہیں کیا ہم میں سے یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو (ان سے) زیادہ نہیں جانتا؟"

پھر فرمایا۔ واذا جاءک الذین..... الرحمۃ۔

ترجمہ۔

"اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو کہہ دیجیے تم پر سلام ہو۔ تمہارے رب نے مہربانی کو اپنے ذمے لازم کر لیا ہے۔"

حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"(اس کے بعد) ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھتے تھے لیکن جب وہ وقت آتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اٹھنے کا (روزمرہ کا) ہوتا تھا تو ہم خود ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر اٹھ جاتے تھے تاکہ آپ بھی تشریف لے جا سکیں۔"

دستک دستک دستک

شاہین رشید

علی حیدر

"کیسے ہیں علی حیدر اور میوزک چھوڑنے کے بعد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا یا سب کچھ ٹھیک ہو گیا؟"

"آپ کسی بھی چیز کو چھوڑیں تو انسان کا دل و دماغ اتنی آسانی سے کہاں اسے قبول کر سکتا ہے۔ کوئی عادت جس میں برسوں سے آپ مبتلا ہوں وہ آسانی سے کہاں چھوٹتی ہے۔ میں نوجوانی سے میوزک سے وابستہ تھا لیکن جب بھائی نے مجھے میوزک چھوڑنے پر اکسایا تو ابتدائی چھ سے آٹھ ماہ میرے لیے مشکل تھے..... مگر پھر اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا اور اب تقریباً ایک سال ہو گیا ہے مجھے میوزک چھوڑے ہوئے۔"

"آپ کے چاہنے والوں کا کیا ردِ عمل تھا؟"

"چاہنے والوں کے ردِ عمل نے ہی تو مجھے زیادہ پریشان کیا۔ کیونکہ وہ کسی طرح بھی نہیں چاہتے تھے کہ میں میوزک کی فیلڈ کو چھوڑوں اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ میرے مداحوں میں زیادہ تر لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے تو مجھ سے بات چیت ہی چھوڑ دی۔ مگر پھر جب میں نے انہیں سمجھایا تو پھر معاملہ سیٹ ہو گیا۔"

"24 جون 2009ء کو آپ نے اس فیلڈ کو خیرباد کہا۔ اس دوران کہیں سے میوزک کے پروگراموں میں حصہ لینے کی آفر آئی؟"

"مجھے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے کسی میوزیکل پروگرام میں شرکت کیے ہوئے اور حصہ لیے ہوئے..... اور آپ یقین کریں کہ مجھے مختلف پروگراموں میں حصہ لینے کے لیے بہت آفرز آئیں اور بہت پرکشش معاوضوں کے ساتھ..... انڈیا کے مشہور پروگرام Fear Factor میں پریانکا چوپڑا کے ساتھ کمپیئرنگ کی پیشکش بھی ہوئی مگر میں نے انکار کر دیا اور آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو گی کہ مجھے تو فلم میں کام کرنے کی پیشکش ہو چکی ہے۔"

"اچھا..... کچھ بتائیے اس کے بارے میں؟"

"انڈیا نے مجھے فلموں میں کام کرنے کی۔ آفر کی اسامہ کے نام سے بننے والی فلم میں ہیرو کے لیے آفر ہوئی۔ ٹیلی وژن کے پروگراموں میں کمپیئرنگ کرنے کی آفرز آئیں اور پرکشش معاوضوں کے ساتھ مگر میں نے انکار کر دیا کہ جب اس فیلڈ کو چھوڑ دیا ہے تو بس چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے کوئی بھی پرکشش معاوضہ مجھے دوبارہ اس فیلڈ میں نہیں لا سکتا۔"

"حمد و نعت کی کوئی البم ریلیز ہوئی؟"

"بالکل ہوئی..... حمد و نعت کے حوالے سے آڈیو البم مہمان مہمان" ریلیز ہوا ہے اور انشاء اللہ 2010ء کے آخر تک صوفیانہ کلام کا آڈیو البم بھی ریلیز ہو جائے گا۔ ابھی میں اس پر کام کر رہا ہوں۔"

"مستقبل کے لیے کیا پروگرام ہے آپ کے دل میں!"

"مجھے خدا نے اچھی شکل کے ساتھ ساتھ خوب صورت آواز بھی عطا کی ہے۔ میں اپنی ان دونوں خوبیوں کو اور خاص طور پر اپنی آواز کو آخرت سنوارنے اور نئی نسل

کو اچھی باتیں سکھانے کے کام میں لاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ نئی نسل میری باتیں سنے اور اس پر عمل کرے۔"

"بندہ جب اسلام کی طرف راغب ہوتا ہے تو پھر اس کے طور طریقے تو بدلتے ہی ہیں لباس بھی بدل جاتا ہے تو کیا یہ سب ضروری ہوتا ہے۔ آپ میں بھی اس قسم کا چینج آیا؟"

"میں بالکل بھی چینج نہیں ہوا' بس میوزک کو چھوڑ کر حمد و نعت اور صوفیانہ کلام پڑھنے لگا ہوں۔ میں کوئی مولوی نہیں بن گیا بلکہ پہلے والا نگی حیدر ہوں۔ لباس سے میں متاثر نہیں کرتا بلکہ میں اپنی باتوں سے نئی نسل کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"لباس میں کیا پہنتے ہیں؟"

"سب کچھ۔ شلوار قمیص' شیروانی' جینز سب کچھ پہنتا ہوں۔ ہمارے مذہب نے لباس کی کوئی قید نہیں لگائی ہوئی۔"

"تھوڑا ماضی کی طرف چلتے ہیں..... اپنے ابتدائی دور کے بارے میں بتائیے۔"

"اگر آپ پوچھنا چاہ رہی ہیں کہ میں کب کہاں پیدا ہوا تو میں 22 ستمبر کو کراچی میں پیدا ہوا۔ اور چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ یہ بات تو آپ سب کو معلوم ہی ہے کہ میں بنیادی طور پر انجینئر ہوں اور این ای ڈی یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کی ہے۔"

"اب تک کتنی البمز ریلیز کر چکے ہیں؟"

"اب تک "چاہت' ترنگ' قرار' سندیسہ' داستان' جانیا' ماہی' سانبان' جادو' چاندنی راتیں' تیرا نام لیا" اور "جانے دو" آ چکی ہیں" اور ایک فلم "چلو عشق لڑائیں" میں بھی کام کر چکا ہوں اور ٹی وی ڈراموں میں بھی اداکاری کر چکا ہوں۔"

"اور گھر میں سب خیریت ہے۔"

"جی اللہ کا کرم ہے۔"

عینی (گلوکارہ)

"ہیلو..... کیسی ہو؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"روزے کیسے گزرے اور عید کہاں کی؟"

"روزے بہت اچھے گزرے' آدھے پاکستان میں آدھے اپنے گھر انگلینڈ میں والدین اور بھائیوں کے پاس۔"

"عید کہاں منائی؟"

"لندن..... اپنے والدین کے ساتھ..... بہت مزہ آیا' بہت اچھا لگا' جہاں والدین ہوں وہاں تو جنگل میں بھی منگل ہو جاتا ہے۔ تو پھر لندن تو لندن ہے۔"

"روزے کتنے رکھے؟"

(ہنستے ہوئے) "اگر بتاؤں گی تو آپ یقین نہیں کریں گی' میں نے پورے روزے رکھے ہیں۔ نمازوں کے ساتھ کیونکہ ہمارے والدین کی تربیت میں یہ بات بھی شامل تھی کہ نماز روزے کی کوتاہی نہیں کرنی اور الحمدللہ ایسا ہی ہے میں ہی کیا ہمارے گھر میں سب کو روزے نماز کی عادت ہے۔"

"گڈ ویری گڈ..... اور آج کل کیا ہو رہا ہے۔"

"بس اپنے البم کی تیاری ہے۔ دیکھیں کب مکمل ہوتی

ہے۔"

"اور وہ جو تم کہہ رہی تھیں کہ اپنی والدہ کے نام کی پرفیوم نکالنی ہے اس کا کیا ہوا؟"

"جی..... وہ بھی ابھی پروسس میں ہے۔ جلد ہی بتاؤں گی آپ کو اس کے بارے میں۔"

"لوگ پاکستان سے بھاگ رہے ہیں۔ یہاں رہنا پسند نہیں کرتے تم کس کشش کے تحت یہاں رہ رہی ہو؟"

"پتا نہیں کیوں مجھے پاکستان بہت پسند ہے اور میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ میرا زیادہ وقت پاکستان میں ہی گزرتا ہے اور میرا ہی کیا میری امی بھی زیادہ تر پاکستان میں ہی رہتی ہیں..... اب کیا کشش ہے۔ شاید یہ کہ یہ ہمارا اپنا ملک ہے' اپنا گھر ہے۔"

"مگر یہاں تو لاقانونیت ہے۔ دہشت گردی ہے۔ گندگی ہے۔ یہ سب کچھ کیسے برداشت ہو جاتا ہے آپ سے؟"

"دیکھیں جی..... لاقانونیت کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ اگر ہم خود قانون نہ توڑیں تو کوئی مسئلہ کبھی بھی کھڑا نہیں ہوگا۔ ٹریفک کا نظام بھی ہم خود خراب کرتے ہیں۔ جہاں تک گندگی کی بات ہے تو جس جگہ میں رہتی ہوں وہاں کوئی گندگی نہیں ہے اور جی اللہ کرے گا کہ دہشت گردی بھی جلد ہی دور بلکہ ختم ہو جائے گی۔"

"تمہارے والد تو ڈاکٹر ہیں اور امی' وہ تو بور ہو جاتی ہوں گی؟"

"نہیں' نہیں امی بالکل بھی بور نہیں ہوتیں۔ وہ بھی اپنے سوشل ورک میں لگی رہتی ہیں اور وہ بہت اچھی ڈریس ڈیزائنر ہیں..... تو کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہیں۔"

"لندن میں تو گھر کے سارے کام خود کرنے پڑتے ہیں۔ مگر پاکستان میں نوکروں کی ریل پیل ہوتی ہے۔ کہاں ایزی فیل کرتی ہو؟"

"ایزی تو میں ہر جگہ فیل کرتی ہوں۔ مجھے گھر کے سارے کام آتے ہیں۔ کوکنگ بھی اور سلائی کڑھائی بھی۔ یہ اور بات ہے کہ اپنا ہنر دکھانے کا موقع نہیں ملتا البتہ جب لندن جاتی ہوں تو پھر امی کے ساتھ ضرور ان کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہوں۔ البتہ پاکستان میں موقعہ نہیں ملتا۔"

"اسٹار بننا بچپن کا خواب تھا؟"

"جی بالکل بچپن کا خواب تھا۔ کچھ اور بننے کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ سچی بات ہے اگر مجھے میری فیملی سپورٹ نہ کرتی تو میں کبھی بھی سنگر نہ بن پاتی۔"

"چلو بھئی اللہ تمہیں بہت ترقی دے پھر بات کریں گے۔"

☆ ☆ ☆

جویریہ سلیم (نعت خواں)

"کیسی ہو کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"جی ٹھیک ہوں اور سیکنڈ ایئر کامرس کی طالبہ ہوں۔ پڑھائی ہو رہی ہے آج کل۔"

"اس ماڈرن دور میں جب لوگ گلوکاری' میوزک کی طرف بھاگ رہے ہیں تم نے حمد و نعت ثناء کو ترجیح دی۔ کیوں؟"

"میرے والد کا نعت خوانی کی طرف بہت رجحان تھا اور وہ ریڈیو پاکستان سے نعتیں پڑھتے تھے تو انہی کی سپورٹ کی وجہ سے آج مجھے بھی یہ مقام ملا..... اور میوزک کی طرف رجحان اس لیے نہیں ہوا کہ ایک تو گھر کا ماحول مذہبی تھا پھر میں قرآن پاک حفظ بھی کر رہی تھی اور دس سال کی عمر میں میں حافظہ بھی بن گئی تھی۔ اس کے علاوہ جب میں چار سال کی تھی تب سے میں حمد و ثناء پڑھ رہی ہوں۔"

"چار سال..... بہت کم عمر ہوتی ہے۔ کس جگہ نعت پڑھی تھی اور کون سی پڑھی تھی؟"

"سب سے پہلے میں نے اسکول کے فنکشن میں نعت پڑھی تھی اور ہمارے پرنسپل کو یقین نہیں تھا کہ میں پڑھ لوں گی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک بڑا سالانہ فنکشن ہے اور اس میں والدین' مہمان اور سب ہی لوگ ہوتے ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تقریب خراب ہو تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ دیکھو بہت اچھا اچھا پڑھنا ہے اور تم اچھا پڑھو گی تو میں تمہیں انعام دوں گا۔ پھر میں نے اچھا پڑھا مجھے ایک ہزار روپے انعام بھی ملا۔"

"جو کامیابیاں حاصل کیں ان کے بارے میں بتاؤ۔"

"1995ء سے میں نے نعت خوانی کا آغاز کیا جب میں چار سال کی تھی۔ اس کے بعد کیو ٹی وی سے نعت خوانی

شروع کی' اس کے بعد پھر میں ریڈیو کی طرف آئی۔ 2004ء میں آل پاکستان مقابلہ نعت خوانی میں پہلا انعام حاصل کیا۔ پھر 2007ء میں مقابلہ نعت خوانی میں انعام حاصل کیا۔ 2007ء میں ہی آل پاکستان مقابلہ نعت خوانی اور مقابلہ حسن قرآت جو کہ کمبائن تھا یعنی لڑکے اور لڑکیوں کا تو اس میں بھی مجھے پہلا انعام ملا اور ڈاکٹر عامر لیاقت حسین کے ہاتھوں سے 25 ہزار اور گورنر سندھ نے 50 ہزار روپے انعام دیے۔ پھر مجھے حراٹریول والوں نے عمرہ کا ٹکٹ دیا۔ میں نے عمرہ کی سعادت حاصل کی اور ایک عمرہ کا ٹکٹ بطور گفٹ ابو کی کمپنی سے ملا..... میں اور میرے ابو عمرہ ادا کر کے آئے۔ 2007ء میں عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ 2007ء میں ہی حکومت پاکستان کی طرف سے ایک سند ملی بہترین نعت خواں کی جو کہ کھیل و ثقافت کے وزیر رؤف صدیقی صاحب نے دی۔ یہ سند تمام بڑے نامور نعت خواں کو ملی ان میں ایک چھوٹا نام میرا بھی تھا اور یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات تھی کہ بڑے ناموں کے ساتھ میرا نام بھی شامل تھا۔"

"اتنی کم عمری میں جو کامیابیاں حاصل کیں ان کو پا کر غرور ہوتا ہے یا فخر؟"

"غرور تو اللہ نہ کرے کہ آئے۔ ہاں فخر ضرور ہوتا ہے کہ میں اپنی آواز کو اللہ تبارک تعالیٰ کی حمد و ثناء کے لیے استعمال کر رہی ہوں۔ چونکہ بچپن سے ہی پڑھ رہی ہوں اور کامیابی حاصل کر رہی ہوں اس لیے غرور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی کو جب کوئی چیز نئی نئی ملتی ہے تو پھر غرور آتا ہے۔ میری اس کامیابی میں والد کی سپورٹ اور والدہ کی دعائیں شامل ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میرے نام کے ساتھ نعت خواں لکھا جاتا ہے۔"

"مستقبل میں کیا ارادہ ہے کہ نعت خوانی کے ساتھ ساتھ گلوکاری کی طرف بھی آؤ گی؟"

"میں جب چھوٹی تھی تو "روشن تارہ" میں آئی تھی اور میری بڑی بہن بھی آتی تھی۔ تو اس وقت کی بات اور تھی۔ لیکن اب اچھا نہیں لگے گا کہ میں میوزک کی طرف آؤں۔ میرے نام کے ساتھ نعت خواں لکھا جاتا ہے اور میں ہمیشہ ایسا ہی چاہوں گی۔"

"رمضان المبارک میں تو بہت مصروفیت رہی ہوگی؟"

"جی' پورے رمضان المبارک میں مصروف رہی اور پھر مختلف چینلز سے میری نعتیں بھی آرہی تھیں "کیونی وی" کے علاوہ "ہم ٹی وی" سے سب سے زیادہ نعتیں چلیں میری۔"

"معاوضہ کیسا ملتا ہے؟"

"نعت خوانوں کو کوئی چینل معاوضہ نہیں دیتا۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کو پبلسٹی اتنی مل جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ آپ کو اپنے پروگراموں میں بلاتے ہیں اور آپ کو پُرکشش معاوضہ دیتے ہیں اور یہ صحیح بھی ہے کہ ٹی وی چینلز کی وجہ سے ہی لوگ ہمیں بلاتے ہیں۔"

"یہ تو میں پہلی مرتبہ سن رہی ہوں کہ ٹی وی چینلز والے معاوضہ نہیں دیتے؟"

"جی بالکل پی ٹی وی اور ریڈیو سے معاوضہ ملتا ہے مگر پرائیویٹ چینلز والے نہیں دیتے اور یہ نہیں کہ میں جونیئر ہوں یا چھوٹی ہوں تو مجھے نہیں دیتے بلکہ جو بڑے بڑے لوگ ہیں' جیسے صدیق اسماعیل صاحب اور دوسرے نامور نعت خواں ان کو بھی معاوضہ نہیں ملتا تو پھر جب لوگ ہمیں بلاتے ہیں وہ ہمیں اچھا معاوضہ یا ہدیہ کے طور پر دیتے ہیں۔"

"تو جب تم نجی محفلوں میں جاتی ہو تو تمہاری ڈیمانڈ ہوتی ہے؟"

"جو ہمیں بلاتے ہیں وہ پانچ ہزار سے دس ہزار تو آرام سے بہت خوشی کے ساتھ دے دیتے ہیں۔ اور جب شہر سے باہر جاتے ہیں تو بیس سے پچیس تک بھی مل جاتے ہیں۔ جو جتنا افورڈ کر سکتا ہے اسی حساب سے دیتا ہے۔"

"دوسرے ممالک بھی گئی ہو؟ اور گھومنے کس کس کو شوق ہے؟"

"جی دوسرے ممالک بھی جا چکی ہوں اور گھومنے شوق کسی کو بھی نہیں ہے جبکہ آوازیں سب کی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ تو میری امی کہتی ہیں کہ جو کام دل سے کیا جائے کامیابی بھی اسی میں ہوتی ہے تو بس مجھے ہی شوق ہے۔"

"اپنے بارے میں کچھ بتاؤ؟"

"میں دسمبر 1991ء میں کراچی میں پیدا ہوئی۔ امی ہاؤس وائف ہیں۔ ہم چار بہنیں ہیں میں دوسرے نمبر پر ہوں اور میمن برادری سے تعلق ہے۔"

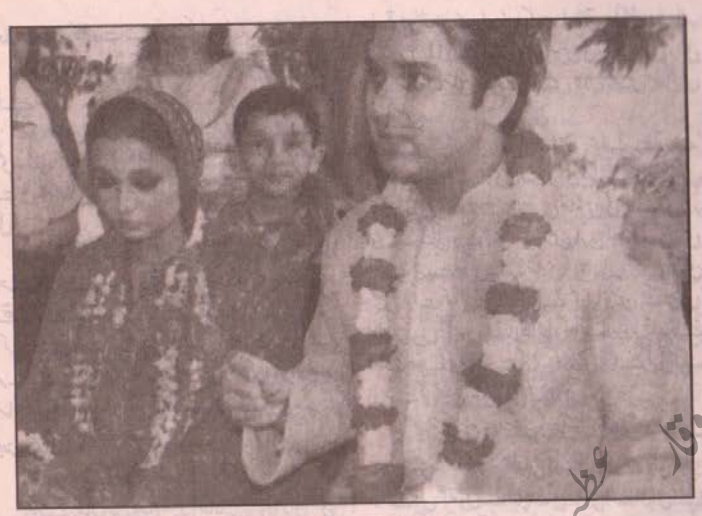

شادی مبارک ہو

سید علی مردان شاہ جیلانی (شاہ فیصل)
ہمراہ
سیدہ کنیز نبوی
سیدہ شاہ بی بی جیلانی

کہتے ہیں کہ جوڑے آسمان پہ بنتے ہیں تو کنیز نبوی اور شاہ فیصل کا جوڑا بھی بزرگوں کی دعاؤں ہی سے آسمان پہ بنا لیکن رشتہ ملانے والی ہستی تھیں ہماری دادی اماں۔

کنیز چھوٹی تھی تب شاہ فیصل کی ولادت ہوئی۔ بڑی اماں کی خواہش تھی بیٹے چچا کی بہو بنے۔ بیٹے چچا کی خوشی بھی دیدنی تھی' بڑی دھوم دھام سے چھٹے دن چھٹی کی رسم منائی' گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا دبی دبی سرگوشیاں ہنستے کھلکھلاتے کھل کھلاتے ہوئے چہرے بڑی اماں کی پرنور آنکھوں میں جھل مل کرتی خواہش چچا نے اپنا چاند سا بیٹا میرے سپرد کر دیا۔

دن گزرتے گئے میں سب کو خاموش کراتی رہی۔

"یہ راز راز رہے' وہ بڑے ہوں گے تو دیکھا جائے گا۔"

دونوں کو یہ پتا نہ چل سکا کہ ہم ایک دوسرے سے منسوب ہیں شاہ کو اٹھارہ برس کی عمر میں یہ پتا چلا تو وہ بھونچکا رہ گیا' اس نے کہا وہ میری باجی ہے' اب تک تو وہ کنیز باجی ہی کہتا آیا تھا۔

اس نے مجھ سے دریافت کیا پہلے تو میں سکتے میں رہ گئی لیکن وقت آگیا تھا میں نے اپنے لاڈلے بیٹے کو اپنے بڑوں کے فیصلے اور خواہش سے آگاہ کر دیا۔

"شاہ بابا! میں نے تمہاری تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی' جو ہمارے بڑوں کی خواہش ہے' اس میں اللہ کی رضا بھی شامل ہوگی۔" کنیز میری چھوٹی بہن بہت ذہین سمجھ دار اور باشعور تھی۔ اس نے بھی بزرگوں کے سامنے سر جھکا دیا میرے چاند نے بھی میری عزت رکھ لی۔

سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

"امی جان! جو بھو آپ کو خوش رکھ سکے مجھے وہ چاہیے۔"

میری تو عید ہوگئی بہن سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ بس ہم نے منگنی کا اعلان کردیا منگنی بھی دھوم دھام سے کی۔ ڈھائی تین ہزار کے قریب مہمانوں نے شرکت کی۔

یہ مارچ 2009ء کی بات ہے ہمارے مرید دوست احباب گھر والے سب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے مبارک باد کے تبادلے کررہے تھے' سب کے چہرے خوشی و مسرت سے دمک رہے تھے۔ منگنی کی رسم کے لیے دلہن رانی کو لایا گیا تو چاند سا دولہا بھی آنگن میں اتر آیا۔ سب نے شور مچادیا۔ مدینہ بضد تھی۔

"شاہ کو دلہن کے ساتھ بٹھاؤ۔"

ہمارے یہاں یہ رواج نہیں تھا۔ میں ہچکچا رہی تھی لیکن موصوف کے حمایتی بہت زیادہ ہوگئے' تالیوں کا شور نعروں کی گونج ساری محفل ناچنے لگی۔ دولہا صاحب بھی انگوٹھی پہنانے کے لئے مصر ہوئے تو سب کے قہقہے بلند ہوئے۔ آخر میں نے کنیز کا ہاتھ پکڑا اور میرے چاند سے بیٹے نے انگوٹھی اتنی احتیاط سے پہنائی کہ انگلیاں مس نہ ہوں۔

مدینہ اور ساجدہ جھوم جھوم کے ناچنے لگیں۔ سب کو رشک آرہا تھا۔ پتہ نہیں چل رہا تھا سالیاں ہیں یا بہنیں یا میری وجہ سے خالائیں ہیں' انہونیاں ہورہی تھیں۔ سب رواج سب رسمیں ختم تھیں پھر بھی منگنی کے بعد کنیز اور شاہ کے درمیان پردہ ہوگیا پر وہ دونوں کے لیے بہت مشکل پیدا کررہا تھا۔

شادی میں ایک برس کا وقفہ تھا لیکن کنیز نے ایک برس کیسے گزارا' وہ یہی بتا سکتی ہے' سارا دن جھولے میں اور جھولے سے اٹھ کے ٹیبل پر جا بیٹھتی بیٹھ بیٹھ کے موٹی ہوگئی۔ لیکن ایک فائدہ ہوا اس عرصے میں قارئین کو بہت دلچسپ افسانے' ناول' پڑھنے کو ملے۔ وہ اپنی ترنگ میں لکھتی رہی اور آپ لوگ پڑھتے اور سراہتے رہے۔

اب شادی کی تاریخ طے کرنے کے لئے پوری برادری کو بلایا گیا۔ ہمارے ہاں تاریخ رکھنے برادری کے مرد حضرات جاتے ہیں۔ پوری برادری کے مرد اوطاق پہ اکٹھے ہوئے۔ 28 اپریل 2010 چاند کی چودھویں کی رات تاریخ رکھی گئی' مبارک سلامت کے شور میں گاؤں بھر میں مٹھائیاں بانٹی گئیں۔

گھر میں بھی رقص ہو رہا تھا۔ ڈھول بجانے سے تو رہے' کیونکہ ہمارے ہاں ابھی تک اس کی اجازت نہیں' ڈھول کا نعم البدل آٹا گوندھنے والا تھال تھا جس کی تھاپ بھی دور دور تک سنائی دے رہی تھی' تین مارچ کو شادی کی پہلی تقریب خیر سے ہوگئی۔ اب شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں رات کو گیت گائے جاتے' دولہا دلہن کے بیٹوں بھانجیوں بھتیجوں نے ہلا گلا مچا رکھا تھا۔ دیر دیر تک گانے بجانے ہوئے نوکرانیاں جو کرین کرنا جتی ڈرامے کرتی ایک دوسرے کو چھیڑتی یعنی مذاق کرتی رہیں۔

عاصم ہائر سیکنڈری اسکول کی پرنسپل بختاور' سو مرو میری بہت اچھی' غمگسار' پرخلوص اور محبت کرنے والی عزیز دوست ہیں' انہوں نے شاپنگ کی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے رکھی تھی۔

پہلی شاپنگ انہوں نے کراچی سے کی' ان کی چھوٹی بہن شہزادی جو شاہ کی استاد بھی تھیں اور وہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔

شاہ آپا بختاور کا بیٹا بنا ہوا ہے اور لاڈلا شاگرد بھی شادی کے سارے معاملات ہم نے مل جل کر طے کرنے تھے ہمارے ہاں کی خواتین بازار بھی نہیں جاتیں اور شاپنگ ہماری پسند کی ہو یہ ناممکن بات تھی۔ یہ ذمہ داری بھی آپا نے اپنے سر لے لی۔

"چلو' تم گاڑی میں بیٹھی رہنا' ہم تمہیں دکان سے کپڑے لاکے دکھائیں گے۔"

جو بات میری اس عزیز دوست نے کہی وہ احسن طریقے سے نبھا بھی دی۔

صدر میں محبوب بارکیٹ سے کپڑوں کے تھیلے بھر بھر کے لا کر دکھا رہی تھیں کبھی طارق روڈ کا چکر لگ رہا ہے۔

اللہ اللہ کر کے دلہن کا لہنگا پسند آیا' میں تو اتنی تھک جاتی کہ سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ آپا کہتیں۔

"تم گاڑی میں بیٹھ بیٹھ کے تھک رہی ہو' ہمیں دیکھو' بغیر کھائے پیئے سارا دن مارے مارے پھر رہے ہیں تمہیں

کچھ پسند نہیں آرہا۔ تم گاڑی میں اے سی چلا کے بیٹھی ہو اور ہمیں دھوپ میں جلا جلا کر ادھ موا کردیا ہے۔

جب گھر آتے تو جو کپڑے اماں کو پسند آئے۔ "اماں رکھ لیتیں۔ پھپھو کو پسند آتے وہ رکھ لیتیں۔ کنیز کو پھوپھو نے گود لے لیا تھا۔ وہ ان کی بیٹی بنی ہوئی ہے۔ ہم پھر خالی ہاتھ رہ جاتے پھرنے چکر لگتے۔ بہت مزہ آرہا تھا دن بہت تیزی سے گزر رہے تھے تیاریاں زور پکڑ گئی تھیں شاپنگ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اماں الگ جہیز بنا رہی تھیں' پھپھو الگ۔ آخر چکر میرے کپڑے کا تھا اور دلہن رانی کے میندل' میک اپ' چوڑیاں بہت ساری چیزیں لینی تھیں۔ نشو بیوٹیشن میک اپ لاکے پسند کروا رہی ہے تو۔ دوسری طرف آپا بختاور آپا شہزادی اور نوشی گاڑی کے باہر ہمارا انتظار ہیں۔ آخر میں نے نشو کو گاڑی سے بھگایا۔

"نکلو۔" آپا کی تھکن چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ بہت بردبار اور صبر والی خاتون ہیں' اللہ پاک انہیں زندگی دے' صحت مند رکھے کینسر جیسے موذی مرض سے نبٹ رہی ہیں وہ جب تھک کے کراہ اٹھتیں تو میرا انگ انگ ان کی صحت اور زندگی کے لئے دعا کرتا۔

25 اپریل کو مایوں تھی اور مہمان جمع ہو رہے تھے' ہمارے ماموں کی فیملی' خالہ کی فیملی' حیدر آباد سے آرہی تھیں اور شاہ فیصل کی خالہ بھی اپنی فیملی سمیت قاسم آباد سے آئی تھیں' آج کی شب "ونواہ" تھا۔

مایوں کو سندھی میں' "ونواہ" کہا جاتا ہے۔ جلدی تقریب شروع کرنے کے موڈ میں تھے۔ لیکن بھلا ہو لائٹ والوں کا مہمان کھانا کھا رہے تھے کہ بجلی غائب جنریٹر چلایا تو پیٹرول غائب۔ دولہا کو فون کیا۔

"شاہ بابا' ٹنڈو محمد خان سے پیٹرول لیتے آنا۔" ہم نے چار جرز جلا کے اپنی تیاری شروع کردی۔ صبح سے دولہا کے ساتھ لڑکوں کا قافلہ نکلا تھا۔ پھولوں کے ہاروں سے لدے' اجرک گلے میں ڈالے فیروزی کرتہ شلوار میں دولہا میاں بہت اچھے لگ رہے تھے۔

ٹیاری ہو سڑی سے روایتی گانے والیاں بلائی تھیں۔ اب وہ سندھی لوک گیت جھوم جھوم کے گا رہی تھیں ڈھول کے بجائے مشین کا ڈھکن' کھانے کے چمچے بڑے روٹھم سے مختلف جھنکار دے رہے تھے۔

"نچے نچے دل خوشی ماں پئی نچے۔"

اس گانے پہ تو واقعی سب کے دل خوشی سے جھوم رہے تھے' سب نے پیلے جوڑے پہنے تھے۔

ہر اک کا کلر کامبینیشن الگ الگ تھا لڑکیاں پراندے ڈالے ہوئے تھیں' سب رقص کرتی ہوئی گئیں اور مایوں کا سارا سامان لے آئیں۔ رنگ برنگی ٹوکریاں ٹرے وار کر رکھے۔

اب "بکی" کی رسم شروع کی' سات سہاگنیں' سات مٹی کے پیڑھوں پر آکے بیٹھیں' یہ پیڑھے موڑھے کی طرز پہ بنے ہوئے تھے۔ ان کے بیچ اوکھلی میں چاول ڈال کے ساتھ کھجوریں بھی ڈالی گئیں۔ باری باری ایک سہاگن مہ اٹھا کر بجی ہوئی اوکھلی میں چاول کو بتی ایک دوسرے کو پکڑاتی گئیں۔ دو باسکٹ میں پھولوں کے اوپر دو شیشے کی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک میں تیل تھا۔ دوسری میں شہد اور مکھن مکس رکھا گیا۔ مینڈھے کی رسم کے لئے بالوں کے آگے کی لٹ نکال کے چوٹی بنائی گئی جس کو مینڈھی بولا جاتا ہے۔

مینڈھے میں سات بل دیے جاتے ہیں۔ باری باری ایک سہاگن انگلی ڈبو کر مانگ میں تیل لگاتی ہے اور بل کھولتی ہے پھر شہد اور مکھن دلہن کی ہتھیلی پر رکھتی جاتی ہے۔

آخری رسم بھی سات سہاگنوں نے ادا کی' جو رسم اکھیو یعنی چہرے پر اک سجا سجایا ریشمی نقاب باندھنا ہوتا ہے' دلہن کے چہرے پر باندھنے سے پہلے سات سہاگنوں کے چہرے پر بطور رسم رکھ کر پھر دلہن کے چہرے پر باندھا جاتا ہے۔

اب دلہن کا چلہ شروع ہوگیا یعنی وہ اپنے دولہا کے لیے چلہ کاٹ رہی ہے۔ اس چلے کے دوران میں مچھلی' گوشت مرغی اور چھری سے کاٹی ہوئی ہر چیز کھانا منع تھا۔ وہ جو پہلے کہہ رہی تھی کہ میں سب کچھ کھاؤں گی مگر اب چلہ کے دوران راضی بہ رضا رہی۔

26 اپریل کو کنیز کی بہت ہی پیاری دوست امتل کراچی سے آگئی تھیں۔

دولہا کے ننھیال والے بھی سیہون شریف سے پہنچ گئے تھے 27 اپریل مہندی تھی آج میری سہیلی منور

سلطانہ بھی مہندی لائی تھی۔ اور بھنی گوٹھ سے نشو بھنی اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ مہندی لیے موجود تھی۔

سب کی بھاری بھرکم تیاری شروع۔ ابھی ہمارا میک اپ ہی ہو رہا تھا شور اٹھا کہ مہندی آگئی۔

مہندی لانے والیوں کا رقص' ہونگ تالیاں اور نعرے بازی عروج پر تھی۔ تھوڑی دیر میں کھانے کا وقفہ ہوا تو آپا ہمارے انتظار میں رہیں اور کھانا انتظار ہی میں ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے ملازمہ کو اپنی پیاری سہیلی نوشابہ کو بلانے بھیجا۔ وہ تیزی سے آرہی تھی کہ اس کا توازن بگڑا اور اک چیخ ہوا میں ارتعاش پیدا کر کے سب کو متوجہ کر گئی۔

"یا اللہ خیر!" سب نے دوڑ لگا دی۔ پانی کے چھینٹے منہ پر مارے' ہچکی کے ساتھ نوشی کی سانس کچھ بحال ہوئی تو جان میں جان آئی۔ پاؤں اور گھٹنے میں چوٹ آنے کے سبب اسے لیٹنے کو کہا۔ اب فنکشن پوری طرح سے شروع تھا۔

دولہا کی نانی نے پکڑ کر مجھے جھمری ڈلوائی۔ ساری لڑکیوں نے تالیوں سے ساتھ دیا اور گانے والیوں کے پاؤں میں بندھے گھنگروؤں کی چھما چھم سے ماحول میں سرگوشیاں رہی تھی۔ لڑکیوں نے مہندی اٹھائی اور دلہن کے کمرے کی راہ لی۔ میں ہجوم کو چیر کر بمشکل دلہن تک پہنچی تو کنیز کے برابر میں بیٹھی امتل کے چہرے پر نگاہ پڑی ان کی مسکراہٹ اور خوشی دیدنی تھی وہ بڑی خوبصورت مسکراہٹ سے سب کو دیکھ رہی تھیں۔

یہاں بھی سات سہاگنیں لڑکیوں کو پیچھے دھکیلتی ہوئی رسم کے لئے آگے آئیں اور باری باری مہندی لگائی۔

مہندی کی رسم کے بعد اردو گانے گانا شروع کر دیے' جنہیں امتل سن کر خوش ہو رہی تھیں۔ مہندی کے بعد چار بجے پروگرام ختم ہوا۔

آج شادی کی رات تھی مغرب کے بعد چاند سے دولہا کا انتظار ختم ہوا اور اس کے ناتا کرتے بھی کھیر لیا گیا مہندی لگانے کے لیے اتنے لوگوں کے ہجوم میں ایک عورت کی روایتی راگ گاتی آواز ساری لڑکیوں کی آواز کو مات دے گئی۔

مہندی لگانے کے بعد میں اپنے بیٹے کو کمرے میں لے گئی' وہ تیار ہو کر ہلکی سبز رنگ کی شیروانی پہن کر آیا۔ آج تو میرا بچہ شہزادہ لگ رہا تھا۔ سب کے جھرمٹ سے نکل کر مردانہ شامیانے کی جانب چل دیا۔ جہاں بہت سے عزیز اقارب وزراء' امراء دوست احباب اس کے منتظر تھے' یہاں تیاری شروع ہو گئی' پوزیشن عجیب افراتفری کا شکار تھی۔

اسی دوران کنیز کی مداح دولت پور سے خاص طور پر اس کی شادی میں شرکت کے لیے تشریف لے آئی غلام صغریٰ لاکھو اور یہ ان کی پہلی ملاقات تھی' اب سے پہلے وہ صرف کنیز کی قاری تھیں پھر رابطہ ہوا تو اچھے تعلق میں تبدیل ہو گیا وہ اتنی دور سے کنیز کی خاطر بڑی چاہ سے آئیں مگر افسوس کہ بہت جلدی چلی گئیں' جبکہ ابھی فنکشن کی شروعات ہی تھی۔

میں ابھی تیاری ہی میں تھی کہ شور اٹھا۔

"دولہا کی امی کو باہر نکالو۔"

آج بھی دولہا کی بہنوں' میری بھتیجیوں بھانجیوں کی تیاری زوروں پر تھی۔ ساری بچیاں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ تمام مہمان جہیز دیکھ رہے تھے۔

اس کے بعد ڈانس کا دور شروع ہوا تو شہزادی آپا نے سب کو مات دے دی' باہر کی محفل میں مشہور گلوکار ثریا سومرو محفل کو خوب صورت بنا رہی تھی' اندر حسب معمول وہی گانے والیاں ان کی سریلی آواز' روایتی رقص' تالیاں جس میں نوٹ وارے گئے سب پر۔ صبح چار بجے یہ محفل اختتام کو پہنچی۔ ہم بھی ستانے کے لیے لیٹ گئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا گیا۔ "دولہا آگیا دروازے پر ہے۔"

فجر کا وقت تھا۔ اندر بیوٹیشن دلہن کو اسی گرمی کے عالم میں جلدی جلدی تیار کر رہی تھی۔ جب کہ دولہا سب کے جھرمٹ میں دروازے پر کھڑا تھا یہاں تک دلہن کو تیار کر کے اسٹیج پر بٹھایا گیا' امتل دلہن کو لے کر برابر میں آبیٹھیں' اب سب کی سنگت میں دولہا کو رسم کر کے سیج تک لانا تھا۔

ساجدہ ہاتھ میں ہوا دینے والا پنکھا لے کر کھڑی تھی جس کے کور پر میرون مخمل کے گوٹے کا کام تھا' جو خصوصی طور پر شادی کی رسم کے لیے بنایا جاتا ہے۔ جس کے ہینڈل چاندی کے بنے ہوئے تھے اور سونے کا پانی چڑھایا گیا تھا۔ اس کے ہینڈل میں دھاگہ باندھے اب دلہن کی بہن کو وہ دھاگہ دولہا کی شہادت کی انگلی میں ڈالنا ہے۔

دولہا کے چہرے پر موتیوں کا سہرا باندھا گیا جو شاہ کے لیے خصوصاً ایک درویش دوست نے بھیجا تھا۔ ایک طرف سدرہ بھائی کو پلو دے دوپٹے کا ایک طرف میں اور سامنے ساجدہ رسم کے لیے کھڑی تھی۔ "لو جی اب سالی صاحبہ کی کوشش" دھاگہ لہراتا ہے' ادھر انگلی مزید اوپر اٹھتی ہے اور دھاگہ مس ہو جاتا ہے۔ سب کے قہقہے اور جوش دولہا کے چہرے پر شرارت' آخر کار انگلی پھنس ہی گئی' سب کا مشترکہ قہقہہ اور تالیاں۔

صاعقہ سرمہ دانی لیے آگے بڑھی اور دولہا کو سرمہ لگایا۔ "ارے یہ کیا سالیاں صاحبہ اپنا نیگ تو بھول گئیں جلدی کے شور میں۔" "ڈیوڑھی پار کرتے ہوئے دولہا کے پاؤں کے نزدیک سا سرر رکھی گئی' جسے ایک ٹھوکر میں ہی کرچی کرچی کر دیا اب مبارک سلامت کے شور میں دولہا صاحب کو سیج تک لایا گیا اور دلہن کے سامنے بٹھا دیا۔

تمام لوگ ارد گرد گول دائرہ بنا کے بیٹھ گئے۔

یہ رسم قصی سے پہلے کی شادی کی آخری اور اہم رسم ہے۔ جسے سندھی میں "لاؤں" کہا جاتا ہے۔ جس میں سارے رشتہ دار باری باری آکر ہلکے سے دولہا اور دلہن کے [illegible] اور نوٹ وارے کر جاتے ہیں' سب سے پہلے اماں دلہے دولہا کے لاؤ آئے' پھر چھوٹا بھائی شرارتی ریاض جس نے زور سے [illegible] لگائی اور میری ڈانٹ سنتے ہوئے سرخ نوٹ وار کر چلتا بنا۔ پھر میں نے اپنے بھتیجے کو لاں دی اور اس طرح باری باری سب نے۔ امتل نے بھی بڑی دلچسپی سے لاں دی' ہلکی سی ہنسی میرے لبوں کو چھو کر گزر گئی۔

اب تل بھرنے کی رسم تھی' پلیٹ میں چاول کے ساتھ کھجوریں ڈالیں۔ اب دولہا چاولوں کی مٹھی بھر کے دلہن کے ہاتھ میں ڈالے اور دلہن دولہا کے روایتی راگ کے ساتھ مدینہ اور ساجدہ دلہن کا ہاتھ پکڑ کر رسمیں ادا کروا رہی تھیں۔

پھر دلہن کے سر پر روئی گرائی گئی اور دولہا جلدی سے چننا گیا۔

پھر دلہن کی باری "روئی گرنے نہ پائے" میں نے آواز لگائی۔"

اب دولہا' دلہن کو ایک دوسرے کو بچکے سے ہوا دینی ہے۔ دولہا ہر رسم میں مزے کے جملے شرارت سے پاس کرتا رہا پھر ایک دودھ کا پیالہ رکھا گیا جس میں دلہن کی انگوٹھی کے ساتھ ساتھ دو اور انگوٹھیاں ڈالی گئیں۔

اب مرحلہ دولہا کے لیے تھا۔ اسے ہاتھ کی چھنگلی سے دودھ میں سے دلہن کی انگوٹھی نکالنی لازمی ہے۔ پہلی دفعہ دو مشترکہ قہقہے۔

"صرف دلہن کی نکالنی ہے۔" کورس میں جتایا گیا' چیٹنگ نہیں چلے گی۔"

"چیٹنگ تو مجھ سے ہو رہی ہے' بتا دینا تھا پہلے دلہن کی کون سی ہے۔" دولہا ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دے رہا تھا۔ تیسری بار دلہن کی انگوٹھی نکل آئی تو مبارک کا شور اٹھا۔

اب بیچ میں آئینہ رکھ کر دولہا کو دلہن کا چہرہ دکھایا گیا۔

"منہ دکھائی میں کیا دو گے؟" کورس میں سوال اٹھا۔

دولہا! نے کہا "بھینس مگر پھپھو کی۔"

ہرگز نہیں۔ اپنی دیتی ہے۔" احتجاج بلند ہوا۔

"کہہ جو دیا پھپھو والی۔" وہ مسلسل چڑا رہا تھا۔

اب دولہا دلہن کے دوپٹے کے پلوؤں کی گرہ لگائی' اب وہ گرہ بھی دولہا کو چھنگلی سے کھولنی ہے' اسے کہتے ہیں (دور نو کیسے چھٹے) یعنی دور کیسے کھلے' اب دولہا گرہ کھولنے لگا تو دونوں طرف سے دوپٹوں کو کھینچ کر گرہ مضبوط کر دی گئی (کورس میں قہقہے) ہونگ۔

جب گرہ کھولی تو مشترکہ تالیاں' اب دوسری بار پلو باندھے' دولہا کی گود میں بچہ دیا گیا اور دولہا دلہن کو اٹھایا' مدینہ کا بیٹا غائب تو سات سالہ مہشر کو گود میں اٹھایا۔ جھک کر ساس صاحبہ۔ بھائی جی اور پھپھو سے ملا۔ بھیا نے بڑے چاؤ سے گلے لگایا' پیشانی چومی' آج ان کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی۔

مجھے بابا کی کمی محسوس ہو رہی تھی جنہیں ہم سے بچھڑے ہوئے بہت عرصہ بیت گیا ہے' ایسے موقعوں پر گھر کے بڑوں کی یاد تو آتی ہی ہے۔ مگر سب کی خوشی نے سارے ملال دور کر دیے۔

اب کنیز کو شاکنگ پنک بھاری شرارے میں دولہا کے ساتھ بٹھایا۔ کنیز بہت ہی معصوم اور پیاری لگ رہی تھی۔ بڑا ہی روپ چڑھا تھا۔ نگاہوں میں سب بلائیں لے رہے تھے دونوں کی' ایسے ہی ہنستے مسکراتے کنیز نبوی اور علی مردان کو سب کی سنگت میں اپنے کمرے میں لایا گیا' ان کے ساتھ بیٹھ کر سب نے مووی بنائی اور اس طرح خوش اسلوبی کے ساتھ اختتام ہوا تقریب کا' تھکے تھکے چہروں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ اور ان دونوں کے لیے بے شمار دعائیں تھیں' جو جگنو بن کر ان کے ارد گرد چمکنے لگی تھیں۔

رضیہ جمیل

خط اپنے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔
آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو اور ہمارے پیارے ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین)

پہلا خط ٹنڈو محمد خان سے سدرۃ المنتہیٰ کا ہے۔ لکھتی ہیں۔

کبھی کبھی آزمائش آتی ہے اور ہمیں اپنی پہچان کرا دیتی ہے۔ حادثہ چاہے جیسا بھی ہو زندگی کو مشکل امر بنا دیتا ہے، ہر کوئی اپنی شناخت سنبھالے، اپنا حوالہ اٹھائے آگے بڑھتا ہے اور ہمارے سامنے زندگی کا آئینہ آویزاں ہو جاتا ہے۔ حادثے جیسے بھی ہوں جان لیوا ہوتے ہیں اور ہم تو جیسے اب حادثوں کی زد میں آگئے ہیں۔

پہلے آٹھ اکتوبر کا زلزلہ اور اب حالیہ سیلاب جو کہ بڑے پیمانے پر انسانوں کی آزمائش بن کر آیا۔ کتنے گھر اجڑے، کتنی عمارتیں پانی میں بہہ گئیں، کتنی بیماریاں پھیلیں، کتنی اموات ہوئیں، دکھوں کا حساب رکھنا ناممکن ہے درد کا دور بڑا ہی تباہ کن ہے۔ آہستہ آہستہ بستیوں کی بستیاں اجاڑتا گیا۔ بے مکانی اور بے سروسامانی، تہی داماں اجڑے ہوئے انسان، جن کی خواہشیں جن کے خواب، جن کی امیدیں تو بہہ گئیں مگر بدا آسرا اور چھت، وہ بھی اسی طوفان کی نذر ہوئی اور ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ ہجرت اور دربدری کے کڑے دور سے گزرے، مکانوں سے، سڑکوں، کیمپوں اور میدانوں تک کا سفر سب سے تکلیف دہ تھا ان جگہوں پر ان کے کیا حالات تھے ہر کوئی اس سے آشنا ہے۔

ایسے میں بھوک کا عذاب جھیلنا آسان نہیں تھا مگر مہات صرف دو وقت کی روٹی پر ختم نہیں ہوتی "ٹرانسپورٹ کی عدم دستیابی کہیں تو کہیں کرایوں کا بہت زیادہ بڑھ جانا" ایسے میں وہ لوگ جو اپنے ڈوبتے مکانوں سے سوائے محرومی کے اور کچھ بھی ساتھ نہ لے سکے ان کے لیے نکل مکانی بھی ایک امتحان بن گیا۔ اور پھر محفوظ مقامات تک پہنچنے کے بعد بھی جن کے حالات نہایت افسوس ناک تھے۔

اسے میں کچھ جگہوں کے بے حس اور چھوٹے دل کے لوگوں نے بھی اپنا کردار نبھایا جن سے شہر میں یہ پریشان حال مہمان برداشت سے باہر تھے، کچھ کا خیال تھا کہ اس شہر میں ان مصیبت زدگان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ایسے میں کھلا کہ اپنے صوبے کے بڑے شہر میں اور شہر کے مکینوں کے چھوٹے چھوٹے دلوں میں وقتی طور پر بھی ان کے لیے کوئی جگہ، کوئی حیثیت نہیں ان حالات میں جہاں آنکھ اشک بار وہاں دل اس حد تک تنگ دل ہے تنگ نظری پر بے حد دکھی۔

مگر کچھ ایسے لوگ جو اپنے، بہن بھائیوں کا درد دیکھ کر باہر نکل آئے گھروں سے اور حسب استطاعت مدد کی، ان کا اجر خدا کے پاس محفوظ ہے۔ پیارے دوستو! بہت سے لوگ زندگی کو شکست کر واپس لوٹ گئے۔ کچھ باقی رہ گئے واپس جانے کے لیے اور افسوس کے کچھ راستوں میں ہی دم توڑ گئے۔ اب باقی زمین و آسمان کو دیکھتے وقت تمام کرتے ہیں، ان کا کوئی نہیں سوائے خدا کے مگر وہ اپنی آنکھوں کی روشنیوں میں خدا کے وسیلوں کو ڈھونڈتے ہیں، امید کی ایک دم توڑتی ڈوبتی ہوئی کرن، کبھی ننھی آنکھوں میں ستارہ بن کر جگمگاتی ہے تو بھی آنسو بن کر بہہ جاتی ہے۔

خوراک کے وسیلوں کے انتظار میں کئی آنکھیں بند ہو گئیں۔ جو کھلی ہیں وہ راہ تکتی ہیں۔ سوچیے، دولت اور وسیلے کون ہیں؟ شاید آپ؟ شاید ہم؟ میری درخواست ہے ان سب بہن بھائیوں کے لیے اپنی دعاؤں، اپنی خواہشات اپنی خوشیوں۔ اپنے اخراجات میں سے تھوڑا سا حصہ ان کے لیے بھی نکالیے، ہو سکتا ہے سو میں سے ایک بھی کوئی ایک آنسو خشک کر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئے۔ آپ کا ساتھ اور حوصلہ ان میں جینے کی امید پھر سے جگا دے، پیارے پاکستانیو! آئیں اپنے پاکستان کے مستقبل کے لیے ایک امید کی ننھی کرن بن جائیں۔ آپ اور ہم۔

★ ہماری سدرہ! یہ خانماں برباد لوگ ہمارے اپنے ہیں اور اپنوں کے لیے کردار حقیقت اپنے لیے کرنا ہے اور جو کچھ ہم اپنے لیے کرتے ہیں وہ کسی پر احسان نہیں ہوتا۔ کسی پر ترس یا ہمدردی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آزمائش سے سرخرو ہو کر نکالے آمین۔

یہ ای میل جمیلہ مراد نے ہمیں کراچی سے تحریر کی ہے۔ کہتی ہیں۔

ٹاکسل بہت خوب صورت تھا۔ "ستارۂ شام" آمنہ ریاض بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ "کوئی دیپک ہو" بے حد اچھا جا رہا ہے۔ رخسانہ آپی سے گزارش ہے کہ کہانی کے صفحات بڑھائیں اور کہانی ذرا جلدی جلدی آگے بڑھائیں۔ عالیہ بخاری کا "دیوار شب" بھی اچھا جا رہا ہے۔ اظہار صاحب کے خاندان کا پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ لوگ حرام کمائی کس دیدہ دلیری سے اس پر اللہ کا شکر بھی ادا کرتے ہیں۔ عنیزہ محمد بیگ کی "چاند رات" ہلکی پھلکی تحریر جو بے حد پسند آئی۔

نبیلہ ابر رانا! گو کہ پرانا موضوع لے کر سامنے آئیں۔ لیکن پھر بھی اس بار زیادہ مایوس نہیں کیا۔ ہاں مگر آبدار کو معصوم دکھانے کے چکر میں زیادہ ہی بدتمیز کر دیا۔ اس پہ سعید الدین کی حمایت اور ہاں ابوبکر جیسے لائق فائق لڑکے کو آوارہ میں کیا نظر آیا۔ جب کہ اس کے سامنے عزہ اور عریشہ جیسی چوائس موجود تھیں۔ کیا بال کھول کر آنکھیں بند کر کے دھمال ڈالنا؟ یا بچوں کے ساتھ کھیلنا، شرٹ کا اوپر کا بٹن کھول کر بھاگتے پھرنا؟ سدرۃ المنتہیٰ کا افسانہ "سندھو زندہ رہے گا" کو کہ اچھی تحریر تھی۔ مگر مجھے ذرا گہرائی میں ڈوبی سنجیدہ تحریر مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں۔ عائشہ فیاض کا "انار کلی" بہت خوب صورت افسانہ تھا۔ "عنی" "ردا فاطمہ کی بہت پیاری تحریر تھی۔ مگر جواد نے محبت کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ بے شک بار بار نہ کیا جائے مگر یہ کیا کہ ایک بار بھی نہ کیا جائے، یہ تو بے وقوفی ہوئی۔ "روشن ہے صبح زندگی" نسیم ارشد کی تحریر بہت ہی پسند آئی۔ مگر اختتام ادھورا لگا کہ مانی کی محبت کا انجام لالی کی شادی وغیرہ کی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی۔ نیر فہیم کا افسانہ کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ ویل ڈن! بے حد سبق آموز تھا۔ ناہید حیات نے بھی بہت اچھا لکھا۔

★ پیاری جمیلہ! خوش آمدید تفصیلی خط لکھنے کا شکریہ آپ کی تنقید اور بہروان سطور کے ذریعے مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

سدرہ سعیدی اور مصباح سعیدی "اندرون قلعہ مکیرہ ضلع بھکر سے تشریف لائی ہیں۔

پچھلے مہینے ای میل کی تھی جو شائع ہی نہیں ہوئی۔ پلیز مجھے بتا دیں کہ ان پیج میں لکھ کر میل سینڈ کرنے کا طریقہ غلط ہے کیا؟ اگر غلط ہے تو صحیح طریقہ بتا دیں پلیز.....

سب سے پہلے تو سرورق نے بہت اٹریکٹ کیا۔ سوبرسی ماڈل "سادہ" دھیمی سی مسکان لیے بیچ دھج کر بیٹھی نہایت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ٹاکسل بہت ہی زیادہ پسند آیا۔

شمارے میں دوسری اہم بلکہ خاص تحریر "ردا فاطمہ" کا افسانہ "عنی" ہے۔ پڑھ کر دل جیسے بند ہو گیا۔ میری طرف سے انہیں بہت بہت شاباش۔ آپ سے شکایت ہے کہ عید نمبر میں عید کے حوالے سے ایک دو اشعار ہی تھے اور نسیم ارشد کا ناول بھی کچھ خاص نہیں لگا۔ (پلیز نسیم ایبا! ڈونٹ مائنڈ) فاطمہ ثریا بجیا کا حال احوال پڑھ کر بھی اچھا لگا، لیکن "ہم جو معتبر ٹھہرے" کے آخر میں "باقی آئندہ" دیکھا تو خود پر بہت غصہ آیا کہ پہلے کیوں نہیں دیکھا۔ خیر شدت سے اگلی قسط کا انتظار ہے۔

نازنین کا خط پڑھ کر ان کے حالات پر بہت افسوس ہوا

لیکن پھر بھی اتنا اطمینان ہوا کہ اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی انہیں اتنا شعور حاصل ہے۔ میری بھی دلی دعا ہے اللہ انہیں ان کی مرضی کے مطابق ماحول عطا فرمائے۔ آمین۔ باقی بہنوں سے درخواست ہے کہ اس بات پر بھی اللہ کا شکر ادا کریں کہ اللہ نے ہمیں دین دار اور عزت دار گھرانے میں پیدا کیا۔ اگر وہ ہمیں کسی یہودی، عیسائی کے گھر پیدا کر دیتا تو ہم جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتے رہتے اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ الحمدللہ، الحمدللہ

★ سدرہ اور مصباح! شعاع کی محفل میں خوش آمدید، ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی میل شائع نہ ہو سکی اللہ تعالیٰ کا شکر تو ہر حال میں واجب ہے۔ اس نے ہمیں بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم زبان سے تو شکر ادا کرتے ہیں لیکن ان نعمتوں کی قدر نہیں کرتے۔

ان پیج میں لکھ کر میل سینڈ کرنے کا طریقہ صحیح ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

منزہ رحمت نے ڈھنگ شاہ سے لکھا ہے۔

اس ماہ کا شعاع بہت زبردست تھا۔ کرن کرن روشنی" پڑھنے کے بعد ڈائریکٹ نایاب جیلانی کے پاس پہنچے اور خوب روئے۔ شفق بیچاری کے ساتھ بہت برا ہوا، نیلیہ ابر راجہ نے بھی ہمیشہ کی طرح دل جیت لیا۔ رخسانہ نگار، نسیم ارشد، انیقہ بیگ نے بھی خوب لکھا، افسانے بھی سب اچھے تھے۔ "ستارۂ شام" نے تو پہلی قسط سے ہی ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میرے خیال میں سفیان ماما نے ثروت سے پہلے شادی کی ہوگی۔ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان جو لڑائی جھگڑا ہوتا ہے اس کی سمجھ نہیں آئی شبیہہ العباس کے علاوہ اور کون سی وجہ ہے۔ "دیوار شب" اب عام سے خاص ہوتا جا رہا ہے پلیز عالیہ۔ بخاری صاحبہ خیام اور معاذ کے ساتھ برا مت کیجیے گا۔ خیام زوبیہ کا بھائی ہے اور مجھے اپنا اندازہ بالکل درست لگتا ہے۔ نازنین۔ بمن نے جو خط لکھا۔ مجھے اس کا دلی صدمہ ہوا ہے ان کا کہنا بالکل درست ہے کہ بعض اوقات شریف زادیاں بھی اس قسم کے کارنامے سرانجام دیتی ہیں کہ شرم سے سر جھک جاتا ہے ہمارے اپنے گاؤں میں اس قسم کی عورتیں موجود ہیں۔

آخر میں پلیز گزارش ہے کہ "خوب صورت بنیے" میں کچھ چینج لائیں۔

★ پیاری منزہ! کئی مہینوں بعد شرکت کی ہمت اچھا لگا۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ربیعہ نے یہ ای میل ہمیں غلہ منڈی سے بھیجی ہے، لکھتی ہیں۔

آلی! آپ کی کیا مجھ سے کوئی دشمنی ہے جو آپ میری ای میل شامل نہیں کرتیں، ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ سب نے ہی تعریف کی۔ سب سے پہلے رائٹرز کے نام پڑھے یہ کیا میری فیورٹ رائٹر کوئی بھی نہیں، سب سے پہلے "ستارۂ شام" پڑھا۔ بہت اچھا جا رہا ہے کیونکہ رائٹر بہت اچھی ہیں۔ مگر اس کو بہت زیادہ طویل نہ کیجیے گا۔ عنیقہ محمد بیگ کا "چاند رات" بھی اچھی تحریر تھی۔ مگر یہ سچ ہے کہ شوہر ٹائم نہ دے تو بیوی کو محسوس تو ہوتا ہے۔ ناہید حیات نے بڑا اچھا لکھا۔ عائشہ فیاض کا "انار کلی" بھی بہت اچھا لگا۔ اب آتی ہوں مکمل ناول کی طرف۔ نایاب جیلانی کے ناول میں تھوڑا جھول محسوس ہوا۔ ایک فوجی بندہ کانوں کا اتنا کچا؟ شفق کے تیرہ سال کے بچے، اس کے تھوڑا سا بہکانے پر اتنی آسانی سے خلاف ہو گئے؟ اور فوجی بندوں کا ایسج بھی اچھا نہیں دکھایا۔ ناولٹس سارے اچھے تھے۔

★ ربیعہ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی ہماری محفل میں شرکت کرتی رہیں گی۔

لکی مروت سے عابدہ شیر نے لکھا ہے۔

ملک کے حالات، سیلاب، فضائی حادثے، لاہور دھماکوں کو رو رہے تھے کہ اپنے علاقے میں وہ سیاہ دن دیکھنا پڑا، لکی مروت پولیس اسٹیشن دھماکہ، سپاہی سوئے ہوئے تھے، ان کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ سانس کیوں بند ہونے لگی ..... گھٹن کیوں ہو رہی ہے۔ عید پر گھر آنے والے عید سے پہلے آ گئے ..... مگر کفن میں۔

میرے خط لکھنے کی وجہ لاہور سے نازنین کا خط ہے۔ آپ کے خط کے جواب میں صرف یہی سوال کروں گی کہ کیا وہ لڑکیاں جن کے بارے میں آپ نے لکھا ہے۔ معاف کر دی جاتی ہیں؟ کیا ان پر کچھ بھی نہیں لکھا جاتا؟

ان کی تو آپ سے بھی بدتر زندگی ہوتی ہے۔ ضمیر کی مجرم، معاشرے پر بوجھ ..... زرد موسم میں ایمن جس پر پورا ناول لکھا گیا۔ آپ لوگ ان لڑکیوں سے پھر بھی بہتر ہیں۔ منافقت سے تو کام نہیں لیتیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ابتلا (آزمائش) کے لیے پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی غریب ہے تو اس کے صبر کا امتحان لیا جا رہا ہے اگر امیر ہے تو اس کے شکر کا .....

میری دعا ہے کہ تمام بناتِ اسلام کو عزت و شرافت کی زندگی نصیب ہو۔

پشتو کا ایک محاورہ ہے کہ۔

"مرگ حق دہ خو کفن کنے شک دہ"

یعنی موت تو برحق ہے۔ مگر کفن میں شک ہے کہ مل بھی جائے گا یا نہیں۔ امید ہے آپ میرے مختصر الفاظ سے میرا مطلب یعنی ماضی الضمیر سمجھ گئی ہوں گی۔ آخر میں شعاع کے لیے دعا .....

★ پیاری عابدہ! خوش آمدید اور دعائیں جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں۔ ان کا ہر حساس دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے۔

آپ کا خط پڑھ کر لگا کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ کبھی افسانہ یا ناولٹ نہیں لکھا؟ اس طرف توجہ دیں۔

ال، سنیعہ، نیہا، نعم، ماہا، سجل، مومنہ، سونیا، طلہ گنگ سے شریکِ محفل ہیں۔

ہمیں شعاع بہت پسند ہے۔ کیونکہ یہ ہمارا اپنا ہے۔ پلیز عالیہ آپی! سالار اور گیتی کو ضرور ملنا چاہیے۔ معاذ اور جویا کے ساتھ بھی برا مت کیجیے گا پلیز پلیز.....

باقی پہلی شعاع سے لے کر خوب صورت بنیے تک پورا شعاع بہت ہی بہترین ہے۔ اللہ اس کو ترقی کی راہ پر گامزن فرمائے۔

★ آپ سب بہنوں کو شکایت ہے کہ ہم نے آپ کا خط شامل نہیں کیا۔ یقین کریں کہ ہمیں آپ کا خط ملا ہی نہیں۔ اگر خط موصول ہوتا تو ہمیں ضرور یاد ہوتا کیونکہ اتنے پیارے نام ہیں آپ سب کے کہ نظر انداز ہونا مشکل ہے۔

سحر نے نامعلوم شہر سے لکھا ہے۔

اگر میں 500 روپے خط میں ڈال دوں اور اپنا پتہ لکھ دوں تو مجھے ہر ماہ ڈائجسٹ مل جایا کرے گا کہ نہیں۔

★ سحر! ایسی غلطی ہرگز نہ کیجیے گا۔ آپ ڈاک خانے جا کر ہمیں 500 روپے منی آرڈر کریں ورنہ لفافے میں سے پیسے گم ہو جانے کا خدشہ ہے۔ منی آرڈر اس ایڈریس پر کریں۔

خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔

اپنا ایڈریس اور نام بھی صاف صاف لکھیں۔

طیبہ کرن، چمن سے شریکِ محفل ہیں۔

شعاع، کرن اور خواتین اپنے سنگی ہیں سہیلی ہیں سہیلیاں ہیں جگری یار ہیں اور وہ سب ہی رشتے ہیں جو ہمارے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ اس کی ہر بات، ہر لفظ ہر جملہ ایسا ہی محترم ہے جیسا کہ سچے پکے دوست کا گوڈی سہیلی کا۔

رائٹرز کے بھی کیا کہنے! بیٹھے بٹھائے کبھی اثر میرے ڈانٹ پلوا دیتی ہیں کبھی کسی اکڑفوں آرمی والے کے ساتھ بھگی برسات میں لانگ ڈرائیو پر بھیج دیتی ہیں۔ کبھی شبلی اور جوادی کے گھر لے جاتی ہیں۔

کبھی کسی سخت گیر آنٹی سے بالا پڑوا دیتی ہیں تو کبھی یونیورسٹی میں بھجوا دیتی ہیں، وہ بھی مختلف ڈیپارٹمنٹس میں ہم ان ہی کی بدولت مفت میں کافی یونیورسٹیز کی سیر بھی کر آتے ہیں تو کبھی کسی بس اسٹاپ پہ کھڑے انتظار کی اذیت جھیل رہے ہوتے ہیں، کبھی کسی سے دھواں دھار بحث کر رہے ہوتے ہیں تو کبھی وگمہ چاچی کی باتوں پہ بے طرح منہ پھاڑے کھلکھلا رہے ہوتے ہیں۔ کبھی کسی کے گھر کے برگد کے بوڑھے پیڑ تلے بیٹھے نظر آتے ہیں تو کبھی کسی کی چھت پر چڑھ کر دوسرے گھر کا منظر دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی بلا جھجک، کبھی کسی کے وسیع دالان اور خالی لان میں انہی کے ساتھ غل غپاڑے میں مشغول ہوتے ہیں تو کبھی دنیا جہان کی بوریت منہ پر سجائے کسی دادی کے ارشادات سن رہے ہوتے ہیں۔

ویسے یہ جو ہیں نہ اپنی انیسہ جی ہمیں صحافی بنا کے ہی چھوڑیں گی، اتنی بہت اچھی ہیں نا نمرہ جی ہمیں ایک بار تو کلائمنگ بھی کروا لائی ہیں اور تب سے ہی دوبارہ جانے کا جوش ابلا جا رہا ہے، فرحت جی آپ ہمیں اب کسی اور یونیورسٹی میں لے کر جائیں گی۔ وعدہ رہا پکا پکا اور جس رائٹر نے جہاں جہاں لے جانا ہو لے جائے۔ ہم بالکل دل و جان سے تیار ہیں سب کے لیے ہماری دلی محبت اور شعاع کے

لیے جگر کا گوشہ نہیں پورے کا پورا جگر۔

★ طیبہ! شعاع کے پہلے شمارے میں ہم نے اداریے میں لکھا تھا۔

بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا
یہ تماشا کتاب میں دیکھا۔

تو حقیقت تو یہی ہے کہ کتاب کے ذریعے ہم گھر بیٹھے سارے جہاں کی سیر کر سکتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

دبئی سے اپنی ای میل میں ارم خان لکھتی ہیں۔

ستمبر کا شمارہ ملا تو عید کا مزہ آگیا۔ سارا دن ڈائجسٹ پڑھتی رہی اور مزے مزے کی ڈشز سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ عنیقہ محمد بیگ کا ناولٹ "چاند رات" بہت زبردست لگا۔ علینہ کا کردار بہت معصوم لگا۔ افسانوں میں نیر فہیم خان کا "سوال" زبردست تھا اور عائشہ فیاض کا "انار کلی" بھی بے حد پسند آیا۔ آمنہ ریاض کا "ستارہ شام" بھی سوسو چل رہا ہے۔ آپی! کیا میں اپنا افسانہ بذریعہ ای میل آپ کو بھیج سکتی ہوں؟ اور ہاں پلیز آپی! میری ای میل ضرور شامل کیجیے گا۔

ج: ارم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید افسانہ ای میل کے ذریعے نہیں، ڈاک سے بھجوائیں شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

منزہ پرویز نے محلہ سلہریاں سے لکھا ہے۔

چودہ سال سے شعاع کو پڑھ رہی ہوں۔ مگر کبھی خط لکھنے کی ہمت نہیں پڑی، بس اک انجانی سی ہچکچاہٹ رہی۔ اب شعاع کی طرف آتی ہوں "سوال" افسانہ نیر فہیم خان کا زبردست لگا۔ غیبت کے مسئلے پر اچھا بیان کیا۔ "خواب نگری" میں شعاع آپا اور رائٹروں کی ہیروئنیں دلچسپ تھا۔ عید نمبر میں زبردست تحریر "چاند رات" عنیقہ محمد کی تھی۔ جملے بازی کمال کی تھی۔ علینہ اور حنا کا کردار زبردست لگا۔ حنا کا جھگڑے میں بے انتہا پیار حساس سا بہت اعلا سا تھا۔ عنیقہ محمد اپنے فین کی لسٹ میں مجھے بھی شامل کر لیں۔ عائشہ فیاض ہمیشہ سے اچھا لکھتی ہیں۔ "سند ہو زندہ ہے"۔ عید نمبر پرفٹ نہ لگا۔ افسردہ سا رہا۔ نسیم ارشد کا "روشن ہے صبح" باتوں کا انبار لگا۔ کہانی کا اختتام بھی اچھا نہیں تھا۔ مکمل ناول میں "جنوں کی راہ" نایاب جیلانی کا میرا دل جیت گیا۔ آمنہ ریاض "ستارہ شام" میں ہاوئی کا کردار زبردست جا رہا ہے۔ نبیلہ ابر راجہ بھی اچھا لکھتی ہیں، بور نہیں کرتیں۔

★ پیاری منزہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ چودہ سال بعد آپ نے اپنی خاموشی توڑی۔ ہمت پیدا کرنے میں اتنا طویل عرصہ لگا، آپ باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔ عنیقہ محمد بیگ اور دیگر مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

حنا آصف نے نامعلوم شہر سے خط لکھا ہے۔

عنیقہ محمد کا ناولٹ "چاند رات" میں جو کردار حنا کا تھا۔ بے شک میں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے بھی بلاوجہ لڑنے اور بحث کی عادت ہے۔ مگر حنا کے کردار کو پڑھ کر میں نے خود کو دیکھا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ اپنی ہی زندگی کو آگ کے جھونک رہی ہوں۔ میاں صاحب نے بھی ناولٹ پڑھا اور میری عید خوشیوں سے گزری۔ عنیقہ محمد بہت بہت شکریہ۔ آپ کی سبق آموز کہانیاں بہت زبردست ہوتی ہیں۔ "انار کلی" بھی ایک زبردست افسانہ تھا۔ جب کہ "خواب نگری" مزے دار تھا۔ رائیٹرز کی ہیروئنوں کا طرز بیان اچھا لگا۔ "سند ہو" افسانہ تھوڑا افسردہ سا لگا۔ باقی پرچہ زبردست تھا۔ خاص طور پر فاطمہ ثریا بجیا کا انٹرویو اچھا لگا۔ شادی سے پہلے کی میں نے کچھ تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔ کیا میں آپ کو بھیج سکتی ہوں۔

★ پیاری نورین! آپ نے ہمیں خط لکھا، بہت خوشی ہوئی لیکن شہر کا نام لکھنا تو بھول ہی گئیں۔ آئندہ یاد رکھیے گا۔

عنیقہ کی کہانی نے آپ کی عید کو خوشگوار کر دیا۔ بہت اچھی بات ہے ویسے بھی لڑائی جھگڑا اچھی بات نہیں ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ کرنے سے تو اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ خود بھی خوش رہیں دوسروں کو بھی خوش رکھیں یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

کہانی بھجوانے کا طریقہ بارہا بتا چکے ہیں۔ ایک بار اور بتا دیتے ہیں۔

کہانی کسی بھی کاغذ پر صفحے کے ایک جانب سطر چھوڑ کر لکھیں اور لفافے میں ڈال کر بذریعہ ارجنٹ میل سروس بھجوا دیں۔ ایڈریس یہ ہے۔

شعاع، 37 اردو بازار کراچی۔

قصبہ جلال پور شریف سے عائشہ کنول لکھتی ہیں۔

پہلا ہی شعاع پڑھنے کے بعد دل چاہا کہ آپ کو خط لکھوں میں سمجھتی ہوں کہ میں ایک اچھی رائٹر بن سکتی ہوں۔ ناولٹ مجھے بہت پسند آیا۔ دلہن بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے بعد "حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول" بہت اچھی لگی۔ "پیارے نبی کی باتیں" تو لاجواب ہیں۔ میں سمجھتی ہوں اس وجہ سے شعاع کو ترقی ملی ہے۔

"کاسۂ دل میں درد مسلسل ہے" "کنیز نبوی کا بہت پسند آیا" پڑھ کر رونا آگیا۔

آمنہ ریاض کا ناول "ستارہ شام" بہت اچھا جا رہا ہے مکمل ناول "جنوں کی راہ" میں نایاب جیلانی کا بہت زبردست۔ شفق کا کردار بہت پسند آیا۔

ہم جو معتبر ٹھہرے۔ نبیلہ ابر راجہ! پلیز آبدار کے ساتھ اچھا کیجیے گا مزید کچھ نہ ہو۔ معصومیت کا لوگ ایسے ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ رخسانہ نگار "کوئی دیپک ہو" بہت اچھا جا رہا ہے۔ ثانیہ کے ساتھ کیا کیا ہو گا۔

"روشن ہے صبح" نسیم ارشد کا پڑھ کر ہنسی کے دورے پڑے۔ ایسی ہی چیزیں ہمیں خوش کرتی ہیں ورنہ ملکی حالات تو اللہ بہتر کرے۔

"چاند رات" عنیقہ بیگ ایسی چاند رات تو سب کا مقدر ہو۔ "سند ہو زندہ ہے" سدرۃ المنتہیٰ کا بہت اچھا تھا۔ "سوال" نیر فہیم خاں بہت ہی اچھا تھا اس میں بہت گہرا سبق تھا اگر غور کریں تو۔ "خواب نگری" ناہید حیات نے کمال کر دیا "تاریخ کے جھروکوں سے" مجھے بہت پسند ہے۔ "موسم کے پکوان" بہت اچھے تھے۔ ایک مزے کی بات ایک ڈش میں نے بنائی تو آپ یقین مانیں میں نے اپنے پورے محلے کو بنا کر دی سب کو اتنی پسند آئی۔ ایک مشورہ ہے آپ خطوط لکھنے والی بہنوں کے لیے ایک سلسلہ شروع کریں ایک سوال کیا کریں زیادہ صحیح جواب دینے والے کا آپ کچھ لکھ کر بھیجا ہوا شائع کر دیا کریں انعام کے طور پر۔ میرا گاؤں بھی تاریخی ہے لکھ کر بھیجوں گی۔

★ عائشہ فی! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے تو ضرور لکھیں اور اپنے گاؤں کے بارے میں بھی بتائیں لیکن رجسٹری کرنے کے بجائے بذریعہ ارجنٹ میل سروس بھجوائیں تاکہ ہمیں جلدی مل جائے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

فاخرہ احمد اپنی ای میل کے ساتھ ہری پور سے شریک محفل ہیں۔

ستمبر کا شعاع ملا تو عید سے پہلے ہی عید کا مزہ آگیا۔ ٹائٹل دیکھ کر یوں لگا جیسے میری کزن بیٹھی ہو۔ ناولز میں نایاب جیلانی کا ناول پسند آیا۔ البتہ نبیلہ ابر راجہ نے بھی بہت اچھا لکھا۔ ناولٹ میں نسیم ارشد نے بہت ہلکا پھلکا سا لکھا جو کہ بہت اچھا لگا۔ عنیقہ محمد بیگ جو کہ نئی رائٹر ہیں۔ مگر انہوں نے اچھا لکھا۔ ان کی کہانی پڑھ کر بہت سی بیویوں کی چاند رات اچھی گزری ہو گی۔ کنیز نبوی نے ہمارے دل کی بات کو الفاظ کا روپ دے دیا۔ عائشہ فیاض نئی رائٹر ہیں مگر آئیں اور چھا گئیں۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ کنیز نبوی کا تعلق کون سے شہر سے ہے؟

ج: فاخرہ خوش آمدید اور دعائیں۔ عید نمبر آپ کو پسند آیا، بہت شکریہ کنیز نبوی کا تعلق ٹنڈو محمد خان کے قریب ایک گاؤں سے ہے۔

اقراء اعوان کسووال سے تشریف لائی ہیں۔

اس ماہ کا ٹائٹل اچھا تھا۔ رسالہ کھولتے ہی سب سے پہلے چھلانگ لگائی رخسانہ نگار کے ناولٹ "کوئی دیپک ہو" پر۔ ناولٹ کے زیادہ صفحات دیکھ کر خوشی ہوئی۔ زونیرا کے رویے سے مجھے توڑ لگنے لگا ہے۔ یقیناً "ثانیہ" کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔

کنیز نبوی میری فیورٹ رائٹرز میں سے ہیں۔ سیلاب کے متعلق ان کی تحریر پڑھ کر آنکھیں بھر آئیں۔ یہاں پر میں ایک بات شیئر کرنا چاہوں گی۔ کہتے ہیں کہ ہر مصیبت اللہ کی طرف سے انسانوں کے لیے ایک آزمائش ہوتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے آرہے ہیں کہ ملک کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک مصیبت ختم ہوتی ہے تو دوسری سر اٹھا لیتی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

نسیم ارشد کا ناولٹ "روشن ہے صبح زندگی" بہت اچھا لگا۔ نیر فہیم کا افسانہ "سوال" سبقت لے گیا۔

شعاع کے سارے سلسلے بہت اچھے ہیں۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ شعاع کی رائٹرز بھی بہت زبردست لکھتی ہیں۔ آپی! مجھے بھی لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے ایک اسٹوری لکھی ہے آپ کہیں تو بھجوا دوں؟

ایک اور بات..... میری سسٹر نے پچھلے ماہ خط بھیجا تھا۔ آپ نے ہمارے شہر کا نام ہی غلط شائع کیا۔ ہمارے پیارے

سے شہر کا نام "کسوال" ہے "ملک وال" نہیں ہے۔

★ پیاری افرا! سب سے پہلے معذرت کہ آپ کے شہر کا نام غلط شائع ہو گیا۔

سیلاب، زلزلے، خشک سالی تمام قدرتی آفات کبھی آزمائش ہوتی ہیں کبھی ہمارے غلط کاموں کا نتیجہ اور کبھی قدرت کی طرف سے وارننگ ہوتی ہے کہ ہم اپنی اصلاح کرلیں، سوچیے کہ ہم پر پے در پے آفات آرہی ہیں لیکن کیا ہم میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟ تو اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ پورے ملک کا حال تو جانے دیں، صرف کراچی میں اگست کے مہینے میں 125 افراد ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو معصوم اور بے گناہ تھے کسی بھی لڑائی جھگڑے میں ملوث نہیں تھے۔ مزدور موچی، چائے والے، ٹھیلے والے، پتھارے والے، رکشہ ڈرائیور، بس ڈرائیور، کنڈکٹر ان بے گناہ لوگوں کے لیے کتنے لوگوں نے سوچا یا آواز اٹھائی۔

ہم کچھ اور نہیں کرسکتے تو کم از کم اتنا ہی کرلیں کہ اپنی دعاؤں میں ان لوگوں کو یاد رکھیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ظالموں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرے۔

آمین شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

حوریہ مرتضیٰ اپنی ای میل کے ساتھ لاہور سے تشریف لائی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری ای میل ضرور خطوط کی محفل میں شامل کریں گی۔ گو کہ میں آپ کی چار سال پرانی قاری ہوں۔ مگر میل اب کر رہی ہوں۔ اس بار ٹائٹل بہت اچھا تھا اور "مہندی کے ڈیزائن" بھی زبردست تھے۔ آمنہ ریاض کا "ستارہ شام" بہت اچھا جا رہا ہے کرداروں پر آمنہ کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ نایاب جیلانی کا "جنوں کی راہ" بہت ہی اچھا اور دل کو چھو لینے والا تھا۔ اور سب سے زیادہ دل تو عنیقہ محمد بیگ کے "چاند رات" نے جیت لیا۔ ویسے تو شعاع کی تعریف کے لیے تو میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ آئی! عمیرہ احمد کہاں غائب ہیں؟

★ حوریہ جی آپ کی ای میل شامل ہے۔ شعاع آپ کو پسند آیا، یہ جان کر خوشی ہوئی۔ عمیرہ احمد نئی دی پر مصروف ہیں۔

شہلا رجانہ نے ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے۔

یہ عید گزر گئی اچھی بری جیسی بھی، بہرحال اللہ کریم اب تو بہتر ہی کرے اور ہمارے عزیز وطن اور ہم وطن بہنوں بھائیوں کو جلد برے حالات سے نکالے (آمین) لیکن ایک حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ مصیبت کے وقت ہم سب کے دل ساتھ دھڑکتے ہیں۔ عوام کے حالات بہت برے تھے لوڈ شیڈنگ، مفلسی، مہنگائی اور بے روزگاری نے بہت سے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے پھر بھی ماشاء اللہ سے ٹرک بھر بھر سامان بھجوایا جا رہا ہے یہ ایک قابل فخر قوم ہے، ہمارے درمیان ابھی بھی بہت درد دل رکھنے والے لوگ ہیں جن کی وجہ سے اسلام کا نام زندہ ہے۔ میرا خط لکھنے کا بڑا سبب "نازنین" صاحبہ کا خط ہے۔ آپ یقین جانیے یہ خط پڑھ کر میرا دل دہل کر رہ گیا۔ کتنے فخر میں چپ چاپ اور گم صم بیٹھی رہ گئی۔ اس لائن پر ہم لوگوں نے بھی سوچا نہ ہو گا بہرحال ان کے احساس دلانے کا بہت شکریہ۔ میرا خیال ہے نازنین جی! رائٹرز کا مقصد آپ جیسا حساس دل دکھانے کا بالکل نہیں ہے، وہ تو جنرل اسٹوریز ہی لکھتی ہیں جیسے معاشرے کے دوسرے لوگوں پر لکھتی ہیں۔

کیا آپ کسی غیر معروف قاری کو بالکل اہمیت یا جگہ نہیں دیتے۔ آپ لوگوں کی اس محفل پر ہم دور دراز والوں کا بھی تھوڑا حق ہے۔ شعاع اس دفعہ عید کو ہی مل گیا۔ بہت ہی زبردست۔ اتنا اچھا ٹائٹل اور ایسی کہانیاں ایک عرصہ بعد پڑھنے کو ملی ہیں۔ پلیز نمرہ احمد کی شادی کا احوال ضرور دیں اور ہو ان ہی کی زبانی پھر پڑھنے کا صحیح مزہ آئے گا۔

★ پیاری شہلا! اگر شعاع پڑھتی ہیں تو آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ اس سلسلے میں پرانے قارئین کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کے خطوط بھی شامل ہوتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیں کہ نیا یا پرانا ہونے سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے ہمیں تو شعاع کی سب ہی قارئین عزیز ہیں، اچھا خط ہو اور وقت پر مل جائے تو ہم ضرور شامل کرتے ہیں۔

نمرہ احمد نے اپنی شادی کا احوال لکھا تو ضرور شامل کریں گے آپ کی فرمائش ہم ان تک پہنچا رہے ہیں۔ آپ کی اس بات سے ہم سو فیصد متفق ہیں کہ چند لوگوں کو چھوڑ کر

بہت سے مجبور ہمارے عوام بہت اچھے ہیں، درد مند دل رکھتے ہیں لیکن ابھی سیلاب زدگان کو بہت مدد کی ضرورت ہے ہمیں چاہیے کہ مل جل کر ان کے لیے اتنا ضرور کر دیں کہ وہ دوبارہ اپنی زندگی کا آغاز کر سکیں۔ فصلوں کے لیے بیج، کھاد وغیرہ مہیا کر سکیں۔ کچھ راشن خرید سکیں۔

نازنین کا خط پڑھ کر ہمیں بھی بہت دکھ ہوا۔ آپ ان کے لیے دعا کریں۔

سونیا ربانی قاضیاں، محلہ بالا سے لکھتی ہیں۔

مجھے ٹائٹل پہ دلہن بالکل بھی اچھی نہیں لگتی ہے۔ اب یہ کہنے کا تو کوئی فائدہ ہے نہیں کہ ٹائٹل پہ ماڈل لڑکی کی جگہ قدرتی منظر کو جگہ دیں کیونکہ آپ نے کون سا ہم غریبوں کی آرزو کو پورا کرنا ہے۔

دل خون کے آنسو روتا ہے کنیز نبوی جی! انسان کتنی بے بسی محسوس کرتا ہے جب اس کا سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ختم ہو جائے اور وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

بہت دکھ محسوس ہو رہا ہے آمنہ ریاض جی آپ کا ناول "زرد موسم" کی کمی محسوس نہیں ہونے دے رہا ہے۔ امید ہے کہ بہت اچھا چلے گا۔ حالے آپا خوش کر دیا آپ نے، آخر میں چلو جیا نے ہمت تو کی مگر اب آگے ہو گا کیا؟ اور دوسری طرف معاذ کا مزاج؟ پلیز اب آپ دکھی نہ کرنا۔ لگ یہی رہا ہے کہ آپ کو ترس آ ہی گیا ہے ہم سب پہ اور جویا نکاز کی معصوم سی محبت پہ۔ ہے نا!

عید نمبر تھا تو سوچا تھا کہ شاید کچھ الگ سا ہو گا۔ مگر افسوس کہ نسیم ارشد نے ہی ہمیں مسکرانے پہ مجبور کیا اور بس۔ "چاند رات" مجھے اچھا نہیں لگا اور خرسانہ جی آپ سے کیا کہوں، بے چاری ثانیہ اب کیا کرے گی؟ یہ زونی تو جانے کیا کرنے والی ہے۔ خیر کہانی اچھی جا رہی ہے۔ مگر پلیز! بہت زیادہ لمبا مت کرنا ورنہ وہ خوب صورتی نہیں رہتی۔

ہاں اس بار افسانے کمال کے تھے۔ سب ایک سے ایک۔ ردا فاطمہ آپ کا انداز مجھے بہت اچھا لگا۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ جہاں کئی یادیں قید ہیں۔ وہاں جا کر انسان ان میں کھو جائے۔ بہت اچھا لگا۔ حال سے پل بھر میں ماضی میں کھو کر سب کچھ محسوس کرنا۔ بہت بہت شکریہ اتنا اعلا اور انمول افسانہ لکھنے پہ۔ دوسرے نمبر پر سدرہ کا "سند ھو زندہ ہے"۔ رہا ایک ایسی تحریر کہ انسان لفظوں میں کھو ہی جائے۔ اور "انار کلی" کی بھی کیا بات تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ عائشہ جی کی بھی کیا بات تھی۔ ویسے پورے افسانے میں جملہ امجد کے بھائی بہت الگ سا لگا۔ مگر کاش امجد نے اپنی ماں سے اپنی پسند کہہ دی ہوتی۔ مکمل ناول ابھی پڑھے نہیں۔ کیونکہ میری پیاری ماما کی صحت خراب ہے اور رضی اعتکاف میں بیٹھا ہے مجھ اکیلی اور کمزور جان کو سب کچھ اکیلے ہی کرنا ہوتا ہے۔

خط آپ کے میں لاہور سے نازنین کا خط پڑھ کر عجیب سی حالت ہوئی، بیاں سے باہر۔ ہر کہانی ایک طرف مگر ایک حقیقت نے "ایک خط نے عجیب بے چینی دے دی اور ایک خط شاہ کوٹ سے سنبل نے لکھا، یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ کسی کو شاعری بھی فضول لگ سکتی ہے۔ اور خطوں سے یاد آیا۔ جولائی کہ شعاع میں عائشہ اور نفیسہ نے لکھا تھا۔ جی نفیسہ جی میں وہی سونیا ربانی ہوں آپ تو اتنے قریب کی رہنے والی ہیں میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ شاید اسلام آباد کی ہی ہوں گی۔ مجھے صرف آپ کا نام یاد تھا۔ عائشہ کا بھول گئی خیر بہت اچھا لگا کہ آپ کو چھوٹی سی ملاقات یاد ہے، حیرت کی بات ہے، آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟

★ سونیا جی! اللہ تعالیٰ آپ کی امی کو صحت دے (آمین) آپ نے اتنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھا۔ بہت اچھا لگا۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

رضیہ چوہدری اور رفیعہ چوہدری، میاں چنوں نویں نہر سے شریک محفل ہیں۔

ٹائٹل اچھا تھا لیکن کیا تھا کہ مہندی والا ہاتھ پورا دکھا دیتے عید کے دن پڑھ کر فوراً "ستارہ شام" پڑھا۔ ماؤی اور اس کی ماں کی انڈر سٹینڈنگ اچھی لگی اور خاص کر شمیم کا نیا روپ روشن ہے صبح زندگی کوئی خاص ناشر نہیں قائم کر سکی جبکہ ردا فاطمہ کی بیٹی نمبر لے گئی۔ بندہ جب اپنی پرانی جگہ پر جاتا ہے تو تاثرات بالکل ایسے ہی ہوتے ہیں نایاب جیلانی جنوں کی راہ میں بہت آگے بڑھ گئیں۔ مجموعی طور پر اچھی لگی "کوئی دیپک ہو" اپنی گرفت کھو رہی ہے سوال بھی اچھی تھی۔ نبیلہ ابر جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں دیپل ڈن

جی۔ آبدار نام بہت اچھا اور یونیک سا لگا۔ عائشہ فیاض بھی بہت اچھا لکھتی ہیں "دیوارِ شب" اچھی ہے لیکن اب بہت زیادہ طویل ہوتی جا رہی ہے۔ عنیقہ محمد بیگ بھی اچھے موضوع پر لکھتی ہیں ناہید حیات کی "خواب نگری" میں ایسے کھوئے کہ پتا ہی نہیں چلا کہ ہیرو آکر چلا بھی گیا۔ باقی تمام سلسلے بھی بہت اچھے ہیں آپی پلیز! اینکر' صحافی جاوید چوہدری کا فیملی انٹرویو دیں اور 103۔FM کے ساحر لودھی کا بھی انٹرویو شائع کریں۔

آپی ایک ناول تھا "ننگے پاؤں" پتا نہیں شعاع تھا یا خواتین میں اس کی رائٹر کا نام نہیں پتا۔ پلیز بتادیں کہ اس کا نام کیا تھا اور کیا وہ کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے' وہ قسط وار تھا۔

★ رضیہ اور رفیعہ! یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ آپ کے بہن بھائی آپ کو دھمکیاں دے رہے ہیں کہ خط شائع نہ ہوا تو شعاع پڑھنا بند۔ آپ ان کی دھمکیوں اور مذاق کی پروا ہر گز نہ کریں ان کو بتادیں کہ شعاع کا اپنی قارئین سے رشتہ بہت مضبوط ہے۔

"ننگے پاؤں" نگہت سیما کا ناول تھا' خواتین میں شائع ہوا۔ ان شاء اللہ آئندہ دو تین ماہ میں کتابی شکل میں شائع ہو جائے گا۔ پھر آپ ہمیں خط لکھ کر منگوا لیجیے گا۔

جاوید چوہدری سے ہم نے کئی بار انٹرویو کے لیے کہا ہے لیکن نہ جانے کیا وجہ ہے کہ وہ انکار کر دیتے ہیں۔ البتہ ساحر لودھی کے انٹرویو کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔

تحسین فاطمہ نے کسووال چک سے لکھا ہے۔

سب سے پہلے تو آپ کے لیے اور آپ کی پوری ٹیم کے لیے دعا گو ہوں جو ہر ماہ ہمارے لیے اتنی بے ساختہ خوشی کا سبب بنتے ہیں کہ جس کا کوئی مول نہیں۔ میں چار سال سے شعاع کی خاموش قاری ہوں۔ آپ کے تقریباً سارے سلسلے بہت اچھے اور زبردست ہیں۔ لیکن جس ناول نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا' وہ نبیلہ ابر راجہ کا ناول "معتبر جو ٹھہرے" ہے اس کے علاوہ نایاب جیلانی نے بھی خوب لکھا۔ رخسانہ نگار جی بہت زبردست لکھتی ہیں خدا ان کا قلم ہمیشہ رواں دواں رکھے۔ "کوئی دیپک ہو" میں زونی اتنی بری اور مطلب پرست ہے کہ جی چاہتا ہے اسے کوئی خوب سزا ملے۔ شعاع اور خواتین پڑھنے کا مجھے جنون کی حد تک شوق ہے' اس شمارے میں "مہندی کے ڈیزائن" پیارے تھے۔ "خوب صورت بنیے" میں نسخے بھی بہترین تھے۔ میں نے پوچھنا ہے کہ راحت جبیں کا تعلق کون سے شہر سے ہے؟ ماہا ملک' عمیرہ احمد فرحت اشتیاق' فائزہ افتخار کہاں غائب ہیں۔ راحت جبیں سے کہیں کہ زرد موسم جیسا کوئی اور ناول لکھیں' ہم نے اس ناول سے بہت کچھ سیکھا۔ عالیہ بخاری کا دیوار شب" بھی بہترین جا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ خیام' یوسف کمال کا ہی لڑکا ہو گا معاذ جویا کو پسند کرتا ہے اور معاذ کو زری پسند کرتی ہے۔ ان کا نجانے کیا انجام ہو گا۔

اگر (طائرلاہوتی) ناول منگوانا ہو تو کتنے پیسے بھیجیں اور کیا اس طرح لیٹر کے لفافے میں ڈال کر بھیج سکتے ہیں یا نہیں۔

★ پیاری تحسین! لفافے میں پیسے ڈال کر بھیجنے کی غلطی ہر گز نہ کریں۔ آپ مکتبہ خواتین ڈائجسٹ کے ایڈریس پر منی آرڈر کریں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نیہا مسعود نے ڈنگہ شہر سے لکھا ہے۔

زندگی میں پہلی مرتبہ شعاع پڑھا۔ میں ششم کلاس کی طالبہ ہوں پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ کہانیاں بہت مزے کی ہوتی ہیں میں صفہ پبلک اسکول میں پڑھتی ہوں۔ اور ڈنگہ شہر میں رہتی ہوں ڈنگہ شہر بہت خوب صورت ہے۔ جو بھی یہاں آتا ہے' ہمارے شہر کی تعریف کرتا ہے یہاں بہت سے ہسپتال ہیں اور کالج بھی۔

★ پیاری نیہا! آپ کا خط پڑھ کر اور آپ کے شہر کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو علم کی دولت سے نوازے (آمین) شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

✡

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما' ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

اُمِ مریم

ستارہ سرِ شام

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خونِ جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے' جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہا ہے۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ بہتر مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی حراست میں ہے' جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزوفرینیا کی مریض ہے۔ جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے قرآن کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماہی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کا تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ فرزند دانیال ملنسار اور مجتبیٰ خاتون ہیں۔ ولی' ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ماہی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

ڈاٹ کام

شبیہہ العباس طبعتاً "سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے' جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ پھپھی زاد نتوی سے منسوب ہے۔ نتوی اس کی تند خو طبیعت سے نالاں ہے۔ شبیہہ' نتوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرہ نتوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ نتوی کا منگیتر ہے' وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ نتوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش گواس بات کا علم نہ ہو۔

(اب آگے پڑھیے)

۴
چوتھی قسط

"یا اللہ.....! کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں۔ کیا یہ زمانے بھر کی کم عقل لڑکی کو میری ہی بہن بنایا جانا ضروری تھا۔"

ولید نے سخت لاچاری کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھا پھر گردن موڑ کر انیبا کو گھورا جو خود کو زمانے بھر کی کم عقل لڑکی قرار دیے جانے پر بری طرح برا منا چکی تھی۔

"اب اپنی خوف ناک آنکھوں کے تیر چلانا بند کرو تمہارے یہ تیر مجھے حق گوئی سے باز نہیں رکھ سکتے۔"

ادائے بے نیازی سے کہتے ہوئے اس نے ماتھے پر اٹکائے گاگلز آنکھوں پر سیٹ کیے۔ کندھے پر لٹکتا تھیلا نما بیگ کا زاویہ درست کرتے ہوئے اپنے ہی گیٹ پر نصب آرائشی شیشے میں اپنا عکس دیکھ کر نظر بد سے بچاؤ کی دعا کی۔ محترم ہائی اسکول جاتے تھے اور آج کل کے دیگر بچوں کی طرح نک سک سے ہیرو بن کر اسکول جانا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ اپنی اسپورٹس بائیک کو کک لگا کر انیبا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انیبا اچک کر سوار ہو گئی اور خفگی کے اظہار کے طور پر بڑی زور سے کندھا بھی دبوچ لیا۔

"اونہہ۔ کیا جاہلوں کی طرح کندھا دبوچا ہے میری شرٹ پر سلوٹیں نہیں پڑنا چاہئیں۔" ہیرو صاحب کو اپنے امپریشن کی بڑی فکر تھی سو تاکید ضروری سمجھی۔

"یار انو! ذرا مجھ پر آیت الکرسی پڑھ کر ہی پھونک دو' بالکل شہزادہ لگ رہا ہوں آج۔ کہیں اپنی ہی نظر نہ لگ جائے اسی خدشے کے پیش نظر دو تک مر بھی نہیں دیکھا۔ جب تمہارے کالج کے سامنے بائیک روکوں گا تو نہ جانے کتنی حسینائیں اپنی انگلیاں چبا ڈالیں گی لیکن یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں' یہ تو فخر کی بات ہے۔ مگر مجھے ڈر ہے کہیں کسی حاسد کی نظر ہی نہ لگ جائے اور میں صبح سویرے ضائع ہو جاؤں' پلیز آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر پھونک دو۔ کیسی بہن ہو تم۔ بھائی کا ذرا احساس نہیں۔"

کالونی کی سڑک عبور کر کے مین روڈ تک آنے میں وہ مسلسل بولتا رہا تھا۔ انیبا نے ایک زوردار گھونسا اس کی کمر پر جڑ دیا۔

"بہن کے جیتے! کسی کی نظر سے تم ضائع ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح فضول بکواس کرتے رہے تو میرے ہاتھوں ضرور ضائع ہو جاؤ گے۔" دوسرا گھونسا پہلے سے زیادہ زوردار تھا۔

"اوہ۔ ہو۔ ہو۔" بائیک بری طرح لہرائی تھی پھر جھنجلا کر بولا۔

"انو کی بچی! کتنا بھاری ہاتھ ہے تمہارا۔ لیلیٰ علی کا ہاتھ بھی تم سے تو نازک ہی ہو گا۔ میں بتا رہا ہوں دوبارہ مارو گی تو میں فٹ پاتھ پر پھینک کے کالج چلا جاؤں گا۔"

"پہلی بار مرد دیکھو تو غور سے دیکھنا تمہاری تو شکل بھی لیلیٰ علی سے ہی ملتی ہے۔" وہ کہاں چوکنے والی تھی فوراً

حساب برابر کر لیا۔ ولید نے بلا توقف قہقہہ لگایا۔

"مجھے بڑا افسوس ہے تمہارا مقصد پورا نہیں ہوا مجھے شرمندہ کرنے کا۔ کیونکہ لیلیٰ علی کا صرف نام ہی لیلیٰ ہے شکل سے تو وہ اچھی خاصی مردانہ ہے۔" پھر ایک اور قہقہہ لگایا۔

"برا ہو اس وقت کا۔ جب میں نے تم سے کالج ڈراپ کرنے کو کہا تھا۔ اوٹ پٹانگ باتیں کر کے میرا دماغ چاٹ رہے ہو اس سے اچھا تھا میں ڈیڈی کے ساتھ ہی چلی جاتی۔"

"ہم گھر سے زیادہ دور تو نہیں آئے۔ کہو تو واپس چھوڑ آتا ہوں' آرام سے ڈیڈی کی فوروہیلر میں بیٹھ کر کالج جانا۔ لیکن جو خیال کچھ دیر پہلے میرے سامنے ظاہر کیا ہے پلیز اسے ڈیڈی کے سامنے ضرور دہرانا اور پھر ڈیڈی تمہارا جو حشر کریں گے نا! اس کے بعد نانی اماں نہ یاد آ گئیں تو میرا نام بدل کر لیلیٰ علی یار اکھی ساونت رکھ دینا۔" انیبا نے پھر اسے گھونسا جڑ دیا۔

"میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا کہ ڈیڈی خفا ہو جائیں۔"

"یہ تم تخریبی کارروائیاں تو بند کرو۔" وہ جھنجلا کر بولا تھا پھر بولا۔

"یقین کرو انو! آج تک تمہاری دل آزاری کے خیال سے میں خود کو سچ بولنے سے روکتا رہا ہوں مگر۔ آج۔ مگر آج میں خود کو روک نہیں پاؤں گا پلیز مجھے کہنے دو تم جتنی شکل سے احمق لگتی ہو اس سے کہیں زیادہ بے وقوف ہو۔ تم صرف ڈیڈی کی خفگی کی بات کر رہی ہو تمہاری بات سن کر شبیہہ بھائی بھی ناراض ہو جائیں گے۔"

"لیکن کیوں؟"

"او میری عقل والی بہن! بھلا کوئی شخص ہماری شکل دیکھنے پر تیار نہیں ہے وہ ہماری خوشی میں کیوں شریک ہو گا؟ ہمارے ممی ڈیڈی کی اپنی اور ہماری ہمارے لیے اہم ہے ان کے لیے نہیں میں تم سے احمقانہ بات کی توقع ہی نہیں کر رہا تھا ممی ڈیڈی کی شادی..... مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے شبیہہ بھائی کی زندگی کا المیہ ہے کبھی کسی کو المیہ پہ خوشی مناتے دیکھا ہے۔"

ولید کا حقیقت پر مبنی تجزیہ۔ انیبا قائل ہو گئی لیکن مایوس بھی۔

"کہتے تو خیر تم ٹھیک ہو لیکن ولید! مجھے ہمیشہ ایک احساس رہتا ہے جب تم میں اور ولی ممی اور ڈیڈی کے ساتھ ہوتے ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہماری فیملی نامکمل ہے۔ شبیہہ بھیا کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے مجھے۔ پھر میں سوچتی ہوں مجھے تو کبھی ان کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ تب بھی اتنی کمی محسوس کرتی ہوں ان کی۔ ممی کیا محسوس کرتی ہوں گی؟ وہ تو بہت مس کرتی ہوں گی بھیا کو۔"

"ممی نے کبھی تم سے کہا ہے؟" ولید نے پوچھا۔

"وہ کہاں کچھ کہتی ہیں انہیں تو گھٹ گھٹ کے رہنے کی عادت پڑی ہوئی ہے لیکن میں محسوس کر سکتی ہوں ان کے دل کیفیت کو۔ سچ کہوں تو شبیہہ بھائی کو انوائٹ کرنے کا خیال بھی مجھے صرف ممی کی وجہ سے آیا۔ ممی کے لیے یہ ایک بہت بڑی خوشی ہوتی۔"

"اور ڈیڈی کے لیے بہت بڑی ناخوشی۔" ولید نے دوبدو کہا تھا۔

"پلیز ولید! کیا پتا ڈیڈی خفا نہ ہوں۔ میں نے بہت عرصے سے ممی کو بہت خوش نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ [illegible] کرکے مسکراتی ہوں۔ تم میرے ساتھ شبیہہ بھائی کے پاس چلو۔" وہ منت سے بولی۔

"میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ جا کر بے عزتی کرواؤں جو بندہ ہماری شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں اس کے گھر

جا کر ذلیل نہیں ہونا مجھے۔" ولید نے صاف کہا۔

"تم بات نہ کرنا میں کرلوں گی۔" انیہا نے ایک اور راہ دکھائی۔

"میں ان کے گھر جانے پر نہیں راضی۔ تم بات کی بات کرتی ہو۔"

"پلیز ولید! میرے پیارے بھائی نہیں ہو۔"

"بھائی ہوں۔ پیارا ابھی ہوں لیکن یہ بات نہیں مانوں گا۔"

"خیر خیر۔ تم تو میری کوئی بھی بات نہیں مانتے۔" وہ غصے سے بولی۔

"جھوٹی ایک نمبر کی پرسوں آئس کریم کس نے لا کر دی تھی؟ اور تمہاری اس بدصورت سہیلی کے گھر سے نوٹس کون لایا تھا؟"

"تو کوئی احسان نہیں کیا تھا میں بھی تمہاری کتنی باتیں مانتیں ہوں، کام بھی کتنے کر دیتی ہوں۔ پرسوں تم نے آئس کریم لا کر دی تھی تو بدلے میں شرٹ بھی تو دھلوائی تھی مجھ سے۔"

"اس میں کون سی بڑی بات ہے، شرٹ تو شازیہ بھی دھو سکتی تھی۔ تم نے کیا کمال کیا؟"

"ولید! تم انتہائی احسان فراموش ہو۔ اللہ کرے تمہاری شادی بھی کسی شازیہ جیسی لڑکی سے ہو جائے جس کے ناخن میل سے بھرے رہتے ہوں اور جو دس دس دن نہائی بھی نہ ہو۔"

"اور خدا کرے تمہاری شادی بیوہ برال سے ہو جس کے سر پر..."

ایسی بددعا پر انیہا نے اسے پھر مکا جڑ دیا۔ ولید نے پلٹ کر کوئی سخت بات کہنا چاہی۔ پل بھر کے لیے سڑک سے نظریں ہٹیں۔ دو طرفہ ٹریفک تھی ہوش اس وقت آیا جب سامنے سے آتی گاڑی سر پر پہنچ گئی۔

تقدیر کا فیصلہ... ایک زبردست تصادم۔

"ولید...!" انیہا کے لبوں سے چیخ نکل گئی تھی۔

بائیک دور تک ٹوٹی ہوئی پتنگ کی طرح لہراتی فٹ پاتھ سے ٹکرائی۔ انیہا گھٹنوں کے بل فٹ پاتھ پر گری۔ ولید نے پاؤں کا سہارا لے کر بمشکل اپنی بائیک کو گرنے سے بچایا تھا مگر اس کوشش میں وہ خود ایک طرف کو لٹک سا گیا تھا۔

شیبہ نے اگر بروقت گاڑی کو بریک نہ لگائے ہوتے تو یقیناً "اس وقت خوف ناک تصادم ہونا تھا۔

"ارے یہ تو ولید اور انیہا ہیں۔" جے ڈی نے ونڈ اسکرین سے جھانکتے ہوئے کہا پھر وہ دونوں ہی بڑی تیزی سے کار سے نکل کر ان کے پاس پہنچے۔

"چوٹ تو نہیں لگی۔" انیہا پہلے ہی کھڑی ہو چکی تھی۔ جے ڈی نے ولید کو بائیک سیدھی کرنے میں مدد دی۔ انیہا نے خفت کے مارے جلدی سے نفی میں سر ہلا دیا، ولید خاموش رہا۔

دو تین راہ گیر صورتِ حال کا جائزہ لینے کھڑے ہو گئے تھے شیبہ نے پہلے انہیں بھگایا پھر ولید کو ڈپٹ کر بولا۔

"دکھائی نہیں دیتا تمہیں۔ جب بائیک چلانی نہیں آتی تو چلاتے کیوں ہو؟" اس کا لہجہ سخت اور اجنبی تھا جیسے ابھی تک کسی راہ گیر سے مخاطب ہو۔

"چلانی تو خیر آپ کو بھی کار نہیں آتی۔ پھر آپ کیوں کوشش کرتے ہیں۔" ولید نے خفگی سے دوبدو کہا تھا۔ شیبہ کا پارہ چڑھ گیا۔

"ہو ایڈیٹ... ایک تو غلطی کرتے ہو پھر زبان چلاتے ہو۔ میں تمہیں..." وہ آگے بڑھا، جے ڈی نے بے ساختہ اس کو شانے سے تھام کر روکا تھا۔

"پلیز شیبہ بھیا! غلطی میری تھی آپ ولید کو کچھ نہ کہیں۔" انیہا منمنائی۔ شیبہ نے غضبناک نظروں سے اسے گھورا۔

"شٹ اپ... اینڈ ڈونٹ کال می بھیا۔ بلاوجہ کی رشتہ داریاں جوڑنے سے سخت نفرت ہے مجھے۔"

اس نے سخت لہجے میں کہا اور پلٹ کر کار کا دروازہ زور دار آواز سے بند کر دیا۔ جے ڈی نے ہمدردی سے انیہا کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا پھر ولید کو جس کا چہرہ خفت و غصے سے لال ہو رہا تھا۔ وہ بے چارہ نہ تین میں نہ تیرہ میں مخمصے میں پڑ گیا۔

"ولید! آؤ ہم تم لوگوں کو ڈراپ کر دیتے ہیں۔" ولید جھک کر بائیک کی چوٹوں کا جائزہ لے رہا تھا پل بھر کے لیے جے ڈی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"وہ جن بیٹھنے دے گا اپنی گاڑی میں؟"

جن، جے ڈی کے انتظار میں ہارن پہ ہاتھ رکھ کر بھول چکا تھا۔

"ولید! بدتمیزی مت کرو۔" انیہا نے ڈانٹ دیا۔ جے ڈی نے لاچاری سے اپنے گرد موجود ان تین کرداروں کو دیکھا جن کے درمیان اسے اپنا وجود پنگ پانگ بال کی طرح محسوس ہو رہا تھا پھر اس نے ولید کا کندھا تھپتھپایا اور پلٹ کر کار میں جا بیٹھا۔

گاڑی جن سے ان کے قریب سے نکلی تھی۔

ولید نے پلٹ کر انیہا کو گھورا۔

"ان کو سمجھا تھا "بھیا" تم نے... تھا کا مطلب تو تمہیں آتا ہو گا۔

اونہہ... سڑیل... بیٹھو اب چلیں گے شام کو ان کی طرف۔ تم پکنک پہ آنے کی دعوت دے لینا۔ مجھے یقین ہے وہ ہنسی خوشی راضی ہو جائیں گے۔" انیہا کی لٹکی ہوئی شکل دیکھ کر بھی وہ طنز سے باز نہیں آ رہا تھا۔

وہ بجھے دل سے بائیک پر سوار ہوئی تو ولید نے بائیک آگے بڑھا دی۔

ولید نے کالج کے سامنے بائیک روک کر گردن گھما کر انیہا کو دیکھا، بلکہ دیکھا کیا موجودگی ہی کنفرم کی تھی۔

پندرہ منٹ کے سفر میں وہ پندرہ منٹ ہی خاموش رہی تھی۔ ولید کو پریشانی سی لاحق ہو گئی تھی اتنی دیر تک تو وہ روٹھے ہوئے خاموش نہیں رہتی تھی کجا کہ جاگتے میں چپ رہنا کیسے گرنہ گئی ہو مگر انیہا کی مرجھائی ہوئی شکل دیکھ کر اداسی آ گئی۔

"یار انو! میرے ہی جیسے کسی ذہین شاعر نے کہا ہے۔"

ذرا سی بات ہے اب بھولنا ہی بہتر ہے
دلِ تباہ کو اب خستہ حال کیا کرنا

انیہا چڑ کر بولی "ایک تو تمہارے ان واہیات اشعار سے میں بڑی عاجز ہوں۔ موقع دیکھتے ہو نہ محل... بس شعر سنانے کی معصومیت پڑی ہوتی ہے۔"

"اس قدر بددماغی ہو تم لڑکی! اس قدر اعلا پائے کا شعر تمہیں واہیات لگ رہا ہے۔" اس نے انیہا کے ذوق پہ دل کھول کے تاسف کا اظہار کیا پھر بولا۔

"قصور تمہارا نہیں تمہاری کھوپڑی کا ہے جس میں دماغ کی جگہ بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ نہ تمہیں اچھے

اشعار سمجھ آتے ہیں نہ کامن سینس کی باتیں۔"

"اب کون سی کامن سینس کی بات میں نہیں سمجھی؟" انیبا نے جل کر پوچھا۔

"دیکھو انو! جو باتیں میں کہنے لگا ہوں یہ بڑی فہم و فراست کی باتیں ہیں اس لیے ایک ہی بار میں سمجھ لینا۔ میں بار بار نہیں دُہراؤں گا وہ جو تمہارے "بھیا" ہیں نا جن کا نقشہ میرا مطلب ہے جن کے مزاج کا نقشہ کچھ کچھ کسی "جن" سے ہی ملتا ہے' وہ ہماری ممی کو بھی ماں والی ریسپیکٹ نہیں دیتے یعنی وہ ممی کو Nobody سمجھتے ہیں جو سگی ماں کو Nobody سمجھتا ہے وہ سوتیلے بہن بھائیوں کو Some body کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے ان کو اہمیت دینا یا ان کی جھاڑ سن کر ہرٹ ہونا چھوڑ دو۔ تم جنتاں کو اہمیت دو گی اتنا ہی ان کے رویّے سے ہرٹ ہو گی۔ جب ان کے نزدیک ہماری کوئی اہمیت نہیں تو ہم انہیں اہمیت کیوں دیں ہم بھی انہیں Nobody سمجھیں گے۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا! مجھ پر آیت الکرسی اور قل پڑھ کر پھونک دو۔ وہ دیکھو وہ حسینہ کب سے مجھے گھور رہی ہے لیکن اس کے دانت مجھے پسند نہیں آئے۔ اتنے لمبے ہیں کہ ٹھوڑی تک آ رہے ہیں۔ بھئی میں تو آج شہزادہ لگ رہا ہوں کہیں یہ بگز بنی (bugs bunny) کی سوتیلی بہن مجھے نظر ہی نہ لگا دے اس لیے میں تو چلا۔"

وہ بائیک اڑاتے گیا انیبا مسکرا کر گیٹ عبور کر گئی۔ ولید کی باتیں اسے سمجھ میں آئی ہوں یا نہیں شبیہہ العباس کی جھاڑ سن کر ذہن پر چھائی کثافت ضرور ختم ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کا دوسرا پہر تھا اور کھڑکی سے جھانکتے آسمان پر ستاروں کا ہجوم دکھائی دے رہا تھا۔

جھینگروں اور مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازوں نے رات کے مخصوص تاثر کو بہت شدید کر رکھا تھا۔ کبھی کبھی کوئی کونج کرلاتی ہوئی گزرتی تو اس کی آواز رات کے منظر پر خراش سی ڈال دیتی تھی۔

زہرہ بڑی دیر سے کروٹ کے بل لیٹی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی اس کا ایک ہاتھ نامحسوس انداز میں گہری نیند سوئی جنت کو تھپک رہا تھا پھر اس نے کروٹ بدلی اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

ایک اضطراب ایک بے چینی سی تھی جو دوپہر سے اسے لاحق تھی اور جس نے اس کی نیند بھی اڑا رکھی تھی کروٹیں بدلنے کے ساتھ ساتھ وہ وقتاً فوقتاً دین محمد پر بھی نظر ڈال لیتی تھی جو پھاٹک کے پاس حساب کتاب کے رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔ زہرہ نے ذرا سی گردن موڑ کر جنت کو دیکھا جنت گہری نیند سو رہی تھی سوائی کی پیش گوئی کے عین مطابق اس کی پیشانی پر تین ٹانکے لگے تھے پورے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور زعفران گھلی رنگت اس وقت کملائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

"کوئی اور وقت ہوتا تو یقیناً "بیٹی کی حالت دیکھ کر زہرہ از سر نو تڑپ جاتی مگر اس وقت اسے بڑی گہری سوچ لاحق تھی جس نے اسے فکر مند بھی نہ ہونے دیا۔

"کیا بات ہے زہرہ! نیند نہیں آ رہی؟" دین محمد کب سے اسے کروٹیں بدلتے دیکھ رہا تھا بالآخر پوچھ ہی لیا۔ اس کی آواز نے کمرے میں پھیلے سناٹے کو تحلیل کر دیا تھا۔

زہرہ نے بے اختیار گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا دین محمد ابھی بھی رجسٹر پر جھکا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں جی! بس ایسے ہی بے چینی سی محسوس ہو رہی ہے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ "دل بڑا گھبرا رہا ہے اللہ خیر کرے۔"

"دل تو گھبرانا ہی ہے جنت کے اتنی چوٹ لگ گئی۔ ہسپتال لے کر جاتے ہوئے میرا ہاتھ خون و خون ہو گیا تھا اب جب تک زخم بھر نہ جائے بے چینی ہی رہے گی۔"

دین محمد نے جنت پر پیار بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ زہرہ اس کی اس حد تک مبالغہ آرائی پر ذرا بھی نہ حیران ہوئی۔ جتنی دین محمد کو جنت سے محبت تھی اس میں خون کا ایک قطرہ بھی ندی محسوس ہونا فطری سی بات ہے۔ لیکن زہرہ کو پہلی بار بے زاری ضرور محسوس ہوئی تھی۔

وہ یہ بھی جانتی تھی جو بات دین محمد سے کہنے کے لیے پر تول رہی ہے اسے سن کر وہ خفا ہو گا۔ جنت سے اس کی غیر معمولی محبت ایسی ہی خفگی کی متقاضی تھی لیکن کیے بنا چارہ بھی کوئی نہ تھا۔

زہرہ کو پریشانی کی دلدل میں دھکیل دیا تھا جس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر چلانا زہرہ کی مجبوری تھی۔

"ہوا چلنے لگی ہے۔ کھڑکی بند کر دیتی ہوں۔"

زہرہ نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دین محمد نے اسے ٹوک دیا۔

"اٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چارپائی ہلنے سے جنت کی نیند خراب ہو گی کھڑکی میں بند کر دیتا ہوں۔"

زہرہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

دین محمد نے کھڑکی بند کی اور احتیاط سے چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ کر محبت پاش نظروں سے جنت کو دیکھنے لگا۔ چارپائی احتیاط کے باوجود ہلکا سا آواز بلند چرچرائی تھی اور اس چرچراہٹ نے جنت کی نیند میں خلل ڈال دیا تھا۔

"کیسی کملا گئی ہے میری بیٹی بھاء رفیق درمیان میں نہ آیا ہوتا تو میں نے اس فاروق کی بچی (گردن) مروڑ دینی تھی۔ دونوں میاں بیوی نے اولاد سرچڑھا رکھی ہے۔ اللہ قسم ایسے بال (بچے) میرے ہوں تو سیدھا کر کے رکھ دوں۔"

پھر اس نے اسی دھیمی اور تلخ آواز میں فاروق کو بے دریغ دو تین گالیاں دیں۔ جنت نے آنکھیں کھول کر نیند بھری آنکھوں سے باپ کو اپنے قریب بیٹھا دیکھا۔ گلابی لب پھیلا کر مسکرائی اور کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔ دین محمد اسے چاہت سے تھپکتا رہا۔

زہرہ کو جب یقین ہو چکا کہ جنت سو چکی ہے تو اس نے بہت سوچ سمجھ کر بلکہ ناپ تول کر بات کا سرا پکڑا۔

"سنیں جی! میں ایک بات کہوں اگر آپ کو برا نہ لگے تو۔"

"ہے بھلی نہ ہو تو۔" دین محمد اس کی سادگی پر ہنسا۔

"آگے تیری کس بات کا برا مانا ہوں؟ اور اب تو مان بھی نہیں سکتا' میری رانی کی ماں ہے تو۔ اتنا پیارا تخلص دینے والی کی بات بری نہیں لگ سکتی مجھے۔" اس نے جھک کر جنت کے سر کا بوسہ لیا تھا۔

"دیکھیں جی! میری بات کو ٹھنڈے دماغ کے ساتھ سننا ہے آپ نے' سیانے کہتے ہیں بچہ جب تک چوٹ نہیں کھاتا بڑا نہیں ہوتا۔ جتنی بار چوٹ کھائے گا اتنی بار گر کر سنبھلنا سیکھے گا۔ جنت کے چوٹ لگنا مقدر میں تھا سو لگ گئی۔ ہم کب تک واویلا کرتے رہیں گے کہ ہماری بیٹیا کے خون نکلا ہے۔ ہو سکتا ہے فاروق کی بھی کوئی غلطی ہو لیکن اتنی معمولی سی بات کے لیے رشتے ناتے تو نہیں توڑے جا سکتے نا! اور نہ ہی یہ سیانوں والی باتیں ہیں۔ ہم نے خاندان برادری سے منہ تو نہیں موڑنا نا! میری بات مانیں صبح جا کر زبیدہ باجی اور رفیق بھاء کو منا لیں۔ اماں بھی خوش ہو جائیں گی اور خاندان ٹوٹنے سے بھی بچ جائے گا۔"

"دماغ تو ٹھیک ہے تیرا۔" دین محمد حسب توقع بھڑک کر بولا تھا۔

"جن کی وجہ سے میری بیٹی نے اتنی تکلیف سہی ہے انہیں منانے جاؤں؟ مرنہ جاؤں اس سے پہلے۔"

"ہائے ہائے! ایسی بھی کیا تکلیف اٹھالی ہے اس نے۔ ایسی چھوٹی موٹی چوٹیں تو بچے ہنسی خوشی سہہ جاتے ہیں۔ میں کہتی ہوں جنت کو اتنی سول جان (سہل پسند) نہ بنائیں کل کلاں کو رخصت بھی کرنا ہے ایسی نازک مزاجیاں لڑکیوں کو نہیں سجتیں پھر آپ کو صرف بیٹی کی فکر ہے۔ یہ بھی تو دیکھیں دوسری طرف بہن ہے۔"

"تو بہن نے بھی تو بیٹے اور شوہر کے لیے مجھے پیچھے دھکیلا ہے۔ جب اس نے بھائی بھاوج کی پروا نہیں کی تو میں کیوں کروں۔ اتنے سال بہنوں کے ناز بھی تو اٹھائے ہیں" آج اسے سب بھول گیا۔ میں اپنی بیٹی کو تکلیف پہنچانے والے کو کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ منانے جانا تو دور کی بات ہے۔" دین محمد نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"باقی بات رہی جنت کو رخصت کرنے کی تو اس کی فکر میں نہ پڑو، میں سوچ چکا ہوں اپنی لاڈو کے لیے ایسا لڑکا ڈھونڈوں گا جو اسی گھر میں رہے میری جنت مجھ سے دور نہ ہو۔" زہرہ دنگ رہ گئی۔

"کیا کہہ رہے ہو جی؟ گھر جوائی بناؤ گے؟"

"ہاں یہی سوچا ہے، بس اس موضوع پر دوبارہ بات نہ کرنا۔ میری جنت ساری زندگی میرے پاس رہے گی۔ تم کیسی ماں ہو بیٹی کی۔ تکلیف یا دوری کی ذرا پروا نہیں۔ دیکھ جنت! تیرا باپ ہی تجھ سے محبت کرتا ہے ماں کو تو بالکل بھی محبت نہیں۔"

دین محمد نے تلخی سے کہا اور کروٹ بدل لی جبکہ زہرہ نے سر پیٹ لیا تھا۔

"اس آدمی کو تو بیٹی کی محبت نے بالکل ہی سودائی کردیا ہے۔" یہ نہیں کہ اسے جنت سے محبت نہیں تھی لیکن چونکہ وہ عورت تھی اس لیے بچی کی پرورش میں ہونے والی کوتاہیوں کے نتائج خدشات بن کر اسے ڈرا رہے تھے۔

وگرنہ ماں کی محبت کا بھی کوئی مقابلہ ہے؟

وہ سوچ رہی تھی اور اس کی سوچ سے بے خبر قریب لیٹی ننھی جنت کا معصوم ذہن ماں باپ کی محبت کو اپنی سمجھ کے مطابق پسندیدگی کے ترازو میں تول رہا تھا۔

"ابا مجھ سے محبت کرتے ہیں، اماں کو بالکل پیار نہیں۔"

ننھے ذہن کی پرواز بس یہاں تک ہی تھی لیکن یہ حقیقت بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی نیچی اڑان بھرنے والے اونچی پرواز ضرور کرتے ہیں۔ جلد یا بدیر یہ فیصلہ تقدیر کرتی ہے۔

☆ ☆ ☆

"آپ کی طبیعت اتنی خراب تھی تو آپ کو مجھے بتانا چاہیے تھا میں آج گھر سے نکلتی ہی نہیں۔"

سوپ کا باؤل ثمینہ کو پکڑاتے ہوئے ماوی نے یہ بات کوئی دسویں مرتبہ دہرائی تھی۔ اس روز واپسی میں خاصی دیر ہوگئی تھی اور گھر میں داخل ہوتے ہی شازیہ نے خوب نمک مرچ لگا کر اسے ثمینہ کی بیماری کا قصہ سنا دیا تھا وہ کچھ نہ بھی بتاتی تو ثمینہ کی زرد رنگت اور نڈھال چہرہ اسے ساری کہانی سنا دیتے۔

ماوی یک دم بے حد پریشان ہوگئی تھی۔ اپنی حد درجہ پریکٹیکل اپروچ کے باوجود وہ ماں کے لیے بہت جذباتی تھی۔ ان کی معمولی سی تکلیف بھی اسے حواس باختہ کرکے رکھ دیتی تھی وہ بار بار پچھتاوے کا شکار ہوئی کہ آج گھر سے کیوں نکلی۔ ایک ہی جملہ کبھی وہ پریشانی اور کبھی خفت سے دوہراتی اس وقت بھی وہ واپس کچن میں جانے کے بجائے ان کے پاؤں کی جانب بیٹھ گئی تھی اور فکرمندی سے ثمینہ کا زرد رنگت والا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

ثمینہ کو بے ساختہ ماوی پر پیار آیا۔ ان کی بیٹی ان کے لیے ایسے فکرمند ہو رہی تھی جیسے کوئی ماں بچے کے لیے ہوتی ہے۔

"ماوی! یہ یخنی مجھ سے نہیں پی جائے گی۔ اب تو کچھ کھانے کے لیے دے دو۔" ثمینہ نے اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے کہا تھا۔

"سادہ یخنی نہیں ہے میں نے اسے سوپ کی طرح بنایا ہے۔ پی کر تو دیکھیں ممی! آپ کو پسند آئے گی۔"

"دو گھنٹے پہلے بھی ایک پیالہ تم نے مجھے یہی کہہ کر پلایا تھا اسے تو میں نے خود پر جبر کرتے ہوئے پی لیا مگر دوسری مرتبہ ہمت نہیں کرسکتی، تم پلیز مجھے تھوڑا سا لزانیہ ہی لادو۔"

ماوی ان کی بات سن کر ہنس دی۔

"یاد رہے کہ ایسے کئی بدذائقہ پیالے آپ نے بھی مجھے پلائے ہیں۔"

"شاباش ہے بیٹی! بڑے اچھے وقت پر بدلہ لے رہی ہو۔" ثمینہ مسکرائیں۔

"لیکن اپنے الفاظ فوراً" واپس لو میں اتنی بری کوکنگ ہرگز نہیں کرتی۔"

"آپ بیمار ہیں اب آپ سے کیا بحث کروں۔ کیا یاد کریں گی آپ بھی لے لیتی ہوں اپنے الفاظ واپس۔" وہ احسان کرتے ہوئے بولی۔

"اچھا جی شکریہ۔ اب اٹھو اور میرے لیے لزانیہ لے کر آؤ۔"

"جی نہیں ڈاکٹر نے ہلکی پھلکی غذا کھانے کا کہا ہے آپ کو۔ اس لیے آپ یہی سوپ پئیں۔"

"ڈاکٹر نے ہلکی پھلکی غذا کھانے کو کہا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ خود کو سزا دو۔"

"اب اتنا برا سوپ بھی نہیں ہے۔" ماوی خفا ہو کر بولی۔

"ہاں میری چندا! اتنا برا نہیں ہے مگر میرے منہ کا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔ لزانیہ کے چند نوالے کھاؤں گی تو خاصا فرق پڑے گا۔"

"آپ تو بچوں کی طرح ضد کر رہی ہیں ممی!"

"تم بھی تو میری ممی بنی ہوئی ہو۔" وہ چڑ گئیں۔ ماوی اٹھ کر کچن میں گئی اور لزانیہ مائیکرو ویو میں گرم کرکے لے آئی جو گھر آتے ہوئے ایک مشہور فاسٹ فوڈ سے پیک کروایا تھا لیکن گھر آتے ہی ممی کو دیکھ کر ایسے ہاتھ پیر پھولے کہ سب بھول گئی۔

پلیٹ میں لزانیہ کے ایک بڑے ٹکڑے کے ساتھ چھری کانٹا اور ساس رکھی ہوئی تھی۔

"ایک پیالہ سوپ کے ساتھ صرف چند نوالے ملیں گے آپ کو۔ وہ بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے۔ ضد نہیں چلے گی۔ ایک بار طبیعت ٹھیک ہوجائے پھر جو مرضی کھائیے گا۔ میں نہیں روکوں گی۔ سچ ممی! مجھے پتا ہوتا آپ کی طبیعت اتنی خراب ہے تو گھر سے کسی قیمت پر نہ نکلتی۔"

"بھئی اتنے اہم کام تھے تمہارے۔ تم خود بتاؤ کیا کوئی ایک بھی کام ایسا تھا جسے میری خاطر ملتوی کیا جاتا۔"

"کمال کرتی ہیں آپ بھی، بھلا آپ سے زیادہ امپورٹنٹ بھی کوئی کام ہوسکتا ہے۔" ماوی نے ناراضی سے کہا۔

"لیکن آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔" اسے یہی غم کھائے جا رہا تھا۔

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔ میں نے ابھی صرف دو لقمے لیے ہیں دو اور لوں گی۔ شاپنگ مکمل ہوگئی۔" ثمینہ نے تائید کے ساتھ ہی پوچھا تھا، ماوی مسکرا کر اسی کانٹے سے خود کھانے لگی۔

"مکمل تو خیر نہیں ہوئی لیکن کافی کچھ خرید لیا۔ منیزہ آنٹی کی وجہ سے کافی سہولت ہوگئی۔ ممی! میں آپ کے لیے بہت پیارا موو کلر کا سوٹ لائی ہوں۔ اس کا دوپٹہ دکھاتی ہوں آپ کو۔ سوٹ تو سلائی کے لیے ٹیلر کو دے آئی ہوں۔"

"بہت اچھا کیا۔ بس ٹیلر کو تاکید کر دینی تھی کہ گلا گہرا نہ بنائے۔ مجھے سخت الجھن ہوتی ہے ڈیپ نیک سے۔"

"جی کہہ دیا تھا۔ میں برٹش کونسل بھی گئی تھی۔ شکر ہے دو تین کتابیں میرے تھیسز سے متعلق ملی ہیں مجھے لیکن زیادہ نہیں آدھ گھنٹے میں تو میں ڈھنگ سے پوری لائبریری نہیں دیکھ سکی کتابیں کیا ڈھونڈتی۔ ویسے تو قیر انکل سے ڈسکس کیا تھا میں نے۔ وہ کہنے لگے ان کی کوئی کزن کسی کالج میں پروفیسر ہیں اور تو قیر انکل کا خیال ہے میرے ریسرچ ورک کے سلسلے میں وہی میری مدد کر سکتی ہیں۔ میں نے کہا انکل آپ سوچئے نہیں فوراً سے پیشتر ان سے میری میٹنگ ارینج کروا دیں۔"

"تو قیر کا بیٹا اب کیسا ہے؟" ثمینہ نے پوچھا اسی بیٹے کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے پہلے روز تو قیر صاحب انہیں منزل تک پہنچانے نہ پہنچ سکے تھے۔

"پہلے سے کافی بہتر ہے۔ ٹخنہ فریکچر ہوا ہے ٹھیک ہونے میں ٹائم تو لگے گا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں پھر ہم عیادت کے لیے ان کے گھر چلیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے مجھے بھی پہلے ہی خیال آرہا تھا تو قیر کیا سوچتا ہوگا۔ کتنی مدد کر رہا ہے وہ ہماری اور ہمیں اتنی توفیق نہ ہوئی ایک بار گھر جا کر اس کے بیٹے کا حال ہی پوچھ لیں۔" ثمینہ نے کہا تو ماوی نے فقط اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آج ثروت بھی آئی تھیں۔" "معاً" ثمینہ کو یاد آیا تو بتانے لگیں۔

"ثروت.....؟"

"مسز دانیال حسن۔" ثمینہ نے بتایا۔

"اوہ مالک مکان کی بیوی۔" ماوی نے بس اتنا کہا پھر پوچھنے لگی۔

"انیبا بھی ان کے ساتھ آئی تھی؟"

"نہیں وہ تو نہیں تھی۔ مسز دانیال کو بھی شازیہ بلا لائی تھی وہی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھیں۔"

"اچھا اس کا مطلب ہمدرد روح ہے ان کے اندر۔ شکل سے تو بڑی روڈ لگتی ہیں۔" ماوی نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

"ہائے روڈ کہاں؟ اتنی پولائٹ بچی ہے وہ تو۔ مجھے تو بڑی اچھی لگی۔ ویسے تمہاری ملاقات کب ہوئی؟"

"ملاقات نہیں ہوئی؟ نہیں چند روز پہلے لان میں بیٹھے دیکھا تھا تو میں ہیلو ہائے کرنے آگے بڑھی تو وہ منہ موڑ کر چلی گئیں۔"

"اچھا حیرت ہے۔ ایسا رویہ دکھانے والی تو نہیں لگی مجھے۔ ملنسار اور خوش اخلاق لگی تھی۔ ممکن ہے اس نے تمہیں دیکھا نہ ہو یا اپنی کسی پریشانی میں ہو۔" ثمینہ کے پاس ہر کسی کے ناپسندیدہ رویے کی کوئی نہ کوئی توجیہہ ضرور تیار ہوتی تھی جو اس کے گھٹتے بڑھتے بلڈ پریشر کو سنبھالا دے۔

ماوی نے کسی قسم کا اظہار نہ کیا خاموشی سے کھاتی رہی۔

چند منٹ کے بعد ثمینہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"ایک بات کہوں ماوی! مجھے لگتا ہے میں نے مسز دانیال کو کہیں دیکھا ہے۔" ماوی چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"اچھا..... لیکن کہاں؟"

"یہی تو یاد نہیں آرہا۔ میں تب سے یہی سوچ رہی ہوں کہ ثروت کا چہرہ مجھے اتنا جانا پہچانا سا کیوں لگا ہے۔ شاید اس کی شکل کسی ٹی وی آرٹسٹ سے ملتی ہے یا اس کے بولنے کا انداز ویسا ہے۔ تمہیں اس کا چہرہ دیکھ کر کسی کی یاد آئی؟"

ماوی نے نفی میں سر ہلایا تو بولیں۔

"پھر مجھے اس کا چہرہ اتنا مانوس کیوں لگا ہے؟" انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"ممی! میں سمجھ گئی کہ آپ کو مسز دانیال سے مانوسیت کا احساس کیوں ہو رہا ہے۔" یکدم ماوی نے کہا۔ ثمینہ پر اشتیاق انداز میں اس کی اگلی بات کا انتظار کرنے لگیں تو آنکھیں مٹکا کر بولی۔

"آپ انڈین موویز دیکھتی ہیں نا! ان میں ایسی ہی اسٹوریز ہوتی ہیں۔ دو جڑواں بہنیں۔ ایک قسم کے میلے میں گم ہو گئی دوسری آئر لینڈ پہنچ گئی۔ اوگاڈ..... ممی! سیم ٹیپکل اولڈ اسٹوری۔ مبارک ہو آپ کو آپ کی جڑواں بہن..... پوری قسم کے میلے میں گم ہوئی جڑواں بہن مل گئی۔"

وہ رتی بھر بھی سنجیدہ نہ تھی ثمینہ نے گھور کر اسے دیکھا اور خالی پیالہ ٹرے میں پٹخ دیا۔

"تم بہت ہی بدتمیز ہوتی جا رہی ہو ماوی!"

"ارے واہ۔ بہن ملی نہیں کہ بیٹی بری لگنے لگی۔" اس نے ہنستے ہوئے انہیں چڑایا تھا۔

"چلو اٹھ کر برتن سمیٹو۔ میں خود ہی سوچ لوں گی مسز دانیال کو کہاں دیکھا ہے۔"

"اوہ شیور..... میرا کولڈ ڈرنک پینے کو دل چاہ رہا ہے' آپ پئیں گی؟" ماوی نے اٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں میرا موڈ نہیں ہے۔ اور میرا خیال ہے فریج میں بھی کولڈ ڈرنک نہیں ہے۔ کل ہی ختم ہو گئی تھی۔" ثمینہ نے بتایا تو ماوی بولی۔

"یہاں قریب ہی میں نے ایک شاپ دیکھی تھی شاید بیکری تھی۔ وہاں سے لے آتی ہوں۔"

"اس وقت؟ تمہارا دماغ ٹھیک ہے ماوی!" ثمینہ نے وال کلاک کی طرف دیکھا سات بج رہے تھے۔ "یہ لاہور ہے ڈیلن نہیں کہ تم آدھی رات کو بھی گھر سے نکلو اور بخیریت واپس آجاؤ۔ دہشت گردوں اور ڈاکوؤں نے ہوش اڑایا ہوا ہے اس لیے تم چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ ایک دن کولڈ ڈرنک نہ پیو گی تو کچھ فرق نہ پڑے گا صحت کو۔"

"آپ ذرا باہر نکل کر دیکھیں پورا شہر روشنیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ پھر گلی کے کارنر پر واچ مین بھی بیٹھا ہوا ہے۔ میں یوں گئی اور یوں آئی آپ بے فکر رہیں میں بچی نہیں ہوں کہ کوئی نقصان پہنچا دے۔"

ثمینہ کی آوازوں کی پروا کیے بغیر وہ تیر کی تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

شبیہہ کے دوستوں کی آمد عین اس وقت ہوئی جب وہ کچھ دیر سونے کے خیال سے بیڈ پر لیٹ چکا تھا اس کی عادت تھی سر شام سو جاتا پھر تہجد سے پہلے اٹھ کر طلوع آفتاب تک پڑھتا۔ چند منٹ وہ کرومیں بدلتا باہر سے آنے والی آوازیں سنتا رہا۔ اخلاقیات کا مارا ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا کہ گھر میں مہمان آکر بیٹھے ہیں اور وہ نیند نہ آنے کے باوجود سونا بنا رہے۔

ناچار اٹھ کر باہر آگیا۔

جاوید اور عذیر واپسی کے ارادے سے کھڑے ہو چکے تھے۔ دوست تو خیر شبیہہ کے تھے مگر اس سے بھی اچھے

روابط تھے تب ہی بڑی خوش خلقی سے حال احوال دریافت کیے گئے۔
"تم لوگ کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو۔ میں چائے بناتا ہوں۔"
اس نے حق میزبانی نبھانا شروع کیا۔
"اس... چائے تم بناؤ گے وہ تمہارا "اجمل" کیا ہوا؟" عذیر نے پوچھا۔
"اجمل چھٹی پر گاؤں گیا ہے۔ نیا ملازم آجانے تک سب کام خود کرنا پڑیں گے۔" جے ڈی نے جواب دیا تو سجاول جلدی سے بولا۔
"معاف کرنا یار! تمہارے تجربے کی نذر میں اپنی جان نہیں کر سکتا۔"
"یار! جے ڈی اچھی چائے بناتا ہے میں تو سوچ رہا ہوں اجمل کی مستقل چھٹی کردی جائے۔" شبیہہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
"اس کا مطلب... تمہارا معدہ پہلا تجربہ بڑی خوبی سے برداشت کر چکا ہے، چلو پھر ہم بھی ہمت کر لیتے ہیں۔" سجاول راضی ہوا تو عذیر ٹھٹک گیا۔
"جے ڈی! چائے ادھار کر لیتے ہیں پھر کبھی سہی۔ ہم تو شبیہہ کو اسائنمنٹ کی سوفٹ کاپی دینے آئے تھے۔ صبح اسائنمنٹ جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے اور میرا تقریباً سارا ہی کام نامکمل پڑا ہوا ہے۔ ابھی جا کر سرچنگ شروع کروں گا تب بھی صبح ہو جائے گی۔"
"اچھا یاد کروایا مجھے بھی احسن نے اپنی اسائنمنٹ میں مدد کے لیے کہا تھا۔" سجاول نے کہا پھر تیزی سے بولا۔
"عذیر! تمہیں یاد ہے نا! تم نے مجھے برگر کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔"
"برگر رہنے دو سجاول! ہمارے بلاک میں ایک نئی بیکری کھلی ہے وہاں کی چاکلیٹ پیسٹریز بہت زبردست ہیں۔ آج وہ ٹرائی کر لو۔"
جے ڈی نے اس کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیا تھا۔ سجاول اور عذیر کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا فوراً "راضی ہو گئے۔
"جے ڈی! ہم بھی ان کے ساتھ نہ چلیں؟ میرا بھی پیسٹری کھانے کا دل چاہ رہا ہے۔" شبیہہ کے کہنے پر وہ چاروں ہی باہر نکل آئے۔
"ویسے یہ برگر تھا کس خوشی میں؟"
عذیر اور سجاول ہنسنے لگے تھے پھر عذیر بولا۔

"تم لوگوں کو حیا اور شوال والے قصے کا تو پتا ہی ہو گا سجاول کا خیال تھا ان دونوں کا افیئر چل رہا ہے لیکن میرا خیال تھا یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ تین مہینے پہلے حیا نے بڑی دھوم دھام سے منیب سے منگنی کروائی ہے۔ اسی بات پر ہم دونوں کی شرط لگی ہوئی تھی۔ آج صبح ہی خبر ملی ہے کہ حیا نے منیب سے منگنی توڑ کر شوال سے رشتہ پکا کروا لیا ہے۔ بس یہ برگر اسی رشتے کا ہرجانہ ہے۔" وہ اپنے کلاس فیلوز کا قصہ سنا رہا تھا۔
جے ڈی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
"حیا نے پھر منگنی توڑ دی۔ بے چارہ منیب تو بہت ہرٹ ہوا ہو گا وہ تو بہت مخلص تھا حیا کے ساتھ۔ منگنی کی خوشی میں اس نے اپنے دوستوں کو میریٹ میں ڈنر بھی دیا تھا۔"
"اطلاع کے لیے عرض ہے منیب نے اس بار بھی اپنے دوستوں کو ڈنر دیا ہے۔ وہ بھی میریٹ میں نہیں بلکہ پی

ی ایں۔" سجاول نے مزے سے کہا تھا۔
"بے چارہ صدمے سے پاگل ہو گیا ہو گا۔" جے ڈی کو اعتبار ہی نہیں آرہا تھا۔ "حیا کے ساتھ تو کتنا خوش تھا وہ۔"
لڑکے ہنسنے لگے۔
"اوہ مو خان! کس دنیا میں رہتا ہے تُو۔" سجاول نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی۔ "منیب تو ہر اس لڑکی کے ساتھ خوش رہتا ہے جو اس جیسے گھامڑ کو ہمہ وقت گھاس ڈال رہی ہو۔ باقی بات رہی حیا بی بی کی تو اس سال میں یہ اس کی چوتھی منگنی ہے۔ بالآخر اپنے انجام کو پہنچی ہاں یہ ضرور ہے کہ اس منگنی کا دورانیہ پچھلی تین منگنیوں سے بہرحال زیادہ تھا۔ دیکھتے ہیں اب اس نئی منگنی کا کیا حشر ہوتا ہے۔"
"ایسا تو مت کہو... کیا پتا حیا اس بار شوال کے ساتھ ہی مخلص ہو۔" جے ڈی نے حسب عادت بہتری کی امید رکھی تھی۔
"میرے خیالات بھی کچھ کچھ تمہاری طرح ہی تھے جے ڈی! لیکن حیا جیسی لڑکی سے کسی اچھائی یا نیکی کی امید لگانا، بلکہ وہ ہی کیا ہمارے کلاس کے اکثر لڑکے لڑکیاں ٹائم پاس کے لیے یہی سب کر رہے ہیں، بس حیا صاحبہ کی ہوشیاری یہ ہے کہ وہ ہر انیز ڈنکے کی چوٹ پر چلاتی ہے۔"
"نہیں عذیر! میرا دل نہیں مان رہا یہ ساری باتیں، کوئی محض ٹائم پاس کے لیے کسی کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھا سکتا ہے یہ تو سراسر دھوکہ بازی ہے۔"
وہ بے چارہ سدا کا معصوم، چونکہ خود کسی کو دھوکہ دینا گناہ سمجھتا تھا لہٰذا خیال یہی تھا ساری دنیا اسی کلیے پر کاربند ہے۔
"یہ باتیں تمہیں سمجھ میں آبھی نہیں سکتیں کیونکہ تم سرٹیفائیڈ (تصدیق شدہ) احمق ہو۔" شبیہہ نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔
بیکری سے پیسٹریز خرید کر وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کھانے لگے۔ عذیر نے ڈپارٹمنٹ میں گردش کرتے نئے افیئر کا قصہ چھیڑ دیا تب ہی سجاول نے ان سب کو متوجہ کیا تھا۔
"اس لڑکی کو دیکھنا یہ جو بیکری کے باہر کھڑی ہے۔ یہ رابعہ مدثر نہیں لگ رہی؟" اس نے پُرسوچ انداز میں کہا تھا۔
"کون رابعہ مدثر؟ وہ جو سیکنڈ سیمسٹر میں یونیورسٹی چھوڑ گئی تھی؟" جے ڈی نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
"ہاں... وہی۔"
"نہیں سجاول! یہ وہ رابعہ نہیں ہو سکتی۔ رابعہ تو اتنی لمبی تھی اس لڑکی کی ہائیٹ تو بمشکل فائیو، تھری لگ رہی ہے۔" عذیر نے فٹافٹ اندازہ لگایا تھا۔
"یار! وہ رابعہ بھی بڑی دلچسپ لڑکی تھی یاد ہے شبیہہ کے کیسے آگے پیچھے پھرا کرتی تھی۔" سجاول کو یکدم یاد آیا تھا اور ان سب کا مشترکہ قہقہہ گونجا تھا۔
"اور یہ ہمارا بیکری بنگ مین... مجال ہے جو کبھی کسی چاری کو ذرا سی بھی لفٹ کروائی ہو۔" جے ڈی نے کہا تھا۔
"ہاں... ابھی لفٹ نہ کروانے پر یہ حال تھا کہ شبیہہ پر نظر پڑتے ہی ٹن ہو جاتی تھی اور اسے ٹکٹکی باندھ کر

دیکھنے لگتی تھی، کبھی یہ لفٹ کروا دیتا تو اس کا کیا حال ہوتا تھا۔"

ایک اور قہقہہ بلند ہوا تھا شبیہہ نے البتہ صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

"تم لوگ کھڑے ہو کر رابعہ کو یاد کرو میں یہ کوک بدلوا کر لاتا ہوں۔ اس بوتل میں کچھ پڑا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔"

وہ بیکری کی طرف آگیا۔ معاً" اس کے پیر کے نیچے ایک پتھر آگیا جس سے وہ لڑکھڑا سا گیا محض چند لمحوں کے لیے اس کی نظریں سامنے سے ہٹیں اور انہی چند لمحوں میں وہ لڑکی اس سے ٹکرا گئی۔

☆ ☆ ☆

دو گلیاں عبور کر کے وہ بیکری تھی جس کے بارے میں ماوی نے ثمینہ کو بتایا تھا گیٹ سے باہر نکلتے ہی اس نے واچ مین کی موجودگی کا یقین کر لیا تھا۔ گلی میں اپنے علاوہ اسے دو کافی فربہی مائل عورتیں بھی دکھائی دی تھیں جو غالباً" وزن گھٹانے کی غرض سے، بہت تیز تیز چل رہی تھیں۔ ماوی کو چونکہ ایسی کسی غرض کا سامنا نہیں تھا لہٰذا وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اردگرد کا جائزہ لیتی بیکری کی طرف چل دی۔

گو کہ ان چند دنوں میں اس علاقے کا حتی المقدور جائزہ وہ لے چکی تھی اور قریبی مارکیٹیں بھی دیکھ لی تھیں تاکہ بوقت ضرورت اسے اور ثمینہ کو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چلتے چلتے ماوی ایک بنگلے کے سامنے ٹھٹک کر رک گئی۔ یہ متمول افراد کا رہائشی علاقہ تھا اور یہاں تقریباً" سارے ہی بنگلے، کوٹھیاں بڑے بڑے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان بنگلوں کی بیرونی زیبائش و آرائش پر جتنی محنت صرف کی ہوئی دکھائی دیتی تھی اسے دیکھ کر بنگلوں کی اندرونی حالت کا اندازہ لگانا قطعاً" مشکل نہ تھا۔

جس بنگلے کے سامنے ماوی کے قدم ٹھٹکے اس کا وسیع و عریض گیٹ اور پالکونی کی گرل اتنی خوب صورت تھی کہ ماوی سراہے بنا نہیں رہ سکی۔ پاکستان آکر اس بات کا احساس اسے بڑی شدت سے ہوا تھا کہ بیرونی ممالک دکھائے جانے والے ٹی وی چینلز پاکستان کی بڑی حد تک غلط تصویر کشی کر رہے ہیں۔ بلاشبہ پاکستان میں گرد و غبار تھا، انتشار تھا، بدنظمی تھی، غربت اور دہشت گردی تھی مگر پاکستانیوں کے پاس پیسہ وافر مقدار میں تھا جو ان کے مکانات اور طرز رہائش میں صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہاں آئرلینڈ میں اگر کوئی بہت رئیس ہوتا تو اپنا دو تین کمروں کا ذاتی فلیٹ یا اپارٹمنٹ افورڈ کر لیتا تھا لیکن یہ عیاشی بھی ان کے حصے میں آتی جو رئیس ابن رئیس مانے جاتے تھے۔ خود ماوی بھی جب کبھی ٹی وی دیکھتی۔ پاکستانی نیوز چینلز پاکستان کی غربت اور لامتناہی مسائل کا انبار بیان کرتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ ان نیوز چینلز کی مہربانی ہی تھی کہ دوسرے ممالک میں بسنے والے افراد کی مجموعی رائے کے مطابق پاکستانی، پاکستان میں بھوکے مر رہے ہیں۔

ماوی نے جب اپنے تھیسز کے سلسلے میں چھان بین شروع کی تو پاکستان کی اس درجہ غربت کو بھی بدنظر رکھا تھا لیکن یہاں آتے ہی جو منظر اسے دکھائی دیا وہ اس تصویر سے قطعی مختلف تھا جو نیوز چینلز دکھا رہے تھے۔ یہاں

گھر تھے جن کو دیکھ کر محلوں کا گمان ہوتا تھا بڑی بڑی گاڑیاں تھیں، عالیشان شاپنگ مالز تھے اور نیشنل اور انٹرنیشنل بینکوں کی بہتات تھی۔

"یا شاید یہ صرف اسی علاقے کا منظر ہے، ضروری نہیں کہ سارے پاکستان کا یہی حال ہو مجھے ایسے ایریاز کو بھی وزٹ کرنا چاہیے جہاں غربت صحیح معنوں میں دکھائی دیتی ہو۔" وہ یہی سب سوچتے ہوئے بیکری تک پہنچ گئی۔

"ایک کولڈ ڈرنک دے دیں۔"

اس نے دکاندار سے کہا۔ دکاندار نے ایک طرف رکھے فریج کو کھول کر جائزہ لیا پھر اسے انتظار کرنے کا کہہ کر دکان سے منسلک ایک چھوٹے سے دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ ماوی کاؤنٹر پر ہاتھ رکھے لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پوری بیکری آرائشی روشنیوں سے جگمگ کر رہی تھی۔ جبکہ تاریک آسمان تلے پوری گلی اسٹریٹ لیمپس کے علاوہ بنگلوں کے باہر نصب الیکٹرک لیمپس کی روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ سناٹا ضرور تھا لیکن روشنی کی بہتات تھی۔

معاً" ماوی کو کچھ عجیب سا احساس ہوا لاشعوری طور پر اس نے گردن موڑ کر داہنی طرف دیکھا پھر چونک سی گئی۔ کچھ فاصلے پر الیکٹرک پول کے نیچے کچھ لڑکے کھڑے تھے اور انہوں نے ماوی کو ہی فوکس کیا ہوا تھا ان کے پاس دو بائیک تھیں اور وہ کچھ کھا رہے تھے۔ ماوی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر ایک نے دھیمی آواز میں کچھ کہا تھا پھر وہ سب ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے تھے۔ ماوی کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری چھا گئی۔ ان سب کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے کاؤنٹر کو زور سے بجانا شروع کر دیا۔

اسی وقت دکاندار باہر آیا اور اس نے کولڈ ڈرنک کی بوتل ماوی کو پکڑا دی۔ اسی وقت لڑکوں کے قہقہے کی آواز اسے پھر سنائی دی تھی۔ ان کی نظریں تو اب تک ماوی کو اپنے چہرے پر چپکی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی پیسے ادا کر کے وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔ یہ نہیں کہ وہ ڈر یا گھبرا گئی تھی، بس یہ اس کی احتیاط پسندی تھی جو اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا مگر سچ تو یہ ہے کہ جو ہوا برا ہوا۔ وہ جلدی میں ضرور تھی مگر اتنی عجلت بھی لاحق نہیں تھی کہ سامنے سے آتا ٹرک دکھائی نہ دیتا۔ ماوی رخ موڑ کر ایک طرف سے نکلنا چاہتی تھی مگر وہ لڑکا سیدھا چلتا اس سے ٹکرا گیا۔ ماوی ایسی حرکت کی توقع نہیں کر رہی تھی اس لیے بری طرح لڑکھڑا گئی کولڈ ڈرنک کی بوتل اچھل کر دور جا گری لیکن لڑکے کے ہاتھ میں پکڑی بوتل کانچ کی تھی۔ زمین پر گر کر کرچی کرچی ہو گئی کولڈ ڈرنک گری اس لڑکے کی شرٹ پر اور کانچ کا ایک بڑا سا ٹکڑا ماوی کی ایڑھی میں پیوست ہو گیا۔

ماوی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نما کراہ نکلی تھی اور وہ پیر پکڑ کر نیچے بیٹھ گئی۔

"واٹ بش..... تمہیں دکھائی نہیں دیتا، اندھی ہو گیا۔" وہ لڑکا جھنجلا کر بولا تھا۔ اس کے دوست بھاگے چلے آئے

"کیا ہوا ہے شبیہہ؟"

ماوی نے سر اٹھا کر غضب ناک نظروں سے اس شبیہہ نامی لڑکے کو گھورا جو شرٹ جھاڑتے ہوئے بار بار اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ ماوی اس کی اداکاری پر اش اش کر اٹھی۔ پوری پلاننگ سے اس سے ٹکرانے کے بعد وہ اس طرح ظاہر کر رہا تھا جیسے یہ ایک حادثہ ہو جس میں ساری غلطی بھی ماوی کی تھی۔

"اندھے ہو گے تم خود اور تمہارے ساتھی۔" ماوی نے بھی کسی لحاظ کے بغیر دوبدو کہا تھا۔

"پہلے تو آنکھیں بند کر کے چلتی ہو۔ میری ساری شرٹ خراب کر دی اوپر سے اتنی بدتمیزی کر رہی ہو؟" وہ غرایا۔

ماوی کو پنگے لگ گئے۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے اتنا گہرا زخم لگ جانے کے بعد مجھے تمہیں پھولوں کے ہار پہنانے چاہئیں۔"

"تمہیں مجھ سے ایکسکیوز کرنا چاہیے..... حالانکہ میں تمہیں معاف تو پھر بھی نہیں کروں گا لیکن بہرحال

مینرز بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ شکل سے تو اچھی خاصی مہذب لگتی ہو۔" شبیہہ نے بدلحاظی کی حد کردی تھی۔

"مائنڈ یور لینگویج پلیز۔۔۔۔" ماوی نے سلگ کر کہا ساتھ ہی کانچ کا ٹکڑا ایک جھٹکے سے نکال کر دور اچھال دیا اور کھڑی ہوگئی۔ ایڑھی سے فون بھل بھل بہہ رہا تھا اور تکلیف کی لہر ایڑھی سے پنڈلی تک دوڑ گئی تھی۔

"پہلی بات تو یہ کہ تم مجھے معاف کرو یا نہ کرو مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ فرق تو تب پڑے گا جب میں معافی مانگوں گی۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن۔۔۔۔ کسی کو اگر معافی مانگنا چاہیے تو وہ تم ہو کیونکہ جان بوجھ کر مجھ سے ٹکرانے کی غیر اخلاقی حرکت تم نے کی ہے میں نے نہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ مینرز تمہیں سیکھنا چاہئیں کیونکہ تم تو شکل سے بھی مہذب نہیں لگتے۔"

یہ پورا جملہ اس نے انگلش میں ادا کیا تھا پھر اردو سے انگلش بولتے ہوئے وہ عربی پر آگئی تھی اور اس نے عربی میں شبیہہ کو سخت سست سنانا شروع کردی تھیں۔ انتہائی خوشی یا غصے کی حالت میں وہ ان تین زبانوں کا ملغوبہ بنانا شروع کردیتی تھی اور یہ اتنی غیر ارادی حرکت ہوتی تھی کہ اسے احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ تینوں زبانوں میں سے کسی ایک زبان سے بھی نابلد شخص اس کی بات سمجھ نہیں پا رہا۔

اب بھی یہی ہوا تھا عربی کے بہ کثرت استعمال کی وجہ سے کوئی بھی اس کی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ان سب کے لیے تو یہی بات اچھنبے کا باعث بن گئی تھی کہ اس گلابیاں گھلی چمکدار رنگت والی لڑکی نے کتنے آرام سے ان کے گروپ کے سب سے ہینڈسم اور ویل مینرڈ لڑکے کو غیر مہذب قرار دے دیا ہے۔

تب ہی ان میں سے ایک لڑکے نے بڑھ کر کولڈ ڈرنک کی بوتل اٹھائی اور ان دونوں کے درمیان آگیا۔

"دیکھیے غلطی کسی کی بھی سہی۔ میں آپ سے ایکسکیوز کر رہا ہوں، پلیز آپ بات کو بڑھائیں۔" اس نے ملتجی انداز میں کہا تھا۔ ماوی نے غضبناک نظروں سے اسے گھورا۔ جھٹ کر اس کے ہاتھ سے بوتل لی گھما جانے والی نظروں سے شبیہہ کو دیکھا اور اپنا زخمی پیر گھسیٹتی گلی کے کونے پر غائب ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

اس لڑکی کے منظر سے ہٹتے ہی عذیر نے گہری سانس بھرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا جیسے مصیبت ٹل جانے پر شکر ادا کر رہا ہو۔

"یار! اس لڑکی کو دیکھ کر لگا تو نہیں تھا کہ اس کی آواز اتنی کرارہی ہوگی۔" جھینپی ہوئی ہنسی کے باوجود اس کا انداز صاف مذاق اڑانے والا تھا۔ سجاول اور جے ڈی ہنس دیے۔

"چلو یہ تو کنفرم ہوا کہ یہ رابعہ مدثر نہیں تھی۔ وہ بے چاری تو اتنی سوفٹ اسپوکن تھی پھر شبیہہ کو دیکھ کر اتنے روڈ لہجے میں بات کر ہی نہیں سکتی تھی۔" سجاول کی بات پر بھی شبیہہ نے اظہار رائے نہیں کیا اس کے چہرے پر ابھی تک تناؤ دکھائی دے رہا تھا۔

وہ تینوں ہی چونکہ شبیہہ کے غصے سے واقف تھے اس لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے پھر سجاول نے ہی ہمت کر کے اسے مخاطب کیا۔

"اس رومال سے اپنی شرٹ صاف کرلو اور اس میں اتنا غصہ کرنے کی تو کوئی بات نہیں ہے شبیہہ! جو بھی ہوا وہ مس انڈر اسٹینڈنگ کا نتیجہ تھا۔"

شبیہہ نے اس کے ہاتھ سے رومال لے لیا اور اپنی شرٹ پونچھنے لگا۔ شرٹ کے اس گیلے حصے سے اسے سخت وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ دماغ پھٹنے کے قریب تھا اور دل و دماغ میں جیسے گرم ہواؤں کے جھکڑ سے چلتے محسوس

ہو رہے تھے۔ کچھ دیر اسی طرح وہ غصے کی آگ میں سلگتا رہا یہاں تک اسے سجاول اور عذیر کے جانے کی بھی خبر نہ ہوئی پھر جے ڈی نے اس کی آنکھوں کے عین سامنے کوک کا ٹن کیا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"پی لو۔ غصہ ختم ہو یا نہ ہو کم ضرور ہو جائے گا۔" شبیہہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر ٹن لے کر کھولنے لگا۔

"سجاول اور عذیر؟"

"کب کے جا چکے۔" جے ڈی نے مختصراً جواب دیا اور کوک پینے لگا۔

شبیہہ نے وہیں کھڑے کھڑے تین چار بڑے بڑے گھونٹ حلق میں اتارے بھڑکتی ہوئی آگ پر چھینٹے سے پڑے تو دماغ سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک ٹھنڈک کا احساس پھیلتا چلا گیا تب اس نے جے ڈی کی طرف دیکھا وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اچھا ہوا تم اس لڑکی اور میرے درمیان آگئے ورنہ اس نے میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ جانا تھا۔" متنفر، برہم لہجہ۔

جے ڈی نے بس ایک نظر ہی اسے دیکھا تھا اور اسے لگا شبیہہ کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔

"پرسوں اگر میں وقت پر نہ آتا تو سعدی نے تمہارے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ جانا تھا۔ کل اگر میں نہ آتا تو ولید نے تمہارے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ جانا تھا۔ آج تم اس لڑکی کے بارے میں یہی بات کہہ رہے ہو۔ مجھے بتاؤ شبیہہ! تم کتنے انسانوں کو ان کے انجام تک پہنچانے کا ارادہ کیا ہوا ہے۔۔۔۔ تاکہ میں بروقت ہر ہر دو رمیان میں پہنچ کر معصوم بے قصور انسانوں کو تمہارے غصے سے محفوظ رکھ سکوں۔"

اس قدر غصے کے باوجود جے ڈی کے آخری الفاظ پر اسے ہنسی آگئی۔ اکل کھرا، بدمزاج، مغرور۔۔۔۔ وہ سب کچھ تھا اپنی غلطی ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر یہ بھی سچ ہے کہ جے ڈی دنیا کا وہ واحد شخص تھا جس کے سامنے اپنا آپ ظاہر کرتے شبیہہ کو کبھی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔

بچپن سے دونوں کی دوستی مثالی تھی۔ تائی اماں کہتی تھیں دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں ایک آگ تو دوسرا پانی۔ شاید یہی اب تک بھتی چلی آرہی ہے۔ مبادا دونوں آگ کی سی فطرت والے ہوتے تو اب تک ایک دوسرے کو جلا کر بھسم کر چکے ہوتے۔

"ہاں تو ٹھیک ہے۔۔۔۔ میں اپنی غلطی مان رہا ہوں۔ مجھے تمہارے دوست پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔" بڑا احسان کرنے والے انداز میں فرمایا گیا۔ جے ڈی کی جان جل کر خاک ہوگئی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول
شائع ہوگئے ہیں
☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبیں قیمت: 225 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
☆ محبت یہاں نہیں لبنیٰ جدون قیمت: 250 روپے
خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر
منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

"بہت شکریہ..... بڑا احسان کیا آپ نے اپنی غلطی مان کر۔" غصہ کرنے کی باری اب اس کی تھی۔ اس نے خالی ٹن سڑک کے کنارے رکھے ڈسٹ بن میں اچھالا اور بنا شبیہہ کی طرف دیکھے گھر کی طرف چل دیا۔ شبیہہ نے اس کی تقلید کی تھی۔

"اب غبارے کی طرح منہ کیوں پھلا لیا ہے؟ میں اپنی غلطی مان تو رہا ہوں پھر یہ ناراضی کس خوشی میں؟ تم کیا چاہ رہے ہو ناراض محبوبہ کی طرح تمہارے قدموں میں بیٹھ کر تمہیں مناؤں؟ یہ نہیں ہو سکتا اپنی غلطی مان رہا ہوں اسی کو میرا احسان سمجھو..... اوبھائی! منہ میں کیا گلوڑال لی ہے بولتے کیوں نہیں ہو؟"

"تم کچھ نہ کرو۔ بس ایک احسان کرو وہ بھی مجھ پر نہیں خود اپنی ذات پر یہ معمولی معمولی باتوں پر بھڑکنا چھوڑ دو۔ تم پاگل تو نہیں ہو نارمل انسان ہو الحمدللہ..... پھر نارمل انسانوں کی طرح بی ہیو کیوں نہیں کرتے...؟ ذرا ذرا سی بات پر بھڑکنا اور مرنے مارنے پر تل جانا..... یہ تو پاگل پن کی نشانی ہے شبیہہ.....!"

تیز لہجے میں بولتے بولتے وہ جیسے تھک سا گیا تھا کیونکہ یہ باتیں جو وہ آج شبیہہ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کوئی نئی نہیں تھیں شبیہہ ایک گھر کے باہر بنے بینچ پر بیٹھ گیا۔ جیسے دیر تک اٹھنے کا ارادہ نہ ہو۔

"گھر نہیں جانا..... بیٹھ کیوں گئے ہو..... چلو۔" جے ڈی نے خفگی سے کہا تھا۔

"تم جاؤ..... میں تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔" اس نے نروٹھے پن سے کہا اور دوسری سمت میں دیکھنے لگا۔

"ناممکن!" جے ڈی نے سرعت سے کہا۔ "تمہیں اکیلے یہاں چھوڑ کر جانے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر کسی سے جھگڑ پڑو گے اور میرے واپس آنے تک دو تین لاشیں تو ضرور ہی بچھا دو گے..... نہ بھئی میں تو نہیں جاتا۔"

"پہلے کون سی لاشیں بچھائی ہیں میں نے؟" شبیہہ نے سلگ کر پوچھا۔

"ارادہ تو آپ کا ہمیشہ سے رہا ہے۔" جے ڈی نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ شبیہہ نے اسے غضب ناک ہو کر گھورا۔

"چلو اب بیٹھ گئے ہو میرے سر ہانے تو کھول دو نصیحتوں کی پٹاری ہم تو کبھی کبھی مجھے اپنی اماں لگتے ہو جے ڈی!"

"جو سچ مچ تمہاری ماں ہیں انہیں تو اماں مانتے نہیں ہو۔" جے ڈی نے بے ساختگی میں کہہ تو دیا مگر بعد میں احساس ہوا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ یہ تو خاموش معاہدہ تھا کہ اس موضوع پر بات نہیں کی جائے گی آج نہ کل کبھی بھی نہیں۔

بدقسمتی سے جے ڈی خلاف ورزی کر بیٹھا کوئی اور ہوتا تو اس جسارت پر جبڑا تو ضرور ہی تڑوا لیتا۔

"پلیز..... میں اس ایشو پر بات نہیں کرنا چاہتا۔" شبیہہ نے کہا تو بس اتنا۔

"اچھا اپنے غصے پر کنٹرول تو کر سکتے ہو۔" جے ڈی نے سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے نادانستہ ٹوٹ گیا تھا۔

"یار! نہیں ہو نا کنٹرول..... تمہیں کیا لگتا ہے میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔" اس نے اکتا کر پوچھا تھا۔

"لیکن یہ بھی تو دیکھو مجھے کبھی ناحق بات پر غصہ نہیں آتا۔ اسی بات پر آنا بھی چاہیے۔" وہ بضد تھا۔

"سعدی کو تم نے بلاوجہ مارا..... یہ تو مانتے ہو؟" جے ڈی نے پوچھا۔

"مجھے اسے مارنا نہیں چاہیے تھا۔ یہ میں مانتا ہوں لیکن سعدی کی حرکت بھی غلط تھی۔ باہر سے کسی کو معمولی

سا بھی شک پڑتا تو ہم دونوں کا نام خراب ہوتا تھا یعنی ہمارے خاندان کے نام یہ حرف آنا تھا اور یہ بات مجھے کسی طرح منظور نہیں بس اسی لیے ایک دم میں بھڑک گیا۔ حالانکہ سعدی کو سمجھایا بھی جا سکتا تھا مگر..... بس پتا نہیں کیسے میرا ہاتھ اٹھ گیا۔"

"یعنی مانتے ہو کہ سعدی کو نہیں مارنا چاہیے تھا؟" جے ڈی نے پھر پوچھا۔

"ہاں۔"

"تو پھر تم یہ بھی مان لو کہ کل تم نے ولید پر بے سبب اتنا غصہ کیا کیونکہ اس کی غلطی نہیں تھی۔"

"ہاں میں یہ بات مان لوں پھر تم کہو گے ابھی جو کچھ ہوا اس میں اس لڑکی کی بھی غلطی نہیں تھی..... اور مجھے یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے۔" شبیہہ نے جل کر کہا تھا۔ جے ڈی نے متانت سے سر ہلا دیا۔

"ایگزیکٹلی اس لڑکی کی غلطی نہیں تھی۔ میں نے دور سے دیکھا تھا وہ تو اپنے راستے پر ہی چل رہی تھی لیکن تمہارا دھیان کہیں اور تھا اس لیے تم اس سے ٹکرا گئے۔"

"اونہہ..... تمہیں ہمیشہ میں ہی غلط لگتا ہوں..... کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جے ڈی! میرے سوا تم ساری دنیا کے دوست ہو۔" وہ پھر خفا ہو گیا۔ جے ڈی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خلوص دل سے کہا۔

"میں ساری دنیا کا دوست ہو سکتا ہوں مگر تمہارا سب سے بڑا مخلص بھی میں ہی ہوں..... اور اسی لیے چاہتا ہوں تم اس غصے پر قابو پا لو۔ یہ جو غصے کی آگ بار بار تمہارے اندر بھڑکتی رہتی ہے یہ کسی دن خدانخواستہ تمہیں ہی جلا دے گی۔ شیطان آگ سے بنا ہے اور غصہ شیطان کی طرف سے آتا ہے اور شیطان انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔"

"ویسے میں ایک بات کلیئر کر دوں اس روز سعدی ٹیلی اسکوپ سے انیبا کو نہیں دیکھ رہا تھا ان لوگوں کے گھر کوئی مہمان لڑکی آئی ہوئی ہے سعدی نے ٹیلی اسکوپ اسی لڑکی کو دیکھنے کے لیے سیٹ کی تھی۔" جے ڈی کے انکشاف پر شبیہہ کو حیرت و بے یقینی کا جھٹکا لگا تھا یہ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ وہ فوری طور پر اپنے تاثرات چھپا بھی نہیں سکا۔

"تو میں کیا کروں...؟ مجھے کیوں بتا رہے ہو۔" چند لمحے بعد اس نے اپنے تاثرات چھپا کر لاتعلق نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تاکہ تم اپنی غلطی مان کر تھوڑا سا شرمندہ ہو لو اور اگلی بار اس غلطی کو نہ دہراؤ..... اور یہ جو ایک جھگڑے کی جھنجلاہٹ میں بار بار جھگڑے کرتے پھر رہے ہو اس سے باز آجاؤ۔"

"جے ڈی! میرا دماغ کھانا بند کرو۔ انیبا میری کیا لگتی ہے جو میں اس کی خاطر سعدی کی پٹائی کرتا پھروں۔" حسب عادت اس نے بھڑک کر کہا تھا۔

"ہاں..... اتنے ہی تو تم اچھے ہو کہ کسی بھی غیر لڑکی کو گھورنے پر کسی راہ چلتے لڑکے کی پٹائی کر دیتے ہو..... اونہہ..... جیسے میں تمہیں جانتا نہیں..... شبیہہ العباس صاحب! یہ دھوکہ کسی اور کو دیجیے گا..... آپ کے دل و دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اصل معاملہ کچھ یوں ہے کہ....." اس کو خاموش پا کر جے ڈی نے دیوار سے ٹیک لگائی اور پُرسوچ انداز میں بولنے لگا۔

"غصے میں آکر تم نے سعدی کی پٹائی تو کر دی لیکن بعد میں احساس ہوا کہ دراصل تمہیں سعدی کا انیبا کو واچ

کرنا برا لگا ہے تو تمہیں خود پر غصہ آنے لگا۔ یہ غصہ بڑھا تو جھنجلاہٹ میں بدل گیا اسی جھنجلاہٹ کے زیر اثر تم نے کل ولید اور انیہا پر غصہ کیا شاید ایسا کر کے تم خود کو باور کروا رہے تھے کہ تمہیں سچ مچ انیہا کی پروا نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے ابھی بھی تم یہی سوچ رہے تھے تبھی اس لڑکی سے ٹکرا گئے پھر اس پر بھڑکنے لگے۔ حالانکہ تم خود جانتے ہو اس بے چاری کی غلطی نہیں تھی۔۔۔ یار! تم غصہ ور تو بیشہ سے ہو لیکن ال مینو ڈیتو کبھی نہیں تھے۔"

اس نے اتنا اچھا تجزیہ پیش کیا تھا کہ شبیہہ چند لمحوں کے لیے کچھ بول ہی نہیں سکا لیکن چونکہ اس کا اپنا الگ ہی مزاج تھا اس لیے فی الفور جے ڈی سے متاثر ہونے کا ارادہ ترک کر کے جھنجلاتے ہوئے بولا۔

"تم نے بکواس فرمانی ہو تو کیا ہم گھر جا سکتے ہیں؟"

"تمہارا چہرہ دیکھ کر صاف پتا چل رہا ہے میری کوئی بات تمہاری عقل میں نہیں سمائی اس کا مطلب میں نے جو بھی کہا وہ واقعی بکواس تھی۔" جے ڈی نے تاسف سے سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو میرے بھائی! پھر گھر ہی چلتے ہیں۔"

شبیہہ اس کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتا ہوا کھڑا ہوا۔ گھر تک کا راستہ ان دونوں نے خاموشی سے طے کیا تھا۔

"میں کل حویلی جا رہا ہوں۔" بلڈنگ کا کمپاؤنڈ عبور کرتے ہوئے شبیہہ نے روٹھے پن سے آگاہ کیا۔

"اچھی بات۔۔۔" جے ڈی نے بس اتنا کہا۔

"جلتے ہو؟"

"نہیں۔۔۔ کل تو ممکن نہیں۔۔۔ مجھے یہاں کچھ کام ہے البتہ ویک اینڈ پر ضرور آؤں گا۔"

پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے شبیہہ نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا ایک چھوٹے ضدی بچے کی طرح اسے بھی اپنی شخصیت کے کسی منفی پہلو کو مکمل طور پر تسلیم کرنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی پھر وہ جھنجلا گیا اور خفگی سے بول اٹھا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں مانتا ہوں مجھے غصہ زیادہ آتا ہے۔" اس نے بالآخر تسلیم کر ہی لیا۔

"زیادہ؟" جے ڈی نے فوراً "تصحیح کروانا ضروری سمجھا۔" تمہیں بہت زیادہ غصہ آتا ہے شبیہہ!" سارا زور "بہت" پہ تھا۔

"اچھا اچھا! میں مان رہا ہوں مجھے زیادہ غصہ بلکہ بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔" حسب عادت وہ فوراً بھڑک اٹھا۔

"اتنی بک بک کی تم نے۔۔۔ لیکن کیا فائدہ؟۔۔۔ غصے پر قابو پانے کا کوئی طریقہ بتایا ہوتا تو بات بھی تھی۔" اس نے ناراضی سے سر جھٹکا تھا۔

"غصے پر قابو پانے کا طریقہ۔۔۔" کی ہول میں چابی لگاتے ہوئے وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

"یار! مجھے ٹھیک سے تو نہیں یاد لیکن بہت پہلے میں نے کہیں پڑھا تھا غصے کی حالت میں پانی پینا چاہیے اور وضو کرنا چاہیے۔ غصہ چونکہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اس لیے پانی شیطانی آگ کو بجھا کر غصہ ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ تم یہ طریقہ ضرور ٹرائی کرو۔

دوسری بات۔۔۔ اپنا دماغ ٹھنڈا رکھا کرو۔

تیسری بات۔۔۔ انسانوں کی اچھائیوں پر نظر رکھو ان کی شخصیت کی برائیاں تلاش نہ کرو۔۔۔"

"تم نے تو پوری لسٹ ہی تھما دی۔" شبیہہ پہلی بار مسکرایا تھا۔

"ویسے شبیہہ! مجھے غصہ بھگانے کا ایک اور طریقہ بھی پتا ہے۔ ارسل بتایا کرتا تھا۔"

"اظہار کس بات کا؟ ارسل والا طریقہ بھی بتا دو۔"

"اور اپنا والٹ دینا۔"

شبیہہ نے بلا تامل والٹ جیب سے نکال کر اسے تھما دیا جے ڈی تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد واپس آیا تو شبیہہ صوفے پر نیم دراز اس کا منتظر تھا۔

"یہ لو اپنا والٹ۔" شبیہہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو بولا۔

"ایک دفعہ ارسل بتا رہا تھا جب بھی اسے غصہ آتا ہے وہ اپنی منگیتر کی تصویر دیکھ لیتا ہے تو اس کا غصہ غائب ہو جاتا ہے۔ میں نے تمہارے والٹ میں تمہاری منگیتر کی تصویر لگا دی ہے۔ تمہیں بھی جب غصہ آئے والٹ نکال کر تصویر دیکھ لینا امید ہے۔۔۔" ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ شبیہہ نے غضب ناک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے والٹ جھپٹا اور پیر پٹختا اپنے کمرے کی طرف پلٹ گیا۔

"شبیہہ! میں مذاق نہیں کر رہا۔۔۔ تم ٹرائی تو کرو۔" جے ڈی نے کھنکتی آواز میں کہا تھا۔ "اچھا یہ تو بتا دو صبح جاگنگ کے لیے بھی جگاؤں یا نہیں۔۔۔ آج کل تو ثروت آنٹی بھی پارک میں نہیں آ رہیں۔"

شبیہہ نے زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر لیا۔ جے ڈی بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"لو جی۔۔۔ اتنا اچھا مشورہ دینے پر بھی ایسی ناراضی کوئی خراب مشورہ دیتا تو اس نے کیا کرنا تھا۔"

☆ ☆ ☆

مسز دانیال کا چہرہ ثمینہ کے ذہن سے چپک کے رہ گیا تھا۔

ماویٰ کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر اس کے لیے فکر مند ہوتی رہیں پھر خیالات کا دریا خود بخود مسز دانیال کی طرف بہنے لگا۔

"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ میں اس کو پہلے کہیں دیکھ چکی ہوں۔" وہ سوچتی رہیں الجھتی رہیں۔ لاشعور میں دبا ہوا ایک چہرہ گزرے وقت کی دھند کے پیچھے۔۔۔ نہ چھپتا تھا نہ واضح ہوتا تھا۔۔۔ فقط الجھتا تھا۔۔۔ تجسس میں ڈالتا تھا۔

شاید کوئی بچپن کی ہمجولی۔۔۔ یا سہیلی کی سہیلی؟

اسکول کی کوئی لڑکی یا پرانے محلے کی کوئی پڑوسن؟

غیر ارادی طور پر وہ ایک ایک کر کے سبھی کو سوچتی چلی گئیں پر وہ چہرہ جو ان کی یادداشت میں باقی رہ گیا تھا ثمینہ نے مسز دانیال کے نقوش میں ان چیزوں کو تلاش کرنا چاہا لیکن۔۔۔

تب ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر ماویٰ اندر داخل ہوئی اس کی چال میں لنگڑاہٹ تھی اور پیر سے خون بہتا دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی تھیں۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہوا ہے ماویٰ؟" وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف لپکیں۔

ماویٰ صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ سخت جھنجلائی ہوئی تھی۔

"کچھ نہیں ممی۔۔۔ بس تھوڑی سی چوٹ لگ گئی۔" اس نے پیر کو گھٹنے پر رکھا اور زخم کا جائزہ لینے لگی۔ ایڑھی کے قریب تقریباً" آدھ انچ کا کٹ لگا ہوا تھا گو کہ زخم اتنا گہرا نہیں تھا مگر خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

"ممی! پلیز آپ مجھے تھوڑی سی کاٹن یا ٹشو پیپر لا دیں گی۔" ثمینہ جلدی سے ٹشو پیپر کا ڈبہ اٹھا لائیں۔ ماویٰ نے

کئی ٹشوز زخم پر رکھ دیے۔
"زخم تو بہت گہرا ہے ماوی! خون بھی کتنا بہہ رہا ہے میں ڈاکٹر۔۔۔"
"پریشان مت ہوں ممی! زخم اتنا گہرا نہیں ہے۔ ایڑھی پر لگے زخم سے تو خون زیادہ ہی نکلتا ہے۔ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے میں خود ہی بینڈیج کرلوں گی۔"
"ضد مت کرو ماوی! خون رکے گا تو بینڈیج کرو گی اور خون خود بخود تو رکنے سے رہا۔" ثمینہ نے فکرمندی سے ڈپٹا۔
"پانی ڈال کر دیکھتی ہوں۔" وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھی۔
"واش روم کے کیبنٹ میں ایک اینٹی سیپٹک لیکویڈ بھی دیکھا تھا میں نے۔ ابھی سب ہو جائے گا آپ فکرمند نہ ہوں۔" صرف ثمینہ کے خیال سے وہ خود کو لاپروا ظاہر کر رہی تھی جبکہ سچ تو یہ تھا کہ تکلیف سے جان نکل رہی تھی۔
"لیکن یہ چوٹ لگی کیسے؟"
"باہر کچھ کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میری نظر ہی نہیں پڑی بس لاپروائی میں ایک ٹکڑا پاؤں میں چبھ گیا۔"
اس نے مہارت سے جھوٹ بول دیا کیونکہ سچ اسے خاصا مہنگا پڑتا۔ ثمینہ کو تو پہلے ہی پاکستان کے حالات سے شکوہ تھا ماوی کے جھگڑے کا سن کر انہوں نے اور بوکھلا جانا تھا۔
"ممی سے تو میں نے جھوٹ بول دیا لیکن وہ لڑکا دوبارہ میرے ہاتھ تو لگے۔ سر نہ پھاڑ دیا تو میرا نام ماوی نہیں۔"
واش بیسن کا نل کھولتے ہوئے وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ولید گہری نیند سو رہا تھا۔
پھر کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر اس کی نیند ٹوٹ گئی کسی خدشے کے پیش نظر اس نے سرہانے کے قریب رکھا سیل فون اٹھا کر وقت دیکھا اور جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ وہ مقررہ وقت سے ساڑھے تین گھنٹے لیٹ ہو چکا تھا۔ اس کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے لیکن اپنا سر پیٹنے سے کیا فائدہ! بہتر ہے اس کا سر پیٹا جائے جس نے بارہ بجے سے پہلے جگانے کی ذمہ داری لی تھی۔
"انو کی بچی کی تو اب خیر نہیں۔"
وہ تن فن کرتا کمرے سے نکلا۔ انیبا کا کمرہ کون سا سات کوس پر تھا بالکل ساتھ ہی تو تھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں ڈوبی ہوئی لابی کے فرش پر انیبا کے دروازے کے نیچے سے نکلتی دودھیا روشنی کی لکیر ساکت پڑی تھی۔
ولید نے دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا پھر ہینڈل گھما کر کمرے میں داخل ہو گیا اور یہ دیکھ کر اس کے تن بدن میں اور بھی آگ لگ گئی کہ وہ کمبل اوڑھے خوابِ خرگوش کا مزہ لے رہی تھی۔
ولید نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بڑھ کر اس زور سے اس کی پونی ٹیل کھینچی کہ بے چاری ہلکی سی چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔
"کیا ہو گیا ولید؟" ایک تو سر میں بری طرح درد ہو اوپر سے کچی نیند میں اس بری طرح جگانے پر دل خوفناک انداز میں دھڑک رہا تھا۔
"قیامت آگئی ہے۔" وہ لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ انیبا کے حواس پوری طرح بیدار نہ ہوئے

تھے سوبری طرح گھبرا گئی۔

"کیا کہہ رہے ہو ولید!" ساتھ ہی اِدھر اُدھر دیکھ کر اس کی بات کی تصدیق چاہی۔

"میرا دل چاہ رہا ہے تمہارا سر پھاڑ دوں کیا کہا تھا تم نے؟..... تم سو جاؤ ولید! میں تو ساری رات جاگ کر پڑھ رہی ہوتی ہوں تمہیں اور ولی کو بارہ بجنے سے پہلے جگا دوں گی پھر ہم ممی ڈیڈی کو اپنی ورسری وش کریں گے۔" اس نے انیبا کی نقل اتارتے ہوئے کہا تھا۔

"ذرا کلاک پر نظر ڈالیے محترمہ! آپ کی اس نیند کے چکر میں ہمارا سارا پلان چوپٹ ہو چکا ہے۔ صبح کے ساڑھے تین بج چکے ہیں۔" وہ دانت کچکچا رہا تھا۔

اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا پھر تاسف و شرمندگی سے سر پر ہاتھ رکھا۔

"آئی ایم سوری ولید! میں نے تو صرف چند منٹ کے لیے آنکھیں بند کی تھیں کیا پتا تھا اتنا وقت گزر جائے گا۔ میں تو اسی لیے بیڈ کے بجائے صوفے پر لیٹی تھی اور لائٹ بھی آف نہیں کی تھی کہ بارہ بجے سے پہلے اٹھنا ہے۔"

"میرا سارا پلان بگاڑ دیا تم نے۔" وہ سخت خفا ہو رہا تھا۔

"نیا دن تو شروع ہو چکا ہے لیکن ابھی رات ہے۔ چلو ہم لوگ ابھی ممی ڈیڈی کو وش کر دیتے ہیں۔" انیبا کو یکدم خیال آیا تھا۔

"نہیں..... جب نیا دن شروع ہونے پر وش نہیں کیا تو اب ان کی نیند خراب کرنے کا کیا فائدہ؟"

"پھر فجر کے لیے دونوں اٹھیں گے۔ اس ٹائم وش کر دیں؟" انیبا نے پوچھا لیکن اس کے اس آئیڈیے کو بھی ولید نے فوراً رد کر دیا۔

"میں اب جاگ گیا ہوں فجر کے وقت مجھ سے اب نہیں اٹھا جائے گا۔ جہاں اتنی دیر ہوئی وہاں کچھ اور سہی۔ اب تو جو ہو گا بریک فاسٹ کے ٹائم پر ہو گا۔" پھر اس نے اسے گھورا۔

"اور میری توبہ..... جو تم کو دوبارہ کوئی ذمہ داری سونپوں۔ انسان خود مشکل برداشت کرے مگر تم سے توقع نہ لگائے۔"

"ارے بابا! سوری بول تو رہی ہوں۔"

"میں کیا کروں تمہارے سوری کو اونہہ سارا پروگرام بگاڑ دیا۔" اس کا غصہ کم ہونے میں نہ آ رہا تھا انیبا بھی بگڑ گئی۔

"تو تم بھی تو میرے بال اتنی زور سے کھینچ کر بدلہ لے چکے ہو۔ اب تک سر دکھ رہا ہے میرا۔"

"غلطی ہوئی بال کھینچنے کے بجائے گردن دبا دینا چاہیے تھی۔"

"نکلو میرے کمرے سے..... میں کوئی جان بوجھ کر تھوڑا سوئی تھی آنکھ لگنا تھی سو لگ گئی۔ تم کیا میرا دماغ چاٹ رہے ہو۔ تم میں ایسا احساس ذمہ داری تھا تو الارم لگا کر سو جاتے۔"

"اونہہ..... غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا۔" وہ پیر پٹختا چلا گیا۔ انیبا دروازے کو گھورتی رہی پھر سر تک کمبل تان کر سو گئی۔

اسی صبح دونوں اس جھگڑے کو بھول بھال کر شیر و شکر ہوئے بیٹھے تھے۔ پلان کے مطابق ان تینوں نے باقاعدہ گا کر ممی ڈیڈی کو وش کر کے صرف چونکایا نہیں تھا بلکہ وہ دونوں جیسے ہکا بکا رہ گئے تھے۔ ان کے بچے ان کے لیے خوش تھے۔ وہ گا رہے تھے انہوں نے ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ انہوں نے پھولوں کے ساتھ کیک کا بھی انتظام کر رکھا تھا اور وہ بضد تھے کہ ممی ڈیڈی مل کر اپنی اینورسری کی خوشی میں کیک کاٹیں۔

ثروت اور دانیال نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر دانیال حسن نے نظریں چرا لیں۔

اٹھارہ سال گزر چکے..... اٹھارہ سال کم نہیں ہوتے کسی کو سمجھنے، کسی پر اعتبار کرنے کے لیے..... پھر بھی، پھر بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے کتنا دور تھے..... کتنا فاصلہ تھا ان دونوں کے درمیان۔

دانیال حسن کو یاد آیا۔ انہیں ثروت سے کتنی محبت تھی، محبت ہے۔ دل کی خوشی چہرے پر جھلکنے لگی۔ لب پہ آپ مسکرا دیے تو انہوں نے ولی کے ہاتھ سے چھری لے کر ثروت کو مخاطب کیا۔

"کیا ہوا جو آج سے پہلے ہم نے اپنی کوئی ویڈنگ اینی ورسری نہیں منائی۔ اب بچے اتنا اصرار کر رہے ہیں تو کیک کاٹنے میں کوئی برائی بھی نہیں۔"

ثروت کی شکل الگ دیکھنے والی ہو گئی۔ ذہن پر بڑا زور ڈالنے کے بعد بھی یاد نہیں آیا آخری بار "سرتاج" کو مسکراتے کب دیکھا تھا بہرحال خوش تھیں..... کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ انہیں تو اول روز سے مصالحت کا دامن تھامے رہنے کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ اس بار خوشی خوشی بڑھ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ دونوں نے مل کر کیک کاٹا۔ بچوں نے تالیاں بجائیں خوب شور مچایا۔

"تھینک یو سو مچ بچو! تم لوگوں نے صبح صبح بڑا زبردست سرپرائز دیا۔" دانیال حسن کا موڈ کچھ زیادہ ہی خوشگوار ہو چکا تھا۔

"یہ ہمارا پلان ولید کا تھا ڈیڈی!" انیبا نے چمکتے ہوئے کہا۔

"یعنی ہمیں ولید کا شکریہ ادا کرنا چاہیے؟" ثروت مسکرا کر بولیں۔

"میں نے تو آپ لوگوں کو رات بارہ بجے وش کرنے کا سوچا تھا لیکن براہوان محترمہ کی نیند کا جس نے سارا پلان بگاڑ دیا۔"

"ڈیڈی! ان دونوں نے مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا ابھی جب میں اسکول کے لیے تیار ہو رہا تھا تب بتایا کہ آپ دونوں کو وش کرنا ہے۔ یہ دونوں مجھے اپنے کسی پلان میں شامل نہیں کرتے۔" ولی کا الگ ہی شکوہ تھا۔

"میں چھوٹا ہوں نا! مجھے چھوٹا ہونے کی سزا ملتی ہے۔"

"یہ کیوں موٹے! پکنک کے بارے میں پہلے نہیں بتایا میں نے؟"

"پکنک رہنے دو ولید! آج رات کا ڈنر میری طرف سے ہو گا..... وہ بھی تم لوگوں کی پسند کے ریسٹورنٹ میں۔"

دانیال حسن کی بات پر تینوں نے پھر شور مچایا۔ ثروت نے خوشگوار حیرت سے دانیال حسن کو دیکھا آج تو بار بار وہ حیران کیے دے رہے تھے۔ اگلی بات پر تو وہ بے چاری مارے تعجب کے بیہوش ہوتے ہوتے بچیں۔

"ثروت! میں ٹاؤن شپ کی طرف ہی جا رہا ہوں۔ آپ کو اپنی کسی سہیلی سے ملنے جانا ہے تو میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

مجھے خدیجہ کی طرف اس کی ساس کی تعزیت کے لیے جانا ہے لیکن آپ کا راستہ تو مختلف ہے۔" وہ بولیں۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ کے لیے تھوڑا سا آؤٹ آف وے ہو جائیں گے۔" بظاہر لاپروائی سے کہتے ہوئے انہوں نے پھر اخبار اٹھا لیا۔ ثروت تو اس بار اپنی حیرانی بھی نہیں چھپا سکیں البتہ انیبا اور ولید نے اپنی بے ساختہ امڈی مسکراہٹوں کو چھپانے کے لیے سر جھکا لیے تھے اور اس سے بھی پہلے ولید، انیبا کو کہنی کا اشارہ کرنا نہیں بھولا تھا۔ وہ دونوں اپنے ماں باپ کے درمیان محسوس ہوتی اس سرد جنگ کو ختم کرنے میں کامیاب رہے تھے جو واضح نہ ہونے کے باوجود، بہرحال اپنا وجود رکھتی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔)

ماہا ملک

بارات لے کر جھوٹی آؤں گا

مہکاں ناولز

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

رات کی خموشی میں کوئی تارا چونکا ہے۔
دل کی ویراں بستی سے ہاں ابھی وہ گزرا ہے۔
اجنبی سا سایہ ہے اور نقوش مدھم ہیں۔
شک ہے اور یقین بھی ہے' دونوں رستے باہم ہیں۔
اجنبی ذرا رک جا..... ایک بات سنتا جا
تو اگر وہی ہے تو..... یہ جنوں ختم ہو لے
اور اگر وہ نہ بھی ہو..... پھر بھی بوجھ کم ہو لے
رات کچھ پگھل جائے' یہ اداسی ڈھل جائے
اس پہاڑ پنجر سے' ایک روح نکل جائے
کہ ہزار صدیوں سے اک گناہ روشن ہے
روح سراپا بوجھل ہے اور ضمیر درپن ہے
جسم کی اک اک تہہ میں اک الاؤ جلتا ہے
جو نہ برف ہوتا ہے' اور نہ راکھ کرتا ہے
اک لپا ہوا جیون ہے اور نفس کی بیساکھی
بات ٹمکے بھر کی تھی اور سزا عمر بھر کی

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ جنگل پر ہو کا عالم طاری تھا۔ جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں' ماحول کی پرسکون جھیل پر جیسے کنکر برسا رہی تھیں۔ سگریٹ کے جلتے شعلے نے جب اس کی انگلی کو چھوا تو اس نے سسکاری سی بھری اور سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی سفید جیپ دور سے دیکھنے والوں کو یقیناً" کوئی بدروح ہی لگتی۔

"خزینہ!" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "آجاؤ۔ آج تو آجاؤ۔"

اندھیرے میں خاموش کھڑا جنگل یقیناً" ایک پراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ مگر وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے ایک ٹک اندھیرے کی اس چادر کو تک رہا تھا۔

"مجھے خبر ہے تم ناراض ہو۔ خفا ہو' تمہارا حق بنتا ہے مگر خدارا ایک مرتبہ آجاؤ۔ ایک مرتبہ' صرف ایک مرتبہ اس عذاب کو دیکھ جاؤ جو میں جھیل رہا ہوں' جانے کب سے جھیل رہا ہوں' جانے کب تک جھیلوں گا۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھ جاؤ کہ میں کب سے جاگ رہا ہوں۔ میں کتنا اجڑ چکا ہوں۔ میں کتنا بکھر گیا ہوں۔ نہ جلتا ہوں نہ بجھتا ہوں' نہ ٹوٹتا ہوں نہ جڑتا ہوں مجھے اس عذاب سے نکال جاؤ۔ میری ان جلتی نگاہوں کو چند لمحوں کی نیند خیرات کر جاؤ۔ میری ان منتشر سوچوں کو چند لمحوں کے لیے یکجا کر جاؤ آجاؤ خزینہ۔ خدارا ایک مرتبہ آجاؤ۔ ایک مرتبہ آجاؤ۔ ایک مرتبہ آجاؤ۔" آنکھیں بند کیے وہ ایک ہی جملے کی گردان کیے جا رہا تھا۔

"صاب!" کسی نے اسے پکارا تو وہ بری طرح سے چونکا۔

"کون؟" اندھیرے میں اسے نقوش پہچاننے میں دشواری ہوئی۔

"ام گل خان' صاب۔ ابھی کب سے آپ کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"

"اچھا! لیکن میں تو مل گیا تمہیں۔" وہ ہولے سے بولا۔

"ہاں صاب! بڑی مشکل سے ملا ہے آپ۔" وہ گھوم کر دوسری طرف سے آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"چند گھنٹوں کی تلاش کو مشکل کہتے ہو گل خان!" وہ استہزائیہ ہنسا۔ "میری تو زندگی ختم ہو چلی ہے۔"

"آپ کس کو ڈھونڈتا صاب۔ ایک بار بولو۔ ام اسے سامنے لائے گا آپ کے۔"

"نہیں گل خان نہیں۔" اس نے جیپ اسٹارٹ کی۔ "سامنے تو مجھے جانا ہے اس کے۔"

"آپ کا بات عجیب ہوتا ہے صاب۔ آپ کس کو ڈھونڈتا ہے' کسے تلاشتا ہے' ہمارے کو پتا نہیں چلتا۔ اس رات میں کون آئے گا اس جنگل میں جسے آپ ڈھونڈتا ہے۔ کبھی جنگل میں ڈھونڈتا ہے' کبھی پہاڑ پر ڈھونڈتا ہے۔ کبھی ندی کے پاس جاتا ہے۔ ایک سال سے یونہی خوار ہوتا ہے۔ ہر رات ام آپ کو پکڑ کر لاتا ہے۔" گل خان الجھا الجھا' ناراض ناراض سا بول رہا تھا۔

"معاف کرنا گل خان! میں چاہتا تو نہیں ہوں کہ میرے بخت کی سیاہی کے چھینٹے کسی اور کے دامن تک جائیں لیکن انجانے میں کبھی دوسروں کو پریشان کر بیٹھتا ہوں۔"

"ایسا نہیں بولو صاب۔ ہماری پریشانی کی بات چھوڑو۔" گل خان شرمندہ ہوا۔ "بس آپ خوش رہو ہمارا ام بھی خوش ہو گا۔"

جیپ کا انجن خاموش ہوا تو گل خان اتر کر بھاٹک بند کرنے لگا۔ وہ سیڑھیاں..... چڑھتا اندر داخل ہو گیا۔

"کھانا لاؤں؟" گل خان اندر چلا آیا۔

"بھوک نہیں ہے۔" اس نے شرٹ اتار کر کونے میں پھینکی۔

"آپ کو بھوک کب ہوتا ہے صاب؟ روز سارا کھانا ام خود ہی پکاتا خود ہی کھاتا۔"

"تمہیں پیسے دیے تھے گل خان سگریٹ کے لیے۔" وہ دراز میں کھول کر دیکھ رہا تھا۔

"جانے سے پہلے آپ پاکٹ لے گئے تھے صاب!" گل خان حیران ہوا۔

"اچھا!" اس نے خالی پیکٹ کو اس طرح گھورا جیسے یقین نہ آیا ہو۔

گل خان نے خالی پیکٹ کو آنکھیں پھیلا کر دیکھا۔ پھر چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔ اس نے لات مار کر پیکٹ کو کونے میں اچھالا۔

"چین اسموکر سکندر بخت۔" وہ بڑبڑایا۔

"اگر تم ایسے ہی ایک کے بعد ایک سگریٹ پھونکتے رہے تو تمہارے پھیپھڑے گل کر ختم ہو جائیں گے۔ سالا ڈاکٹر کا بچہ۔" اس نے کسی کی نقل اتاری۔

"چھ مہینے سے زیادہ ایک دن نہیں جی سکو گے۔ او نشہ آلو کا پٹھا۔" اس نے میز کو لات ماری۔

"آہ' آؤ دیکھو میں زندہ ہوں ڈاکٹرائے بی سی میں چین اسموکر..... سکندر بخت' سیاہ بخت بدبخت زندہ ہوں۔ لاؤ اپنی ڈگریاں لا دو مجھے' میں سگریٹ کی جگہ انہیں پی ڈالوں۔ شاید ان ہی سے مر جاؤں۔"

دروازے میں گل خان کو کھڑا دیکھ کر اس نے زبان کو بریک لگایا۔

"صاب! ایسے کیوں چیختا ہے۔" وہ بے حد دکھی لگ رہا تھا۔

"یہ لو صاب۔" اس نے سگریٹ کا پیکٹ اس کی جانب بڑھایا۔

"پی کر کم از کم خوش تو رہتا ہے آپ۔"

"خوش؟" اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ "اچھا؟ بھلا میں خوش بھی نظر آتا ہوں۔ دلچسپ خبر ہے۔"

گل خان کے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک ہنستا رہا۔

"خوش! میں؟..... اچھا' ہاہاہا..... ہاہاہا۔"

☆ ☆ ☆

"سکندر بخت! تم بہت جلد مر جاؤ گے۔" ڈاکٹر اے بی سی اللہ بخش چوہدری نے اس کا چیک اپ کرنے کے بعد کہا تھا۔

"ناممکن۔" اس نے دونوں ٹانگیں اٹھا کر میز پر رکھ لیں۔

"کم از کم تانیہ سے شادی سے پہلے میں مرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" اے بی سی نے منہ بنایا۔

"بدتمیزی؟ یعنی کہ میرا شادی تک زندہ رہنے کا پروگرام بدتمیز کے زمرے میں آتا ہے۔ وہ کیسے؟ وضاحت کی جائے۔"

"وضاحت کے بچے۔ ٹانگیں نیچے رکھ۔" وہ چلایا۔

"اوہ سوری۔" اس نے ٹانگیں نیچے کیں۔ "جب سے تو نے پرائیویٹ کلینک کھولا ہے' دوستی کے اصول بھول گیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟ کس کتاب میں لکھا ہے کہ دوستوں کے گندے جوتوں والی ٹانگوں کو اتنی قیمتی میز پر سجایا جائے۔" اے بی سی اس کا ایکسرے دیکھنے میں مصروف تھا۔

"لعنت ہو تیری اس قیمتی میز پر اور تیری سطحی سوچ پر اور تیرے کنجوس جذبات پر۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"شام کو گھر آئے گا نا تو ٹوٹی ہوئی کرسی پر بٹھاؤں گا تجھے۔ سمجھا۔"

دروازے تک پہنچ کر وہ واپس مڑا۔ میز پر ایک زور

دار مکا مارا اور لپک کر کمرے سے نکل گیا۔

"کمینہ۔" اللہ بخش مسکرایا۔

"ہیلو مس ڈی۔ ای۔" باہر نکل کر اس نے اللہ بخش کی ریسپشنسٹ دیبا رم کو مخاطب کیا۔

"جا رہے ہیں سکندر صاحب!" وہ مسکرائی۔

"جی ہاں! کیا کہتے ہیں وہ 'بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔'" اس نے منہ بنایا۔

"سمجھایا کریں اپنے ڈاکٹر کو' اتنی کنجوسی اچھی نہیں ہوتی۔"

"اپنے ڈاکٹر کو؟" وہ ہنسی۔ "میرے ڈاکٹر کب سے ہو گئے وہ۔"

"ہمیشہ سے ہی آپ کے ہیں۔" اس نے شرارت سے آنکھ دبائی۔

"پلیز پلیز سکندر صاحب۔" اس نے حسب عادت منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنا شروع کیا۔ "اب آپ پھر وہی اے بی سی ڈی پڑھنا شروع کر دیں گے۔"

"ظاہر ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "اس سے بڑا ثبوت کیا دوں۔ سی فار چوہدری ڈی فار دیبا۔"

"یس پلیز۔" وہ فون کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ باہر نکل آیا۔

"انکل! میں آپ کو چوتھی دفعہ انفارم کر رہا ہوں۔" شام کو اللہ بخش گھر پہ گوہر بخت کے پاس بیٹھا تھا۔ "آپ کا لڑکا نکل رہا ہے آپ کے ہاتھ سے۔"

"لڑکا؟" وہ بھنائے۔ "لڑکا نہیں اچھا بھلا مرد ہے یہ اور نکل رہا کیا ہے' یوں کہو نکل چکا ہے اور یہ سب تمہاری آنٹی کے کام ہیں۔"

"میرا نام مت لیجیے خان صاحب۔" انہوں نے چائے کی پیالی اللہ بخش کو تھمائی۔ "لڑکے ماں سے نہیں باپ سے ڈرتے ہیں۔ آپ نے خود شیر بنایا ہے۔"

دوسرے کونے میں ریسیور تھامے سکندر نے اللہ بخش کو گھورا۔

"نہیں تانیہ! آج نہیں آسکتا۔" اس نے سنانے کو اونچا بولا۔ "آج ایک بی جمالو آئی ہوئی ہے نا۔ ہاں ہاں اللہ بخش ہے نا بی بی' شادی کر رہا ہے۔"

"شادی! اچھا بڑی اچھی خبر ہے بھئی۔" وہ گھبرائیں۔ "کون لڑکی ہے؟"

"اوئے!" اے بی سی کڑبڑایا۔ "سکندر پاگل ہو گیا ہے؟"

"لو بھلا یہ میں کیوں پاگل ہونے لگا۔ وہی تمہاری ڈی ای ای بتا رہی تھی۔"

"ڈی ای۔" گوہر بخت حیرانی سے بولے۔ "بھئی اے بی سی تو تم ہو بقول سکندر کے۔ یہ ڈی ای کون ہے؟"

"دیبا رم۔" وہ فٹ سے بولا۔

"اچھا انکل! میں چلتا ہوں۔" اللہ بخش گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "پھر آؤں گا۔"

"بیٹھو بھئی۔" بی بی مسکرائیں۔ "میری بہو کے آنے میں تو کچھ بتاتے جاؤ۔"

"اس کا نام تانیہ ہے بی بی!" سکندر فوراً بولا تو وہ ہنس دیے۔

"مجھے مجھوں گا سکندر۔" کار اسٹارٹ کر کے اللہ بخش نے دھمکی دی تھی۔ جواباً اس نے لمبی سی زبان نکالی۔

☆ ☆ ☆

"سکندر۔۔۔ اٹس ٹو مچ!" اس نے سگریٹ اس کے ہونٹوں سے نکال کر پانی کی طرف اچھال دیا۔

"اوہ تانی۔ اچھے بھلے موڈ کا ستیاناس کر دیا ہے تم نے۔" ہیڈ فون کانوں سے اتار کر وہ بڑبڑایا۔

"میں اس لیے آتی ہوں تم سے ملنے کہ تم علی شاہ پرانی کو سنتے رہو اور اسموکنگ کرتے رہو۔" وہ سخت ناراض تھی۔ "پچھلے ایک گھنٹے سے میں اسٹیچوبنی بیٹھی ہوں اور تم چھٹی سگریٹ سلگا کر دوسری مرتبہ یہ کیسٹ سن رہے ہو۔"

"تو یار! یہی تو مزا ہے زندگی کا۔ تمہارا ساتھ ہو۔ پیسن اینڈ ہیجز کا پیکٹ ہو اور علی شاہ کی آواز ہو۔" وہ مسکرایا۔ "کیا خوب صورت سماں ہوتا ہے۔"

"بھاڑ میں گئی تمہاری علی شاہ۔" وہ کھڑے ہو کر کپڑے جھاڑنے لگی۔ "اللہ بخش صحیح کہتا ہے۔ تم سے نا ہنجار کر زندگی خراب کر لی ہے میں نے اپنی۔"

"ہاں' یہی تو طے کیا ہے میں نے اور اے بی سی نے۔" اس نے اطمینان سے درخت سے ٹیک لگائی۔ "وہ تمہیں بھڑکائے گا اور میں دبا کو۔ ادھر تم ناراض ادھر دبا خفا۔ ہم دونوں کی جان چھوٹے گی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

"کیا ضرورت ہے بھڑکانے کی؟" وہ چیخی۔ "میں دس دفعہ لعنت بھیجتی ہوں تم پر۔ اونہہ۔" اس نے درخت پر ٹھوکر ماری اور ٹانگ پکڑ کر ایک بار پھر چیخ ماری۔

"گئی کام سے۔" وہ بڑبڑایا "پہلے ہی شکل بہت اچھی تھی۔ ٹانگ اور توڑ لی۔ کون پوچھے گا۔ آہ علی شاہ!"

"میں کہتی ہوں' مجھے گھر چھوڑ کر آؤ۔"

"آپ کے ابا نے ڈرائیور رکھا ہے مجھے؟ جاؤ پیدل لنگڑاتی ہوئی۔" وہ بدستور بے نیاز تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بھیں بھیں کر کے رونا شروع کر دیا۔

"ارے ارے لاؤڈ اسپیکر۔" وہ گھبرا کر اٹھا۔ "چپ کرو یار! کوئی سمجھے گا بھگا کر لایا ہوں۔ شکل سے ہی نابالغ لگتی ہو۔ ارے چپ کرو پاگل!"

"اب جماؤ رعب۔ نکل گئی ساری اکڑفوں۔" اس نے یکایک ہنسنا شروع کر دیا۔

"چابی کی گڑیا ٹک ٹک چلے۔ روئے ابھی اور ابھی ہنسے۔" وہ مسکرایا۔

"سکندر!" گاڑی میں بیٹھ کر اس نے مخاطب کیا۔

"ہاں بولو۔"

"ایک بات کہوں؟"

"سو باتیں کہو۔ لیکن ذرا مجھے ہیڈ فون لگانے دو۔"

"سکندر پلیز۔"

"اوکے' اوکے۔" وہ ہنس دیا۔ "بولو کنیز! کیا مدعا ہے۔"

"مدعا یہ ہے جہاں پناہ کہ کیا آپ اس انارکلی کی

خاطر ایک چیز چھوڑ سکتے ہیں؟"

"انار کلی کی خاطر ہم دنیا چھوڑ سکتے ہیں۔"

"دنیا نہیں جہاں پناہ' صرف اسموکنگ چھوڑ دیجئے۔ بصورت دیگر دنیا خود بخود آپ کو چھوڑ دے گی۔"

"اوہ۔" اس نے گہرا سانس کھینچا۔ "اے بی سی۔ تجھے قتل کردوں گا میں۔"

"بولو نا سکندر!" تانیہ نے ضد کی۔ "چھوڑ دو گے نا میری خاطر۔"

"تانی..... دنیا میں دو چیزیں ہیں جو میں چھوڑ نہیں سکتا۔ ایک تم ایک سگریٹ۔"

"میری خاطر بھی نہیں؟" وہ مایوسی سے بولی۔

"اوکے یار! کوشش کروں گا۔" اس نے بیزاری سے کندھے اچکائے۔ "تم سے اچھی تو علی شاہ ہے' بے کار کی ضدیں تو نہیں کرتی۔"

جواباً اس نے فوراً منہ پھلا لیا۔

"کبھی تو ایسی ملاقات بھی کیا کرو کہ واپسی میں تمہارا منہ نہ پھولا ہو۔" گاڑی روک کر وہ مسکرایا۔

"اوکے خدا حافظ۔" وہ خفا ہی رہی۔

"تانیہ!" وہ چند لمحے اسے جاتے دیکھتا رہا پھر آواز دی۔

"کیا ہے؟" اس نے وہیں سے پوچھا۔

"ادھر آؤ!"

"کیوں؟"

"ارے بابا! ایک مزے کی بات بتاؤں گا۔"

"اچھا.....!" وہ مسکرائی پھر بھاگتی ہوئی آئی۔ "ہاں بولو۔" جھک کر پوچھا۔

"تم سے اچھی علی شاہ ہے۔" وہ ہنسا اور زن سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ پیچھے سے پتھر اٹھا اٹھا کر مارتی رہی۔

"یار! مانتی ہی نہیں ہے۔ کیا کروں؟" اس نے چوتھی مرتبہ لائن ڈس کنکٹ کی اور ریسیور رکھ دیا۔

"ایسا کیا کہہ دیا تو نے اسے۔" اللہ بخش نے فائل پر سے سر اٹھایا۔

"میں نے نہیں' تو نے کہا ہے۔ ساری فساد کی جڑ تو ہے' آستین کا سانپ ہے تو' دوست کے روپ میں دشمن' بھیڑ کے روپ میں بھیڑیا' فاختہ کے روپ میں کوا۔"

"سکندر کے بچے۔" اس نے پیپر ویٹ اٹھا لیا۔ میں سر پھاڑ دوں گا ایمان سے۔"

"میں تیرا گاؤن پھاڑ دوں گا۔ ساری ڈگریاں جلا دوں گا' تیرے کلینک کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

اندر آتی دیبا ارم کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"لو..... یہ اور آگئیں دل جلانے کو۔ اے محترمہ ڈی ای! ہنسنے کے سوا اور کیا کام کرتی ہو اس کلینک میں؟"

"سکندر صاحب!" اس نے کاجل بھری آنکھیں پھیلائیں۔ "کیا میں بہت ہنستی ہوں؟"

"ارے نہیں نہیں۔" اللہ بخش جلدی سے بولا۔ "اس کی تو عادت ہے بکواس کرنے کی۔"

"ہاں ہاں۔ اپنی صفائیاں پیش کیا کر جلدی جلدی۔ اور وہ جو میری جان کی دشمن ایک ہفتے سے ناراض بیٹھی ہے اس کی ذرا پروا نہیں ہے۔"

"اور کیا پروا کروں؟" وہ چلایا۔ "اس ایک ہفتے میں تو نے سات ہزار فون کیے ہیں اس کو۔ دن تھاؤزنڈ پر ڈے (One thousand per day) اور یہ بل تیرا باپ۔ میرا مطلب ہے انکل گوہر بخت نہیں میں بھروں گا۔ میرے ستر مریض بھگا چکا ہے تو میرا اچھا ریکارڈ بتا کر۔ دو اسٹیتھسکوپ توڑ چکا ہے۔ بلاوجہ میرا بلڈ پریشر دس دفعہ چیک کر چکا ہے۔ میرے نئے صوفے پر دو دفعہ چائے گرا چکا ہے۔ اس کے باوجود تو اس کلینک میں دکھائی دے رہا ہے اور کیا پروا کروں تیری؟"

"ہاں۔" اس نے منہ کھول کر سانس لی۔ "آگیا نا اپنی سطحی باتوں پر۔ ارے شام کو ہی بلینک چیک بھجوا دوں گا۔ خود بھر لینا' خود ہی دستخط بھی کر دینا (دبا پھر ہنسی) لیکن کان کھول کر سن لو ڈاکٹر اللہ بخش چوہدری۔ شام

کو بھی تانیہ سے ملنا ہے۔ ہر حال میں۔ ورنہ میں تیرا ہاسپٹل ٹیک اوور کرانے کے لیے بلڈوزر لے آؤں گا۔ سمجھا نا۔"

"اوکے۔" اللہ بخش نے سر تھاما۔ "جاؤ دیبا پلیز جاؤ۔ کسی طرح بھی منا کر لے آ تانی کو' ورنہ وہ شام کو بلڈوزر لے آئے گا۔ جاؤ پلیز۔"

اور دیبا گھبرا کر کمرے سے نکلی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا ہے اس کو؟" اس نے چوتھا ٹشو ڈسٹ بین میں پھینکا اور اے بی سی کی توقع کے عین مطابق چوتھی واحد ہی نشانہ خطا گیا۔

"ایک خطرناک بیماری۔" اس نے کان کھجایا۔

"یہ تو سویں دفعہ بول رہے ہو تم۔" وہ جھنجلائی۔

"صحیح سے بتاؤ کیسی بیماری۔"

"دیکھو تانی..... یہ رونا دھونا بند کرو اور چلو اس سے ملنے۔ وہاں میں تمہیں ساری صورت حال سمجھا دوں گا۔"

"میں کیسے جا سکتی ہوں۔"

"میرے ساتھ گاڑی میں۔" وہ حیران ہوا۔ "اور کیسے؟"

"وہ تو میں بھی جانتی ہوں۔" وہ بھنائی۔ "لیکن میں بھی گئی نہیں اس کے گھر۔ اس کے والدین۔"

"ان کی فکر نہ کرو تم۔ وہ سب اچھی طرح جانتے ہیں تمہیں۔ سکندر نے تمہارے ناک نقشے سے لے کر عادتوں تک حفظ کرا رکھی ہیں ان کو۔"

"لیکن میں تو اس سے ناراض ہوں۔" وہ ہچکچائی۔

"تو..... ٹھیک ہے پھر۔" وہ بھنا گیا۔ "رہو ناراض جب وہ مر جائے۔"

"پلیز اللہ بخش۔ ایسے مت کہو۔ چلو میں چلتی ہوں۔"

"دیکھو تانی! مجھے ایک بے حد ضروری کام ہے۔" راستے میں وہ بولا۔ "میں تمہیں گیٹ پر ہی چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں نہیں۔ میں تمہارے ساتھ اندر جاؤں گی۔" وہ گھبرائی۔

"اور پھر وہاں میرا سر پھوڑ گی۔" وہ بڑبڑایا۔

"کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔ لو آگیا اس کا بلکہ تم دونوں کا گھر۔" اس نے گاڑی روکی۔

"اے بی سی!"

"ہاں بولو۔ اور یار! کم از کم تم تو صحیح سے مخاطب کیا کرو۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"فکر مت کرو۔ یہ سب لوگ بہت اچھے ہیں سوائے اس کمینے کے۔"

اس کی ہمراہی میں چلتی ہوئی وہ لاؤنج میں داخل ہوئی۔ سامنے ہی گوہر بخت اور بی بی بیٹھے تھے۔ اللہ بخش نے تعارف کا فریضہ سرانجام دیا۔ بی بی نے اٹھ کر اس کی پیشانی چومی۔

"ماشاء اللہ۔" وہ مسکرائیں۔ "بڑی خوب صورت بہو ہے ہماری۔ سکندر تو یونہی بکواس کرتا تھا۔"

"کیا کہتا تھا بی بی؟" اس کے کان کھڑے ہوئے۔

"کچھ نہیں۔" وہ ہنسنے لگیں۔ "تم بیٹھو تو۔"

"بتائیے نا بی بی۔" اسے جستجو لگ گئی تھی۔

"کچھ نہیں بیٹی۔" گوہر بخت بولے۔ "یونہی بکواس کرتا تھا کہ کالا رنگ ہے۔ موٹی ناک ہے۔ بٹن آنکھیں وغیرہ وغیرہ۔ عادت ہے اس کی شرارت کرنے کی۔"

"اف!" اس نے مٹھیاں بھینچ کر غصے پر قابو پایا۔

اے بی سی نے دل ہی دل میں سکندر کی خیریت کی دعا مانگی۔

"نصلو! سکندر بخت کو بلاؤ۔ بولو خاص مہمان آئے ہیں۔" گوہر بخت نے نوکر کو آواز دی۔

"میں اپنی بیٹی کے لیے کچھ لاتی ہوں۔" بی بی اٹھیں۔

"نہیں بی بی پلیز۔ آپ بیٹھئے نا۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑا۔

"ایسے کیسے بیٹی۔ پہلی مرتبہ آئی ہو۔" انہوں نے پیار سے ہاتھ چھڑایا۔

"اچھا انکل! میں چلتا ہوں۔" اے بی سی کے سانس اکھڑے۔

"کیوں بیٹے۔ بیٹھو نا، محفل جمے گی۔ بلکہ چلو لان میں شطرنج ہو جائے۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"انکل! وہ مم۔ میں۔" وہ منمنایا۔

"آؤ، آؤ بہانے بازی نہیں۔" انہوں نے حکم دیا تو وہ مسمسی صورت بنا تا ان کے پیچھے ہو لیا۔

"تانی!" سکندر آیا تو مارے خوشی کے وہیں جم گیا۔ "تم! یہاں؟"

وہ خاموشی سے سر سے پاؤں تک اسے دیکھتی رہی۔

"خطرناک بیماری؟" آثار ندارد!

"کیا ہوا؟" وہ آ کر دھڑ سے اس کے برابر بیٹھا۔ وہ جلدی سے تھوڑا دور ہوئی۔

"ارے ڈرو نہیں، آرام سے بیٹھو۔ مجھے پتا تھا، تم زیادہ دن ناراض رہ ہی نہیں سکتیں۔ جذبۂ عشق سلامت ہے تو ان شاء اللہ کیا مصرع تھا آگے کا بھول گیا۔"

"تمہیں کیا ہوا ہے سکندر؟" بالآخر اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"پاگل ہو گیا ہوں۔" وہ خوشی سے بولا۔

"ہیں؟" وہ اچھلی۔ "کیا کہہ رہے ہو سکندر! دیکھو صحیح صحیح بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ مجھ سے چھپاؤ مت پلیز!"

"کیا ہوا تانی۔" اب وہ حیران ہوا۔ "کیا پوچھنا چاہ رہی ہو۔"

"تمہیں کیا بیماری ہے۔ وہ اللہ بخش کہہ رہا تھا۔"

"اے بی سی۔" وہ الجھا۔ پھر اچانک ہنس دیا۔

"اب سمجھا!"

"کیا سمجھے؟"

"وہ الو..... تمہیں پٹا کرنے آیا ہے۔" بی بی کو دیکھ کر اس نے گالی ادھوری چھوڑی۔

"اے بی سی۔" اس نے دانت پیسے۔ "سمجھوں تمہیں۔"

"اچھا بابا! سمجھتی رہنا اس سے۔ مجھ سے تو ناراض نہیں ہو نا؟"

"نہیں۔"

"وہ مارا۔" وہ اچھلا۔ "بی بی! دیکھیں، یہ مجھ سے ناراض نہیں ہے۔"

"اچھا!" وہ مسکرائیں۔ "یہ کون سی بتانے کی بات ہے۔"

"یہی تو بتانے کی بات ہے اس پورے ہفتے میں۔"

"اچھا، اب تم جاؤ۔ میں اپنی بیٹی سے بات کروں گی۔"

"لیکن یہ تو مجھ سے ملنے آئی ہے۔" وہ پریشان ہوا۔ "ہے نا تانی؟"

"جی نہیں۔" اس نے صفائی سے انکار کیا۔ "میں اپنی بی بی سے ملنے آئی ہوں۔"

"اچھا! میں باہر لان میں ہوں۔" اس نے بی بی کے پیچھے سے اسے مکا دکھایا۔

پھر کتنی ہی دیر وہ بی بی سے باتیں کرتی رہی۔ ان سے بات کر کے ایک عجیب سا سکون مل رہا تھا اسے۔ اسے پتا ہی نہ چلا اور شام ڈھل گئی۔

"بیگم صاحب! کھانا لگا دیا ہے۔" ملازم نے اطلاع دی تو وہ گھبرا کر اٹھی۔

"اف! اتنی رات ہو گئی؟"

"کوئی بات نہیں۔" بی بی مسکرائیں۔ "سکندر چھوڑ آئے گا۔ فضلو! باہر سے صاحب کو بلاؤ۔" کچھ دیر بعد وہ ناراض ناراض سا آیا۔

"کھانا کھا لو تو چھوڑ آؤں تمہیں۔"

"کیوں تم نے نہیں کھانا؟" گوہر بخت نے پوچھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"سکندر بخت!" ہمیشہ کی طرح انہوں نے تنبیہی آواز نکالی۔ وہ جلدی سے کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

"ہوں۔ خوب باتیں ہوئیں ساس بہو میں۔" گوہر بخت مسکرائے۔

"ہونہہ۔ آئی بڑی ہو!" اس نے سرگوشی کی، جسے اس نے ہی سنا۔

"ہو کیوں؟ بیٹی ہے میری۔" بی بی مسکرائیں۔

"چل گیا نا جادو چڑیل کا۔" وہ پھر بولا مگر سرگوشی میں

"دیکھیں نا بی بی! مجھے چڑیل کہا ہے اس نے۔" وہ

"اس نے!" گوہر بخت حیرانی سے بولے۔ "انہوں نے بولا ہی۔"

بی بی پٹتے سکندر کو اچھو لگ گیا اور پھر ہنستے ہنستے وہ بے حال ہو گیا۔

"کیا بات کہی ہے بابا! آپ نے بھی۔" وہ مسلسل ہنس رہا تھا۔ "مجھے اور اتنی عزت دے۔ یہ بدتمیز، خوار لڑکی۔"

"سکندر بخت!"

"سوری بابا۔" وہ شرمندہ ہوا۔

"ہاں تو ہماری بیٹی کیا کہے گی آج سے اس نالائق کو۔" انہوں نے پیار سے تانیہ سے پوچھا۔ جو شرمندگی سے زور چرائے بیٹھی تھی۔

"جی آپ!" وہ آہستگی سے بولی۔ سکندر کے چہرے پر فوراً رنگ ابھرے۔

"شاباش۔ چلو۔ اب کھانا کھاؤ۔"

کھانے کے بعد کافی پی گئی۔ تانیہ مسلسل پہلو بدل رہی تھی۔ جس کا سبب وہ جانتا تھا۔ ظاہر ہے، وہ اب سے مخاطب کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ بھی اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور بابا سے محو گفتگو رہا۔

"سنئے.....!" بالآخر اسے کہنا ہی پڑا۔

"جی کہئے۔" اس نے ہونٹ کاٹ کر ہنسی روکی۔

"مجھے اب گھر جانا ہے۔" اس نے پہلو بدلا۔

"تو پھر؟" وہ اگلے جملے کا منتظر تھا۔

"تو چھوڑ آئیں نا مجھے۔" اس نے الفاظ سے نہ سہی، لہجے سے خفگی کا اظہار کیا۔

"تو چلئے نا، بیٹھی کیوں ہیں آپ۔" وہ بلاشبہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"فضلو!" بی بی نے آواز دی تو فضلو دوڑ کر ایک پیکٹ اٹھا لایا۔

"یہ کیا ہے بی بی؟" وہ سخت حیران تھی۔

"یہ ریت ہے ہمارے گھرانے کی۔" وہ مسکرائیں۔

"لیکن بی بی۔"

"اب چھوڑو تکلف۔" سکندر نے فوراً لقمہ دیا۔ "سمجھ لو بیٹی نے دیا ہے۔"

"ہونہہ آئے بڑے۔"

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے زور سے ایک مکا اس کے بازو پر مارا۔

"کمینے..... مذاق اڑا رہے تھے میرا۔"

"آف دی ریکارڈ گفتگو شروع۔" وہ ہنسا۔

"میری جوتی کہے گی تمہیں آپ۔" وہ سخت تلملا رہی تھی۔

"ہاں ہاں بھئی، اب تو رواں رواں پکارے گا۔" اسے سخت ہنسی آ رہی تھی۔

"تمہیں اور، آپ کہوں گی میں۔ ناممکن۔" وہ ہٹیلے پن سے بولی۔

"ارے بابا آپ کہنا "تو" کہنا، جو چاہے کہنا مگر بابا کے سامنے وہی کہنا جو انہوں نے کہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ کچھ مطمئن ہوئی۔ پھر دوبارہ اچھلی

"بات سنو۔"

"ہاں کہو۔"

"تم نے بی بی اور بابا کو میرا حلیہ کیا بتایا تھا؟"

"مارے گئے۔" وہ ہنسا۔ "کوئی خاص نہیں۔ بس جیسی ہو، اس سے ذرا سا ہی اچھا بتایا تھا۔ کیوں انہیں دھوکا لگا گیا؟"

"سکندر! تم بہت خبیث ہو۔" اسے ہنسی آ گئی۔

"حد ادب میڈم! میں مستقبل کا تمہارا شوہر نامدار ہوں۔" اس نے کیسٹ پلیئر میں کیسٹ لگائی۔ علیشاہ کی آواز گاڑی میں گونجی تو تانیہ نے برا سا منہ بنایا۔

"ہر چند کہ یہ کیسٹ میں نے تمہیں دی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اسے میری سوکن بنادو۔"

"کسے؟ علیشاہ کو۔"

"کیسٹ کو۔" وہ بھنائی۔

"علیشاہ پہ راضی ہو؟"

"میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔ تم صرف میرے ہو۔" وہ غرائی۔

"کیا رومینٹک جملہ ہے۔" اس نے جھٹکے سے گاڑی روکی۔

"اگر لہجہ شیرنی کا سا نہ ہوتا لطف آجاتا آج کی ملاقات کا۔ چلو پھوٹو!"

"بڑے بدتمیز ہو۔"

"پرانی اطلاع ہے۔ اترتی ہو کہ نہیں۔"

اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

"لعنت ہو تم پر اور تمہاری کھٹارا پر۔" اس نے زور سے دروازہ بند کیا۔

"احسان فراموش! آئندہ بیٹھ کر دکھانا۔"

"ہونہہ۔" وہ کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔

"تانی!" اس نے حسب عادت آواز دی۔ مگر وہ رکی نہیں۔

"کل بتاؤں گا جنگلی بلی۔"

☆ ☆ ☆

"اے بی سی! تیرا مقصد صرف مجھے ہرانا ہے۔ ورنہ تو انتظار کر سکتا ہے چھ مہینے۔"

"مجھے کیا ملے گا یار! ان چھ مہینوں میں۔" وہ چڑ گیا۔

"بات دیبا کی ہے۔ وہ انتظار نہیں کر سکتی۔"

"کیوں؟ اس کا عشق زیادہ سچا ہے؟"

"بات عشق کی نہیں ہے۔" اسے ہنسی آئی۔

"اس کے گھر والوں کی ہے۔ وہ اس کی شادی اسی مہینے کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ہامی نہیں بھری تو اس کا چچا زاد میرا سہرا بڑے فخر سے باندھے گا جو یقیناً تو بھی نہیں چاہے گا۔"

"ایسی کی تیسی اس کے چچا زاد کی۔ تیرا اسٹیتھسکوپ اس کا پھانسی کا پھندا بنا دوں گا میں۔" سکندر نے ہاتھ جھاڑے۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اللہ بخش مسکرایا۔

"کیوں؟ تو نے انجکشن کا بندوبست کر لیا ہے؟"

"دھت تیرے کی۔" وہ جھنجلایا۔ "ارے بھئی۔ میرا مطلب ہے کہ میں رشتہ بھیج دوں گا پہلے ہی۔"

"کون لے کر جائے گا تیرا رشتہ؟" سکندر نے اطمینان سے میز پر پاؤں رکھے۔ "میرے ماں باپ کا ذکر مت کرنا۔"

"اچھا دوست ہے۔" اللہ بخش خفا ہوا۔ "اور کون ہے میرا؟ میں خود جاتا اچھا لگوں گا؟"

"اچھا لگے یا برا، خود ہی جانا۔" وہ مسکرایا۔ "بائی داوے۔ تو نے مجھے پاؤں نیچے رکھنے کو نہیں کہا؟"

"انتہائی گھٹیا ہے تو۔ بلیک میلر۔" اے بی سی چیخا۔

"ذرہ نوازی ہے ڈاکٹر صاحب کی۔" اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر بجایا۔

"یہ کیا ہے؟" اے بی سی کا پارہ ہائی ہوا۔ "سگریٹ میرے کلینک میں؟ ناممکن۔ پھینک اسے۔ میں کہتا ہوں پھینک۔"

"دھیرج ڈاکٹر صاحب دھیرج۔" اس نے سگریٹ سلگا کر تیلی اے بی سی کی طرف اچھالی۔

"آج تو موقع ملا ہے۔ اگلے پچھلے حساب چکانے کا۔ بڑا برداشت کیا تیرا کمینہ پن میں نے۔ آج تو تمس اپنی قوت برداشت کو۔"

"سکندر بخت! تو اچھا نہیں کر رہا ہے۔"

"چھلنی بولی سوئی سے تیرے پیٹ میں چھید۔" وہ مسکرایا۔

"سکندر بخت! تو تو مار آستین ہے، دوست کے روپ میں دشمن ہے۔ بھیڑ کے روپ میں بھیڑیا۔ فاختہ کے روپ میں کوا ہے۔"

"بہت چرا لیے ہیں میرے ڈائیلاگ۔" وہ مسکرایا۔ "ڈیٹ کون سی رکھوائی ہے؟"

"بیس مارچ۔" اے بی سی کا چہرہ کھل اٹھا۔ اگر

"ہاں کیوں نہیں۔ جیسے تم لوگ مناسب سمجھو۔"

"بس تو جلیے پھوٹتے ہیں قسمت مس ڈی ای کی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

☆ ☆ ☆

بات تو ایک طرح سے طے ہی تھی۔ دیبا نے گھر والوں سے اللہ بخش کا غائبانہ تعارف کرا رکھا تھا۔ دوسری ہی ملاقات میں تاریخ رکھ دی گئی۔

"ٹھوس۔" اس نے پورا لڈو اے بی سی کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور سانس رکنے لگا۔

"کیوں میرا دم گھونٹ کر مارنا چاہتا ہے۔ مجھے۔"

اس نے لڈو ختم کر کے بے حالی سے کہا۔ "اس بے چاری کو سوکن بننے سے پہلے بیوہ بنا دے گا۔"

"ایسا مت کہہ اے بی سی!" سکندر نے آواز میں رقت پیدا کی۔ "میرا وعدہ ہے مجھ سے تو مر گیا اتفاقاً تو میں ہاتھ تھاموں گا اس کا۔"

"سکندر صاحب!" دیبا نے حسب عادت آنکھیں پھیلائیں اور اللہ بخش نے اٹھ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔

"میں پہلے ہی جانتا تھا، تیری نیت خراب ہے۔ جب سے تو نے دیبا کو دیکھا ہے بہانے بہانے سے مجھ پر قاتلانہ حملے جاری کر دیے تو نے۔ سار آستین!"

دیبا اور تانیہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔

"تانی کی بچی!" اس نے تانیہ کی پونی کھینچی۔ "بڑی خوشی ہو رہی ہے شوہر کو پٹتا دیکھ کر۔"

"کیسے شوہر؟ کہاں کے شوہر۔" وہ ہنسی۔ "مجھے انکار ہے اس رشتے سے۔"

"تانی!" وہ اچانک ساکت سا ہو گیا۔ "آئندہ ایسا مت کہنا پلیز!"

اے بی سی اور دیبا حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ تانیہ شرمندہ ہو گئی۔

"چلو بھئی!" اے بی سی نے دیبا کو مخاطب کیا۔ "کتنی رہتی ہے تمہاری شاپنگ؟"

"چند چیزیں اور ہیں۔" وہ مسکرائی۔ "زیادہ دیر

"کوئی خاص بات؟"

"ہاں پہلی ملاقات ڈاکٹر مسکرایا۔

"اچھا شعر ہے۔" سکندر ہنسا۔ "تو سرے کا آرڈر میں بی بی سے بات کرتا ہوں۔"

"چپ کر چاپلوس۔" اس نے جلتا سگریٹ اس کی طرف اچھالا۔ لیکن اے بی سی بہت خوش تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں چاہتی ہوں تم دونوں ایک ساتھ سہرا باندھو۔" اے بی سی نے ہولے سے کہا۔

"رہنے دیں بی بی۔" سکندر بولا "بے چارے کا دل ٹوٹ جائے گا۔ جب سب لوگ کہیں گے ایک دولہا تو بہت خوب صورت ہے۔ یہ دوسرا کیوں نظر ہٹو ہے۔"

"ارے کیوں؟" بی بی نے "میرا دوسرا بیٹا بھی بڑا خوب صورت ہے۔"

"سمجھا کریں نا بی بی! میری شادی کے لیے ایک ہاتھ بٹانے والی آجائے گی۔ اس لیے بی سی کی تو جیسے بھی ہو، کہیں۔ پر اپنی ذرا دھوم دھام سے ہونا چاہیے۔"

نے کالر کھڑے کیے۔

"کیوں بھلا!" بی بی خفا ہوئیں۔ "میں کیوں فرق کروں بیٹوں میں جیسے میرے لیے تم ہو، ویسے ہی اللہ ش ہے۔"

"چلیں۔ اس پر بھی لگا دیں لاکھ ڈیڑھ لاکھ پر بات کرنے تو چلیں ڈی ای کے گھر۔"

"یہ کیا الٹے سیدھے نام رکھے ہیں تم نے۔"

"آپ دیکھیے گا بی بی! والی زیڈ تک جاؤں گا میں۔ میں نے تو آخری والے کا نام بھی سوچ لیا ہے۔ یاسر ظفر کیسا ہے؟"

"کیا بکتے رہتے ہو سکندر! میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" بی بی بے بسی سے بولیں۔

"آئے گا بی بی آئے گا۔ آہستہ آہستہ۔ خیر پھر آپ تیار ہیں نا؟"

نہیں لگے گی۔"

"اب یہ گھومنا پھرنا بند کرو دیبا!" تانیہ نے اسے ڈانٹا۔ "ایک ہفتہ رہتا ہے تمہاری شادی میں۔ ذرا روپ نہیں آئے گا اور جو کسی نے دیکھ لیا نا تو بڑا تماشا بننا ہے۔"

"ارے بڑی بی!" سکندر نے اسے گھورا۔ "تمہیں کاہے کی تکلیف ہے۔ خود جو دن رات میری گاڑی میں گھسی رہتی ہو وہ کچھ نہیں۔"

"تو جناب! اپنی کون سی ابھی شادی ہو رہی ہے۔" وہ ہنسی۔ "جب ہونے لگے گی تب تھوڑا ہی آؤں گی تمہارے سامنے۔"

"ایک جھانپڑ دیا نا تو چار دانت ٹوٹ جائیں گے۔ خبردار جو میرے ساتھ کوئی ڈراما بازی کی تم نے۔ میں شادی سے ایک دن پہلے بھی ملوں گا تم سے۔"

"مل کر دکھانا۔" اس نے بھی آستینیں چڑھائیں۔ "محلے کے لڑکوں سے پٹوا دوں گی تمہیں۔"

"سیز فائر پلیز!" دیبا چیخی۔ "ہم لوگ ویسے ہی جا رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔" اے بی سی کھڑا ہوا۔ "اس ناٹک کی ضرورت نہیں۔ چلو دیبا! کہاں ایکٹروں میں پھنسے ہیں۔"

پیچھے سے سکندر نے گلاس کھینچ کر مارا۔

"ارے ارے ٹوٹ جاتا تو؟" دیبا نے اسے گھورا۔

"کیسے ٹوٹتا۔ اسٹیل کا ہے۔"

"میں گلاس کی نہیں اس کے سر کی بات کر رہی ہوں۔"

"تو کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے پیر پسارے۔ "سائیڈ ہیرو کے جانے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل ہیرو تو موجود ہے نا مس ڈی ای۔" اس نے کالر کھڑے کیے۔

"سنبھالو تانیہ!" دیبا ہنسی۔ "لگتا ہے میرے حسن کا جادو چل گیا ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ مجھے جادو اتارنا آتا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

"اے مسٹر۔" ان دونوں کو سی آف کر کے وہ اس کے پاس آگئی۔ "آپ رخصت ہوں گے کہ نہیں؟"

"ہو لیں گے یار! ابھی کبھی تو یہ شرف مہمانی بخشیں آپ۔"

"جی ہاں۔ لیکن جب وہ دونوں بھی ساتھ ہو لیں ہیں۔ یوں اکیلے آپ کی خاطر نہ کرنا..... مجھے ذرا اپنا نہیں ہے۔ چلو اٹھو اب بھاگو۔"

"نوازش!"

"اچھا بات سنو۔ تم نے شاپنگ نہیں کرنی شادی کے لیے۔"

"ابھی پے نہیں ملی۔" اس نے لاپروائی سے برتر سمیٹے۔

"پھر؟ کپڑے نہیں بنوانے؟"

"بنوالوں گی۔"

"اچھا چلو۔ شاپنگ کر کے آتے ہیں۔"

"نہیں!"

"تانی پلیز! مجھے غیر سمجھتی ہو؟"

"تمہیں غیر سمجھوں گی تو اپنا کسے سمجھوں گی۔"

"یار ایمان سے بی بی نے خاص تمہارے لیے پیسے دیے ہیں۔ چلو نا۔"

"کل چلیں گے۔"

"نہیں ابھی چلو۔ اٹھو اٹھو نا۔" وہ بضد ہو گیا۔

"اچھا بابا! ہاتھ تو چھوڑو۔" اس نے ہار مان لی۔

☆ ☆ ☆

شادی میں انہوں نے جی بھر کر ہنگامے کیے۔ سکندر نے ہنسا ہنسا کر سب کے پیٹ میں بل ڈال دیے۔

"دیبا!" رخصتی کے وقت وہ اس کے پاس چلا آیا۔ "سفید کار میں بیٹھنا اچھا!"

"اوئے بدمعاش!" اے بی سی نے اسے ایک مکا جڑا۔ "میری بیوی کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔ سفید کار میں لے جا اپنی لیلیٰ ثانی کو۔"

دیبا کو رخصت کرا کے بی بی اپنے گھر ہی لائی تھیں۔

"ابھی پہنچنے تک تو نہیں جانے دوں گی۔" انہوں نے فیصلہ سنایا تھا۔

"ہیں بی بی۔" سکندر ہنسا۔ "کتنا خیال ہے بیٹے کا۔"

"او بدمعاش! اب تو پیچھا چھوڑ دے میری بیوی کا۔"

"ہاں ہاں چھوڑ دیا۔ ہم کیا کنگلے ہیں۔ تانی کہاں ہے تم؟" دیبا کی ہنسی نکل گئی۔

"بڑے دانت نکل رہے ہیں دلہن صاحبہ! چار دن کی چاندنی والا محاورہ سنا ہے؟"

"سکندر!" بی بی نے ڈانٹا۔ "ذرا قابو میں رکھا کرو زبان کو۔"

"اچھا بھئی۔ اب ہو چلا یقین کہ بُرے ہم ہیں تو۔ چلو تانی! تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"

"چلیے۔" وہ سعادت مندی سے بولی کہ بی بی وہیں تھیں۔

"آج تو بڑی دیر ہو گئی۔" وہ گاڑی میں بیٹھ کر بولی۔ "عارفہ نے کان کھینچنے ہیں میرے۔"

"لے آتیں نا اس کو بھی۔"

"میں نے بہت کہا لیکن وہ اتنی تھکی ہوئی ہوتی ہے کہ کہیں دیکھنے کا بھی ہوش نہیں ہوتا اسے۔"

"تھک تو تم بھی جاتی ہو گی۔"

"ہاں پر تمہیں دیکھ لیتی ہوں نا۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"سو تو ہے۔" اس نے شوخی سے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔

"کیا بات ہے اتنی کھانسی کیوں ہو رہی ہے تمہیں۔" اس کے بار بار کھانسنے پر وہ پریشان ہوئی۔

"بس یار! کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دم سا گھٹ رہا ہے۔"

"ابھی جا کر کوئی دوا لینا اچھا!" وہ فکرمندی سے بولی۔

"میری دوا تو تم ہو۔" وہ مسکرایا۔ "لوگ کہتے ہیں زندگی کے لیے پانی ضروری ہے۔ میں کہتا ہوں زندگی کے لیے تانی ضروری ہے۔"

"مذاق نہیں سکندر! اپنا چیک اپ کرانا۔ اچھا۔"

"کیا ضرورت ہے یار۔ ذرا سی کھانسی ہی تو ہے۔"

"پلیز!"

"اچھا بابا۔" اس نے گاڑی روکی۔ "اتر و اب جان کھا جاتی ہو۔ بھی تو کہتا ہوں۔"

"کیا کہتے ہو؟" اس نے اتر کر دروازہ بند کیا۔

"کہ تم سے اچھی عیلیشاہ ہے۔" وہ مسکرایا۔

"اچھا! کھاؤ میری قسم!"

"کیوں کھاؤں۔ تم مفت کی ہو کیا؟" وہ ہنسا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆ ☆ ☆

"سکندر بخت! تم بہت جلد مر جاؤ گے۔" اے بی سی سخت غصہ میں تھا۔

"اچھا! لیکن تجھے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ تیری شادی ہو چکی ہے۔ تانیہ محفوظ ہے۔"

"سکندر پلیز!" وہ واقعی سنجیدہ تھا۔ "تمہاری اسموکنگ سے تمہارے پھیپھڑے متاثر ہو رہے ہیں اگر تم اسی طرح ایک کے بعد ایک سگریٹ پھونکتے رہے تو تمہارے پھیپھڑے گل کر ختم ہو جائیں گے اور پھر تم چھ مہینے سے زیادہ ایک دن نہیں جی سکو گے کیا سمجھے؟"

"کیا کروں یار!" وہ بے بسی سے بولا۔ "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔"

"اپنا نہیں تو بی بی کا خیال کرو۔ انکل کی کچھ پروا کرو تانیہ کی فکر کرو۔ کون ہے تمہارے سوا ان سب کا۔"

"کیا ہے اے بی سی۔" وہ جھنجلایا۔ "تو تو واقعی ڈانٹ رہا ہے یار۔"

"ڈانٹ نہیں رہا ہوں۔ سمجھا رہا ہوں۔ ڈانٹ دیکھی کب ہے تو نے میری۔ شام کو میں آ رہا ہوں انکل کے پاس۔"

"او بھائی! خدا کو مان۔" اس نے فوراً ہاتھ جوڑے

"۔۔۔سچ میں پوری کوشش کروں گا کم کرنے کی۔"

"کوشش نہیں چاہیے' فائنل رزلٹ چاہیے۔"

اے بی سی نے مسکرایا "اور میں نے کم کرنے کو نہیں ختم کرنے کو کہا ہے۔ کیا سمجھا؟"

"تیرا سر!" وہ بھنا گیا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ شام کو میں ہائی کورٹ میں تیرا مقدمہ داخل کر رہا ہوں۔" اے بی سی نے اطمینان سے کرسی سے ٹیک لگائی۔

"آئی ڈیم کیئر۔" سکندر نے منہ بنایا۔ "میں نے کہہ دیا ہے میں صرف کوشش کر سکتا ہوں۔"

"ہائی کورٹ سے کام نہیں چلا۔ نہیں چلا تو میں سپریم کورٹ تک جاؤں گا۔" اشارہ تانیہ کی طرف تھا۔

"اللہ بخش چودھری!" وہ چلایا "تو مار آستین' دوست کے روپ میں دشمن' بھیڑ کے روپ میں بھیڑیا ہے۔"

"اب پہچانا پیارے۔" وہ ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ "میں پچھتا رہا ہوں تیری شادی کرا کے۔"

"اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔" اس کی مسکراہٹ بدستور تھی۔

"میں قتل کر دوں گا تجھے۔"

"بصد شوق۔ دیا کے خرچے پورے کرے گا تو پاگل ہو جائے گا۔"

"سمجھ لوں گا تجھے۔" وہ سخت جھلایا ہوا اٹھ کر چلا گیا۔ اللہ بخش نے گنگناتے ہوئے فائل پر سر جھکا لیا۔

☆ ☆ ☆

"انکل! اس کی اسموکنگ خطرناک حد تک بڑھ چکی ہے۔" شام کے دعوے کے مطابق اے بی سی موجود تھا۔

"ہوں!" انہوں نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔ "یہ معمولی بات نہیں ہے پھیپھڑے بہت جلد متاثر ہو سکتے ہیں۔"

"ہوں!"

"آپ اسے فی الحال کسی پرفضا مقام پر بھیج دیں۔ میں اس سلسلے میں تانیہ سے بھی بات کر چکا ہوں۔ اس نے بھی سمجھانے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں' آپ اسے ایک زبردست ڈانٹ پلائیں۔ وہ خطرناک حد تک ڈھیٹ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا ہے۔"

"اب بس بھی کریں۔" ساتھ بیٹھی دیبا ہنسی۔

"چپ کرو۔" اے بی سی کو شکایتوں کا سلسلہ منقطع ہونا ناگوار گزرا۔ "بی بی!" اس نے بی بی کی جانب رخ موڑا "آپ بھی کچھ بچائی کیجئے گا۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں۔" انہوں نے لمبا سانس کھینچا "اولاد جوان ہو جائے تو بھلا کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"اولاد جوان ہو کر خود سر ہو جائے تو اس کی ٹانگیں توڑی جا سکتی ہیں۔" گوہر بخت گرجے۔ "کہاں ہے وہ الو کا پٹھا؟"

انہوں نے گالی میں اپنی پوزیشن کو نظرانداز کیا۔

"اسے خبر تھی' آج مجھے آنا ہے۔" اے بی سی اپنی کامیابی پر خوشی سے اچھلا۔ "ابھی کہیں چھپ گیا ہے۔ بہرحال گھر تو آئے گا نا۔ ایک کپ چائے اور ہو جائے۔"

فتح مندی کے احساس سے سرشار ہوتے ہوئے اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے معلوم نہیں تھا' تم اس قدر خود سر ہو۔" اس نے لال ناک کو رومال سے رگڑا۔

"اب تو معلوم ہو گیا اور اب یہ ٹسوے بہانا بند کرو۔" اس نے ناگواری کا اظہار کیا۔

"میری خاطر تم اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتے؟" تانیہ نے آواز کو پراثر بنانے کی آخری کوشش کی۔

"کر سکتا ہوں۔ ایک بار نہیں ہزار بار کر سکتا ہوں سگریٹ کیا چیز ہے میں دنیا چھوڑ سکتا ہوں تمہارے لیے۔ لیکن' لیکن تم سب نے مل کر ضد بنالی ہے میری۔ اس لیے مجھے غصہ ہے۔ اس اے بی سی کو میں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔ اب وہ مجھے تم سے جدا

کرنے پر تل گیا ہے۔" اس نے غصے سے گھاس اکھاڑی۔

"جدا کرنے کی کیا بات ہے اس میں؟" وہ چیخی "سچ تو کہتا ہے وہ۔ کچھ دن کے لیے کہیں گھوم پھر آؤ' تو کون سی قیامت آجائے گی؟"

"ٹھیک ہے۔ مجھے اعتراض نہیں ہے۔ لیکن تم بھی چلو میرے ساتھ!"

"میں۔۔۔ میں کس حیثیت سے چلوں تمہارے ساتھ۔ تم جانتے ہو اگلے مہینے میرے ایگزامز ہیں۔ پھر میری جاب کا مسئلہ ہے اور پھر اچھا ہے تمہاری غیر موجودگی میں' میں کچھ پڑھ بھی لوں گی۔"

"میں' میں رکاوٹ ہوں تمہاری پڑھائی میں؟" اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا۔

"یہ حقیقت ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"آفس سے گھر جو وقت ملتا ہے' وہ تمہارا ہو جاتا ہے۔ پھر کس وقت میں پڑھا کروں میں؟"

"تم جدا رہ لو کی مجھ سے پورے دو مہینے؟" اس کے لہجے میں شکست خوردگی امڈ آئی۔

"میں انتظار کروں گی نا تمہارا۔" تانیہ نے پوری کوشش کی کہ اس کے دل کی "نہ" اس کی آواز میں نہ مل جائے۔

"نانی!" وہ واقعی بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ "تم بھی نہیں سمگریٹ بھی نہیں' زندگی کیا ہوگی۔"

"تمہاری زندگی کی حفاظت کے لیے ہی تو ضروری ہے یہ۔۔۔!"

"ٹھیک ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "بابا بھی یہ چاہتے ہیں' بی بی یہی کہتی ہیں' تمہاری ضد بھی یہی ہے تو پھر میں کل ہی چلا جاتا ہوں۔"

"کل!" اس کا دل ایک لمحے کے لیے جیسے بند ہوا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

"آبائی گاؤں ہے ہمارا۔ بڑا پرفضا مقام ہے سوچا تھا شادی کے بعد دونوں چلیں گے۔ مگر خیر میں کل ہی چلا جاؤں گا۔ یہاں سے کوئٹہ جاؤں گا پھر وہاں سے قریب ہی ہے۔"

"کل۔۔۔ میں چھٹی کر لوں گی آفس سے۔" اس نے ہولے سے کہا۔

"نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "میں تم سے ملے بغیر جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"تمہیں جانے سے پہلے دیکھا نا تو پھر جا نہیں پاؤں گا۔" اس نے تانیہ کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ "چلو تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"

☆ ☆ ☆

"تانی۔۔۔ نی' نی۔" اس کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر لوٹی تو وہ ہنس دیا۔

"تانی۔۔۔ نی۔۔۔ نی۔" اس کھیل میں اسے بڑا لطف آ رہا تھا پاس کھڑے شیر دل نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔

"تانی! آپ کا گھر والا ہے صاب۔" بالآخر وہ پوچھ بیٹھا۔

"گھر والا!" وہ ہنسا۔ "ہاں شیر دل! اختیارات کے حساب سے جانچا جائے تو وہ میرا گھر والا ہے۔"

"آپ بیگم صاحب کو ساتھ نہیں لایا؟" اسے حیرانی ہوئی۔

"لایا ہوں۔" اس نے مختصر جواب دے کر دوربین آنکھوں سے لگائی۔

"کیدر ہے فر؟" شیر دل سخت حیران ہوا۔

"ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی۔" وہ گنگنایا۔

"آپ عجیب باتیں کرتا ہے صاب!" شیر دل شرمندگی سے ہنسا۔

"تمہاری شادی ہو گئی شیر دل؟" اس نے پوچھا۔

"نئیں صاب! ایک بہن ہے۔ اس کا شادی کر کے فرہم کرے گا۔"

"کوئی لڑکی پسند ہے تمہیں؟"

"نئیں صاب۔" وہ شرمندہ ہوا۔

"اچھا تو شیر دل صاحب۔ جب کوئی لڑکی پسند کر لو گے نا پھر میری باتیں تمہیں عجیب نہیں لگیں گی۔

سمجھے۔"

"ابھی کچھ کچھ سمجھا صاب۔" اس نے نسوار زدہ دانتوں کی نمائش کی۔

"بس تو پھر چلو آگے۔" اس نے شیر دل کے گلے میں ہاتھ ڈالا۔

جس کاٹیج میں وہ رہائش پذیر تھا' شیر دل بیک وقت اس کا مالی' چوکیدار' خانساماں اور دوسرے امور کا ملازم تھا۔ اس کے علاوہ فارغ وقت میں وہ اس کا گائیڈ بھی تھا۔ شام کو وہ پابندی سے اسے پہاڑوں کی سیر کرانے لاتا تھا۔ یہاں آکر اگر وہ بہت خوش نہ تھا تو اتنا اداس بھی نہ تھا۔ وہ حیران تھا کہ سگریٹ کی طلب اچانک کہاں جاکر چھپ گئی ہے۔ اسے تو اب یاد بھی نہ آتا تھا کہ اس کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ وہ قسم بھی تھی جو تانیہ نے اسے دی تھی۔ تانیہ کی قسم توڑنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب بس دن رات یا تو وہ پہاڑوں پر گھومتے ہوئے تصویریں اتارتا رہتا یا کیلنڈر کے آگے بیٹھا تاریخوں پر کراس لگاتا رہتا۔

"ایک' دو' تین' چار' پانچ۔" اس نے دن گنے۔

"شیر دل!"

"جی صاب۔" شیر دل نے جوتے پالش کرتے کرتے نگاہ اٹھائی۔

"پانچ دن سے اسے نہیں دیکھا۔"

"کسے صاب؟" شیر دل جوتوں کی چمک میں مگن تھا۔

"اسے!" اس نے اسے پر زور دیا۔

"تانی بیگم کو؟" شیر دل نے اس قدر بے نیازی سے پوچھا کہ اسے غصہ آگیا۔

"نہیں' اللہ بخش کو۔" اس نے جل کر جواب دیا۔

"فر کیا ہوا؟"

"اوفوہ..... پہاڑوں پر رہنے والوں کے دل کس مٹی سے بنے ہوتے ہیں شیر دل؟"

"ابھی دل کہاں مٹی سے بنتا ہے صاب۔ وہ تو گوشت کا ہوتا ہے۔"

"ہاں لگتا ہے!" وہ ہنسا۔ "تمہارا دل یقیناً گینڈے کے گوشت سے بنا ہوا ہے۔"

"جی!" اس نے ہونقوں کی طرح اسے دیکھا۔

"اوہ یار! کچھ نہیں۔" اس نے بیزاری سے رسا پنجا۔ "چلو گھوم کر آتے ہیں۔"

"ابھی معاف کرو صاب۔" اس نے التجا کی۔ "آ ماں بیمار ہے۔ اس کے پاس جانا ہے۔"

"اچھا!" وہ مایوس ہوا۔ "پھر میں خود ہی چلا جا ہوں۔"

"جی صاب۔ ابھی وہاں جاکر آپ بات تو کرتا نہیں ہے۔ تانی' تانی چلا رہتا ہے۔"

"اچھا اچھا۔ بس۔" اس نے جوگرز اپنی طرف کھسکائے "پھر کیا اے بی سی کو پکاروں۔"

جاگرز پہن کر دوربین گلے سے لٹکا کر اس نے کیمرہ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ جانے کتنی ہی دیر وہ وادی میں گھومتا رہا۔ کافی ساری تصویریں بنا کر' بچوں کو پیار کر کے اور ان کے ساتھ مختلف کھیل کھیل کر اور عورتوں اور لڑکیوں کو مویشی چراتے دیکھ کر جب اس کا دل بھر گیا تو اس نے واپسی کی راہ لی۔

دروازے کے پاس سیڑھیوں پر بیٹھی اس پہاڑی لڑکی کو اس نے تب دیکھا جب وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

"سلام صاب۔" اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جاتے ہوئے سلام کیا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکا اور اس طرح مبہوت ہوا کہ جواب دینا بھول گیا۔

لڑکی کیا تھی۔ لفظ "حسن" کی مکمل تفسیر تھی۔ رنگت اس قدر گلابی تھی کہ موم سے بنی ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس قدر حیرت میں ڈوبی ہوئی لگتی تھیں' جیسے ہر چیز کو پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو

"سلام صاب۔" اس نے دوبارہ سلام کیا تو وہ چونکا

"آں ہاں وعلیکم سلام۔"

"بوت دیر سے انتظار کرتا صاحب آپ کا۔" اس نے سیڑھیوں پر رکھا تھیلا اٹھایا۔

"کہاں سے آئی ہو تم؟"

"ام شیر دل کا بہن ہے صاب! ماں کی طبیعت خراب ہے نا' اس لیے وہ کھانا پکانے نہیں آئے گا۔ ام روٹی لایا ہے۔" اس نے تھیلا اس کی جانب بڑھایا۔

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔" اس نے تھیلا تھاما۔

"اور یہ چابی!"

"ہاں۔ لاؤ دے دو۔"

"ابھی ام جاتا ہے صاب۔" وہ جانے کو مڑی۔

"بات سنو۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"ام کا نام خزینہ ہے صاب۔" وہ تھوڑا شرمائی۔

"خزینہ۔ یہ بھلا کیسا نام ہوا۔ جیسے پودینہ۔" وہ ہنسا۔

"پتا نئیں صاب۔" وہ بھی مسکرائی۔ "بس ماں نے رکھ دیا۔"

"تم خود رکھ لیتیں۔"

"ابھی ام کیسے رکھتی بھلا۔" وہ بے حد حیران ہوئی اس کی بات پر۔ "ام تو چھوٹی ہوتی۔"

"اچھا! ام تو چھوٹی ہوتی۔" اس نے اس کا جملہ دہرایا پھر بے اختیار ہنس دیا۔ "ام تو چھوٹی ہوتی۔" اسے بے اختیار ہنسی آئے چلی جارہی تھی۔ وہ چند لمحے حد حیرانی و پریشانی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر مڑ کر سرپٹ بھاگی اور سکندر کا ہنس ہنس کر برا حشر ہو گیا۔

دوسرے دن وہ صبح شیو بنا رہا تھا جب دروازہ بجا۔

"کم ان۔" اس نے آواز لگائی۔

چند لمحوں بعد دروازہ پھر بجا۔

"کون ہے بھئی؟" اس نے دروازے تک جاکر دروازہ کھولا۔ باہر وہ کھڑی اپنی حیران آنکھیں پٹ پٹا رہی تھی۔

"اوہو..... پودینہ۔" وہ مسکرایا۔ "آجاؤ' باہر کیوں کھڑی ہو۔" وہ جھجکتے ہوئے اندر آگئی۔

"ناشتا صاب!"

"ہاں رکھ دو۔ لیکن چائے تو ہے نہیں۔" اس نے تھیلے سے منہ پر گرا۔

"چائے ام یہیں بنا دے گا آپ کو۔" وہ مسکرائی۔

"بات سنو۔ ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانو گی؟" اس نے بغور اس کو دیکھا۔

"بولو صاب۔"

"ایک تصویر اتار لوں تمہاری۔"

"کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔ "اما را تصویر کا آپ نے کیا کرنا ہے۔"

"جلانا ہے کسی کو۔" وہ شرارت سے ہنسا۔

"جی؟"

"کچھ نہیں۔ بتاؤ پھر اتار لوں؟" اس نے پوچھا تو جواباً اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"اچھا پھر یوں کرو۔ وہ جو ندی سی بہتی ہے نا نیچے۔"

"ہاں' وہاں سے ام روز پانی بھرتا۔"

"بس وہاں آنا شام کو پھر تمہاری تصویر بناؤں گا۔ ٹھیک؟ آؤ گی نا۔"

"جی۔" وہ مسکرائی۔

"اف۔" اس نے منہ پھیر کر سانس لی۔ "تانیہ بیگم! تمہاری قسمت اچھی تھی جو پہلے مل گئیں۔"

"کچھ بولا صاب؟"

"صاب کچھ نہیں بولا۔ جاؤ چائے بناؤ۔" اس نے قصداً اس کی جانب دیکھنے سے گریز کیا۔

شام کو جب وہ کیمرہ لٹکائے ندی کے پاس پہنچا تو وہ حسب وعدہ موجود تھی۔ بڑے سے پتھر پر ٹیھی پانی میں ٹانگیں لٹکائے وہ بڑی محویت سے کچھ سوچ رہی تھی۔ اس نے بڑی خاموشی سے اس کی دو تصویریں اتاریں۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے پیچھے جا پہنچا۔

"باؤ۔" اپنی دانست میں اس نے بڑی خوفناک آواز نکالی تھی۔ لیکن وہ بالکل نہیں ڈری بلکہ اس کو یوں حیرانی سے دیکھا۔ جیسے اس حرکت کا مقصد پوچھ رہی ہو۔ وہ شرمندہ ہوا۔

"ارے تم ڈریں نہیں۔ ابھی تانیہ ہوتی تو بے ہوش ہو جاتی۔"

"کون ہوتی؟"

"تانیہ!"

"آپ کا گھر والی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے

اسے دیکھا۔

"نہیں۔ میرا گھر والا۔" وہ ہنسا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی ٹانگیں چلاتی رہی۔

"تصویریں نہیں بنواؤ گی؟" وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"نئیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟" اسے حیرانی ہوئی۔ "صبح تو کہا تھا تم نے؟"

"وہ صاب....." وہ ہچکچا رہی تھی۔

"کسی نے منع کیا ہے؟"

"جی۔" اس نے انگلیاں مروڑیں۔

"کس نے؟ شیر دل نے؟" وہ حیران ہوا۔

"نئیں نئیں۔" اس نے سر ہلایا۔ "لالہ نے منع نہیں کیا۔ وہ دلبر خان۔"

"دلبر خان؟ یہ کون ہے؟"

"ابھی وہ۔" اس کے چہرے پر گلال بکھرا۔

"اوہ' آئی سی۔" وہ مسکرایا۔ "دلبر خان..... اسم بامسمّیٰ۔"

"کیا صاب؟" وہ حیران ہوئی۔ "ابھی کیا بولا تم دلبر کو؟"

"ہائے کیا قسمت پائی ہے دلبر نے۔" اس نے کھڑے ہو کر قہقہہ لگایا۔ "بس آج سے تانیہ کے لیے میرا نام بھی دلبر ہے۔" "کیسا؟"

"آپ بڑی عجیب باتیں کرتا ہے۔" جھنجلا کر کھڑی ہو گئی۔ "ابھی ام جاتا۔"

"تم جاتا تو ام بھی جاتا۔" اس نے ہنس کر کیمرہ سنبھالا۔

دوسرے دن شیر دل نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ اب وہ یہاں بے حد بور ہو رہا تھا۔ خوب صورت مناظر بھی اس کا دل بہلانے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔

"شیر دل۔ تم دیکھنا۔ دو مہینے میں یہاں رہ ہی نہیں سکتا۔"

"کیوں صاب۔" شیر دل چونکا "ام سے کچھ غلط ہوا؟"

"ارے نہیں یار۔" اس نے گہرا سانس لیا۔ "تو میں نے کیا ہے یہاں آ کر۔ مجھے پتا تھا۔ میں رہ نہیں سکتا اس کے بغیر' پھر بھی آ گیا بلاوجہ۔"

"فراسے بھی لے آتے۔"

"کسے؟"

"جس کے بغیر آپ رہ نہیں سکتا۔" شیر دل سادگی سے مسکرایا۔

"لایا تو ہوں۔" اس نے جیب سے تانیہ کی تصویر نکالی۔ "لیکن وہ کیا کہتے ہیں جو بات تجھ میں ہے تری تصویر میں نہیں۔"

"یہ بیگم صاب کا فوٹو ہے؟" شیر دل نے مسکرا کر پوچھا۔ "ابھی ام بھی دیکھے صاب؟"

"لو دیکھو۔" اس نے تصویر اس کی جانب بڑھائی۔ "ویسے تصویر کوئی خاص نہیں آئی۔ پاگل تصویر اتروا تے ہوئے بلی جیسی شکل بنا لیتی ہے۔"

"اچھی ہے صاب۔" شیر دل نے فسوں زدہ دانت نکالے اور تصویر واپس کی۔

"خاک اچھی ہے!" اس نے منہ بنایا۔ "بولتی تو ہے نہیں۔"

"فوٹو کیسے بولے گی۔" وہ حیران ہوا۔

"ارے یہ مت کہو تم۔" وہ ہنسا۔ "وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ بولنا تو چھوٹی بات ہے۔ وہ تصویر سے ہاتھ نکال کر مجھے مکا بھی مار سکتی ہے۔"

"اچھا!" شیر دل کو یقین نہیں آیا لیکن کچھ بولا نہیں۔

"چلو یوں کرتے ہیں جتنے دن یہاں ہیں ایک تصویر بناتے ہیں تانی کی۔" سکندر نے خود کلامی سی کی۔

"وہ کیسے؟" شیر دل ہمہ تن گوش تھا۔

"ہاتھ سے اور کیسے۔ ارے ابھی میری ڈرائنگ کے جوہر نہیں دیکھے تم نے۔" وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دن رات بڑی جانفشانی سے تانیہ کی تصویر بنانے میں مگن تھا۔ اس کا ارادہ تانیہ کے برتھ ڈے پر اسے گفٹ کرنے کا تھا۔

"کیا یاد کرو گی تانیہ بیگم!" اس نے بٹن کھول کر آستین اوپر چڑھائی "کس سکندر نے عشق کیا تھا تم سے۔"

"صاحب!" پیچھے سے مدھ بھری آواز آئی۔

"ارے پودینہ بیگم آئی ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"ابھی آپ ہم کو پودینہ کیوں بولتا؟"

"کیونکہ پودینے کو دیکھ کر میرے خیالات بڑے فریش ہو جاتے ہیں۔ ہرا ہرا تازہ' تازہ پودینہ دیکھو تو آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہے۔"

وہ اس کا مطلب سمجھ کر شرم سے مسکرائی۔

"یہ آپ کیا بناتا صاب؟" اس نے اسکیچ کا بغور معائنہ کیا۔

"بس یونہی دل چاہا کہ زندگی کی تصویر میں جی بھر کر رنگ بھر دوں۔"

"فرکب بنے گی یہ؟"

"اوں۔ بس بن جائے گی تھوڑے دن میں۔" "فر ہم اس کو گلے میں لٹکالے گا۔" وہ ہنسنے لگا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

"ابھی ام جاتا ہے۔" وہ جانے کو مڑی۔

"سنو خزینہ! ناراض ہو گئیں کیا؟" اس نے آواز دی۔

"نئیں صاب! آپ سے کاہے کا جھگڑا؟" وہ مسکرائی "آپ تو پردیسی ہو۔"

"کاش تانیہ کے لیے بھی میں پردیسی ہوتا۔ کم از کم جھگڑا تو نہ کرتی۔" اس نے خزینہ کے جانے کے بعد خود کلامی کی اور مسکرا دیا۔

☆ ☆ ☆

تصویر کو مکمل ہونے میں پورے تین ہفتے لگے تھے اور اب وہ باغیچے میں کھڑا اس کو فائنل ٹچ دے رہا تھا۔ موسم اس قدر سہانا ہو رہا تھا کہ وہ خود بخود ہی گنگنانے لگا۔

"نیلے نیلے امبر پر چاند جب آئے۔" سامنے کینوس پر تانیہ پر نظریں جمائے وہ بے حد خوشگوار موڈ میں تھا۔ جب پیچھے آہٹ سن کر وہ مڑا۔

"ارے پودینہ! تم کب آئیں؟"

"ام....." اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے "ابھی آیا۔"

"یہ' یہ کیا ہوا تمہیں؟" اس کے ہاتھ سے رستا خون اور چہرے پر لگے نشانات دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

"ابھی ام گر گیا ہے صاب۔" اس نے لڑکھڑا کر اس کا کاندھا تھاما۔

"مگر کیسے؟ پر کیسے اور پیر میں کیا ہوا؟ موچ آ گئی کیا؟"

"ام بھاگ رہا تھا نا بھیڑ کا بچہ پکڑنے کو۔" تکلیف کی شدت سے اس کا گلابی چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"اچھا' اچھا چلو اندر چلو۔ میں کچھ ٹریٹ منٹ دوں۔" وہ اسے سہارا دے کر اندر لے آیا۔ "بیٹھو یہاں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" اسے کرسی پر بٹھا کر وہ اندر کمرے میں گیا اور وہاں سے روئی اور اسپرٹ لے آیا۔

اسپرٹ لگی روئی اس نے خزینہ کے ہاتھ پر پھیری تو اس نے ایک چیخ ماری۔

"ارے' ارے۔" وہ ہنس دیا۔ "بڑی کم ہمت لڑکی ہو۔ پتا ہے ایک مرتبہ تانیہ کا ہاتھ کٹ گیا تھا۔"

"صاب! بہت جلن ہوتا ہے۔" وہ قطعی اس کی طرف متوجہ نہ تھی۔

"پھر پتا ہے کیا ہوا؟" اس نے روئی کا رخ اس کے گال کی طرف کیا۔ "میں نے اس کے ہاتھ پر۔"

"نئیں صاب!" وہ چلائی۔ "جلن ہوتا ہے۔"

"ارے کچھ نہیں ہوتا یار!" وہ بھنا گیا۔ "زخم صاف کرنے دو۔ پھر مرہم لگا دوں گا۔"

"نئیں صاب۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"ہاتھ ہٹاؤ۔" اس نے ڈانٹا۔

"نئیں۔"

"ہٹائی ہو یا لگاؤں ایک!" وہ بھنایا تو اس نے جلدی سے ہاتھ ہٹا دیا۔ بے حد گورے گلابی گال سے اس کا ہاتھ ٹکرایا تو اسے خود کو کرنٹ سا لگا۔ خزینہ نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"جلن ہوتا ہے نا.....!"

"خزینہ!" وہ اپنے محسوسات کو کوئی نام نہ دے سکا۔ "ہاتھ چھوڑو!"

جانے کیا تھا اس کی آواز میں' وہ حیرت میں ڈوبی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکائے ایک ٹک اسے گھورتی رہی۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی اور وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح اس کی آنکھوں میں ڈوبنے لگا۔

اچانک ہی بادل بڑے زور سے گرجے تھے۔ تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کاٹیج کا دروازہ بڑی زور سے بند ہوا۔

باہر شاید بارش ہو رہی تھی۔ پانی کی بوندیں دروازے اور کھڑکیوں سے ٹکرا کر بڑی زور کی آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ لیکن وہ کچھ نہیں سن پا رہا تھا۔ اس کے کان بند ہو گئے تھے یا شاید اس کے اپنے وجود میں اتنا تیز طوفان اٹھ رہا تھا' اتنا زبردست شور ہو رہا تھا کہ باہر کی آوازیں اس شور کے آگے ماند تھیں۔

"تڑاخ۔ تڑاخ۔ تڑاخ۔" سوچ کی لہریں بپھری ہوئی آتیں اور اس کے سارے وجود پر طمانچے برسانے لگتیں۔ مگر وہ بلبلاتا نہیں تھا' حرکت نہیں کرتا تھا۔ کسی فالج زدہ بوڑھے کی طرح بے حس و حرکت پڑا چھت کو گھور رہا تھا۔ آس پاس کی ہر شے خاموش تھی' ساکت تھی لیکن اس کے وجود کے اندر جیسے آتش فشاں موجیں مار رہا تھا۔

ساری رات وہ یونہی آڑا ترچھا بستر پر پڑا رہا تھا۔ پلکیں بھی شاید اس نے دو تین مرتبہ ہی جھپکی تھیں۔ بارش پوری رات ہوتی رہی تھی۔ اور پوری رات اس کے وجود نے ملامت' غم و غصے اور اپنے وجود سے اٹھتی کراہیت کے طوفان کے تھپیڑے کھائے تھے چرر..... رر۔" دروازہ شاید ہوا سے کھلا تھا اور پھر تیز ہوا سے ہی بند ہوا۔

"دھڑ۔" زور سے آواز آئی اور وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔

"نہیں..... نہیں..... نہیں۔" وہ سر پکڑ کر چیخا۔

"کھول دو دروازہ کھول دو۔ فار گاڈ سیک دروازہ مت بند کرو۔ مت بند کرو۔ مت بند کرو۔" اپنی ہی آواز کی بازگشت اپنے دماغ میں سنتا رہا۔ پھر جیسے اچانک ہوش میں آیا۔ بستر سے اتر کر وہ آہستہ آہستہ چلتا باہر آگیا۔ بارش کا زور کم ہو گیا تھا۔ اب صرف ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ کہر بھی چھٹ گئی تھی۔

سامنے اپریل پر لگا کینوس بے حد بدرنگ ہو چکا تھا۔ سارے نقوش بہہ گئے تھے۔ وہ کسی معمول کی طرح چلتا ہوا اس تک پہنچا۔

"تانی!" اس کے لب ہولے سے ہلے۔

"ٹپ ٹپ ٹپ۔" بوندیں باقی ماندہ رنگوں کو اپنے ساتھ لیے پھسل رہی تھیں۔

"تانی۔" اس کے حواس جیسے پلٹنے لگے۔ تانی۔ کپکپاتا ہوا ہاتھ بڑھا کر اس نے پھٹے ہوئے کاغذ کو چھو پھر جانے کیا ہوا۔

"تانیہ! اس نے زور سے چیخ ماری تھی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دوپہر کو کھانا لے کر آتے شیر دل کو وہ وہیں بے ہوش پڑا ملا تھا۔

"صاب! یہ دوا پی لو صاب۔" ہوش میں آنے پر شیر دل کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔

"آہ!" اس کے سر میں درد کی شدید ٹیس اٹھی۔

"صاب! آنکھیں کھولو صاب۔ دیکھو ام شیر دل!" وہ تین دن سے بے ہوش تھا اور شیر دل تین دن سے یونہی اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔

"کک۔ کون؟" وہ کراہا۔

"ام شیر دل صاب۔" اس نے اس کا جلتا ماتھا چھوا

"شیر دل!" اس نے آنکھیں کھولیں۔

سامنے شیر دل کا دھندلایا چہرہ تھا۔ گوری رنگت' گلابی ہونٹ اور آنکھیں۔ ہاں آنکھیں وہی تھیں۔ حیرت میں ڈوبی۔ سحر زدہ کر دینے والی۔

"نہیں۔" اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

"صاب!" شیر دل نے پریشانی سے اس کا بازو تھاما تو وہ یوں اچھلا جیسے کرنٹ لگا ہو۔

"نہیں..... پلیز ہٹ جاؤ۔ مجھے' مجھے ہاتھ مت لگاؤ

شیر دل۔ شیر دل!" وہ زور زور سے رونے لگا۔

شیر دل کو دیکھ کر' خزینہ کے بھائی کو دیکھ کر اس کے دل کے سارے ٹانکے ایک ساتھ اکھڑے تھے۔ شرمندگی' ملامت اور ذلت نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

"صاب! ابھی کیا ہوا آپ کو؟" شیر دل سخت فکر مند تھا۔

"تم' تم چلے جاؤ یہاں سے' چلے جاؤ' جاؤ۔" وہ حواس باختہ سا چیخا۔ "جاتے کیوں نہیں ہو؟" اس نے آس پاس رکھی چیزیں اٹھا اٹھا کر اس پر پھینکنا شروع کر دیں۔ پھر اچانک اسے چکر سا آیا اور آس پاس کی ہر شے دھندلا گئی۔

"سکندر!" کوئی مہربان آواز' مسیحا لہجہ تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر فوراً" بند کر لیں۔

"سکندر دیکھو پلیز۔ آنکھیں کھولو!" وہ ملتجی انداز میں کہہ رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔

"اے بی سی۔" وہ اللہ بخش کی طرف مڑی۔

"ہوش آگیا ہے۔ یہ ہوش میں ہے۔ پھر..... پھر یہ آنکھیں کیوں نہیں کھولتا۔ مجھے پہچانتا کیوں نہیں ہے یہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"بیٹ اٹ ایزی تانیہ!" اللہ بخش نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "ابھی اس کا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔ ابھی آہستہ آہستہ ہوش میں آئے گا۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم!" وہ چیخی۔ "میں جانتی ہوں ہوش میں ہے۔ کل اس نے تم کو بھی پہچانا تھا۔ مجھ سے بھی بات کی تھی۔ پھر میرے سامنے کیوں نہیں بن رہا ہے۔ تم' تم دونوں یقیناً" کوئی کھیل کھیل رہے ہو۔ مجھے ستا رہے ہو۔ ہے نا؟ ہے نا؟ بولو نا؟ سکندر..... سکندر۔" وہ مڑ کر اسے جھنجوڑنے لگی۔

"تانیہ پلیز!" اے بی سی نے اسے بمشکل

"پلیز! اسے لے جاؤ۔"

"یہ! وہ مجھے کیوں نہیں....."

"کم آن تانی۔ پاگل ہوئی ہو کیا؟" دیبا نے اسے پیار کیا۔ "اللہ بخش کی بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔" وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر باہر لے گئی۔

اے بی سی نے گہرا سانس لیا اور اس پر جھکا۔

"سکندر! میرے دوست! آنکھیں کھول یار!"

اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ اللہ بخش ایک لمحے کو کانپ سا گیا۔ سرخ ملگجی آنکھوں میں کیا تھا' وہ سمجھ نہ پایا۔

"اے بی سی۔" اس نے نحیف سی آواز نکالی "وہ چلی گئی نا؟"

"ہاں یار! چلی گئی لیکن تو۔"

"بس۔" اس نے دوبارہ آنکھیں بند کیں۔ "کچھ مت پوچھو' کچھ مت پوچھنا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اے بی سی نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"کچھ نہیں پوچھتا۔ تو دماغ پر بوجھ مت ڈال۔ شام کو انکل اور آنٹی آئیں گے' ان کے سامنے بالکل فریش رہنا۔ اچھا؟"

"ہوں۔" اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

☆ ☆ ☆

"اللہ بخش۔ مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ کیا ہوا ہے میرے بچے کو۔ کس کی نظر لگی ہے میرے لال کو۔" وہ ہذیانی کیفیت میں بول رہی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوا بی بی۔ کچھ نہیں ہوا۔" اللہ بخش اٹھ کر ان کے پاس آیا۔ "بس معمولی سی ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ شیر دل بتا رہا تھا' جانے کتنی دیر یہ بارش میں بھیگتا رہا تھا۔ بس اسی سے نمونیہ ہو گیا تھا اور کوئی بات نہیں ہے۔"

"نہیں۔ کوئی اور بات ہے۔ ضرور ہے۔" وہ رونے لگیں۔

"پہلے بھی کئی مرتبہ بیمار ہوا ہے وہ۔ لیکن' لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا چپ لگ گئی ہے اسے۔ کچھ نہیں بولتا

بس گھنٹوں بیٹھا دیواروں کو گھورتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے رونے لگتا ہے۔ آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ ساری ساری رات جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں گھومتے رہے۔ "یہ کیسی بیماری ہے اللہ بخش۔ یہ کون سا روگ ہے؟"

اللہ بخش نے بے بسی سے ہاتھ مسلے۔ اصل بات تو اسے بھی پتا نہیں تھی۔ اتنا وہ کہہ سکتا تھا کہ کوئی بات، کوئی واقعہ، کوئی لمحہ اس کے ذہن کو بری طرح جھنجھوڑ کر گزرا ہے۔ کوئی احساس ہے جو کینسر کی طرح اس کے دماغ سے لپٹ گیا ہے۔ کوئی احساس جرم جو اس کی رگ رگ میں زہر کی طرح بھر گیا ہے وہ کسی سے نظر نہیں ملاتا، بات نہیں کرتا۔ لیکن بات اصل میں تھی کیا، اللہ بخش بھی نہیں جانتا تھا۔

"بی بی۔ آپ فکر مت کیجئے۔ میں شام کو آؤں گا تو تفصیلی بات کروں گا اس سے، جانے کیا بات ہوئی ہے جس سے اس کے دماغ کو صدمہ پہنچا ہے۔ بہرحال آپ فکر مند مت ہوں۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔"

"اچھا!" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "ہو سکتا ہے خان صاحب کی موجودگی میں وہ کھل کر بات نہ کرے۔ میں اور خان صاحب شام کو رضا بھائی کی طرف چلے جائیں گے۔ تم اکیلے میں اس سے اچھی طرح بات کرنا۔"

"جی بالکل۔" اس نے سعادت مندی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

☆ ☆ ☆

"سکندر!"

"ہوں؟"

"یہ لے چائے پی۔" اس نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔

"کیا دیکھ رہا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے گہرا سانس لے کر کپ تھاما۔ "اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا لکھا ہے؟" اے بی سی مسکرایا۔

"پتا نہیں۔" وہ سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آسمان گھورنے لگا۔ "پتا ہوتا تو کھرچ کھرچ کر مٹا دیتا اس کو۔"

"سکندر! تو کچھ چھپا رہا ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں!"

"بتائے گا نہیں؟"

"نہیں!"

"مجھے بھی نہیں؟" اے بی سی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں "یاد کر میں..... وہی ہوں۔"

"کون؟"

"وہی!" اے بی سی شرارت سے مسکرایا۔ "ماں، آستین، دوست کے روپ میں دشمن، بھیڑ کے روپ میں بھیڑیا۔ بھول گیا مجھے؟"

جواباً" وہ خاموش بیٹھا چائے کے گھونٹ بھرتا رہا۔

"سکندر! تیری خاموشی مجھے پاگل کردے گی۔" اس نے جھنجلا کر کپ پٹخا۔

"اللہ بخش۔" سکندر نے کپ رکھا۔ "جب ہر طرف بادل چھائے ہوئے ہوں۔ گھٹا پھیلی ہو۔ ہوا چلتی ہو اور پانی کی ایک بوند نہ برسے تو دم گھٹتا ہے نا؟"

"ہاں گھٹتا ہے۔"

"میرا دم بھی گھٹ رہا ہے!" اس نے سر ٹکا کر آنکھیں بند کیں۔

"تو برس جا میرے یار۔ جی پھر کر برس جا۔ دل ایک دم صاف ہو جائے گا۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں چاہتا ہوں میں یونہی گھٹتا ہوں۔ ساری زندگی میرے اندر دھواں بھرا رہے۔ اندر یونہی آگ سلگتی رہے۔"

"کیوں آخر؟ کس جرم کی سزا ہے یہ؟ کیا کیا ہے تو نے؟" وہ چڑ کر بولا۔ "بول سکندر! ورنہ میں تیرا خون کردوں گا۔"

"احسان کرے گا میرے دوست۔"

"ٹھیک ہے۔" اے بی سی کھڑا ہوا۔ "تو یوں مانے گا نہیں۔ میں رات کو پھر آؤں گا تانیہ کے ساتھ۔"

"تانیہ۔" دل پر ایک گھونسا سا لگا۔

"ہاں۔ اس کو تو بتائے گا نا۔"

"اے بی سی!" وہ اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ "تجھے دوستی کی قسم ہے، دوست۔ تجھے میری دوستی کی قسم ہے، مت لانا۔" وہ اس سے لپٹ کر ہانپنے لگا۔ "پلیز میں ہاتھوں پکڑتا ہوں تیرے۔"

"سکندر..... سکندر!" اللہ بخش نے اسے گلے لگا لیا۔ "نہیں لاؤں گا میرے دوست نہیں لاؤں گا۔" دو آنسو چپکے سے اس کی آنکھوں سے نکلے۔ خود اس کا اپنا دل بھی بھیگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کمرے کی کھڑکی میں کھڑا وہ دور آسمان کی وسعتوں کو گھور رہا تھا۔ نیلگوں آسمان پر نظر جمائے خالی الذہنی جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

"بے رنگ، بے نور زندگی!" وہ ہولے سے بڑبڑایا۔ "کہاں گئے سارے رنگ؟ کس لمحے نے چرا لیے؟"

گہرا سانس لے کر اس نے نظر سڑک پر ڈالی اور بری طرح چونکا۔ ہاں وہی تھی! زرد رنگ کے کاٹن کے کپڑے میں لیدر بیگ کاندھے پر لٹکائے وہ آہستہ آہستہ گلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ لپک کر کھڑکی کی طرف ہو گیا۔ پھر دوڑتا ہوا دروازے تک آیا۔

"فضلو، فضلو۔" اس نے باہر جھانک کر زور سے آواز دی۔

"جی صاحب جی!" فضلو گھبرا کر دوڑتا ہوا آیا۔

"بات سنو۔ باہر جو بی بی آئی ہیں نا، ان سے کہنا میں گھر پر نہیں ہوں۔ بابا اور بی بی کو بتا دینا کہ میں نے منع کیا ہے۔ سمجھے؟"

"جی اچھا صاحب!"

"جاؤ جلدی جاؤ۔ دوڑو۔" وہ ہاتھ ملتا ہوا پھر کھڑکی تک آیا۔

اس نے کال بیل بجائی تھی۔ کال بیل کی آواز نے جیسے اس کے دل کے تاروں کو چھوا۔ ذرا سا منہ نکال کر وہ اسے دیکھنے لگا۔ مانوس نقوش اس کے سارے وجود میں ہلچل مچانے لگے۔ جی چاہا کہ دوڑتا ہوا جائے اور اسے اندر لے آئے۔ اس سے دل بھر کر باتیں کرے۔ اسے سامنے بٹھا کر گھنٹوں تکے۔ وہ فضلو بابا سے بات کر رہی تھی۔ پھر مایوس ہو کر واپس مڑی تو سکندر کا دل جیسے اس کے ساتھ جانے لگا۔ رگیں کھنچنے لگیں۔

"تانی!" اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ "آئی ایم سوری..... آئی ایم سوری۔"

☆ ☆ ☆

بادل زور سے گرج رہے تھے۔ بوندیں کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا کر ٹن ٹناٹن کی مسلسل آواز پیدا کر رہی تھیں۔ بستر پر لیٹے لیٹے اس نے پہلو بدلا۔

"چرر..... چرر..... رر..... دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر دھڑ سے دروازہ بند ہوا۔

"خزینہ۔" اس کا پورا بدن کانپا۔ "رک جاؤ۔ رکو تو سہی۔ میری بات سنو۔ دیکھو روؤ نہیں۔ پلیز پلیز رک جاؤ خزینہ! آگے کھائی ہے۔ گر جاؤ گی۔ بات سنو میری خطائیں بخشتی جاؤ۔ دیکھو یوں مت جاؤ۔ ایک مرتبہ کہہ جاؤ کہ تم نے معاف کیا۔ دیکھو گر جاؤ گی۔ تانی!" اس نے چیخ ماری اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

"یہی ہو رہا تھا! پچھلے دو مہینے سے یہی ہو رہا تھا۔ وہ سو نہیں سکتا تھا۔ سلیپنگ پلز کھا کر بھی اسے نیند نہیں آتی تھی۔ ساری رات بستر پر لیٹا چھت کو گھورتا رہتا اور اگر کسی رات اتفاقاً" نیند کی دیوی مہربان ہو بھی جاتی تو چند لمحوں کے لیے۔ اس کے بعد اس کے دماغ کی ریل پر فلم سی چلنے لگتی۔ خزینہ اسے ہواؤں میں تیرتی نظر آتی۔ گہری کھائیوں میں ڈوبتی نظر آتی اور پھر اچانک اسے تانی نظر آتی۔ خون میں ڈوبی ہوئی تانی۔ سراپا زخم زخم! اور پھر وہ یوں ہی چیخ مار کر اٹھ جاتا۔ اگلی کئی راتیں جاگنے کے لیے وہ ایک لمحہ جو اس کے نفس پر غالب آیا تھا۔ وہ ایک لمحہ جب اس کے اندر کا شیطان جاگا تھا۔ وہ ایک لمحہ اس کی ساری زندگی کا پچھتاوا بن گیا۔ احساس جرم کی آکاس بیل بن کر اس

کے وجود سے لپٹ گیا تھا اور وہ خود کو چھڑا نہیں پا تا تھا۔

"خزینہ!" اس نے ہولے سے سرگوشی کی۔

"نادانی میں جو خطا ہوئی ہے اس کی سزا بہت کڑی ہے۔ میں سمجھ نہیں پاتا ہوں خزینہ! تھک گیا ہوں۔ مجھے تھوڑی نیند، تھوڑا سکون چاہیے۔ میں پھر آؤں گا تمہارے پاس۔ تمہیں اپنانے۔ میری تھوڑی سی سزا بانٹ لینا۔ تھوڑی سی سزا بانٹ لینا۔ جواب میں مجھ گنہگار کو اپنا لینا۔ پلیز!"

☼ ☼ ☼

"تو بتائے بغیر نہیں جا سکتا۔" اس نے میز پر مکا مارا۔

"میں جلدی آجاؤں گا۔" سکندر نے جیب میں بٹوا اڑسا۔

"لیکن آخر تو جا کہاں رہا ہے؟" وہ زچ ہوا۔

"آؤں گا تو تو خود ہی جان لے گا۔" اس نے جوتے اپنی جانب کھسکائے۔

"سکندر! خدا کی قسم تجھ سا دوست اس دنیا میں کسی اور کو ملا ہوتا نا تو وہ اب تک یا تو خودکشی کر چکا ہوتا یا قتل کر چکا ہوتا۔ ایمان سے تو تو دوست کے روپ میں دشمن بلکہ انتہائی گھٹیا دشمن ہے۔ ارے دشمن کو بھی اتنے سسپنس سے نہیں مارتے۔"

"تو جاننا چاہتا ہے میں کہاں جا رہا ہوں۔" اس نے ہاتھ روک کر بغور اسے دیکھا۔

"ہاں، ہاں، ہاں۔" وہ چیخا "کتنی مرتبہ ہاں کہوں قاضی صاحب نے بھی تیسری بار پر یقین کر ہی لیا تھا۔"

"اچھا سن۔" وہ ایک لمحے کو رکا۔ "میں شادی کرنے جا رہا ہوں۔"

"شادی؟" اے بی سی بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں شادی۔" اس نے دوبارہ جاتے پہننے شروع کیے۔

"لیکن کس سے؟" وہ چیخا۔

"چیخ مت اے بی سی۔ ایک پہاڑی لڑکی ہے خزینہ۔"

"اور وہ تانیہ؟ یاد رکھنا سکندر! وہ تیری دوسری بیوی بننا ہرگز پسند نہیں کرے گی۔"

"میں تانیہ سے شادی نہیں کروں گا۔"

"کیا؟ شادی نہیں کرے گا اس سے۔ سکندر تو تو اتنا فلرٹ شخص ہے؟ اتنا دھوکے باز؟ آئی ڈونٹ بلیو!"

"کچھ بھی سمجھ لے۔ میں بہرحال اس سے شادی نہیں کروں گا اور پھر کیا ہے تانیہ میں؟ نہ حسن، نہ دولت، نہ سیرت۔ خزینہ کو دیکھے گا۔ تو پلک نہیں جھپکائے گا۔" سکندر نے دل سے اختری میس کو دبایا۔

"واہ سکندر صاحب واہ۔ بے وقوف بنائیے کسی اور کو۔" اے بی سی نے تالیاں پیٹیں۔

"میں تجھے جب سے جانتا ہوں جب تیرے دودھ کے دانت سلامت تھے۔"

"خدا کو مان اے بی سی۔" اس نے ہاتھ جوڑے۔ "چھوڑ دے میرا پیچھا۔"

اللہ بخش نے کچھ کہنے کو منہ کھولا پر اندر آتے فضلو کو دیکھ کر سختی سے لب بھینچ لیے۔

"صاحب جی! کوئی آدمی آیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"میں کسی سے نہیں مل سکتا اس وقت۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "کہہ دو صاحب کام سے گئے ہیں چار پانچ روز کے لیے۔"

"اچھا!" فضلو مڑا۔ "وہ لمبے صاحب بڑا غریب آدمی لگتا ہے۔ بڑی دور سے آیا ہے۔ سخت پریشان ہے۔"

"اوہ فضلو! مجھ سے زیادہ پریشان نہیں ہو گا وہ۔ کچھ مالی مدد چاہیے ہو گی۔ کہہ دو شام کو بابا سے بات کرے۔ میری فلائیٹ مس ہو جائے گی۔"

"دیکھو فضلو!" اللہ بخش نے اسے پکارا۔ "کچھ پیسے وغیرہ چاہیے ہوں تو مجھ سے لے جانا!"

"ایسا آدمی نہیں لگتا صاحب۔ کہتا ہے وہ سکندر صاحب کو جانتا ہے۔ شیر دل نام بتاتا ہے۔"

"شیر دل!" سکندر یوں اچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ "تو باہر کیوں کھڑا رکھا ہے۔ بلاؤ اس کو، جلدی بلاؤ

میں آتا ہوں۔"

اللہ بخش نے حیرانی سے دیدے پٹ پٹائے۔ وہ اس کو یوں ہی چھوڑ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"سلام صاحب جی۔" شیر دل نے اسے دیکھتے ہی سلام کیا۔ جانے کیوں اس کے مسامات سے پسینہ پھوٹ نکلا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ بے حد ہولے سے بولا۔ "کیسے ہو شیر دل؟"

"بس صاب! جی رہا ہوں۔"

"بیٹھو، کھڑے کیوں ہو؟" شیر دل کو دیکھتے ہی سارے احساسات پھر سے حملہ آور ہونے لگے۔

"صاب! ابھی آپ کہے گا۔ اتنے عرصے بعد شیر دل آیا بھی تو اپنے کام سے آیا۔" وہ شرمندہ شرمندہ لگ رہا تھا۔

"نہیں نہیں۔ ایسا مت کہو شیر دل! یقین کرو، تمہارا کام کرنے سے مجھے جو خوشی ملے گی، وہ ہفت اقلیم کی دولت پا کر بھی نہیں مل سکتی۔"

شیر دل نے اس پذیرائی پر حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔ بھائی کی آنکھیں ان کی آنکھوں سے حد درجہ مشابہ تھیں۔

"صاب! ہمارے خاندان نے برسوں سے آپ کا نمک کھایا ہے۔"

"پلیز شیر دل!" اس نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹی "چھوڑو ان فضول باتوں کو۔ تم بتاؤ کیا پریشانی ہے؟"

"صاب!" اس نے ہاتھ مسلے۔ "ابھی آپ ام کو یہیں تو کرر کھ لو اپنے بنگلے پہ۔"

"کیوں؟" اسے حیرانی ہوئی۔

"بس صاب! ام اپنے گاؤں کو چھوڑ آیا ہے ہمیشہ کے لیے۔"

"لیکن کیوں شیر دل؟ جس مٹی سے تمہاری جڑیں وابستہ ہیں، اسی کو چھوڑ آئے۔"

"بس صاب!" اس کی آواز بھرائی۔ "اور کیا رکھا ہے اب! نہ ماں رہی نہ بہن۔" اس نے گہرا سانس کھینچا اور سکندر کا سانس چلتے چلتے رک گیا۔

"کک... کیا ہوا انہیں؟"

"بس صاب۔ بوہت بیمار تھی ماں پہلے بھی۔ فر خزینہ کا دکھ مار گیا اسے۔ وہ بھی چھوڑ گئی ام کو تنہا۔ اکیلا۔" شیر دل بہت دکھی ہو رہا تھا۔

"خزینہ۔" اس کا سانس گولہ بن کر حلق میں اٹک گیا "کیا ہوا اسے؟"

"معلوم نہیں صاب! گیا روگ لگ گیا تھا اسے۔ راتوں کو چیختی تھی، بستر سے اٹھ کر بھاگتی تھی۔ سب کہتے تھے جن آگیا ہے اس پر۔ چھوڑ دو، چھوڑ دو۔ چیختی تھی۔ کبھی روتی تھی، کبھی ہنستی تھی۔ فروہ دلبر خان کی ماں نے اس کا منگنی توڑ دیا۔ بس اسی رات وہ غائب ہو گئی۔ دروازہ کھول کر نکل گئی تھی۔ صاب طوفان آیا تھا اس رات۔ نالہ چڑھا ہوا تھا۔ کوئی کہتا ہے نالے کی طرف گئی تھی۔ کوئی بولا، جنگل کی طرف گئی تھی۔ فرنئیں لوٹ کر آئی صاب!" وہ چہرا ہاتھوں سے ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ "ابھی سب کہتا ہے اس کا روح نظر آتا ہے۔ کبھی نالے پر نظر آتا ہے۔ کبھی جنگل میں نظر آتا ہے۔ ام تو بوت ڈھونڈا صاب۔ آدھی آدھی رات کو جنگل میں گیا، پہاڑوں پر پھرا، پر ام کو نئیں ملا وہ۔ کبھی نئیں دکھا۔"

وہ ساکت بیٹھا میز کو گھورتا رہا۔ اس کا رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"شیر دل!" اس کے لب کپکپا کر رہ گئے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی نہ کہہ سکا کہ تمہارا گنہگار میں ہوں۔ مجھے قتل کر دو شیر دل۔ میری بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کو کھلا دو۔ میرے رونیں رونیں سے اپنی معصوم بہن کی عزت کا، اس کی زندگی کا حساب طلب کرو۔ وہ کہنا چاہتا تھا لیکن ہونٹ صرف کانپ کر رہ جاتے۔ الفاظ ہونٹوں تک آکر دم توڑ دیتے تھے۔ اپنا آپ کھول دینا خود کو یوں بے نقاب کرنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ یہ اس نے آج جانا تھا۔

"جانے کس کا نظر لگا میری بہن کو صاب!" شیر دل بول رہا تھا۔ "خدا نے چاہا تو اس کا زندگی برباد ہو گا۔

جیسے ام اکیلا رہ گیا ہے ناصاب! ایسے ہی وہ تنہا ہو جائے گا۔ اللہ نے چاہا تو۔"

اس کی روح کانپ اٹھی۔ خون میں بھرا تانیہ کا وجود اس کی نگاہوں میں گھوما۔

"صاب!" شیر دل اچانک اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"آپ کا طبیعت ٹھیک نہیں نظر آتا۔ ابھی آپ کا نمونیہ کیسا ہے؟"

"شیر دل۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی تم مہمان خانے میں رکو شام۔ شام کو بات کریں گے۔ اچھا!"

"اچھا صاب۔"

"فضلو۔" اس نے بدقت تمام فضلو کو ہدایات دیں اور اپنے کمرے میں آگیا۔ اللہ بخش نے بغور اس کا معائنہ کیا۔

"کیا بات ہے؟ زرد کیوں ہو گیا اچانک؟" وہ اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ "تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

"کیا ہوا ہے سکندر؟ کون ہے یہ شیر دل؟ کیا کہا ہے اس نے تجھے؟"

وہ چپ آنکھیں موندے پڑا رہا۔ اللہ بخش کسی وفا شعار بیوی کی طرح اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

"ٹرن..... ٹرن۔" فون کی بیل بجی تو وہ زور سے اچھلا۔

"ٹیک اٹ ایزی سکندر!" اے بی سی نرمی سے بولا

"فون ہے۔ میں سنتا ہوں۔" وہ اٹھ کر فون تک گیا۔

"ہیلو۔" اس نے ریسیور اٹھایا۔ "جی..... جی ہاں..... جی؟" اس کے لہجے میں کوئی بات تھی۔ سکندر نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

"اچھا جی ٹھیک ہے۔ پہنچتا ہوں۔" اے بی سی نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا اور ریسیور رکھ دیا۔

"کس کا فون تھا؟"

"وہ۔" اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ "وہ سکندر! رانگ نمبر تھا۔"

"رانگ نمبر؟" وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا۔ "رانگ نمبر پر ایسے بات کرتے ہیں۔" اس نے اللہ بخش کو جھنجھوڑا۔ "بتا اے بی سی کس کا فون تھا۔"

"سکندر میرے یار! حوصلہ رکھ۔ اسپتال سے فون تھا ایکس۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے انکل آنٹی کی کار کا۔ ویسے فکر کی بات نہیں ہے۔ میں جاتا ہوں۔ کوئی سیریس بات ہوئی خدانخواستہ تو فون کر دوں گا۔ تو، بن پر مت لینا اچھا؟" وہ بے جان جسم کے ساتھ صوفے پر گر پڑا۔

"جانے کس کا نظر لگا میری بہن کو صاب۔" کانوں میں شیر دل کی آواز گونج رہی تھی۔ "اللہ نے چاہا تو اس کا زندگی برباد ہو گا۔ جیسے ام اکیلا رہ گیا ہے نا۔ ایسے ہی وہ تنہا ہو جائے گا۔"

"نو..... نو۔" وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخا۔ "میرے گناہوں کی سزا کسی کو مت دو۔ میری بی بی کو بچا لینا خدا میری بی بی کو بچا لینا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

☼ ☼ ☼

"کہاں جائے گا سکندر؟ کیا کرے گا؟ کچھ تو بتا یار!"

"بس اللہ بخش! کہیں بھی چلا جاؤں گا لیکن یہاں نہیں رہ سکتا میں۔ ورنہ پاگل ہو جاؤں گا۔" اس نے سر تھاما۔ "میرا وجود اندر سے ہل رہا ہے۔ سڑتا جا رہا ہوں۔ ختم ہو رہا ہوں۔"

"حوصلہ کیوں ہارتا ہے میرے دوست!" اللہ بخش آواز بھرائی۔

"اب اور کیا ہے میرے پاس ہارنے کو۔" وہ دکھ سے ہنسا "سب کچھ تو ہار گیا ہوں۔"

"سکندر! انکل آنٹی کی روحیں پکاریں گی تجھے! ڈھونڈیں گی۔ اپنا گھر، اپنا شہر مت چھوڑ۔ دیکھ ہم سب اکیلے رہ جائیں گے۔"

"کسی کی روح ہی تو پکار رہی ہے۔" وہ جیسے خوابوں میں بولا۔ "بددعائیں دے رہی ہے۔ مجھے پتا تھا اللہ

بخش! ہو گا ضرور۔ کچھ چھن جائے گا مجھ سے۔ مجھے [illegible]"

"سکندر!" اللہ بخش گھوم کر اس کے پاس آیا۔ "آج بتا دے دوست، آج دل کھول کر رکھ دے اپنا دکھ بوجھ کم کر لے۔ کچھ تو بتا؟"

"کیا بتاؤں اللہ بخش۔ بڑا مشکل ہے یوں اپنے آپ کو کھولنا۔ یوں اپنی ذات کو بے آبرو کرنا۔ پر تجھے ضد ہے تو سن!" اس نے گہرا سانس لیا۔ "سن اللہ بخش میں نے..... میں نے زندگی تباہ کر دی ہے کسی معصوم کی۔" اللہ بخش نے اس کے کاندھے کے پیچھے سے تانیہ کا چہرہ طلوع ہوتے دیکھا۔

"سکندر!" اس نے لب کھولے۔

"ہاں اللہ بخش میں گنہگار ہوں۔ میں نے ایک معصوم لڑکی کو برباد کر دیا۔ وہ مقدس تھی۔ چاندنی کی طرح۔ میں نے میلا کر دیا اسے۔ اس نے جان دے دی اپنی۔" وہ زور زور سے رونے لگا۔

"سکندر! تانیہ۔" اللہ بخش نے بے بسی سے پیچھے کھڑی تانیہ کو دیکھا۔

"تانیہ کو کچھ مت بتانا اللہ بخش۔ تجھے قسم ہے۔ وہ مر جائے گی۔ وہ مر جائے گی۔ میرے اس گناہ کے بوجھ کو سہہ نہیں سکے گی وہ۔ اسی لیے میں اس کا سامنا نہیں کرتا۔ اس سے ملتا نہیں ہوں۔ جانتا ہوں میرے وجود کی ہلکی سی پرچھائیں بھی پڑی اس پر تو جل جائے گی وہ۔"

"سکندر..... چپ ہو جا!" اللہ بخش بے بسی سے چلایا تو سکندر نے اپنا جھکا ہوا سر حیرانی سے اٹھا کر اسے دیکھا۔ اللہ بخش لاچاری کی تصویر بنا تانیہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بجلی کی طرح گھوما۔

"تانی!" اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تو پتھر کے بت میں جیسے جان پڑی۔ اس کی غم و غصے سے پھٹی آنکھوں سے دو آنسو گرے اور وہ پلٹ کر واپس بھاگی۔

"تانی۔" وہ اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ لیکن وہ جیسے..... اندھی اور بہری ہو چکی تھی۔ دیوانہ وار ہر چیز سے ٹکراتی وہ کلینک سے باہر نکل گئی۔

"تانیہ! بات سنو۔" اسے آوازیں دیتا وہ گیٹ تک آیا۔ اللہ بخش کا کلینک ایک مصروف شاہراہ پر تھا۔ ٹریفک کا بے پناہ ہجوم تھا۔ لیکن وہ پاگلوں کی طرح دوڑتی چلی گئی۔

"تانیہ!" وہ حلق پھاڑ کر چلایا تھا۔ ٹرک کو اس نے اپنی آنکھوں سے تانی پر سے گزرتے دیکھا تھا۔

اسے خبر نہیں تھی کہ تانیہ زندہ بھی ہے کہ نہیں۔ وہ اسے موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا چھوڑ آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مر جائے گی اور وہ اسے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے وہ چلا آیا تھا۔ اس سے ملے بغیر۔ اس کو دیکھے بغیر۔ وہ چاہتا تھا کم از کم ایک امید، ایک آسرا تو رہے ساری زندگی اس کے دل کو۔ وہ خود کو فریب ہی دیتا رہے کہ شاید وہ بچ گئی ہو۔ زندہ ہو۔ اسے سوچتی ہو۔ اسے یاد کرتی ہو۔

اور اب پچھلے ڈیڑھ برس سے وہ دیوانہ وار ان وادیوں میں گھومتا تھا جہاں خزینہ کے نقش پا تھے۔ پہاڑی لوگ کہتے تھے، وہ اکثر نظر آتی ہے۔ راتوں کو جنگل کی طرف جاتی ہوئی۔ سورج غروب ہوتے وقت نالے پر بیٹھی ہوئی یا پہاڑیوں پر چلتی ہوئی اور وہ پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتا تھا۔ ساری ساری رات سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا وہ جنگل میں بھٹکتا رہتا۔

گل خان بڑی مشکلوں سے اسے ڈھونڈ کر لاتا۔

"صاب کس کو ڈھونڈتا ہے آپ؟" کبھی وہ اس کے خبطی پن پر چڑ کر پوچھتا۔

"صدیوں پہلے زندگی سے ایک لمحہ گر گیا تھا گل خان۔ مرضی کے بغیر، نادانستہ پھسل گیا تھا میرے ہاتھوں سے۔ اسی کو کھوجتا ہوں۔ سنا ہے گم شدہ چیزیں جہاں پر کھوئی جاتی ہیں وہیں پہ مل بھی جاتی ہیں۔"

گل خان ٹکر ٹکر اس کو گھورتا رہتا۔

کبھی کہتا۔ "گل خان! ایک امید سی ہے کہ شاید زندگی جیتی ہو کہیں۔ میرا انتظار کرتی ہو۔ بس اسی تک پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"خزینہ! ایک مرتبہ مل جاؤ مجھے تو تم سے اپنی تانی کی زندگی کی بھیک مانگوں گا۔ مجھے جو سزا چاہے دے لینا پر

میری تانی۔ اسے سلامت رہنا چاہیے۔ اسے سلامت رہنا چاہیے۔"

وہ اپنے خیالوں میں مگن تھا۔ تب ہی اس پہاڑی لڑکی کو نہ دیکھ سکا جو دروازے کے پاس سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ چونکا تب جب اس نے اٹھ کر سلام داغا۔

"سلام صاب!"

اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی اور ایک لمحے کو اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

"خزینہ!"

"ام سبینہ صاب!" وہ مسکرائی۔ "گل خان کا بہن۔"

وہ ایک ٹک کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

"ایسے کیا دیکھتا ہے آپ؟" وہ شرمائی۔

"آں! کچھ نہیں۔" اس نے ہتھیلی سے ماتھے کا پسینا پونچھا۔ وہ خزینہ نہیں تھی لیکن اس سے کافی مشابہ تھی۔

"ام کھانا لایا ہے صاب! لالہ کام سے شہر گیا ہے۔ دو دن کھانا ام لائے گا۔ صفائی بھی ام کرے گا۔" وہ پٹر پٹر بولتی تھی۔

"اچھا لاؤ۔ دے دو مجھے۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

"آپ کا بوت باتیں سنا تھا پر دیکھا پہلی بار ہے۔"

"کس سے سنی تھیں میری باتیں؟" وہ ہولے سے مسکرایا اور جیب سے چابی نکال کر تالا کھولنے لگا۔

"میری سب سہیلیاں آپ کو دیکھی ہیں صاب۔" وہ شرارتی سے مسکرائی۔ "سب بوت تعریفیں کرتا آپ کا۔ وہ پشینہ تو دیوانا ہے آپ کا۔"

وہ ایک لمحے کو رکا۔ مڑ کر اسے دیکھا۔

"اور تم!"

"ام؟" وہ گھبرائی۔ "امارا تو منگنی بھی ہو گیا ہے صاب۔" وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

"ام اندر آجائے صاب۔ صفائی کرنی ہے۔"

"نہیں۔" اس نے صاف انکار کیا۔ "میں خود کر لوں گا۔" سبینہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزرا۔

"لالہ ناراض ہو گا ام پر!" وہ ہولے سے بولی۔

"میں کہہ دوں گا گل خان سے۔"

"ام چور نئیں ہے صاب۔" وہ شاید خفا ہو کر بولی تھی۔

"مجھے معلوم ہے۔" وہ سختی سے بولا۔ "لیکن تم مجھے نہیں جانتیں۔ میں ڈاکو ہوں۔" اس نے دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ حیرانی سے کھڑی بند دروازہ تکتی رہی۔

☆ ☆ ☆

گل خان دوسرے دن لوٹ آیا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ بے حد پریشان ہے۔

"گل خان! کیا بات ہے؟" وہ اس کے سامنے کھانا رکھ رہا تھا تو اس نے ہولے سے پوچھا۔

"کیسا بات صاب؟"

"پریشان ہو ہونا؟"

"جی صاب!" وہ ہولے سے بولا۔ "پریشان تو بوت اے ام۔"

"کیوں؟ کیا ہوا ہے؟"

"صاب!" اس نے گہرا سانس لیا۔ "امارا بہن ہے نا۔ سبینہ۔ اس کا شادی کرنا ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ پیسے چاہئیں؟"

"نئیں صاب نئیں۔ پیسوں کا بات نہیں ہے۔" وہ شرمندہ ہو کر جلدی سے بولا۔

"پھر کیا بات ہے بتاؤ۔ شاید میں کچھ کام آسکوں تمہارے۔"

"صاب وہ۔" وہ ہچکچایا۔ "بات بوت پرانی ہے۔ ام نے دو برس پہلے سبینہ کا بات طے کیا تھا اپنی مرضی سے۔"

"تو پھر؟"

"فرصاب۔ سبینہ کو یہ بات اچھا نہیں لگا۔ وہ دلاور کو پسند کرتی تھی۔ وہ بہت روئی۔ ام سے لڑی۔ امارا تو ایک ہی بہن ہے نا صاب! اسی کی خوشی پیاری ہے ہم کو۔ ام نے اس کا بات توڑ کر دلاور سے منگنی کر دیا اس کی۔ بس صاب! اس پر وہ لوگ خفا ہو گئے۔ دھمکیاں

دینے لگے۔ ابھی اس کا شادی کی تاریخ طے کیا تو انہوں نے کہلایا کہ ام انتظام کر لے اپنا۔ ام بوت غریب آدمی صاب۔ ان لوگوں کا ٹکر کا نہیں۔ بس اسی سے پریشان ہے۔"

"کیوں ڈرتے ہو گل خان۔ سب سے بڑی ذات تو اللہ کی ہے۔ اسی پر بھروسا رکھو۔" اس نے گل خان کو تسلی دی۔

"کب ہے شادی سبینہ کی؟"

"دو دن بعد ہے صاب۔" وہ مسکرایا۔

"آپ بھی آنا۔"

"ضرور آؤں گا۔" وہ بھی مسکرایا۔

☆ ☆ ☆

رات کی خموشی میں کوئی تارا چونکا ہے
دل کی ویراں بستی سے ہائے کبھی وہ گزرا ہے
کبھی سا سایہ ہے اور کشمکش مدھم ہیں
اک ہے اور یقیں بھی ہے دونوں رستے باہم ہیں
کبھی ذرا رک جا، ایک بات سنتا جا
اگر وہی ہے تو یہ جنوں ختم ہو لے
اگر کچھ وہ نہ بھی ہو پھر بھی بوجھ کم ہو لے
رات کچھ پگھل جائے، یہ اداسی ڈھل جائے
اس پہاڑ پنجر سے ایک روح نکل جائے
کہ ہزار صدیوں سے اک گناہ روشن ہے
روح سراپا بوجھل ہے اور ضمیر درپن ہے
جسم کی اک اک تہہ میں اک الاؤ جلتا ہے
جو نہ برف ہوتا ہے، اور نہ راکھ کرتا ہے
اک اپاہج جیون ہے اور نفس کی بیساکھی
بات تلخے بھر کی تھی اور سزا عمر بھر کی

وہ حسب عادت آدھی رات کو جنگل میں چل رہا تھا۔ چاند کی چودہ تاریخ تھی۔ جنگل پر ایک پراسرار لیکن خوب صورت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر شے چاندنی میں نہائی ایک عجیب سے نشے میں مدہوش کھڑی لگتی تھی۔

لیکن وہ کسی شے کی خوب صورتی کی طرف متوجہ نہ

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

☆ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔
☆ نئے بال اگاتا ہے۔
☆ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
☆ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
☆ ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سوہنی ہیئر آئل قیمت =/80 روپے

12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہٰذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف =/70 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

1 بوتل کے لئے ---------- =/100 روپے
2 بوتلوں کے لئے ---------- =/180 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- =/270 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

تھا۔ اسی خالی الذہنی کی حالت میں بس سوکھے پتوں کو روندتا چل رہا تھا۔

رات۔ پرسکون اور پرکشش نیند کا تصور۔ کوسوں دور میری دسترس سے۔ سزا کی کوئی حد مقرر ہو۔ کوئی معیار ہو۔ دل پر یہ بے چینی تو طاری نہ ہو۔ کیا مرنا بھی اس قدر ہی مشکل ہوتا ہوگا جتنا کہ جینا؟

آہ کس آسمان تک پہنچی تھی تمہاری بددعا خزینہ، جہاں تک میری توبہ کی رسائی نہیں ہوتی!

کس طرح کانپے ہوں گے زمین و آسمان کہ اب تک میرا وجود ڈگمگاتا ہے۔ سانس لڑکھڑاتی ہے۔ ہر شے ڈولتی نظر آتی ہے۔ خدارا اب سزا ختم کرو۔ اب سزا ختم کرو۔"

اچانک ہی ایک دل خراش چیخ نے جنگل کی خاموشی کو چیر اتھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ اسے اندازہ نہ ہوا کہ ایک لمحہ قبل اس کے کان بجے تھے یا واقعی جنگل گونجا تھا۔

"آ۔۔۔ آ۔۔۔ بچاؤ۔" کسی لڑکی کی آواز تھی اور اب بے حد قریب سے آئی تھی۔ وہ بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"لالہ۔۔۔ لالہ۔۔۔ چھوڑو مجھے!" لڑکی رو رہی تھی اچانک ہی سارا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔

وہ تعداد میں تین تھے اور ایک لڑکی کو بے دردی سے زمین پر گھسیٹتے ہوئے لا رہے تھے۔

"جب تک تیرا لالہ یہاں پہنچے گا، تیری بوٹیاں پورے جنگل میں پھیل گئی ہوں گی۔" ان میں سے ایک غرایا۔

"کون ہو تم لوگ؟" سکندر زور سے چلایا۔ وہ سب بیک وقت اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ لڑکی بجلی کی سی پھرتی سے اس تک پہنچی۔

"صاب!" وہ اس کی پشت کے پیچھے ہوگئی۔ "ام کو بچالو صاب۔"

"اوئے پردیسی!" ان میں سے ایک غرایا۔ "موت کو جان بوجھ کر گلے مت لگا۔ چھوڑ دے لڑکی کو۔"

"کیا دشمنی ہے اس معصوم لڑکی سے تمہاری؟" وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

"ہماری دشمنی ام تک ہی رہنے دو۔ سارا جھگڑا خبیث لڑکی کا ہے۔"

"سنو سبینہ!" اس نے ہولے سے سرگوشی کی "میں ان لوگوں کو روکتا ہوں۔ تم گھر تک پہنچ جاؤ گی نا؟"

"جج۔۔۔ جی!" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا جاؤ۔ کسی درخت کی اوٹ میں ہو جاؤ۔"

"پردیسی!" ان میں سے ایک چلایا۔ "لڑکی کو ادھر بھیج دو۔ ورنہ ام خود آتا ہے۔"

"لڑکی تک پہنچنا ہو تو میری لاش کو پھلانگنا۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا اور ان کی طرف بڑھنے لگا۔

چاند کی درختوں سے چھن کر آتی ہوئی روشنی میں تین بڑے پھل دار خنجر ایک ساتھ چمکے۔

"قاسم خان! اس کی تو موت آہی گئی ہے۔ تم لڑکی کو قابو میں کرو۔"

قاسم خان کا ارادہ بھانپ کر اس نے سب سے پہلے اسی پر چھلانگ لگائی۔ ایک آگ سی تھی جو اس کے پہلو میں اتری۔ ہونٹ سختی سے بھینچے وہ اس پر پل پڑا۔ اتنے دنوں سے دبا جنون، غصہ، احساس محرومی اچانک ہی ایک نئی طاقت بن کر ابھرا تھا۔ جو ڈکیت اس کی تربیت کام آئی تھی وہ اکیلا تھا اور نہتا تھا لیکن ان تین مسلح افراد پر بھاری پڑ رہا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے تک ان سے لڑتا رہا اور قسم کے ہر حصے پر گھاؤ سہتا رہا۔

اچانک ہی جنگل روشن ہونے لگا۔ روشنی کا ایک ریلہ سا ان کی طرف آرہا تھا۔

"اوئے قاسم۔ گاؤں والے آگئے ہیں۔" انہوں نے زمین پر بے حس و حرکت پڑے وجود کو ٹھوکریں ماریں اور جنگل کے اندرونی حصے کی طرف بھاگے۔

"صاب، صاب۔" سب سے آگے گل خان تھا جو اس سے لپٹ کر زار و قطار رو رہا تھا۔ "تم ہمارا بسن کا جان بچایا صاب۔ ام تم کو مرنے نہیں دے گا۔"

"خزینہ!" وہ نیم بے ہوشی میں بڑبڑا رہا تھا۔ "تم آ گئیں خزینہ!"

"سبینہ بالکل خیریت سے ہے۔" گل خان اس

کے چہرہ و بدن کو سنبھال رہا تھا۔

"مجھے معلوم تھا تم ایک دن آؤ گی۔ ضرور آؤ گی۔" اس کے لب مسلسل ہل رہے تھے۔ "آج ہر خطا بخش دیا۔ آج اس مردہ تن کو زندگی بخش جانا۔ خزینہ!"

☆ ☆ ☆

"تمہارا بے حد شکریہ گل خان۔ وہ اب خطرے سے باہر ہے۔" اللہ بخش نے گل خان کا کاندھا تھپکا۔

"صاب! شکریہ تو ام ادا کرے گا سکندر صاب کا۔ وہ نہ ہوتا احسان کیا ام پر۔ ام تو ساری زندگی بس دعائیں ہی دیتا رہے گا۔"

"اسے ضرورت بھی ہے۔" اے بی سی مسکرایا۔ "جاؤ تو اسے دیکھ سکتے ہو۔"

"جی صاب! جانے سے پہلے دیدار کر کے جائے گا۔" گل خان نے دانت نکالے۔ "ابھی ام چلتا ہے۔"

"خدا حافظ۔" وہ مڑ کر اندر کمرے میں آیا۔

تانیہ اس کا پٹیوں میں جکڑا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی مسلسل آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تا۔۔۔ تانی۔" اس نے خفیف سی آواز نکالی۔ "تم ناراض تو نہیں ہو نا؟" تانیہ نے نفی میں سر ہلایا اور اس نے جلدی جلدی جھپکائیں۔

"کیوں، کیوں ناراض نہیں ہو؟" اے بی سی نے ڈانٹا۔ "کہو اس سے کہ تم شدید ناراض ہو۔ صاب خدا کا یعنی اتنے سال بعد ملا بھی تو اپنے کام سے کہ میں اس کا علاج کروں مفت! لعنت ہے مجھ پر!"

"بس بھی کریں۔" دبا مسکرائی۔ "موقع دیکھتے ہیں نہ وقت بس ہو جاتے ہیں شروع۔"

"ارے ابھی تو لحاظ کر رہا ہوں میں اس کا۔ ذرا اس کو ٹھیک ہو لینے دو پھر دیکھنا۔ وہ تو شکر ہے کہ حضرت نے کبھی بھولے بھٹکے میرا نمبر لکھ لیا تھا ڈائری میں۔ ورنہ جو ٹریٹ منٹ ان کی ہو رہی تھی ناوہاں۔ اس سے چلے ہوتے اب تک نہیں۔"

"بڑے کام کا آدمی ہے گل خان!" دبا نے اعتراف میں سر ہلایا۔

"اب چپ ہو جاؤ۔ مجھے بھی کچھ بولنے دو۔" وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ "مجھے بہت سی باتیں کرنی ہیں اپنی تانی سے۔"

"بہت سی باتیں؟" اللہ بخش چلایا۔ "میں ایک جملے کی اجازت نہیں دوں گا۔ غضب خدا کا مجھ سے پوچھ، کس مشکل سے تیرا قیمہ سیا ہے میں نے۔" سکندر ہنس دیا لیکن تانیہ رونے لگی۔

"ارے تانیہ! چپ کرو۔" دبا نے اسے تھپکا۔ "جتنا رو چکی ہو نا اتنا کافی ہے۔"

"یہ لے!" اللہ بخش نے واک مین اس کی جانب بڑھایا۔ "تانی کو بھول جا اور علیشاہ کو سن۔ ابھی تیرے باتیں کرنے کے دن ہیں۔"

"خبردار!" تانی نے واک مین چھینا۔ "یہ نہیں بول سکتا تو میں تو بول سکتی ہوں نا۔ باتوں کا اسٹاک میرے پاس بھی ہے۔"

"اور میرے پاس گالیوں کا!" اے بی سی مسکرایا "لیکن اس سے پہلے کچھ سزاؤں کا اسٹاک ہے۔ چلو تانیہ! باہر نکلو۔ اس کے آرام کا وقت ہے۔"

"اے بی سی!" سکندر نے چیخنے کی کوشش کی۔

"شٹ اپ۔" وہ ہنسا۔ "چلو تانی! باہر نکلو۔"

"اے بی سی۔۔۔ تو۔۔۔ تو مار آستین ہے۔"

"رائٹ۔"

"تو۔۔۔ تو دشمن ہے دوست کے روپ میں!"

"رائٹ!"

"تو۔۔۔ بھیڑ کے روپ میں بھیڑیا، فاختہ کے روپ میں کوا ہے۔"

"رائٹ!"

"تانیہ یہیں رہے گی میرے پاس۔ بول رائٹ۔" جواب میں اے بی سی نے اس کے منہ میں تھرمامیٹر لگایا تھا۔

سونیہ نوید

ایک بیٹی ایسی بھی

مہ جبین نے سوکھے ہوئے ٹوسٹ کو کڑوی کسیلی چائے میں ڈبو کر نرم کیا اور پھر دانتوں سے کترا۔ صبح کے ناشتے کا بچا ہوا ٹوسٹ ربڑ بن کر دوبارہ گرم کی ہوئی چائے سے بھی زیادہ بدمزہ ہو چکا تھا' کھائے بنا چارہ اس لیے نہ تھا کہ مہ جبین بھوکے پیٹ دن بھر کے ڈھیروں کام نپٹانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

بھابھی کا موڈ صبح سویرے ہی نہ جانے کس بات پر آف تھا۔ بچوں کے روز کے فرمائشی پروگرام کو ڈیٹ کر رد کرتے ہوئے انہوں نے روزانہ کی نسبت آج مہ جبین سے خاصا مختصر ناشتا بنوایا تھا' جس میں سے بچوں کے کھا لینے کے بعد فقط ایک چائے کی پیالی اور بچا ہوا ڈبل روٹی کا سلائس ہی مہ جبین کے حصے آیا۔

(بچوں کے لیے بلا دریغ طرح طرح کے کھانے پکوانے والی بھابھی' مہ جبین اور ابا کے معاملے میں بہت تنگ نظر ہو جایا کرتی تھیں۔)

بہت عرصے سے مہ جبین کا شمار گھر کے ان لوگوں میں ہو چکا تھا' جن کے حصے میں بچے کھچے کھانے ہی آتے تھے۔ گزارا اس لیے ہو جاتا تھا کہ بھیا کی تینوں شیطان صفت اولادوں کو طرح طرح کے کھانے بنوا کر بہت کچھ چھوڑ دینے کی عادت تھی' یہ ہی بچی کھچی جھوٹن مل کر مہ جبین کا پیٹ بھرنے کا انتظام کر دیا کرتی تھی۔

"اپنے ہی بچے ہیں' ان کا چھوڑا ہم نہ کھائیں گے تو اور کون کھائے گا۔ ویسے بھی رزق کو ضائع کرنا اچھی بات نہیں۔"

ٹھنڈے' بدذائقہ ملغوبوں کو اپنے اندر اتارتی مہ جبین اکثر خود کو یہ کہہ کر تسلی دیا کرتی تھی۔

یہ جو ٹھن ہمیشہ سے مہ جبین کا نصیب نہیں تھی کبھی اس کے لیے بھی بطور خاص پکوان بنا کرتے تھے۔ اس کا پسندیدہ بھربھری ٹکیوں والا حلوہ تو اماں بہت چاؤ سے بنایا کرتی تھیں۔

حلوے تو گھر میں اب بھی بنتے تھے اور مہ جبین ہی بناتی تھی۔ مگر اب اس کا انہیں چکھنے کو بھی جی نہیں کرتا تھا۔ پتا نہیں کیوں انہیں دیکھ کر اماں اور ان کی بے لوث محبت کی یاد آ جاتی۔

اماں اپنے درد بھرے گھٹنے لے کر دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں اور ان کی جگہ گھریلو سلطنت کی حکمران بھابھی نے سنبھال لی تھی۔ گھر کی سربراہی تھی تو ایک نوکری ختم ہو جانے کے بعد خود بہ خود بھیا کے حصے میں آ گئی۔

تب سے سب کچھ بدل گیا۔

ابا اپنے بے کار وجود کے ساتھ ایک کونے میں ڈال دیے گئے' کیونکہ اب وہ گھر والوں کے لیے مہ جبین سے بھی زیادہ غیر اہم ہو چکے تھے۔ مہ جبین تو دن بھر کام میں جت کر پھر بھی اپنے ہونے کی افادیت کا احساس دلا دیا کرتی تھی' پر ابا اب گھر والوں کے لیے سوائے ایک بوجھ کے اور کچھ نہ رہے تھے۔

مہ جبین ناشتے کے برتن دھو کر رکھ رہی تھی' جب بھیا آفس جانے کے لیے تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلے۔

مہ جبین ادھ دھلے برتن وہیں سنک میں چھوڑ کر

دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی تیزی سے کچن سے باہر آئی اور دروازے کے پاس بھیا کو جالیا۔

مہ جبین کے یوں راستہ روکنے پر بھیا ٹھٹکے۔

"مجھے دفتر کے لیے دیر ہو رہی ہے' جو کچھ کہنا ہے میری واپسی پر کہہ لینا۔" بھیا نے روکھے سے لہجے میں کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی۔

مگر مہ جبین کا آج انہیں اپنی بات سنائے بنا جانے دینے کا ارادہ نہیں تھا۔ رہا ان کی ضرورت سے واپسی پر ان سے بات کرنے کا سوال' اس کا کوئی موقع ملنے کی امید ہوتی تو وہ انہیں صبح صبح کیوں پکڑتی؟

"ابا کی کھانسی بڑھتی جا رہی ہے۔ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔" اس نے بھیا سے کہا۔

"ہاں تو لے جاؤ نا۔ مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو۔" بھیا کی لاپروائی دیدنی تھی۔

"تھوڑے پیسے چاہیے تھے بھیا۔" مہ جبین نے جھجک کر کہا تو بھیا کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"دیکھو مہ جبین! تمہیں معلوم ہے کہ مہینے کا آخر ہے۔ میرے پاس ابھی پیسے نہیں ہیں۔ تنخواہ ملے گی تب دے دوں گا۔"

"تنخواہ ملنے میں تو ابھی بہت دن باقی ہیں بھیا! اور ابا کی کھانسی روز بروز بگڑتی جا رہی ہے۔ کل ساری رات جاگ کر کاٹی انہوں نے۔ اب تو کھانس کھانس کر ان کی پسلیاں بھی دکھنے لگی ہیں۔ سرکاری اسپتال لے جاؤں گی' زیادہ خرچہ نہیں آئے گا۔"

بھیا کے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھ کر مہ جبین نے کہا تو انہوں نے بادل نخواستہ جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"فی الحال اتنے ہی ہیں' اس میں گزارا کرو۔"

انہوں نے گنتی کے چند نوٹ مہ جبین کے ہاتھ میں تھمائے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" عقب سے آتی بھابھی کی پاٹ دار آواز پر بھیا اور مہ جبین دونوں ہی اچھلے۔

"ابا کی دوائی کے لیے پیسے دیے ہیں۔ علاج ضروری ہے' ورنہ حالت اور بگڑ جائے گی۔" بھیا نے گھگھیائے انداز میں بھابھی کو صفائی پیش کی' جو انتہائی جارحانہ نظروں سے انہیں گھور رہی تھیں۔

خلاف توقع بھابھی نے اعتراض نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی ابا کی اس جناتی کھانسی سے عاجز آئی ہوئی تھیں۔

ابا کی کھانسی بھی عجیب نوعیت کی تھی۔ دن میں پھر بھی آرام رہتا' مگر راتیں کھانستے گزرتی تھیں۔ بھابھی بے شک رات کو اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لینے کے بعد صبح ہونے سے پہلے اسے دوبارہ کھول کر باہر نکلنے کی زحمت نہیں کرتی تھیں' مگر ابا کے پھیپھڑوں سے نکلتی ہولناک کی قسم کی آوازوں سے نیند میں تو ان کی بھی خلل پڑتا تھا۔

بھیا تو بھابھی کی شعلہ بار نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے فوراً" دروازے سے باہر سٹک لیے اور مہ جبین بھی نوٹ دوپٹے کے پلو میں باندھتی پھر سے گندے برتنوں سے نپٹنے کچن میں چلی آئی۔

گھر کی صفائی سے لے کر دوپہر کا کھانا پکانے تک کا سارا کام مہ جبین نے دگنی پھرتی کے ساتھ نپٹایا' پھر بھی گھر سے نکلتے تک دس بج گئے۔

گھر کا دروازہ ٹاپتے سے بھابھی نے ایک اضافی ذمہ داری بھی ہاتھ میں تھمادی۔

"یہ مائرہ آپا کو پہنچا دینا۔ وہیں اسپتال کے پیچھے تو گھر ہے ان کا۔" بھابھی نے ایک تھیلا مہ جبین کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

مہ جبین ایک ہاتھ میں بھابھی کا دیا بڑا سا شاپر سنبھالے اور دوسرے ہاتھ سے ابا کا سفاری ایسے سواری کی تلاش میں مین روڈ تک آگئی۔

اسپتال میں مریضوں کی ایک لمبی لائن ان لوگوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی موجود تھی۔ مہ جبین بھی ابا کے ساتھ ایک طرف بیٹھ کر باری کا انتظار کرنے لگی۔

ابا کی کھانسی بگڑ گئی تھی۔ دوائی اور پرہیز میں باقاعدگی رکھنے سے افاقہ ہو سکتا تھا۔ یہ ان ڈاکٹر صاحب کی رائے تھی جن سے تقریباً" دو گھنٹے کے انتظار کے بعد ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

مہ جبین جب ابا کو لے کر باہر نکلی تو سورج سوا

نیزے پر آ چکا تھا۔ گرمی اور تھکن سے مہ جبین کا سر پھٹا جا رہا تھا' مگر بھابھی کا دیا کام نپٹائے بنا وہ گھر لوٹ کر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"ابا آپ یہاں رکیے' میں بھابھی کا سامان پہنچا کر آتی ہوں۔"

مہ جبین نے ابا کو اسپتال کے احاطے میں گھنے درختوں کی چھاؤں میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیسے جاؤ گی؟" ابا نے اس سے پوچھا۔

"پیدل ہی جاؤں گی ابا۔"

بھابھی کی مائرہ آپا کے اسپتال کے پیچھے والے گھر کا پیدل راستہ کم از کم دس' پندرہ منٹ کا ضرور تھا۔ پر مہ جبین کی مٹھی میں اب صرف اتنے پیسے بچے تھے کہ وہ ابا اور ابا کی گھر تک کی سواری کا کرایہ دے سکتی۔

"وہ بہت سنسان گلیاں ہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" ابا کو وہم ستانے لگے۔

"آپ اتنا دور تک نہیں چل پائیں گے۔" مہ جبین نے پریشان ہو کر کہا۔

مگر ابا بھی ضد میں آگئے۔ زبردستی ساتھ ہو لیے' جوان بیٹی کو ویران علاقے میں اکیلے بھیجنا ان کے لیے قابل آنے جانے کی مشقت سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔

مائرہ آپا کے گھر سامان پہنچانے تک دوپہر کے دو بج چکے تھے۔

مہ جبین کو اب گھر کی فکر ستا رہی تھی۔ ان لوگوں کے گھر واپس پہنچنے تک بچے اسکول سے آچکے ہوں گے۔ دوپہر کا کھانا مہ جبین صبح ہی تیار کر کے رکھ آئی تھی۔ اسے قوی یقین تھا کہ اس کے اور ابا کے گھر پہنچنے تک ان کے لیے اس میں سے کچھ بچا ہو گا۔

بچے کھاتے کم اور ضائع زیادہ کرتے تھے۔ مہ جبین کی غیر موجودگی میں اس بہت سارے ضائع ہونے والے کھانے میں سے اپنے اور ابا کے لیے حصہ بچا کر نکال لینے والا کوئی نہ ہو گا۔

صبح والی اکڑی ڈیل روٹی بھی اس وقت مہ جبین کو من و سلویٰ کی مانند لگ رہی تھی۔ اسے حالات اور ان کے سامنے اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا۔

یوں تو مہ جبین صبح کی کڑوی کسیلی چائے کی طرح حالات کی تلخیوں کو اپنے اندر صبر شکر کے ساتھ اتار لینے کا فن جان چکی تھی' مگر آخر انسان تھی۔ کبھی نہ کبھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہی جاتا تھا۔

چل چل کر ابا بے حال ہو چکے تھے۔ مائرہ آپا بھی بھابھی کی ہی رشتہ دار تھیں۔ جن کی خاطر اتنی دور تک چل کر آئے۔ انہوں نے اندر بلا کر پانی تک پوچھنے کی زحمت نہ کی۔ دروازے سے ہی ٹرخا دیا۔ اب تو ابا کو سہارا دے کر چلاتی مہ جبین بھی ہانپنے لگی تھی۔

"مہ جبین تو اپنا کوئی بندوبست کر لے بیٹا۔" ساتھ چلتے ابا نے پھولی سانسوں کے درمیان کہا تو وہ بھونچکی رہ گئی۔

"ہیں؟ میں کیا بندوبست کروں؟" وہ ہکلا کر بولی۔

جانے ابا کیا کہنا چاہ رہے تھے۔

"تو کوئی نوکری ہی کر لے۔ چار پیسے اپنے ہاتھ میں رکھے گی تو یوں فیضی کے سامنے ذلیل نہیں ہونا پڑے گا۔ یہ فیضی کم بخت تو بالکل ہی زن مرید ہو گیا ہے۔" ابا تاسف سے بولے۔

ابا پر صبح کے منظر کا اثر ابھی تک تھا اور شاید اس لیے بھی تھا' کیونکہ مہ جبین نے اپنی نہیں بلکہ ابا کی ضرورت کے لیے ہاتھ پھیلایا تھا۔

یہ ہی فیضی بھیا تھے جن کی بچپن اور لڑکپن کی فرمائشوں کو ابا جان توڑ محنت کر کے پورا کیا کرتے تھے اور اب اسی فیضی کے پاس ابا کے علاج کے لیے گنجائش نہیں نکلتی تھی۔

"میں نوکری پر نکل جاؤں گی تو آپ کا کیا ہو گا ابا۔"

"وہی جو اب ہوتا ہے۔" ابا تنک کر بولے۔

مہ جبین شرمندہ ہو گئی۔

سارے دن کی مصروفیات میں اسے ابا کے پاس دو پل گزارنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ بے چارے سارا دن اکیلے ہی پڑے رہتے تھے۔

"بھیا نہیں مانیں گے۔" مہ جبین نے گھٹی آواز میں کہا۔

"ہونہہ۔" ابا نے ہنکارا بھرا' مگر کچھ کہنے سے گریز

کیا۔

مہ جبین اور ابا دونوں جانتے تھے کہ فیضی بھیا اس نوکری کے لیے اس لیے راضی نہ ہوں گے کیونکہ بھابھی راضی نہ ہوں گی۔"

کسی زمانے میں اچھی بھلی نوکری ہوا کرتی تھی مہ جبین کی۔ چاہے اسکول کے بچوں کو پڑھانے کی' سر کھپانے والی ہی سہی' پر وہی ابا والی بات' چار پیسے تو ہاتھ میں آ ہی جاتے تھے۔

پھر بھابھی نے شور مچا کر کہ ان سے گھر کا کام اکیلے نہیں سمیٹا جاتا۔ زبردستی چھڑوادی اور پھر گھر کی ساری ذمہ داری بھابھی کی مدد کے لیے نوکری چھوڑنے والی مہ جبین کے سر پر ہی پڑ گئی۔ بھابھی جو پہلے مارے باندھے تھوڑا بہت گھر کا کام کر لیا کرتی تھیں' اس سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔

مہ جبین کو نوکری چھوڑنے یا گھر کا کام کاج سنبھالنے کا غم نہیں تھا۔ یہ سب وہ بخوشی کر سکتی تھی۔

اسے بھابھی کی ذہنیت پر افسوس ہوتا تھا اور اس سے زیادہ فیضی بھیا کی بے حسی کا دکھ تھا' جنہیں بوڑھا باپ اور جوان بہن بحیثیت فرد نظر آنا بند ہو چکے تھے۔

جہاں تک بھابھی کا سوال تھا تو انہیں مہ جبین کی ہر اس خوبی سے نفرت تھی' جو اسے ان سے برتر ثابت کرتی تھی۔

مہ جبین کی اچھی تعلیم و تربیت' اس کی خود اعتمادی' بہتر شکل و صورت بھابھی کے اندر حسد اور رقابت کے جذبات اجاگر کرتی تھی۔

مہ جبین کی تعلیم اور خود اعتمادی کو تو انہوں نے گھر کی بے دام نوکرانی بنا کر مٹی میں رول دیا۔ رہی شکل و صورت تو وہ بھی چند سالوں تک خاک ہو جانی تھی۔

ایک عجیب سا احساس کمتری تھا' جو انہیں ایسی اوچھی حرکتیں کرنے پر اکساتا تھا۔

مہ جبین اور ابا خاموشی کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ ان کے دونوں اطراف گھر بنے ہوئے تھے' مگر اتنی گرمی میں کوئی بھی ذی روح دکھائی نہ دے رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔

تب ہی نہایت تیز رفتاری کے ساتھ گلی کے اندر مڑتی سبز رنگ کی کورے کے ٹائروں کی چرچراہٹ نے سناٹے کو چیرا' گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ اس وقت ایسے نوجوان کے قبضے میں تھی' جس کی عمر اسے گلیوں کے اندر چلائی جانے والی گاڑی کی رفتار کو مناسب رکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

سڑک کے کنارے پر چلتی مہ جبین تیز رفتاری سے آتی گاڑی کو دیکھ کر لاشعوری طور پر ابا سمیت تھوڑا سا اور سائیڈ پر ہو گئی۔ ایسے سر پھرے ڈرائیور کا کیا بھروسہ؟

عین اس وقت جب سبز گاڑی ان کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ مہ جبین کے برابر سفید دیواروں والے گھر کے چوڑے سے آہنی گیٹ میں سے ایک چھوٹا سا بچہ گیند کے پیچھے بھاگتا باہر نکلا اور بنا رکے سڑک تک پہنچ گیا۔

اس کے بعد جو مہ جبین نے کیا وہ سراسر ایک اضطراری حرکت تھی۔ کوئی اگر اسے اس طرح جانتے بوجھتے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کے لیے کہتا تو شاید وہ نہ ڈال پاتی' پر اس نے چھوٹے سے بچے کو گاڑی کی زد میں آتا دیکھ کر وہ بنا سوچے سمجھے لپکی اور بچے کو پیچھے کی طرف کھینچتے ہوئے اسے اور خود کو گاڑی کے نیچے آجانے سے بروقت بچایا۔

آن کی آن میں اس سنسان سڑک پر جہاں صرف چند سیکنڈ پہلے تک مہ جبین اور ابا اکیلے چلے جا رہے تھے۔ ایک دم سے بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور یہ سب لوگ اسی آہنی گیٹ سے باہر نکلے تھے۔

سب سے پہلے بچے کے پیچھے بھاگتا کانپتا بوڑھا آدمی جو یقیناً" بچے کا نانا یا دادا تھا اور اس کے پیچھے بہت سے نوکر نما لوگوں کا ہجوم۔

بچہ محفوظ تھا۔ اسے کوئی گزند نہیں پہنچی تھی' مگر وہ ڈر گیا تھا۔ زور' زور سے رونے لگا۔

"بس میری جان بس۔" بوڑھے آدمی نے بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے پچکارا۔

اس کے بعد گیٹ پر کھڑے تمام نوکروں کی شامت آ گئی۔ سب سے پہلے بچے کی آیا کی کلاس لگی' جو رفع

حاجت کے لیے جاتے سے گھر کا بیرونی دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھی۔ (نوکروں کے لیے غسل خانے وغیرہ غالباً" گھر کے پچھواڑے میں بنے تھے) اس کے بعد نیستی پوتی چوکیدار کی باری آئی جو مین گیٹ پر اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر نہ جانے کہاں دفع ہو گیا تھا۔ بچے نے سارے راستے کھلے دیکھے تو گیند لیے باہر نکل گیا۔ دادا پیچھے لپکے مگر اتنی دیر میں بچہ گیٹ پار کر چکا تھا۔

فیضے کے مارے دادا جان کی گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ نوکروں کی گڑبڑاتی معافیوں کے باوجود کسی کو اتنی آسانی سے بخشنے کے موڈ میں نہیں لگ رہے تھے۔

ان کا غصہ بجا تھا۔ گو کہ کسی نے بھی لاپروائی جان بوجھ کر نہیں کی تھی۔ مگر ان کی کوتاہی سے بچے کی جان بھی جا سکتی تھی۔

مہ جبین کو اس عارضے ڈرامے میں اپنا اور ابا کا وجود فالتو کردار کی مانند کھٹکنے لگا' جو اپنا پارٹ ادا کر چکے ہوں اور کہانی کے مطابق انہیں اب منظر سے رخصت ہو جانا چاہیے۔

"تھینک یو بیٹا! میں نے تمہارا شکریہ ادا ہی نہیں کیا۔ آج تم نہ ہوتیں تو ہمارا ناقابل تلافی نقصان ہو جاتا۔"

مہ جبین کو خاموشی کے ساتھ ابا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے دیکھ کر دادا کا دھیان ایک دم ان دونوں کی طرف گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں' بس اللہ نے وسیلہ بنا دیا' ورنہ بچانے والی ذات تو اس کی ہے۔" مہ جبین نے متانت سے جواب دیا۔

"بے شک۔" دادا نے سر ہلا کر اقرار کیا' پھر مہ جبین کے ساتھ کھڑے ابا کی طرف غور سے دیکھا۔

"لگتا ہے میں نے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔"

"ارے تم سخاوت علی ہو نا۔" دادا خود ہی ابا کو پہچانتے ہوئے بولے۔

"مجھے پہچانا؟ میں خورشید حسن ہوں۔" دادا نے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"میں نے آپ کو پہچان لیا تھا سر!" ابا نے کہا۔

"ارے بھئی تو بولے کیوں نہیں۔" دادا نے جوش میں آتے ہوئے کہا۔

"اس وقت آپ سب پر گرج رہے تھے۔ ویسے ہی جیسے آفس میں ہم سب پر گرجا کرتے تھے۔" ابا دھیمے سے مسکرائے۔

"ہاہاہا۔" دادا کھل کر ہنسے۔ "تم نے یاد بھی رکھا تو کس طرح رکھا۔" وہ خوش دلی سے گویا ہوئے۔

مہ جبین ایک سے دوسرے چہرے کو الجھ کر دیکھ رہی تھی۔

"میں خورشید صاحب کا پی اے ہوا کرتا تھا۔" ابا نے ہی تعارف مکمل کر کے معمہ حل کیا۔

"ارے اب کیا یہیں کھڑے رہو گے' چلو اندر آؤ۔" خورشید صاحب عرف دادا نے ان سے کہا۔

"نہیں۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔ ہمیں کافی دور جانا ہے۔" مہ جبین بولی۔

"کوئی مسئلہ نہیں' ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔"

خورشید صاحب نے عذر چٹکیوں میں اڑا دیا۔

"اور سناؤ سخاوت' ابھی تک نوکری پر ہو یا میری طرح فارغ ہو چکے ہو۔ میرا تو نوکری چھوڑنے کے بعد کسی سے رابطہ ہی نہیں رہا۔ کچھ پتا نہیں کون کس حال میں ہے۔"

خورشید صاحب ابا کو لیے باتیں کرتے اندر چلے جا رہے تھے۔ چار و ناچار مہ جبین کو بھی پیچھے جانا پڑا۔

باہر کی گرمی کے بعد اندر کا ماحول خاصا فرحت بخش تھا۔

گھر اچھا بڑا اور دو منزلہ تھا۔ خورشید صاحب کا کمرہ نچلی منزل پر ہی تھا۔ وہ ان دونوں کو اپنے ہی کمرے میں لے آئے۔

اے سی والے کمرے میں ملازمہ کا لایا ٹھنڈا ٹھار جوس پی کر مہ جبین کو گرمی جسم کے مساموں سے خارج ہوتی محسوس ہوئی۔

ابا اور خورشید صاحب پرانے لوگوں کی پرانی باتوں میں مگن ہو کر مہ جبین کو بھولے بیٹھے تھے۔ دونوں کے درمیان افسر ماتحت کا فرق اگر کبھی تھا بھی تو اب دکھائی

نہیں دے رہا تھا۔ اب وہ فقط تنہائی کے مارے دو بڈھے تھے جو اپنے اپنے حالاتِ زندگی ایک دوسرے کے گوش گزار کررہے تھے۔

"ہمارے مجھلے صاحبزادے فرماتے ہیں، ابو کوئی مصروفیت ڈھونڈیے، پھول، پودوں سے دل لگائیے، میں نے کہا تم اپنے مشورے اپنے پاس ہی رہنے دو میاں! مجھ سے تو اب اس عمر میں جھک جھک کر زمین نہیں کھودی جاتی۔ میری کمر کو تو دُکھنے کے لیے ویسے ہی بہانہ درکار ہوتا ہے۔" خورشید صاحب ابا کو بتا رہے تھے۔

خورشید صاحب کے دو بیٹے اور بہوئیں ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ ایک بیٹا نوکری کے سلسلے میں دوسرے شہر تعینات تھا۔ اولادِ فرماں بردار تھی مگر اپنے اپنے کام دھندوں میں مصروف گھر میں رہنے والے بیٹوں اور بہوؤں سے بھی صبح کے بعد کہیں شام میں ملاقات ہوتی تھی۔ سارا دن اکیلے رہتے تھے۔ پوتے کے پیدا ہونے کے بعد سے دو سرا ہٹ پیدا ہوگئی۔ حالانکہ وہ ننھا سا شیطان انہیں سارا دن مینگنی کا ناچ نچائے رکھتا تھا۔ پھر بھی اکیلے پڑے رہنے کے مقابلے میں انہیں دو ڈھائی سال کے پوتے کے پیچھے بھاگتے رہنا برا نہیں لگتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ پوتے میں ان کی جان تھی۔

مہ جبین نے اس ننھے فرشتے کی طرف دیکھا جو ان لوگوں کی ملاقات کا سبب بنا تھا اور اب سب سے بے خبر اپنے دادا کے بستر پر جوڑا ہو کر اطمینان سے سو رہا تھا۔

"اور بیٹا! آپ کی کیا مصروفیات ہیں۔ پڑھتی ہو کیا؟"

مہ جبین کو اچانک احساس ہوا کہ اسے مخاطب کیا جارہا ہے۔ ابا سے باتیں کرتے خورشید صاحب اب اس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

"مہ جبین نے ایم اے کر رکھا ہے۔" مہ جبین کی جگہ ابا نے جواب دیا۔

"ارے واہ کیا بات ہے۔" خورشید صاحب نے کھل کر تعریف کی کہ مہ جبین شرمندہ ہوگئی۔ مگران کی ستائش بھری نظروں کے اثر سے اسے اپنے اندر مختصر سے دور ائیے کے لیے وہ والی مہ جبین پھر سے زندہ ہوتی محسوس ہوئی جو ایک بے مثال طالب علم تھی، شعلہ بیان مقرر تھی اور جو اب عرصہ ہوا مستقبل کے خوف اور روزمرہ کے اندیشوں تلے دب کر کہیں دفن ہو چکی تھی۔ اس کی زباں بندی کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ یہ وہی مہ جبین جب کبھی ڈائس پر چڑھا کرتی تھی تو مباحثے ٹوٹ کر اترتی تھی۔

"پھر اب کیا نوکری وغیرہ کا ارادہ ہے کہیں؟"

خورشید صاحب اس کی ذات میں بدستور دلچسپی لے رہے تھے۔

"نوکریاں آج کل اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہیں سر۔" ابا نے آہستہ سے کہا۔ "کچھ عرصہ پہلے ایک اسکول میں پڑھایا کرتی تھی، مگر چند وجوہات کی بنا پر وہ نوکری چھوڑنی پڑی۔"

"اگر کرنا چاہو تو نوکری کا بندوبست تو اب بھی ہوسکتا ہے۔ مگر اس کے لیے قابلیت شرط ہے۔"

خورشید صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ ایسا ہے کہ ہماری بڑی بہو صاحبہ ایک اسکول چلاتی ہیں اور اپنے اسکول کی نئی برانچ کے لیے انہیں قابل ٹیچروں کی تلاش ہے۔ میں تمہیں ریفر کرسکتا ہوں، مگر وہ تمہیں کام پر تب ہی رکھیں گی جب وہ خود تمہاری کارکردگی سے مطمئن ہوں گی۔ معیار میں اونچ نیچ انہیں بالکل گوارا نہیں۔ تمام ٹیچرز کا ڈیمو خود لیتی ہیں۔ بہت اصول پرست خاتون ہیں وہ۔"

خورشید صاحب نے جس اسکول کا نام لیا اسے سن کر مہ جبین کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ ایک نامی گرامی اسکول تھا، جس میں نوکری کے لیے عرضی پیش کرنے کی بھی مہ جبین جیسے لوگوں کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

"ان کا اسکول تو بہت بڑا ہے۔ پتا نہیں میں انہیں پسند آؤں گی بھی یا نہیں۔" مہ جبین نے پریشان ہو کر اپنے خوف کا اظہار کیا۔

"کیوں؟ تمہیں اپنی قابلیت پر شک ہے کیا؟" خورشید صاحب نے الٹا سوال کیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں، قابلیت کی مہ جبین میں کمی نہیں۔ ان شاء اللہ یہ معیار پوری اترے گی۔"

ابا نے یقین کے ساتھ کہا تو مہ جبین نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

لگتا تھا ابا نے آخر کار گھر میں محض تماشائی بن کر نہ رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اگر ابا ساتھ دے رہے ہیں تو بھیا اور بھابھی کے اعتراضات سے نمٹنے کا ذمہ بھی ان کا تھا۔ یہ سوچ کر مہ جبین کے دل میں چھپے کئی اندیشے کم ہوگئے۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہارا فوزیہ سے ذکر کروں گا۔ تم جاکر مل لینا اور میرا حوالہ دے دینا۔ باقی جو اللہ کو منظور اور جو تمہاری قسمت ہو، کھانا بھی آگیا۔"

خورشید صاحب نے آخری فقرہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جہاں سے ملازمہ بھری ٹرالی دھکیلتی اندر لارہی تھی۔

"میں نے بلقیس سے کہا تھا، کھانا یہیں لے آئے، باہر گرمی میں جاکر ڈائننگ ٹیبل پر کھانے سے بہتر ہے یہیں ٹھنڈے کمرے میں آرام سے بیٹھ کر کھا لیا جائے، کیوں کیا خیال ہے۔"

خورشید صاحب نے ابا اور مہ جبین کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔

"سر! آپ نے یہ تکلف کیوں کیا۔" اب تو ابا بھی اس عنایت پر پریشان ہوگئے۔

"تکلف کیسا، جو پکا تھا منگوالیا۔ میں نے تو کھانا ہی تھا، ساتھ تم لوگ بھی کھا لینا۔" خورشید صاحب ڈونگوں کے ڈھکن اٹھاتے ہوئے لاپروائی سے بولے۔

"تو بیٹا!" انہوں نے ٹرالی مہ جبین کی طرف دھکیلی مہ جبین نے جھجکتے ہوئے اپنے اور ابا کے لیے پلیٹ میں کھانا نکالا۔

بھاپ اڑاتا مرغی کا سالن، ہرے مسالے اور باریک کٹی ادرک سے دھکی ماش کی کھڑی دال۔ ساتھ میں گرما گرم پھلکے۔ پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہی ذائقے کے ساتھ توانائی کا بھرپور احساس بھی اجاگر ہوا۔

مہ جبین کی آنکھیں بے اختیار بھر آئیں۔

صبح سو کھا توس اور باسی چائے سے پہلے ہم نے یہ پورشن وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ میرے ابو، امی، گھنٹے کے بعد انتالیذیڈ کھانا اس کا مقدر ٹھہرے گا۔ تھے، دن کا ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب اسے دوپہر کا کھانا ملنے کی امید بھی ختم ہوگئی تھی۔

اور وہ اس لیے ہوا تھا کیونکہ اس نے نادانی میں اپنے رزق کا تعلق اللہ کے بجائے انسانوں سے جوڑ لیا تھا۔ یہ واحد نادانی نہ تھی جو پچھلے چند سالوں میں مہ جبین سے سرزد ہوئی۔ ماں کے گزر جانے کے بعد بھائی، بھاوج کے تیزی سے بدلتے رویوں اور سر پر سے چھت چھن جانے کے خوف نے مہ جبین کو بہت ڈرپوک بنا دیا تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ جس محفوظ مستقبل کی آس میں اس نے اپنی عزتِ نفس کو گنوایا تھا، اس کی ضمانت تو وہ لوگ بھی نہیں دے سکتے تھے، جن کے آگے اس نے سر جھکا کر جینے کی عادت ڈالی تھی۔

فقط ایک بھاپ اڑاتی مرغی اور بگھار لگی دال نے مہ جبین کو یاد دلا دیا کہ اپنے اختیارات خدا اور اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کے حوالے کردینے والے گھاٹے میں رہتے ہیں۔

مہ جبین کو اپنی گزشتہ سوچ اور طرزِ زندگی پر بے انتہا شرمندگی محسوس ہوئی۔ اسے احساس ہوا کہ اللہ کی ذات سے ناامید ہو کر ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھ جانا، صرف غلطی ہی نہیں بلکہ اس باری تعالیٰ کی شان میں گستاخی کے مترادف ہے۔ اس لمحے مہ جبین کو اپنے اندر برسوں کی بھری یاسیت و مایوسی کا خاتمہ ہوتا محسوس ہوا۔

اسے یقین ہوگیا کہ جس اللہ نے اس کے بھوکے پیٹ کو بھرنے کا غیب سے بندوبست کیا تھا وہ اس کی زندگی سنوارنے سے بھی ہاتھ نہیں کھینچے گا، بس اس کی ذات پر یقین کامل رکھنے کی اور کڑی محنت کی شرط تھی۔ مہ جبین نے آسودہ انداز میں نرم روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے آئندہ یہ دونوں کام کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆

ناولٹ

شاہین ملک

کاش تجھے ہو دید میسر

نوکری کا ٹرانسفر، نیا شہر، مکان بدلنے کا نیا بکھیڑا اور یہ جو تیرا مکان دیکھا تو برابر والے گھر سے نیم اور بیری کے درخت کو اس پر جھکا دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی، نہ پتا جڑیں کہاں ہیں اور کتنی ہی جھاڑیاں آس پاس ہیں۔ ٹوٹی ہوئی سی ایک دیوار، صحن میں اگے ہوئے نیم اور بیری کے دو درختوں کو انگور کی بیلوں نے الگ ڈھانپ لیا تھا۔ بیری کی پتیاں زرد تھیں اور شاخیں کمزور ہو کر جھول رہی تھیں، البتہ نیم کا پیڑ سرسبز و شاداب تھا۔ اتنا خوش و خرم تو میں نے کسی شخص کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر سسکیاں کوئی لیتا تھا تو بیری کا درخت!

بیری تنہا کیوں ہے؟

بیری اداس کیوں ہے؟

"اگر اس پر پھل نہیں لگ رہے تو اسے جڑ سے کاٹ ہی کیوں نہیں دیتے؟" میں نے سوال کیا۔

"تم نہیں جانتیں بیری کو دھرتی سے، جہاں وہ بوئی جاتی ہے اس جگہ سے عشق جنوں کی حد سے بڑھ جاتا ہے، اسے آپ لاکھ کاٹیں یہ پھر اُگ آتی ہے۔" قصور خالہ جو مالک مکان کی بیگم تھیں، مجھے جواب دے کر قائل کرنے کی کوشش کی۔

"آج رات کا کھانا ہماری طرف کھا لینا، یہ بیچ کا دروازہ کھٹکھٹانا، میں کھول دوں گی، ویسے بھائی صاحب نو بجے تک تو دفتر سے لوٹ ہی آتے ہوں گے۔" انہوں نے ازراہ مروت مجھے دعوت بھی دی اور رامس کے آنے کا وقت بھی پوچھ لیا۔

"خالہ کہاں زحمت کریں گی، میں چولہا سیٹ کر لوں گی آج اور ان کے آنے کا کوئی ایک وقت مقرر نہیں، اخبار کی نوکری ہے نا دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔"

"اے ہے کتنی دیر ہو جاتی ہوگی، میں دیکھ رہی ہوں، ابھی سامان بکھرا پڑا ہے، اکیلی ہو کرنے والی... یا بازار کا کھانا منگوانا ہے تو الگ بات ہے۔" وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرائیں۔ شاید میری نیل پالش یا بالوں کو جدید انداز سے تراشا ہوا دیکھ کر ان کا خیال تھا کہ مجھے کہاں پکانے وکانے سے دلچسپی ہوگی۔

میں نے مسکرا کے کہا۔ "نہیں خالہ! ایسی کوئی بات نہیں، میں دو، چار روز کا کھانا پہلے سے پکا کے فریزر کر لائی ہوں۔ آج ایک آدھ دن وہی چلا لوں گی اور دیکھیے ابھی ہاتھ کے ہاتھ اوون سیٹ کرتی ہوں، یہ پلمبر کو گھر گئے تھے گیس کی فٹنگ وغیرہ دکھوالوں گی۔" میں نے انہیں ٹالتے ہوئے کہا۔

"میں کون سا روز روز اہتمام کرتی ہوں، آج قیمہ بھرے کریلے بنائے ہیں۔ چنے کی دال کی روٹی، چولائی کا ساگ اور آم کا رس رکھوں گی، بھئی یہ ہے آج کا ہمارا خاص مینیو، کیا تمہیں یہ چیزیں پسند نہیں؟" ان کے چہرے اور بات سے سادگی جھلکتی رہی۔

"خالہ! ہم تو کھانے پینے میں نخرے نہیں کرتے، کم پکاتے ہیں، مگر سب ہی کچھ کھا لیتے ہیں، اچھا آپ اگر کڑھی پسند کرتی ہوں تو میں چاولوں کے ساتھ لے آؤں گی، مل بیٹھ کے کھالیں گے۔" میں نے انہیں دعوت دینی چاہی۔

"ارے کڑھی بنائی ہے۔ اور وہ بھی فریز کی ہوئی ہے رہنے دو اس کا تو حلیہ اور جغرافیہ ہی بدل ڈالا ہوگا اس موئی برف خانے کی سردی نے، تم ایسے ہی آجانا۔" ان کے ماتھے پر تاگواری کی شکنیں دیکھ کر میرا دل چاہنے لگا کہ انہیں منالوں۔

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن سچ کہتی ہوں خالہ! پنجابی کڑھی کو اس برف خانے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، ایک ابال دے کر دم پر رکھو اور پکوڑے ڈال دو یا نیا بگھار لگادوں گی تو تازہ کی تازہ ہو جائے گی۔" میں نے دل سے چاہا کہ وہ میری آدھی پونی دعوت قبول کرلیں۔

"لگتا ہے پکانا تو ایک طرف سجانا بھی جانتی ہو" اور ہم دونوں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

یوں مسکراتے مسکراتے ہماری دوستی سی ہوگئی۔ دوستی میں ویسے بھی ذہنی رفاقت کا عمل دخل ہوتا ہے، عمروں اور جنس کے فرق کا نہیں۔

تھوڑی دیر بعد پلمبر آگیا۔ میں نے سب سے پہلے اوون ہی سیٹ کروایا، تاکہ بازار کا کھانا نہ پڑے اور اپنا کھانا جو فریز کیا ہوا ہے وہ جلد ختم ہو، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بہت دنوں تک منجمد کیے ہوئے کھانے میں نہ ذائقہ رہتا ہے نہ غذائیت اور بیکٹیریا پیدا ہونے کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔

شام ڈھلنے تک میں جتنا کام سمیٹ سکتی تھی سمیٹ چکی تھی، اب کڑھی پر تجربہ بھی کرلیا اور نئے چاول بھی تیار کرلیے، یوں انتظار تھا تو فیصل اور رامس کا، فیصل ہمارا بیٹا کمپیوٹر کی سمر کلاسز لے کے آتا تھا، چھٹیاں ختم ہونے کو تھیں اور یہ مکان بدلنے کے بکھیڑے، پھر کچھ کراچی میں برسوں بعد آنے پر بیٹے کا اظہار برہمی ہم دونوں میاں، بیوی بری طرح محسوس کر رہے تھے۔ لاہور میں اس کے دوست اور کزنز کا ایک جم غفیر تھا جن میں وہ اکلوتے بچے کی طرح اپنے خوب لاڈ اٹھواتا تھا، یہاں پھوپھی تھیں تو مگر ان کے ہاں اولاد نرینہ نہیں تھی اور کزنز بھی عمر میں بڑی تھیں، سیکنڈری اسکول کا بچہ تھا۔ مگر سوچیں بندوں کی طرح کی اور فلسفہ تو اوڑھنا بچھونا ہے جیسے۔ میں بھی اپ سیٹ تو تھی، مگر بینک کی نوکری کی اپنی ہی ٹینشن ہوتی ہے، مراعات بھی زیادہ تھیں، مستقبل بھی امکانات سے بھرپور تھا۔ ورنہ درمیانی عرصے میں رامس کو خیال آیا تھا کہ گولڈن شیک ہینڈ لے کر اپنا کاروبار شروع کرلیتے ہیں، لیکن ان کے والدین اس حق میں نہیں تھے اور وہ خود بھی آدھے دل سے بڑا فیصلہ نہ کرسکے تھے۔

رات نو بجے صحن کے وسطی دروازے پر دستک دی تو ایک اجنبی خاتون نے دروازہ کھولا۔ سانولا سا باوقار چہرے والا یہ سراپا تھا، تصور خالہ کی بنا کا جس کا نام میں نہیں جانتی تھی، وہ پُرتپاک انداز میں ملیں، محسوس ہوا کہ واقعی ہمارا انتظار ہو رہا تھا، وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے ہمیں ایک کمرے میں لے گئیں، جسے انہوں نے اپنے مشرقی انداز سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ گھر میں کتابیں، پھول، منی پلانٹ کے پودے اور قرآنی آیات کے باب طغرے موجود تھے اور مجھے یہ تمام چیزیں اچھی لگتی تھیں۔ اس گھر میں آکر دل لگنے کی شروعات ہوئیں، پکن سے بگھار کی تازہ خوشبو کے جھونکے نے بھوک بھی جگادی۔ فیصل اور رامس

دونوں آداب کے بعد سے چپ تھے، دونوں نے پہلو بدلے، کمرے کا جائزہ لیا، بڑی بی سامنے سے آتی نظر آئیں تو ہم تینوں احتراماً کھڑے ہوئے، علیک سلیک کے بعد از سرنو وہی باتیں جو ہم پہلے بھی کر چکے تھے، نئی سمجھ کر کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد تصور بیگم کے داماد، بیٹی اور بھائی آگئے، یوں مردوں کی بیٹھک دوسرے کمرے میں سج گئی۔ پھر کھانا لگا، ہم چونکہ تھکے ہوئے تھے، اس لیے جلد اجازت چاہتے تھے، مجھے فیصل کے موڈ کی پروا کھانے سے کہیں زیادہ تھی، لیکن مجھے تسلی یوں بھی تھی کہ وہ اپنی کلاس کے ساتھ اسنیک بار ہو آیا تھا اور اس نے شام کا ناشتا ٹھیک ٹھاک کیا ہوا تھا، ورنہ نہ تو اسے ساگ پسند تھا، نہ دال بھری روٹی، نہ ہی کریلے، اسی لیے میں بوجھل پن محسوس کر رہی تھی، لیکن رامس پر اسے مطمئن دیکھ کر تمام کوفت دور ہوگئی۔

وہاں باتوں باتوں میں، میں نے محسوس کیا کہ خاندان کی ایک خاتون جسے تصور بیگم کی نند بتایا گیا تھا بیٹھے بیٹھے کھو جاتی ہیں، گفتگو میں، کبھی بھرپور حصہ لیتی ہیں، تو کبھی اکتاہٹ کا اظہار کرتی ہیں، مسکراتی بھی کم کم ہیں، مگر ایسا لگ رہا، جیسے ان کا کچھ کھو گیا ہے۔ عجیب سی بے چینی، تلملانا اور بکھرے بکھرے رہنا یا پھر ایک دم چپ ہو جانا، جیسے کوئی گہرے دکھ میں گھرا ہو اور اس سے کچھ بھی کیا نہ جارہا ہو، کبھی ان کی آنکھوں میں پانی کے دیے جھلملانے لگتے تو وہ بہت اچھی لگتیں اور کبھی ایسا لگتا ان کی کوئی خوشی کھو گئی ہے، جس کی پنگار پان کی آنکھوں سے دہکنے کو تیار ہوں۔

"نہیں بھئی، یہ خاتون بہت عجیب، مگر دلچسپ ہستی ہیں۔" دل نے کہا کہ ان کی قربت حاصل کرنا ضروری ہے، مجھے ویسے ہی پراسرار، خاموش اور الگ تھلگ رہنے والے لوگوں میں دلچسپی محسوس ہوتی تھی یا شاید ایسے لوگوں میں اور طرح کی کشش ہوتی ہے جو اپنی مثالیسی شخصیت سے دوست بن جاتے ہیں۔

اس روز میں نے بیری کے ٹنڈ منڈ سے درخت کو کاٹنے کی تجویز ان سب کے سامنے رکھی تو کوئی اور نہیں سلیمہ نے بڑھ چڑھ کر مخالفت کی۔

"ہمارے آباؤ اجداد کی آخری نشانی ہے، اسے کچھ نہ کہیے گا۔" انہوں نے مجھے واضح طور پر منع کیا، پھر تو میں نے خاموش ہی ہونا تھا۔ تصور خالہ کو شاید میرا دل بھی رکھنا تھا۔

"بیٹا! کچھ روز ٹھہر جاؤ، سلیمان صاحب ملائیشیا سے آجائیں تو ان سے بھی پوچھ لوں۔" آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کے سمجھانے کا انداز ایسا تھا کہ میں ان کی ذہانت کی قائل ہوگئی، وہ بتا رہی تھیں کہ سلیمہ کو بیری کا درخت پسند ہے، بیر پسند ہیں اور... اور شاید اس درخت سے جڑی کوئی ایسی یاد یا واقعہ بھی ہے... انہوں نے مجھے اشارتاً "چپ ہو جانے" کو کہا۔ اس رات کی اچھی اور پراسرار سی کیفیت لے کر ہم گھر لوٹ آئے۔ واپسی پر تھوڑا بہت کام کر کے سونے لگی تو رامس نے بتایا۔

"سلیمان صاحب نے اپنی ایک بہن کا ذکر بہت محبت سے کیا تھا، وہ دیکھی تم نے... کتنی چپ چپ تھی۔"

"انہوں نے ہی تو بیری کو کاٹنے سے منع کیا ہے۔" میرا چہرہ اتر گیا۔

"تو رہنے دو... صفائی کا مسئلہ ہوتا ہے، دوپہر والی ایک ماسی لگوالو، سو پچاس دے دیں گے۔" اور میں کروٹ بدل کے لیٹ گئی۔

"کیا ہوا؟ تجویز پسند نہیں آئی کیا؟" انہوں نے اٹھ کر بلب روشن کردیا۔

"نہیں... ایسی بات نہیں... فیصل سیٹ ہو جائے تو کوئی پریشانی نہ رہے۔" میں نے بات بدلنی چاہی۔

"بچہ ہے... ہو جائے گا سیٹ، تم اپنا خیال رکھو۔" بہت دنوں بعد انہوں نے ایسی پیاری سی بات کہی تو میں مسکرا دی تھی۔

"اوکے... آج سو جائیں تھوڑی تھکن تو ہے نا!" اور انہوں نے اثبات میں گردن ہلا کے بستر میں پناہ لے لی۔

☆ ☆ ☆

اگلا دن معمول کے مطابق شروع ہوا۔ فیصل کے لیے کچھ کتابیں لینا تھیں، میں مارکیٹ گئی تو برسوں پرانی جاننے والی ایک خاتون مسز زبیر شاپنگ کرتے ہوئے مل گئیں۔ ایک دوسرے کے سیل فونز نمبر save کیے گئے، گھر کی پتے سمجھائے گئے۔ میرے مکان کا نمبر سن کر وہ چونکیں۔

"ارے میں تو رہ چکی ہوں کوئی پانچ برس وہاں۔ مسز تصور، سلیمان اور ان کی نند سلیمہ ہے نا، یہ ہی فیملی ہے نا!" وہ پہچان چکی تھیں۔ "تو پھر تو اکثر ملنا ملانا ہوگا، ایسا کرو کل ہی آجاؤ نا، چائے پئیں گے گپ شپ کریں گے۔" میں انجانے میں ان خاتون سے زیادہ مالک مکان کی فیملی میں دلچسپی رکھتی تھیں، اس لیے بھی ان سے طویل ملاقات چاہتی تھیں۔

"کل ہی کیوں آج ہی مل لیتے ہیں، دراصل مجھے ان کے کچھ حساب چکانا ہیں۔ میں آجاؤں گی یہ ہی کوئی چھ، ساڑھے چھ بجے، چائے تیار رکھنا۔ سمجھیں۔" اور وہ بھیڑ میں کھو گئیں۔ حالانکہ میں چاہتی تھی کہ مجھے ایک دن اور مل جاتا تو میں کچھ اچھے لوازمات تیار کر کے ہائی ٹی کا پروگرام بنا لیتی، مگر راستے میں واپسی پر بیکری اور جنرل اسٹور نے میری دردسری اپنے سر لے لی۔ چائے کے لوازمات کے ساتھ ساتھ ہلکا پھلکا ڈنر بھی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے، میں نے دل ہی دل میں سوچا، اس شہر میں دل بھی لگانا تھا اور لوگوں سے تعلقات بھی استوار رکھنا ضروری تھے، کچھ قدرت بھی میرا ساتھ دے رہی تھی۔

گھر واپس پہنچ کر روٹین کے کام نپٹانے کے بعد میں کمر سیدھی کرنے صوفے پر لیٹ گئی۔ میری ایک برسوں پرانی بتا نہیں اچھی یا بری عادت ہے کہ ایک بار بستر سیٹ کر کے سلیقے سے سجا کر چاہتی ہوں کہ اس پر سلوٹ بھی نہ پڑے اور وہ صرف دوبارہ رات ہی کو آرام کی غرض سے استعمال ہو یا پھر میں دوپہروں میں تنہا بستر کے استعمال سے طبیعت میں اضطراب محسوس کرتی تھی اور راحیل کے موجود نہ ہونے پر تنہائی محسوس کرنے لگتی تھی، کوئی بات تو تھی سونے کے اس کمرے میں، جو دوپہر میں کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ اتنے میں دستک دروازے پر دستک ہوئی، ایک بار، دو اور تیسری بار۔ میں بیدار ہو کر دروازے پر پہنچی تو سلیمہ کی آواز آئی۔

"بھابھی سو رہی ہیں کیا؟"

"نہیں۔۔۔ تو آجائیں۔" اور میں نے دروازہ کھول دیا۔

"کیا کرتی رہتی ہیں؟" وہ ہولے ہولے بولتی تھی۔

"وہی سب کچھ جو عام گھریلو عورتیں اس وقت کرتی ہیں۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"وہ تو ڈرامے دیکھتی ہیں یا پھر سو جاتی ہیں۔" انہوں نے سمٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔ مگر میں پھر شاید ذرا مختلف ہوں، میں کہانیاں، شاعری اور ادبی شہ پارے وغیرہ پڑھتی ہوں تو دوپہریں زیادہ اچھی گزر جاتی ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ کہاں ہیں آپ کی کتابیں؟" انہوں نے صوفہ، میز کے اطراف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آج میں نے سوچا انہیں کچھ دیر بعد پڑھتی ہوں، پہلے قیلولہ کر لوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس لیے تو۔۔۔ مجھے شک تھا کہ آپ سو رہی ہوں گی، دراصل گھر سیٹ کرنے کے جھمیلے میں تھکن تو بہت ستاتی ہے نا!"

"سب کچھ آہستہ آہستہ کر رہی ہوں۔"

"گھر اور بیری پسند آئے دونوں؟" بڑا عجیب سا سوال کیا انہوں نے۔ ان کی نگاہیں میری پر جمی ہوئی تھیں۔

"جی۔۔۔ جی جی۔" میں چونک گئی تھی، میرے منہ سے پہلا جی حیرت کی عکاسی کراتا تھا اور دوسرے جی مصلحت نبھانے کے لیے، ہتھیار کے طور پر استعمال کیے۔ ایسی ویران سی بیری کو پسند کیسے کیا جا سکتا ہے؟ وہ باتیں کر رہی تھی اور میں اپنی سوچوں میں گم تھی۔ مگر بہت ہی جلد میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ مہمان کی خاطر داری ایسے سوکھے منہ بھی نہیں ہونی چاہیے۔

تکلفات میں پڑے بغیر ہم کچن میں آگئے۔ "کچھ ٹھنڈا ہو جائے۔" میں نے شربت تیار کرنا شروع کیا۔

"رہنے دیجیے، کیوں تکلف کر رہی ہیں۔"

"تکلیف، تکلف اور زحمت یہ لفظ میری لغت میں ہیں ہی نہیں۔" چلیے لاؤنج میں چلتے ہیں، اور میں شربت کا گلاس تھامے اسے وسطی کمرے میں لے آئی۔ اس نے ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈال کر زیر لب کہا۔

"اچھا ٹیسٹ ہے آپ کا۔"

"ارے یہ کیا، آپ نے ابھی چکھا بھی نہیں۔" میں نے شرارت سے کہا تھا۔

"ارے۔۔۔ نہیں میرا مطلب کمرے کی آرائش سے ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی اور میں بھی ہنس دی۔

"یہ جھولا کس کی چوائس تھی؟" انہوں نے نیا سوال پوچھا تو یکایک میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ اس منسٹر الخیال خاتون کے انٹرویو نما سوالات کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔

"چوائس تو مشترکہ ہی تھی، دراصل ہم شادی کے بعد دو برس یہاں کراچی میں رہے تھے، میری ایک سندھی دوست سے ملاہوا تحفہ ہے، میں کرتی یہ ہوں کہ چند برس بعد پرانے فرنیچر کو پالش کروا لیتی ہوں اور یہ نیا کا نیا لگنے لگتا ہے۔"

"جی۔۔۔ یا۔۔۔ لش۔" اس نے فقرہ تو ڈکرا دیا کیا۔ وہ افسردہ سی ہو گئیں، میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"آپ لیجیے نا!" ان کا دھیان بیٹے اور یادوں سے بھی ہوئی اگر کوئی بات فرنیچر، جھولے یا پالش سے متعلق ہے تو ان کا دل بوجھل نہ ہو، کم از کم کچھ دیر کے لیے ہی سہی۔

"بہت اچھا لگا آپ لوگوں سے ملنا، میں تو ڈر رہی تھی، پتا نہیں کیسے مالک مکان ہوں، بینک والے تو بس ملاقات کروا دیتے ہیں۔" میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ بولیں "تو اچھی رہی نا ملاقات؟"

"جی بالکل۔"

"آپ کو پتا ہے شادی سے پہلے ہم نے یہ پورشن اپنے استعمال کے لیے رکھا ہوا تھا۔ میرے ابو، امی، بھائی اور بہن، تصور باجی ہم سب یہاں رہتے تھے، میری شادی بھی یہیں ہوئی اور پھر میں واپس بھی یہیں آئی تو ابو نے کہا سلیمہ اب یہیں رہے گی۔" اتنا کہتے کہتے وہ چپ ہوئیں اور پھر ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ وجہ سمجھ میں آرہی تھی، کوئی بھی سوال نہیں تھا جو تشنہ رہتا، لیکن میں نے انہیں ستانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے کچھ بھی کریدا نہیں۔ انجانے میں میری خواہش تھی کہ وہ اپنے آپ میں اتنی ہمت ضرور پائیں کہ اپنی کہانی اپنی زبانی کہہ دیں، ورنہ چپ ہو جائیں اور اس راز پر پردہ پڑا رہے، یوں بھی راکھ کریدنے سے دبی ہوئی کسی چنگاری ہی کے بھڑکنے کی امید ہوا کرتی ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے زخم جلیں بھی تو وہ ستانے والوں کو دعا دے سکتے ہیں۔ آندھی اور ڈھے کے سورج کو بلا دا دینا ہر کسی کے بس میں نہیں، سلیمہ کے درد کا رنگ کچا نہیں تھا، اسی لیے آنکھیں بھر آنے پر ان کے عذاب ہرے ہوئے تھے۔

میں ان کے قریب سمٹ آئی، ان کے ہاتھ سے گلاس لے کر میز پر رکھا، جسے اب تک ایک بار ہی چکھا گیا تھا، ان کی نرم ہتھیلیاں اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہنا شروع کیا۔ "چھوڑیں سلیمہ، گزرا ہوا وقت یاد نہیں کرتے، کئی مرتبہ اجالوں کے لیے دل کا فانوس جلانا پڑتا ہے، مگر روشنی نہیں ہوتی، کچھ لوگ ہمارے لیے نہیں ہوتے، ہم بھی کچھ لوگوں کے لیے نہیں بنے ہوتے۔ کچھ لوگوں کی تقدیر میں دھوپ کا صحرا عبور کرنا لکھا ہوتا ہے، واویلا بھی کب تک کیا جائے، زندہ رہنے کے لیے حوصلہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے کوئی کام کر کے خود کو بہلا لیا ہوتا تو آج تنہائی کے غاروں سے شاید نکل جاتیں۔" آخری فقرہ میں نے کس ہمت سے کہا، میں تو خود کو ٹوٹتا ہوا، بکھرا ہوا محسوس کرنے لگی تھی۔

کچھ دیر تک وہ اپنی بیاہتا زندگی یاد کرتی رہیں۔

"شاید بہت اچھے لوگ تھے وہ یا شاید میری قسمت۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی' میں سمجھ گئی کہ روایتی طرز فکر کی حامل عورتوں کی طرح وہ قسمت' مقدر اور تقدیر کو کوسنے کی مشق دہرانے جارہی ہیں۔

"پھر میں نے ایک بار اور کوشش کی' دوسری شادی بہت سادگی سے ہوئی' وہ صاحب بیمار رہتے تھے' جوان بچے تھے ان کے' بچوں نے مجھے پچھل پیری سمجھ کر گھر سے نکال دیا اور ایسا اس روز ہوا جب وہ اپنی will لکھ رہے تھے' میری خدمت کے عوض ایک مکان میرے نام لکھ رہے تھے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوگیا۔ وصیت تبدیل کردی گئی اور میری خدمت گزاری کو لالچ اور ہوس کے جوہڑ میں پھینک دیا گیا۔ وہ مرگئے مجھے روتا چھوڑ کے' شاید مرنے کے بعد ہمیں تو رونا ہی ہوتا ہے نا' ایک ہی کام رہ گیا اور اس کام کی اجرت نہ شمار ہوتی ہے نہ باری آنے پر ملا ہی کرتی ہے۔ ارے کتنا وقت ہوگیا مجھے آئے ہوئے۔" انہوں نے کمرے میں گھڑی کو تلاش کیا' اسی وقت ان کے موبائل پر میسج کی ٹیون بجی۔

"باجی بلا رہی ہیں' اچھا چلتی ہوں' انہیں نہ بتایئے گا کہ میں نے... ایسا کچھ کہا ہے۔ وہ تو آپ مجھے اچھی لگیں تو جی ہلکا کرلیا' باجی تو میری باتیں بھی نہیں سنتیں' حالانکہ اس طرح کتھارسس ہوجاتا ہے۔"

اور میں فلسفے اور اخلاقی اقرار کے لیکچر دینے والی عورت ان کے سامنے بے بس سے ہوں ہاں کرتی رہی' کیونکہ مجھے اپنی کمزوری کا بخوبی علم تھا۔ انہیں وسطی دروازے سے اللہ حافظ کہہ کے لوٹ آئی۔ شہرت کا پون بھر گلاس اب بھی بھرا رکھا تھا۔

اتنے میں عصر کی اذانیں ہونے لگیں۔ میسج کی رنگ ٹون نے اعلان کردیا کہ مسز زبیر گھر سے روانہ ہورہی ہیں' میں نے وضو کرکے پہلے فرض نماز کی ادائیگی ضروری سمجھا اور پھر کچن کی راہ لی۔ میں اب تک ہوسٹس ٹرالی نہیں لے سکی تھی' یوں بھی مہینہ بھر ہی ہوا تھا کراچی منتقل ہوئے' اس لیے کچن ہی میں مائیکروویو کے آس پاس مدارات کی چیزیں ڈھک کے رکھ آئی۔

فیصل نے کوچنگ سینٹر جانا تھا' وہ روانہ ہوا تو اگلے ہی لمحے مسز زبیر کی دستک ہوگئی اور پھر شام گہری ہوگئی' رامس بھی آگئے اور زبیر صاحب بھی اپنی بیگم کو لینے آن پہنچے' سر اٹھانے کی فرصت نصیب نہ ہوئی اور تھکن بھی نہیں ہوئی' واپسی پر فیصل کو میں کوچنگ سے لایا کرتی تھی' مگر آج تو کچن پھیلا ہوا تھا' رامس نے ایک بڑی مہارتی کی کہ تھکن سے چور ہونے کے باوجود اسے لینے چلے گئے' اتنے میں میں نے ڈرائنگ روم' لاؤنج اور کچن کو اوور سنوسیٹ کیا۔ رات کا کھانا میز پر لگایا اور خود کوئی وی ڈرامہ کی نئی قسط دیکھنے میں گم کردیا۔ لیکن آج بھڑکیلے میک اپ' جدید تراش خراش کے ملبوسات اور جیولری کچھ بھی مزہ نہیں دے رہے تھے اور ابھی آدھی رات تک کی ڈیوٹی باقی تھی۔

"خاصے باتونی اور ملنسار ہیں بھئی دونوں میاں' بیوی۔" رامس نے چمکتے سے آگرہلی رائے کا اظہار کیا۔ میں چونکی' کہ مجھے [illegible] ہوا کہ میں نے جو مہمان بغیر ان کے مشورے کے بلا لیے وہ انہیں برے نہیں لگے۔

"گھر میں آج کچھ زیادہ ہی رونق لگی تھی' کیا؟" فیصل نے مجھ سے سوال کیا۔

"چلو بیٹا! کھانا لگاتی ہوں' وہیں باتیں کریں گے' آپ ذرا فریش ہوآجائیں۔" میں نے دونوں کی طرف دیکھا' دونوں ہی مست پڑے ہوئے تھے' مگر میرے لہجے میں تابعداری تھی' کھنک تھی۔

"ہاں تو بھئی فیصل کیسی جارہی ہے پڑھائی؟" رامس نے بات شروع کی۔

"جی... اچھی' امی یہ اسپیگھٹی آپ نے بنائی ہے؟"

"نہیں... یہ تمہاری آنٹی لائی ہیں بیٹا' وہ اس مکان میں کرائے دار مقیم ہیں یہاں برسوں میں بھی گئی تھیں' تصور بیگم نے بھی ان سے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔ یہ ہمارے بھی پرانے واقف کاروں میں سے ہیں' ان کے تمام رشتہ دار اسلام آباد لاہور میں ہیں' میاں صاحب

چونکہ مرچنٹ نیوی سے وابستہ تھے' اس لیے یہ شروع سے کراچی ہی میں رہتے رہے۔ آج صبح مارکیٹ میں ان سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی' اس لیے بلالیا۔"

"اچھا کیا... یہ ڈش کیسی لگی بیٹا!" رامس نے کانٹے کی مدد سے اسپیگھٹی کا چھوٹا سا آپریشن کیا۔

"زبردست..." اور فیصل نے ڈش اپنے سامنے سرکالی۔

"اچھا بیٹا! برسوں سے رمضان المبارک شروع ہورہا ہے آپ کا کیا معمول رہے گا؟" رامس نے کھانے کے اوقات کے ساتھ ساتھ روزے رکھنے سے متعلق رائے لی۔

"ابو! گرمیوں کے روزے تو خاصے طویل ہوتے ہیں۔" وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا' یہ ہم دونوں سمجھ چکے تھے۔

"کوئی بات نہیں' پہلی مرتبہ تھوڑا ہی آرہے ہیں' پچھلے چند برسوں سے گرمیوں ہی میں آرہے ہیں اور ہم الحمدللہ رکھتے آئے ہیں۔" رامس نے بیٹے صاحب کو یاد دلایا' میں ہولے سے مسکرائی۔

"چند دنوں میں آپ عادی ہوجائیں گے' بارہ بجے اسکول ختم اور پھر کوچنگ' شاید چار ساڑھے چار بجے آف ہوجائے گا' گھر آکر مزے سے اے سی والے کمرے میں آرام فرمایئے گا۔ آپ نے کون سی افطاریاں یا سحریاں تیار کرنی ہیں' کیوں بھئی۔" انہوں نے شوخ نگاہوں سے ہم دونوں ماں' بیٹے کو دیکھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

"افطاری میں کیا کچھ بنایا کریں گی؟" فیصل نے دوبارہ کھانے پینے میں دلچسپی لی۔

"وہی سب کچھ جو ہر سال ہوتا ہے۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"ہوں' لیکن اس بار ڈشز کی بھرمار نہ ہو' دیکھیے منہ گائی بھی بڑھی ہے اور پھر خاندان میں کئی جوان اموات بھی ہوئی ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ ان دو مہینوں میں ان یتیم بچوں اور بیواؤں کو بھی یاد رکھیں جنہیں بھرپور خاندان اور مالی وسائل کی خوشیاں نصیب نہیں۔" رامس نے عمدہ تجویز پیش کی۔ یوں بھی ہمارے ہاں اہتمام بہت ہوتا تھا۔ ہر روز چنے کی چاٹ' فروٹ چاٹ' دہی پھلکی' مختلف اقسام کے پکوڑے' میٹھے سموسے' آلو اور قیمے کے سموسے' رول' جلیبیاں' امرتی' گلاب جامن اور عربی پراٹھے' پتا نہیں ہم کیا کرتے تھے۔ کہنے کو گھر میں صرف ڈھائی افراد ہوتے تھے اور لگتا تھا کنبہ بھر کے افطار کرنے آیا ہے' یہ وقت اور وسائل کا زیاں ہی تو تھا اور تھکن الگ ہوتی تھی۔

"امی... بھئی بدل بدل کے سہی' مگر پکوان تو ایسے ہی اچھے لگتے ہیں۔" فیصل نے تیوریاں چڑھا کے گویا احتجاج کیا۔

"تمہارے ابو کی تجویز دل کو لگتی ہے بیٹا! افطاری کے خرچے کم کرکے ایک خاندان کو عید منانے کے لوازمات اور کپڑے وغیرہ دیے جاسکتے ہیں' اب خوامخواہ مٹاپا اور کولیسٹرول بڑھانے کا فائدہ بھی کیا۔ ہر سال رمضان المبارک میں وزن بڑھ جاتا ہے جسے اتارتے اتارتے کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔" میں نے اپنا فلسفہ سمجھانے کی کوشش کی۔ فیصل مان تو گیا مگر اس کے اندر کا چٹورا فیصل پوری طرح جاگ رہا تھا۔ سومنہ بنا ہوا تھا۔ رامس نے اچانک کھانے سے ہاتھ علیحدہ کرکے کرسی گھسیٹی' ہم دونوں ہی چونکے اور وہ بولے۔

"جس نے نفس پر قابو نہ پایا اس کی عبادات پتا نہیں کیسے کسی کھاتے میں شمار ہوں گی' بیٹا! اپنا کھانا سیکھو کہ سانس بھی روانی سے لے سکو۔" فیصل نے ایک لمحے کو ہاتھ روک کر باپ کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے پلیٹ صاف کرکے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گیا۔

"ٹھیک ہے آپ ان ہی کی بات مانیے' کوئی افطاری کا اہتمام نہ کیجیے گا' ہم شربت پی کر کھانا کھایا کریں گے۔" اس نے زیرلب کہا' جسے رامس نے نہیں سنا' مگر مجھے اس کے بچپنے کا یقین آگیا۔

"خیر اب وہ یہ بھی نہیں کہہ رہے کہ کوئی ایک آدھ چیز بھی نہ بنے' بس پچھلے برسوں والے عیاشی نہ ہو' یہ مطلب ہے ان کا۔" میں جلدی جلدی کچن سمیٹ رہی تھی۔

"ملک کے حالات دیکھو' لوگوں کی بیروزگاریاں' مہنگائی کی عفریت اور بیماریاں دیکھو تو سچی بات ہے کسی اضافی خرچے کے لیے دل مانتا ہی نہیں۔" میں پھر بولی' مگر فیصل اپنے کمرے میں جاچکا تھا۔

☆ ☆ ☆

چند روز بعد تصور بیگم کے ہاں افطاری لے جاتے ہوئے فیصل کی مدد چاہی تو وہ بولا۔

"پہلے بتائیں کیا لے جارہی ہیں' کہیں بے عزتی نہ ہوجائے۔"

مجھے غصہ آگیا۔ "کیا بات کرتے ہو' سیدھے سیدھے ٹرے پکڑ کے ساتھ چلو۔ مجھے واقعی بچے کاپوں کہنا برا لگا۔ ایک تو اس روز اہتمام بھی خوب کیا' ویسے بھی جمعہ کا مبارک دن تھا' اسی روز ان کے میاں ملائیشیا سے لوٹے تھے' گھر میں آنے جانے والوں کی گہما گہمی اور آوازیں بتا رہی تھیں کہ مصروفیت زیادہ ہے۔ میں چاہتی تھی کہ ان کا کچھ کام ہلکا کروں' اس لیے گھر اور بازار دونوں جگہوں کی خاص خاص چیزیں لے جارہی تھی اور جاتے وقت میں نے رامس سے بھی مشورہ کرلیا تھا اور یہ بچہ' عجیب سا سوال کر بیٹھا تھا۔

تصور اور سلیمہ دونوں ہی محبت سے ملیں' شکریہ بھی ادا کیا۔

"شکریے کی کوئی بات نہیں۔" میں اتنا ہی کہہ سکی۔

سلیمان صاحب بھی سامنے آگئے اور اپنی دوسری بہن وردہ کا تعارف بھی کرانے لگے جو شاید عصر کی نماز پڑھ کے بیٹھی تھیں' دوپٹہ ابھی تک ویسے ہی سر پر لپٹا ہوا تھا' ہلکا نور تھا ان کے چہرے پر۔ پتا چلا معذور بچوں کے ایک ادارے سے منسلک ہیں۔ میرا پوچھنے لگیں۔ میں لاہور میں بھی مختلف این جی اوز کے ساتھ مل کر دستاویزی فلموں کے اسکرپٹ لکھا کرتی تھی اور یہاں بھی ایک نجی چینل کے ساتھ منسلک ہونے والی تھی۔

"کچھ ہمارے ادارے کے لیے بھی پروموشن کا سلسلہ ہوسکے تو کیجیے گا۔ میں آؤں گی کبھی آپ کی طرف۔" اتنی دیر میں وہ برتن خالی کرچکی تھیں۔ سلیمان صاحب ملائیشیا کے انناس کا تحفہ دیتے ہوئے بولے۔

"بہت دن بعد ہمارے حساب کے کرائے دار ملے ہیں' بیٹا! رامس صاحب سے بھی کہنا چکر لگائیں' سلام کہنا ہمارا۔"

اور میں اللہ حافظ کہہ کر چلی آئی' سلیمہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئیں۔

"بیری کی کوئی تکلیف تو نہیں' اگر آپ کہیں تو صفائی میں کردیا کروں آکے؟" میں ششدر رہ گئی کہ انہوں نے بیری کا ذکر اور صفائی کی خدمات کیسے اور کیونکر پیش کردیں۔

"نہیں' نہیں سلیمہ! اس زحمت کی کوئی ضرورت نہیں' ماسی آتی ہے نا اور پھر جب ضرورت پڑے گی میں تو ہوں نا!"

ان کی آنکھوں میں ہزاروں دیپ جل اٹھے۔ شاید ان کے گمان میں تھا کہ میں سلیمان صاحب کو بیری کٹوانے کی تجویز دوں گی' لیکن ایسا بھی کم از کم اس وقت نہیں سوچا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ دل میں ایک خواہش تو تھی' چند روز اور معمول کے گزر گئے۔

☆ ☆ ☆

رمضان المبارک کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ٹیلی ویژن کے لیے دستاویزی فلموں اور لوک روایتی کرداروں پر رپورتیں تیار کرنے کا کام بڑھ گیا تھا۔ رامس مذاق میں کہا کرتے تھے۔

"کیا اتنے پیسے مل جائیں گے کہ بچن چل سکے؟"

جواباً" میری خامشی سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔

مجھے پروین شاکر کی نظم یاد آتی کہ کیسے ورکنگ وومن اپنی ہریالی کو اپنے لہو سے سینچتی ہے۔ وہ گویا ایسا پیڑ ہے جس کے سارے پتے شادابی کی نیک کمائی کماتے ہیں اور ان پر کسی ہوا اور بارش کا بال برابر قرض نہیں ہوتا۔ وہ عورت یعنی میں بھی آپ اپنی دریافت کرنے نکلی تھی اور ہر موسم سے سراونچا کرکے مل سکتی تھی۔

جب میں فیصل کے لیے ایک معمولی سا پین بھی خریدتی تو خود کو تناور پیڑ کی طرح محسوس کیا کرتی تھی۔ ورکنگ وومن اپنی زرخیز نمہ کے سارے امکانات کو پہچان لیتی ہے' بس اتنا سا غرور کرنے کا حق اس کا بھی بنتا ہے آگے اور زیادہ مقدار میں نہیں۔

"میں کبھی آپ کی... آپ کے وسائل کی ضرورت سے آزاد نہیں ہوسکتی۔" میں رامس پر باور کرنا چاہتی تھی' لیکن وہ ہر بار جلدی میں ہوتے "اوہو میرے بینکنگ آورز ہی ایسے ہیں۔" وہ آدھا کپ چائے حلق سے انڈیل کر (اسے چائے پینا تو نہیں کہہ سکتے۔) گاڑی بھگا کے چل دیتے تھے۔ ایک مخصوص جملہ میرے لیے رکھ چھوڑا تھا انہوں نے۔ "سی یو ان دی ایوننگ" اور ہماری شام اس قدر گہری ہوتی کہ رات اپنا دامن وا کرکے نئے بکھیڑوں سے ملنے کو تیار ملتی۔

مجھے بھی تنہائی کا روگ لگنے لگا تھا' انہیں تو خیر کراچی کی برانچوں کو منظم کرنے اور معیشت کو سنبھالا دینے کے لیے ایک بڑا ٹارگٹ پورا کرنا تھا۔ اس لیے بھی محنت کررہے تھے۔ میں آدھی آدھی رات تک اسکرپٹ لکھنے میں گزارنے لگی۔ ان ہی دنوں ایک روز تصور بیگم ملنے آئیں تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد سلیمہ کے لیے رشتہ تلاش کرنے کی درخواست کرنے لگیں۔ مجھے بڑی شرم آئی کہ میں کچھ بھی نہ کرتے ہوئے اس خاندان کے قریب تر کیسے ہوتی جارہی ہوں جو وہ اپنا ہر راز مجھ سے شیئر کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ویسے تو مسز زبیر نے مجھے سلیمہ کی دونوں شادیوں کے احوال بتائے تھے' لیکن میں نہ پیشہ ور میچ میکر (مشاطہ) تھی نہ کسی سے کہہ سن کر انہیں راغب کرسکتی تھی' پھر بھی میں نے انہیں دلاسہ دے کر کہا۔

"کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں' آپ بھی لوگوں سے کہیے' سنیے میں بھی کہتی ہوں۔"

اس رات... اضطرابی سی کیفیت کے کئی سبب تھے' ایک تو سندھ اور بلوچ قبائل کی عورتوں پر کیے جانے والے غیر قانونی' تہذیبی اور روایتی مظالم کی رپورٹنگ کے نکات اکٹھے کرنے پر دل بوجھل تھا۔ کچھ فیصل کی عید شاپنگ کا ہنگامہ تھا اور کچھ گھر کے امور منظم نہ رہے تھے۔ کام اور دباؤ کی مسلسل کیفیت کی وجہ سے نیند بھی بھرپور نہ مل سکی۔ دل چاہتا تھا کہ اگلا دن مکمل آرام میں گزرے۔ نہ کوئی آئے نہ کہیں جانا ہو۔ اور گھر میں بھی سکوت کی فضا رہے' مگر ہنستے بستے گھر ایسے نہیں ہوتے' فیصل کو عید تک کی چھٹیاں ملیں تو اب وہ وقت بے وقت سونے اور اپنی مرضی سے کھانے پینے کے علاوہ انٹرنیٹ پر بیٹھے رہنے کو ترجیح دینے لگا تھا۔ بچا کچھا وقت ہی نصابی کتابوں کے حصے میں آتا۔ زیادہ تر ڈزنی چینل دیکھنے میں گزرنے لگا۔

سلیمہ اب اکثر ہمارے گھر آنے لگی تھی' فیصل سے اس کی دوستی ہوگئی تھی' وہ اسے چیکو بیٹا کہا کرتی تو فیصل کو ہنسی آجاتی۔ ایک دن اس نے پوچھا۔

"امی میں اتنا گول مٹول تو نہیں' پھر چیکو سے میری شباہت کے معنی...؟" اس نے بات ادھوری چھوڑ کے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"پیاری پیاری باتیں کرتے ہو' بیٹھا بیٹھا سا لہجہ ہے تمہارا' سلیمہ نے چیکو کی نرمی' گداز پن اور مٹھاس محسوس کی ہوگی۔"

"ویسے اگر وہ مجھے جونز برادر کے کسی کردار سے تشبیہ دیتیں تو کیا بات تھی۔" وہ کمرے میں آویزاں قد آدم آئینے کے سامنے لہرا کر بولا۔

"فیصل' تم بھی ناڈزنی والوں کے دیوانے ہوگئے ہو' ہر چیز میں انہیں آئیڈیلائز کرنا درست نہیں اور وہ لوگ بھی دن رات محنت کے بعد اس مقام تک پہنچے ہیں۔"

میں نے جلدی جلدی اس کا بکھرا ہوا کمرہ ٹھیک کیا۔

"اب آپ کہیں گی تم سے تو جوتے تک ڈھنگ سے نہیں رکھے جاتے تم تو چیکو بیٹا نہیں پھوہڑ لڑکے ہو۔" اور کہاں تو مجھے الجھن ہونے لگی تھی' مگر مجھے بھی ہنسی آگئی۔

"کیا امی! ان سلیمہ آنٹی کا کوئی بیٹا تھا میری عمر کا؟" اب وہ سنجیدہ گفتگو کی طرف آگیا۔

"بچے کا تو مجھے پتا نہیں شادی ٹوٹ گئی اتنا علم

ہے۔" اتنا کہہ کر مجھے اپنی ہی بات پر ندامت محسوس ہوئی' بچے کے سامنے شادی ٹوٹنے کا ذکر کیسے کرلیا میں نے؟ بس اسے کہیں اور سے تو پتا چلتا اور شاید سلیمہ خود بتادیتی' کمرے سے باہر نکلتے ہوئے میں نے دیکھا فیصل کسی کا میسج پڑھنے میں مشغول تھا' شاید اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

دو' چار روز پھر مصروفیت کے گزر گئے۔ ایک سہ پہر غزالہ آپی میری بڑی بہن کا لاہور سے فون آیا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگیں کہ ایک مشکل آن پڑی ہے' جب سے پروین ان کی دیورانی کا انتقال ہوا ہے دونوں بچے سنبھل کے ہی نہیں دے رہے' اپنی ماں کو تو یاد کرتا ہی ہے' باپ تک کے قریب نہیں جاتے' وہ شاید سمجھتے ہوں کہ ان کے والد نے امی کا علاج نہیں کروایا' ٹھیک ہے' ہمارے رشتہ داروں کا حال احوال بھی تو ایسا ہی ہے نا جو بات کرتی' بچوں کی موجودگی میں کرتی' مجال ہے ذرا احتیاط کرتے ہوں۔"

"جی ہاں غزالہ آپی! یہ تو میں نے سوئم والے دن محسوس کرلیا تھا کہ دونوں طرف کچھ الجھنیں اور فاصلے ہیں نہ بچوں کے ننھیال والے کھل مل رہے ہیں اور نہ ددھیال والے آگے بڑھ کے بھوکے والدین یا بہن' بھائیوں کا دکھ سمجھ رہے ہوں' جبکہ پروین جب بیمار پڑی تھی تب تو یہ ہی سننے میں آیا تھا کہ بریسٹ کینسر ابتدائی اسٹیج پر ہے' سرجری کے بعد کچھ کیموتھراپی کے کچھ مراحل ہوں گے اور پھر احتیاطی تدابیر کے ساتھ انہیں ایک معقول عمر مل جائے گی زندہ رہنے کے لیے۔ لیکن علاج میں کچھ عرصے کا تعطل اسے وقت سے پہلے موت سے ہمکنار کرگیا۔

چلو انسانی غلطیوں کو مقدر کے کھلے پردے میں لپیٹنا اور معصوم بن جانا تو ہم انسانوں کا شیوہ ہی ہے' اچھا آپی! میرے قریب یہاں ایک طلاق یافتہ خاتون ہیں آپ عید کے بعد کراچی آجائیں یا چھٹیوں میں بچوں کو بھی لے آئیں' یہاں بات چلائیں' دیکھیں شاید شہزاد بھائی کا دوسری مرتبہ گھر بسے تو بچوں کے حق میں کچھ بھلا ہوجائے اور ان خاتون کی ذہنی کیفیت بھی بہتر ہوجائے۔"

میں نے کہنے کو اتنی بڑی بات کہہ دی' مگر انجام سے ڈر بھی لگتا تھا' اچانک کامیابی سے شطرنج کھیلتے کھیلتے پانسہ الٹ جائے تو ہاتھ یا کھیل بگڑ سکتا ہے۔ یہاں تو دو معصوم بچوں جن کی عمریں دس اور آٹھ سال کی تھیں' ان کے جذباتی اور نفسیاتی مسائل اور خلا کا سوال تھا۔ اگر سلیمہ یہ خلا پورا نہ کرپائیں تو' ساری عمر کا الزام اور ناکام تجربے کا احساس مجھے بھی تو مار ڈالتا۔ تخلیق کا کرب سہے بغیر ماں بننا آسان نہیں ہوا کرتا۔ فطرت اس منہ بولی ماں میں ویسے نتھرے اور پاکیزہ جذبے بھی بھر دے' یہ ممکن ہوسکتا ہے' مگر یہ تو ذرا تصوراتی اور خیالی سی ہے اور سلیمہ کے ساتھ دو مرتبہ گھر اجڑنے کے تجربے نے مجھے ڈرایا ہوا تھا۔

میں نے رمضان کے آخری عشرے میں تمام کام لپیٹ کے رکھ دیے تھے۔ اب میں صرف اپنا اور دو سروں کا گھر بسا رہنے اور بھرپور اعتماد بھری زندگی گزارنے کی دعا کرنے لگی تھی۔ پچھلے دنوں میں نے دستاویزی فلموں کی ایک سیریز مکمل کی تھی' جس میں مختلف قبیلوں' برادریوں اور خاندانوں میں بیاہتا عورتوں کے مسائل زیر بحث لائے گئے تھے۔ اب تک کی فیچر اور دستاویزوں میں پیش کاروں نے روایت کے چشمے سے مرد کو ظالم اور عورت کو نہتا اور کمزور ہی نہیں مظلوم ثابت کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی تھی۔ مگر میرا نظریہ ذرا مختلف تھا۔ میں نے کوشش کرکے ایسی عورتوں کے انٹرویوز لیے جنہوں نے براہِ راست مرد جیسے پہاڑ سے ٹکر لی تھی۔ اپنا آپ ظاہر کرکے اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیا اور خود کو شادی کے بندھن سے آزاد کرلیا۔

جو اپنی منشا اور مرضی سے جینا چاہتی تھیں۔ جنہیں مرد کی تعمیر کی ہوئی جاگیر نہیں بھا سکی تھی یا جنہیں مرد کی بلاوجہ کی حاکمیت پسندی اچھی نہیں لگی' یعنی ایسی انا پرست عورتیں جنہوں نے بہشتی زیور کی ابتدائی

معلومات بھی حاصل نہ کی تھیں یا جن کی ماؤں نے انہیں وفا کی گھٹی نہ دی تھی۔ کچھ اپنی نا سمجھیوں اور جہالت کے ہاتھوں اجڑی بیٹھی تھیں تو کچھ کے ساتھ بری گھڑیوں کے آسیبی سائے تھے۔ ان کی کتھا کہانیاں سن کر دہائی میں آنا ایک فطری سی بات تھی۔ مگر ان ہی عورتوں نے مجھے مذہب کے قریب بھی کردیا تھا اور مجھے سمجھ میں آنے لگا تھا کہ انسانی زندگی اور معاشرہ بھی جگسا پزل کے ایک ٹکڑے کے اِدھر اُدھر ہوجانے یا غلط فکس ہوجانے پر بے ربط' بے ترتیب اور مضحکہ خیز شکل اختیار کرسکتے ہیں۔ قدرت نے اپنے اس زیور کے ہر ہر جز اور نگینے کاٹنے اور پیچ و خم کی جگہ بڑی حکمت سے رکھی ہے۔ انسان کی بدھی میں اس کی حکمت کے یہ راز سوچنے سمجھنے والوں ہی کو نظر آسکتے ہیں۔

غزالہ آپی کے شوہر محسن صاحب کو اپنے بڑے بھائی کے بائی پاس آپریشن کے لیے لاس اینجلس جانا ضروری تھا' کیونکہ محسن بھائی وہاں اکیلے تھے' بھابھی تھیں تو مگر وہ آرتھرائٹس کی مریضہ تھیں اور ظاہر ہے کہ جب ایک فریق وہیل چیئر پر ہو تو دوسرا مریض ساتھی کا بھرپور انداز میں کیسے خیال رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ ہی ایک موقع تھا جب برسوں بعد غزالہ آپی اپنے بچوں راشد اور حفصہ کے ساتھ تحسین (اپنے دیور) کے دونوں بچوں کو لے کر کراچی آئیں۔ تحسین بھائی امریکہ نہیں جاسکتے تھے' کوئی کاروباری الجھن بھی تھی اور سرمایہ بھی خاصا ورکار تھا۔ اس لیے طے یہ پایا کہ ایک ہفتہ بعد وہ کراچی آکر بچوں کو ساتھ لے جائیں گے۔ غزالہ آپی بھی اسی طرح لوٹ جائیں گی' سفر میں دو سراہٹ ہوجائے گی۔ ویسے تو اندرونِ پاکستان ہی سفر کررہی تھیں۔

ان دنوں بچوں کے روزانہ ہی فون آنے لگے' کسی کی چپل کی خریداری نہ ہوسکی تو کسی کی میچنگ چوڑیاں نہیں مل پائیں اور میں سب کو دلاسہ دیتی جاتی اندر سے بہت دنوں بعد بیٹیوں کی چیزیں خریدنے کا ارمان پورا ہوتا نظر آرہا تھا اور میں خوش تھی کہ طارق روڈ یا حیدری کی پُررونق مارکیٹوں میں کچھ دیر کسی بڑے اہم مقصد کے لیے گھوم سکوں گی۔

بچوں کو باہر کچھ کھلاؤں گی' ان کی شراتوں سے محظوظ ہوں گی اور کوشش کرکے آپی کو بھی پیسے خرچ کرنے کا پورا پورا موقع دوں گی۔ بیس برسوں میں صرف دو' چار عیدیں ہی ہم نے اکٹھی گزاریں' باقی تو روٹین کی عیدیں تھیں۔ فیصل نے عید کے مینیو سیٹ کرنے کی ذمہ داری قبول کرلی تھی' وہ دوستوں سے ان کے تجربات کی روشنی میں ریسٹورنٹس سے متعلق معلومات اکٹھی کرنے لگا۔ اسے اپنے کپڑوں کی فکر اس لیے نہ تھی کہ آج کل ڈیزائنر زنے یہ درد سری اپنے کاندھوں پر لے کر کسٹمر کو فکروں سے آزاد کردیا ہے' یہ اور بات ہے کہ فکروں کی اس آزادی کی قیمت ذرا بڑھ گئی ہے۔

دوپہر کے وقت آپی کا فون آیا تو انہوں نے بچوں کی خوشیوں کے قصے سنائے' کچھ نے تو پیکنگ مکمل کرلی تھی۔

"اور تحسین بھائی کے بچے' کیا وہ بھی اتنے ہی ایکسائٹڈ ہیں؟" میں نے پوچھا۔ آپی کچھ دیر رک کر بولیں۔

"انہوں نے تمہیں بہت بچپن میں دیکھا ہے' اس لیے وہ بھی سوال کررہے ہیں' وہ کیسی ہیں؟ فیصل بھائی کتنے بڑے ہیں؟ ان کے گھر میں اور کون کون ہے' کیا ہم اپنی مانو بلی کو ساتھ لے جاسکتے ہیں' وہ تو میں نے صاف منع کردیا ہے کہ اسے تو تم پیا کے پاس ہی چھوڑ کے جاؤ' بلیوں کو کون جہازوں میں سفر کرائے۔"

"میں ہنستی چلی جارہی تھی۔"

"دیکھو' فیصل سے کہنا سارے بچوں کے ساتھ اکٹھے مل جل کر رہے' ہم جس مقصد کے لیے خاص طور پر جارہے ہیں وہ تو قسمت سے ہوگا۔" وہ کچھ دیر توقف کیے رہیں تو میں نے پوچھا۔

"آپی! کوئی ایک مسئلہ ہے' کیا تحسین بھائی اب کسی اور کو پسند نہیں کرنے لگے؟ میرا مطلب ہے دوسری شادی تو کرنی ہی ہے' اس خیال سے کچھ اور تو سوچ

نہیں رکھا انہوں نے؟"

"تو یہ خیال تو مجھے پہلے آگیا تھا اور میں صاف صاف پوچھ چکی ہوں' وہ شخص ایسا ہے ہی نہیں۔۔۔ یہ تو ہم لوگ ہی پکڑ کر رشتہ کروا دیں تو وہ کر بھی لیں گے' ورنہ وہ تو کہتے ہیں۔ مجھے ان دنوں ماں بننے سے جتنی توانائی مل رہی ہے میں بتا نہیں سکتا۔ شاید پروین جاتے جاتے اپنی ماتا مجھے کر گئی ہے۔

اور واقعی وہ پہلے سے زیادہ ذمہ دار اور حساس باپ ہو گئے ہیں' پہلے کبھی بچوں کو نظر انداز بھی کر دیتے تھے۔ مگر اب نہیں گورنس کرتے ہیں ٹھیک ٹھاک قسم کی۔ اتنے صاف ستھرے اور اسکول جانے کے پابند بچے بہت کم ہوتے ہیں' ہم تو دونوں میاں' بیوی ڈنڈا لیے گھومتے رہتے ہیں کہ اب کھیلنے کا وقت نہیں ہوم ورک مکمل کرو' کمپیوٹر پہ نہ بیٹھو ٹی وی کھول لو' بند کردو' مگر وہ بچے بچے میرے پاس بھی آتیں تو سنجیدہ ہو کر رہتے ہیں' نہ پہلے جیسی شرارتیں اور نہ بدتمیزیاں' شاید ہم سب نے انہیں خصوصی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ انجانے میں شاید ہمیں پروین سے کیا ہوا عہد یاد آرہا ہے کہ ہم تمہارے بچوں کا خیال رکھیں گے' وہ ہمیں بھولتی نہیں بہت نفیس عورت تھی اور غرور نام کو نہیں تھا اور اب ڈر بھی لگتا ہے کہ پتا نہیں دوسری شادی کے بعد تحسین بھائی بچوں کو کیسا رکھیں' اور۔۔۔"

میں نے قطع کلامی کی معذرت کرتے ہوئے آپی سے کہا۔ "ٹھہریے آپی! ہم لوگ ڈرتے رہے تو ممکن ہے زندگی مزید الجھنوں میں گھر جائے' یہ رسک تو کسی کو لینا پڑے گا۔ ہمیں بچوں کے ساتھ ساتھ تحسین بھائی کی بیاہتا زندگی کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے' وہ جوان ہیں' دنیا عورتوں سے بھری پڑی ہے' بس طرح تنہا عورتوں پر شہد کی مکھیوں کے چھاتے لگتے ہیں' تنہا مردوں پر دوڑے ڈالنے والیوں کی کمی ہے کیا؟ اس صورت میں ان کا گھر بس جانا ہی اچھا ہے۔ فیملی لائف کا خلا پر ہونا ضروری ہے۔" اور پھر ہم دونوں بہنوں کو اپنے ضروری کام یاد آگئے' یوں ہم نے فون بند کر دیا۔

اسی طرح دنیا اپنے اپنے کاموں میں مگن ہو جاتی ہے اور ہم لوگ بھول جاتے ہیں کہ جن کی زندگیوں میں کوئی کمی رہ گئی ہے یا جو نظرات کا شکار ہیں ان کی الجھنیں کیسے دور ہوں گی۔ ان کے بہلاوے یا دلچسپی اور زندگی کی حرارتوں کو محسوس کر کے زندگی جینا کس قدر دشوار ہو جاتا ہے۔

اس شام گئے رامس سے باتیں کرتے ہوئے فیصل نے مہمانوں کی آمد اور آؤ بھگت کی تفصیلات بیان کیں' پھر وہ نائٹ کرکٹ کھیلنے چلا گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

"ان لوگوں سے بھی تو ان کا عندیہ لینا چاہیے تھا۔ اپنے بچوں کے مل بیٹھنے کے بہانے تو اور بھی آئیں گے' میں باہر جا رہا ہوں' تم چلی جاؤ ان کے یہاں اور بات کرو۔"

چند لمحوں بعد اتفاق سے وسطی دروازہ بجنے کی آواز آگئی۔ میں لیپ ٹاپ پر نیل چیک کرتے ہوئے وہیں سے بولی۔

"جی آرہی ہوں۔"

یہ سلیمہ تھیں۔ ہاتھوں میں ایک ڈش ـــــ ریپر سے ڈھکی ہوئی تھامے کھڑی تھیں۔

"کبھی ایسے بھی آجایا کریں' آپ تو ہر بار کچھ نہ کچھ لے ہی آتی ہیں۔" مجھے واقعی شرم محسوس ہوئی کہ بہت دن ہوئے میں نے انہیں کوئی تحفہ نہیں دیا' کوئی سوغات بھی نہیں' جبکہ ان ہی کے بارے میں دن رات سوچتی رہتی تھی۔

"عید کی خریداری مکمل ہو گئی آپ کی؟" میں نے رسماً شکریہ ادا کر کے ڈش میز پر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"میں نہیں کرتی کوئی اہتمام' بچہ تھوڑا ہی ہوں۔" مجھے احساس ہوا کہ یہاں بات برائے بات کرتے ہوئے غلطی ہی ہو گئی۔

"آپ تو فیصل کی وجہ سے بھی اور بھائی صاحب کی خوشی کے لیے بھی نئے کپڑے جوتے وغیرہ لیتی ہوں گی۔" ان کی آنکھوں میں حسرت کے جذبے محسوس کیے جا سکتے تھے۔

"ہاں۔۔۔ یہ دونوں ضد کرتے ہیں تو کچھ نہ کچھ لے لیتی ہوں' مگر حالات اور موسم کی وجہ سے ہلکے پھلکے سوتی کپڑوں کے سوا کچھ نہیں' البتہ اس مرتبہ بڑی بہن اپنے اور دیور کے بچوں کے ساتھ عید یہاں میرے پاس منائیں گی' اس لیے کچھ ہلا گلا کر لیں گے' ورنہ سیلاب کی تباہ کاریاں دیکھ کر دل بجھ گیا ہے' صرف فرض ادا کرنا ہیں۔"

"بھائی' بھابھی نے بھی کوئی اضافی خرچہ نہ کرنے کی دہائی دی ہے۔ اپنے پیارے دکھ تکلیف میں ہوں تو کوئی عید منائی جا سکتی ہے؟" وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"بالکل۔۔۔ کہاں تو عید کے نام پر چار' چار جوڑے بن جاتے تھے' اب ایک تو مہنگائی اور دوسرے سیلاب کی وجہ سے بھی ایک جوڑا بنایا ہے' فیصل کو بھی اسراف سے ڈرایا ہے' بچہ ہے' سمجھ گیا ہے۔"

"آپ کے ہاں بڑی خاموشی رہتی ہے' حالانکہ بچہ ہے۔" وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔

"بچہ بڑا ہو گیا ہے' اب گلی ڈنڈا نہیں کھیلتا' کرکٹ کھیلنے بھی ناظم آباد کے گراؤنڈ میں جاتا ہے' آج اس کا نائٹ میچ ہے' سحری کر کے لوٹے گا' اس کے ابو ایک این جی او کے لیے عطیاتی مہم کے سلسلے میں گھر سے باہر ہیں' بلکہ ہر دوسرے تیسرے دن یہ ہی مصروفیت رہنے لگی ہے' اس مرتبہ رمضان المبارک اور عید بڑے عجیب حالات میں آئے ہیں۔ تہواروں کے مواقع ایسے افسردگی لیے' آئیں تو زندگی کی کشش جاتی رہتی ہے۔"

کچھ دیر کے لیے ہم دونوں چپ ہو گئے' لائٹ چلی گئی' ان دنوں ہمارا UPS سسٹم خراب پڑا تھا۔ میں نے ایمرجنسی لائٹس آن کیں اور کچھ چند موم بتیاں بھی روشن کر دیں۔ دل بوجھل تھا کہ اب یہ جلدی چلی گئیں تو بات کیسے کرپاؤں گی' مگر وہ اندھیرے میں نہیں گھبرائیں' بلکہ زیادہ اعتماد سے بیٹھ گئیں۔

"ہم نے پہلے یہاں موٹے موٹے رسوں کی مدد سے ایک جھولا ڈالا ہوا تھا۔" وہ بیری کی ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

"اچھا۔۔۔ کتنا لطف آتا ہو گا پینگیں بڑھانے اور ہوا سے باتیں کرکے۔" میں نے بات آگے بڑھائی' تاکہ ان کی دلچسپی قائم رہے۔

"ایک دفعہ میں گرتے گرتے بچی تو' حسن نے بہت ڈانٹا تھا' کیا سولہ سال کی ٹیار بنی جھولے جھولتی ہو' اس عمر میں ہڈی پسلی ایک ہوئی تو کیا ہو گا؟" یادیں تلخ بھی ہوتی ہیں' ہمیشہ فرحت بخش نہیں ہوا کرتیں۔

اور میں سوچنے لگی کہ جس شخص کا ذکر اتنی محبت سے وہ کر رہی تھیں اس نے کوئی رومان پرور یا خوش کن بات تو کبھی نہیں کہی' پھر بھی جھولے سے جڑی یاد انہیں یاد تھی' جس کا تذکرہ کرنا انہیں برا نہیں لگا۔

"میں جب آپ کے پورشن میں آتی ہوں تو مجھے اپنی پچھلی زندگی یاد آجاتی ہے' میرا جی چاہتا ہے میں کسی کو بتاؤں یا خود کو احساس دلاؤں کہ کبھی میں بھی زندہ تھی۔ وہ رک رک کر اپنا ماضی کریدنا چاہتی تھیں' میرے پاس بھی اور کوئی ضروری کام نہ تھا۔

"میں آپ کو بتاؤں۔۔۔ میں ایسی ہمیشہ سے نہیں ہوں' میں نے بی ایس سی کیا تو امی' ابو نے میری منگنی کر دی' اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ وہ صاحب شادی سے زیادہ امریکہ جانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ میرے بہنوئی امریکہ میں تھے' بہن آتی جاتی رہتی' وہ اسی چاہت میں میرے قریب آنا چاہتے تھے۔ لیکن ایک شخص اور بھی ان سے کہیں زیادہ مجھ سے انسیت کا اظہار کرتا تھا۔ اس کی باتوں میں وفا کی خوشبو کو میں محسوس کر سکتی تھی۔ وہ کمپیوٹر کی دنیا کا شخص تھا' اسی کاروبار میں ایک پی سی خریدتے خریدتے ہماری دوستی ہوئی' ان کے پروپوزل سے پہلے ہی میں انہیں بتا چکی تھی کہ سال بھر بعد میری شادی طے ہے۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میری حیرانگی بجا تھی۔ میں دراصل چاہتی تھی کہ وہ میرے لیے بغاوت کریں۔ میں خوش شکل تھی اور صاحب حیثیت بھی۔

انہوں نے ایک مرتبہ اپنے گھر مدعو کیا۔ تنگ و تاریک گلیوں میں غریبوں والے محلے جا کر مجھے زندگی کا

اصل روپ نظر آیا۔ ابلتے نالے، گلی کے کتے، مچھروں، کاکروچوں اور چوہوں کی بھرمار والی گلیوں کے بیچوں بیچ منی پلانٹ اور بوگن ویلیا کی بیلوں سے آراستہ مختصر سے آنگن اور چھوٹے چھوٹے کمروں والے گھر میں داخل ہوتے ہی موٹر سائیکلوں کی گریس اور فرش پر گرے پیٹرول کے دھبوں نے مجھے ریڈ کارپٹ دیا۔ گھر کا ہر فرد مسکراتا تھا، کسی نے جالی تو کسی نے ململ کے کاڑھے ہوئے دوپٹے اوڑھے ہوئے تھے۔ ایک جگہ تخت پر اماں بی قسم کی بزرگ خاتون مصلیٰ بچھائے لیٹی تھیں، پھر وہ آہٹ پا کر اٹھ بیٹھیں، مجھے شرم آئی کہ شاید میری آمد نے انہیں بے آرام کیا، مگر ان کے چہرے پر تختی تھی، میں خاموش ہو گئی۔

نعمان احمد صاحب نے مجھے ٹیبل ٹینس والے کمرے میں بٹھا دیا اور خود کہیں باہر چلے گئے۔ ٹاٹ کا پردہ سرکا تو ایک درمیانی عمر کی عورت لسی کا گلاس لیے کمرے میں داخل ہوئی، میں نے ادب سے کھڑے ہو کے سلام کیا۔ انہوں نے جواب دے کر کہا، میں نعمان کی بڑی بھابھی ہوں اور یہ خوشنودہ چھوٹے بھائی کی بیوی ہے۔ ایک جارجٹ والے سوٹ میں ملبوس شرمیلی سی خاتون کو انہوں نے گھسیٹ کر میرے سامنے کر دیا، جو ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ پنکھے کی ہوا نے گریس اور پیٹرول کے بھبکوں پر قابو پا لیا تھا۔ میں مسہری کی ایک جانب بیٹھ گئی۔

"آپ نعمان کے ساتھ پڑھتی ہیں؟ کچھ کام کرتی ہیں، میرا مطلب ہے ٹیچری، کتنے بھائی، بہن ہیں، آپ کا گھر کہاں ہے؟ کیسے آئی ہیں، میرا مطلب ہے سواری پر یا اپنی گاڑی پر؟" نعمان نے کہا تھا بہت بھولی بھالی سی بچی ہے۔ دیکھو گے تو پسند ہی کرو گے۔ دراصل وہ خود تو بہت شرمیلے ہیں، کچھ بتاتے ہی نہیں یہ تو ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ آپ کو پسند کرتے ہیں۔"

عورتوں نے اپنے باتونی ہونے کا مکمل احساس دلایا، میں نعمان کی چاہت میں اس قدر گم تھی کہ مجھے اِدھر اُدھر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، بس میں نئی نویلی دلہن کی طرح ہوں ہاں کر رہی تھی، ایسا لگتا تھا آج ایک امریکہ میں نے دریافت کیا ہے، جہاں معصوم اور بھولے بھالے لوگوں کی جماعت آباد ہے، پیار کی روانی ہے اور بہت زیادہ انسیت کے ساتھ ساتھ سادگی ہے۔

نعمان کو شاید پتا نہیں تھا کہ بھابھی لسی بنا چکی ہیں، وہ میرے لیے کولڈ ڈرنک لے آئے۔

"ارے چھوڑیں یہ کیا خوشنودہ! تم نے لسی کیوں بنائی، میں لا رہا تھا نا کولڈ ڈرنک یہ تو یہ ہی پیتی ہیں۔" اور بڑی بھابھی نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں نہیں یہ تو میں لائی ہوں، تم نہ جانے کہاں چلے گئے تھے، میں سمجھی شرما کر چلے گئے ہو، خاطر مدارت تو عورتیں ہی کرتی ہیں نا!"

"نہیں۔۔۔ یہ ٹھیک ہے بہت اچھی ہے۔" میں نے نعمان کو بوتل کھولنے سے منع کیا۔

"آپ لوگ لیجیے نا۔" اب میں نے ہمت کر کے بھابھیوں کو آفر کی، لیکن وہ دونوں گم صم تھیں اور انہوں نے نعمان کو بیٹھنے کا کہہ کر آہستہ آہستہ کمرہ خالی کر دیا۔

"یہ دیکھا، مگسی۔۔۔ یہاں کچھ نہیں ہے، اب تو ضد چھوڑ دو، میں کچھ نہیں دے سکتا تمہیں سوائے ذمہ داریوں کے بوجھ کے۔" انہوں نے برملا کہا اور مجھے ان کی میلی کچیلی جینز سے بدبو آتی بری نہیں لگی، تب تک میں نے سوچ لیا تھا، امی کو جا کے ساری صورت حال بتا دوں گی اور شاید وہ عاکم آباد والے گھر کا ایک پورشن کرائے داروں سے خالی کروا کے مجھے دے دیں تو میں اپنی گرہستی وہیں شروع کر لوں گی۔ اس امید نے میرے اندر پہلوانوں کی سی طاقت بھر دی، میں روح تک سرشار ہو کر لوٹی۔ نعمان بڑی سڑک تک چھوڑنے آئے، وہاں سے رکشہ لے کر گھر آنے تک ان کی بے ترتیب سانسوں کی سنگت میرے عشق کو گہرا کرتی چلی گئی تھی۔

میں نے باجی سے تذکرہ کیا تو انہیں بہت برا لگا۔ انہوں نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ "کبھی ذکر بھی نہ کرنا۔ تم سے چھوٹی بھی ایک بہن ہے، اس پر تمہاری

اس بغاوت کا کتنا غلط اثر پڑے گا جانتی ہو۔ لوگ ہمیں بدکردار سمجھیں گے۔ کبھی اس طرح انجانے والوں میں رشتہ ہو سکتا ہے۔ پھر جس کے پاس نہ حیثیت ہے، نہ گھر وہ صرف کمپیوٹر بیچنے والی ایک کمپنی کا سیلز مین ہی تو ہے اور تم خود کو سنبھالو، منگنی ہو چکی ہے تمہاری، ان لوگوں کو بھنک بھی پڑ گئی نا تو ہم سب بدنام ہوں گے۔"

"پھر بھی آپ اماں سے بات تو کر کے دیکھیں۔"

"میں تو اماں سے کہنے والی ہوں کہ کل کی کرتی آج بیاہ کر دیں تمہارا، تم کن خیالوں میں کھوئی ہوئی ہو۔" وہ بہت ناراض تھیں، اُدھر نعمان احمد کہہ رہے تھے کہ ضد چھوڑ دوں، اُدھر آپی ناراض تھیں اور میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اسکول کی ساتھیوں، کالج کی دوستوں اور ایک تو ٹیوشن سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے اماں، ابو کے کہنے کے مطابق شادی کر لی اور سوچ لیا کہ زندگی کو عملی انداز ہی میں گزارنا بہتر ہو گا، ورنہ اماں، ابو سے لے کر بہن، بھنوئیوں تک سب کو یا تو چھوڑنا پڑے گا یا پھر۔۔۔ اس سے آگے میری ننھی منی فکر کام نہیں کرتی تھی۔

بزرگ کہتے تھے کہ شادی جوا ہوتی ہے، وہ آج بھی یہ کہتے ہیں، وہ تو کہتے ہی رہیں گے، کیونکہ یہ ہی سچائی ہے، لیکن پتا نہیں کیوں ساری منطقیں اور سچائیاں میرے ہی نصیبوں کے کھاتے میں لکھ دی گئیں اور بھی دو بہنیں ہیں، انہیں سسرال والوں کی کسی آزمائش میں مبتلا نہیں ہونا پڑا۔

مجھے اس گھر میں صابر لوگوں سے کہیں زیادہ اسٹیٹس کے بدلنے والوں سے سابقہ پڑا۔ مہنگائی نے گھر میں جھاڑو پھیری، مگر چار بہوئیں گھر میں تھیں اور چاروں کی چاروں پیچھے سے کھاتے پیتے گھرانوں سے آئی تھیں۔ وہ اپنا دھن بھی یہیں نچھاور کرنے لگیں۔ مجھ سے بھی یہ ہی توقع کی جانے لگی، کبھی کوئی بل پکڑا دیا جاتا کہ یوٹیلٹی بل آپ ادا کر دیں، میں لفظوں اور ہندسوں کے اعداد و شمار پڑھ کر چکرا جاتی۔ کچھ عرصہ بعد شوہر صاحب نے سارے تکلفات بالائے طاق رکھ کر صاف صاف کہہ دیا کہ آپی سے بات کر لو، کینیڈا اور امریکہ ہی میں ہمارا مستقبل محفوظ ہو گا۔ یہاں تو آئے دن ہڑتالیں اور سوگ میں کاروبار بند رہتے ہیں، گھر کا خرچہ ہی دیکھ لو یہاں پڑے رہے تو جتنا کماتیں گے سب خرچ ہو جائے گا۔ پھر اپنے بچے معمولی اسکولوں، کالجوں میں پڑھ کر کیا بن کر نکلیں گے، باہر کی ڈگریوں کی ویلیو دیکھو، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے گھر آ کر ان سب کو بتایا تو سب ہی شش و پنج میں پڑ گئے۔ ان دنوں میرا دوسری مرتبہ حمل گرا تھا۔ میں تکلیف میں تھی۔ اس لیے مکے آئی تھی۔ یونہی بے دھیانی میں ایک بار پلی سی پہ بیٹھے بیٹھے فیس اپنی ای میلز چیک کیں، کچھ سہیلیوں کے تبصرے اور آرا پڑھیں اور پی سی بند کر دیا، یہ تو واقعی ایک دلچسپ ترین گورکھ دھندہ ہے، جس میں ایک قدم رکھو تو دھنستے چلے جاؤ۔

جس روز میں نے سہ پہر کو اپنے گھر جانے کی ٹھانی تو اماں کے کہنے کے باوجود اپنے شوہر امیر علی کا انتظار نہ

محبت کے نرم اور سبک جذبوں کو الفاظ میں ڈھالنے والے مشہور و مقبول شاعر
امجد اسلام امجد
کا نیا شعری مجموعہ
نزدیک
قیمت۔۔۔ -/550 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37- اردو بازار، کراچی۔

کیا۔ ڈرائیور نے بیل بجائی اور میرا بھتیجی کیس دروازہ کھلتے ہی دالان میں رکھا۔ میں نے دیکھا کہ لان کی گھاس لاوارثوں کی طرح بڑھ چکی تھی۔ سخت سردیوں کا زمانہ آنے والا تھا اور جب کہ پڑے گا تو یہ ہی ہری بھری گھاس پہلی پڑ کر مرجائے گی۔ ہنستے بستے گھر میں نہ جانے وحشت کیسی تھی۔

میں کمرے میں گئی تو یوں لگا مجھ سے پہلے چور گھس کر نکلے ہیں، امیر علی کہیں نہ آیا سلیقہ اپنے کپڑوں کو سنوارے رکھنے کا! میں نے اپنے آپ سے کہا اور میرے ہاتھ ہینگروں اور الماریوں کے پٹوں کے درمیان یل سے بن گئے۔ میں کمرہ ٹھیک کر رہی تھی۔ گھر کے باقی لوگ سو رہے تھے یا گھر پر نہیں تھے۔ ملازم نے مجھے نہ کچھ بتایا نہ میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ اتنے میں لائٹ چلی گئی، میں نے کمرے کا دروازہ یوں بھی ادھ کھلا ہی چھوڑا تھا۔ ڈھلتی سہ پہر کی نرم دھوپ اندھیرے کی سوا کے لیے تیار کھڑی تھی ابھی کہ ساس صاحبہ فون کا ریسیور تھامے وہاں سے گزریں، وہ کہہ رہی تھیں۔

"بھئی آج بیس روز ہوگئے منجھلی بہو میکے پڑی ہے، بچہ وچہ ان کے نصیب میں ہوتا نظر نہیں آتا میں نے تو امیر علی سے کہہ دیا ہے نہ بچہ ہے نہ امریکہ کا ویزا ہی اب تک لگا ہے تو ویر کاہے کی اس ڈاکٹرنی کو پکڑو جس کے باوا امریکہ لے جا کر بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دفعہ بچہ امریکہ کی زمین پر قدم تو رکھے بچہ وچہ بعد میں دیکھا جائے گا اور سنو کل شام تم بھی تیار رہنا لڑکی دیکھنے جائیں گے۔ ارے نہیں یہ تو بہانا ہے امیر علی نے خود ڈھونڈی ہے دیکھ بھال کر ہی لی ہوگی۔ مستقبل دیکھو پورے کنبے کا سنورے گا اور میں سلیمہ کو نکالوں گی تھوڑا ہی یہ تو بہت خدمت گزار ہو ہے میری، بڑھاپے کا واحد سہارا۔"

اور اس روز مجھے اپنے تاریک مستقبل کا بخوبی اندازہ ہوگیا۔ نقاہت اور طویل افسردگی کی وجہ سے میں نڈھال پہلے ہی تھی، اب تو پلنگ کا سہارا لیے ایک جانب ٹک سی گئی۔

پہلی مرتبہ نعمان احمد کو میں نے عملی زندگی گزارنے کے لیے بھولنا چاہا تھا اور آج امیر علی نے عملی زندگی کی تفسیر سمجھنے کے لیے میری ریاضتوں اور وفا کی قربانی دے دی تھی۔ کچھ بھی ہو تا صبر آجاتا، لیکن رات گئے جب وہ دفتر سے لوٹے اور مجھے کمرے میں پایا تو درشت لہجے میں بولے۔

"کس نے بلایا ہے؟ کون لایا ہے؟ کیوں آئی ہو۔"

اور پھر وہ ایک رات گزار کر اگلے روز میں پھر میکے میں موجود تھی۔

امی، ابو، بہن، بھنوئی کہتے رہ گئے کہ ہمیں کچھ وقت دے دیں، ہم انتظام کرلیں گے، لیکن امیر علی کو بہت جلدی تھی۔ مجھ بے وقوف کو بہت دن بعد پتا چلا کہ ہم میاں، بیوی کے تو بلڈ گروپ ہی ایسے متضاد تھے کہ اولاد کے زندہ بچ رہنے کے امکان معدوم ہوتے چلے گئے، بعد میں ابو کہتے بے تو کیا شادیاں خون کے گروپوں کو ٹیسٹ کرکے کرنی چاہئیں، ہمارے تو ماں باپ میں تو ایسا کبھی نہ دیکھا نہ سنا اور امیر علی کا رات گئے تک دوسرے کمرے میں کمپیوٹر پر دفتر کے کام کا جھوٹ بھی دیورانی نے بعد میں پکڑا کہ وہ تو کسی خاتون دوست سے چیٹنگ ہی کیا کرتے تھے، کئی مرتبہ بچوں نے بھی انہیں ٹریس آؤٹ کرلیا تھا اگر میں وقت پر حالات کا اندازہ کرلیتی تو بھی کیا کرلیتی، ہیں فیچر فلموں کی تھانیدار انی تو تھی نہیں کہ ڈنڈے کے زور پر اپنا شوہر بچالیتی یا چھینا جھپٹی کرلیتی۔

ایک بار پھر بیری کٹی۔ جڑیں نہ کٹ سکیں۔ اتنی مہین تھیں کہ مالیوں کا زور ہی نہ چل پایا۔ چند برس اسکول کی ملازمت کے دوران ہی کسی نے انظار صاحب کا رشتہ بتایا۔ وائس پرنسپل کو یہ خاندان بہت جچا۔ وہ ہی ابا سے بات کرنے آئیں، ان کا احوال تو میں نے آپ کو بتایا تھا نا، سارے بچے بڑے تھے اور انظار صاحب کو بڑھاپا گزارنے کے لیے تنہا کر چکے تھے، لیکن، جونہی شادی کا ذکر چھڑا تو بچوں نے پہلے تو جائیداد کا

جھگڑا کھڑا کیا، پھر میرا حال سوتنوں سے بدتر کردیا، میں پتا نہیں کیوں فٹ بال بن کر رہ گئی اور کسی سے گول نہ ہو سکا اب دیکھو بیری پھر پھل پھول رہی ہے۔"

سلیمہ کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی، مگر رو رو کر اس کی آنکھیں متورم ہو چکی تھیں، ادھر میں بھی اپنے آنسوؤں کو کہاں روک پائی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ کہانی ابھی یک طرفہ ہے اور نہیں پتا کہ دوسری طرف سے کسی فریق نے کتنا ظلم واقعی کیا ہے۔ پھر جب میں نے غزالہ آپی کے دیور اور بچوں کے ساتھ ساتھ ان کی پیاری سی دیورانی کا ذکر بھی کیا تو وہ اور بھی متاثر ہوئیں۔

"میں بیالیس سالہ عورت اب صرف بچوں کی منہ بولی ماں ہی بن سکتی ہوں تو کیا اس کے لیے کسی جوان مرد کے نکاح میں آنا ضروری ہے؟" انہوں نے عجیب و غریب سا مگر بہت خوب صورت سوال کیا تھا، مجھ سے تو جواب ہی بن نہ پڑا۔

"میں چاہتی تھی کہ ایک ایسا بندھن بندھے جس کی پیار اور مذہب کی حد بندی بھی ہو۔ دنیا سوال نہ کرے، کوئی ہم میں سے کسی پر انگلی نہ اٹھائے، بچوں کے پاس شیلٹر ہے، اینٹ گارے پتھروں کا گھر بھی ہے اور گاڑی ڈرائیور کی سہولت بھی، وہ جہازوں میں سفر کرتے ہیں، انگریزی میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں، مگر ماں کھو چکی ہے۔ آپ جیسی محروم عورت اور وہ محروم بچے ایک دوسرے کا سائبان بن سکتے ہیں۔ یہ دل سے مفاہمت کرنے کا ایک بندھن ہے۔ آپ صرف اتنا کیجیے کہ بچے عید پر آرہے ہیں، ان سے ملے جلے، ان کے قریب رہیں، اگر ان سے دل ملیں تو رشتہ جوڑ لیجیے، ورنہ توقع کا رشتہ بھی استوار نہ کیجیے۔ ہمیں گلہ نہیں ہوگا، کوئی زور زبردستی نہیں کسی کے لیے بھی، منہ بولی ماں بننا واقعی آسان نہیں، یہ تو ماہ کے حمل کو اٹھائے اٹھائے پھرنے اور سنبھالے رکھنے سے کہیں زیادہ نازک رشتہ ہے۔" اور میری بات مکمل ہوتے ہی وہ اٹھیں اور صحن سے ہوتی ہوئی اپنے گھر کے دروازے تک نالے نالے قدم اٹھا کے چلتی رہیں۔ میں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ ماں بننے والی ہوں اور وفا کے رشتے میں سرشار ہو۔

عید آئی اور بہت محتاط انداز سے ہم نے بچوں کو سلیمہ سے ملوایا۔ ظاہر ہے وہ اجنبی تھے۔ تمناؤں میں الجھی ہوئی یہ عورت راتوں رات کتنے کھلونے جمع کرکے بیٹھی ہوئی تھی، ننھی منی چھتریاں، گاڑیاں، ہوائی جہاز، روبوٹ، باربی ڈول اور چھوٹے چھوٹے کمپیوٹر گیمز اور کارٹون کی سی ڈیز، بچے تو نہال ہوگئے، یہ سب چیزیں فیصل نے نہیں لی تھیں ہم یہ ہی سوچ رہے تھے کہ بچوں کو شاپنگ کرائیں گے، مگر اس منہ بولی ماں کو کیسے پتا چل گیا اور وہ ہوم ورک کرنا شروع کرچکی تھی۔

"مان جائیے آپی! خود فریبی یا خود کو بہلائے رکھنا عورت کا سب سے بڑا جذباتی سہارا ہوا کرتا ہے۔ میں نے اب تک عورت کے مزاج اور مسئلوں سے متعلق کئی ڈاکیومنٹریز بنائی تھیں۔ لیکن ریشم سے بھی نازک یہ انسانی رشتہ اور کانچ جیسے کومل احساس کی ترجمانی کرنے میں ناکام رہی تھی۔" میں نے روتی ہوئی آپی کو دلاسہ دیتے ہوئے ہار مان لی۔ ادھر سے سلیمہ کی آواز آئی "آؤ بچو! یہ ڈھول بجانے والے آئے ہیں، انہیں عیدی دے دو، رمضان بھر انہوں نے ہمیں سحری کے لیے بیدار کیا تھا، ان کا حق بنتا ہے عیدی لینا۔" اور تحسین بھائی کے بچوں کے ساتھ فیصل اور آپی کے بچے بھی روپیہ دو روپیہ لے کر گیٹ پر بھاگے گئے تھے۔

علی الصبح میری پھر رمضان کو الوداعی سلام کہنے کتنے ہی چڑیاں آئیں۔ ان کے سلام میں کیا کچھ پنہاں نہ تھا۔ کاش یہ چڑیاں سرسبز بیری کے پتوں کی اوٹ میں چھپ کر ہمیشہ چہچہاتی رہیں۔ انہیں اب کی بار کسی دشمن کی نظر نہ لگے۔ میں نے دل سے دعا مانگی۔ ایک مہینے بعد جب سلیمہ کے باراتی ہمارے گھر کے صحن میں بیٹھے مولوی صاحب کی راہ تک رہے تھے تو مجھے اسی بیری سے عشق سا ہوگیا، آج تو اس کے پتے بھی زرد نہیں تھے، البتہ نیم سو کھنے لگا تھا۔

☆

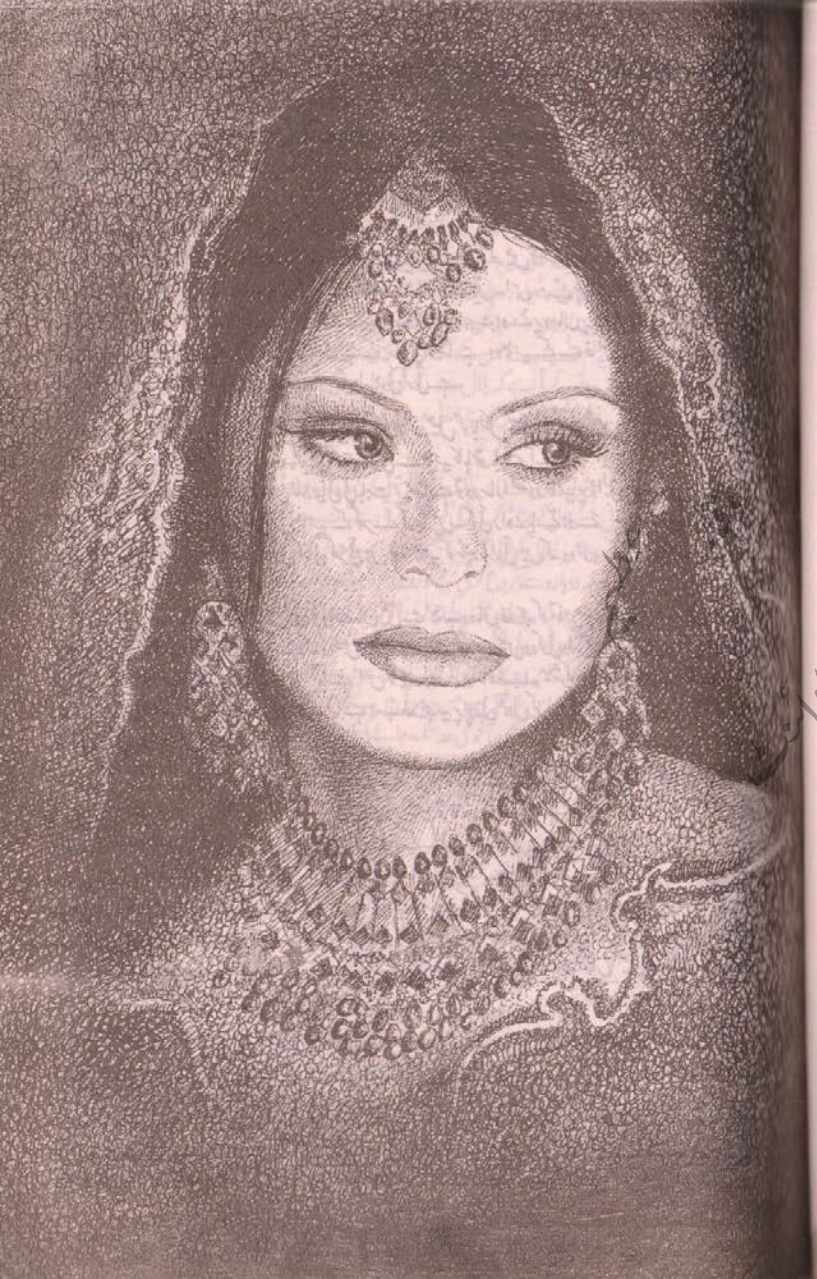

رخسانہ نگار عثمان

کوئی سیکھ ہو

ثانیہ ایک ذہین اور خوددار لڑکی ہے جس کو حالات نے غربت اور مسائل کا شکار بنا دیا ہے۔ اس کی ماں خدیجہ شوہر کی معذوری کی بنا پر لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہے۔ ثانیہ علم سے محبت اور لگن کی بنا پر پڑھائی جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہ اپنی اسسٹنٹ پروفیسر فضیلہ مبشر کو اپنا آئیڈیل مانتی ہے جن کی قابلیت اور رکھ رکھاؤ پورے کالج میں مشہور ہے۔ ثانیہ ان جیسا بننا چاہتی ہے۔

میڈم فضیلہ اس کی ذہانت کو سراہتی ہیں تو اسے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ گھر میں ماموں زاد روحیل کی آمد اسے پریشان رکھتی ہے۔ کالج میں بیسٹ اسٹوڈنٹ کا ایوارڈ ملنے پر میڈم فضیلہ کی بیٹی زونیرا کو شدید دھچکا لگتا ہے' وہ اسے اپنا حق سمجھتی ہے۔ اس کے دل میں ثانیہ کے لیے گرہ پڑ جاتی ہے جبکہ میڈم فضیلہ اور بلال (بیٹا) اسے اس کا بچپنا قرار دیتے ہیں۔

ثانیہ کا بھائی عمیر' تعلیم چھوڑ کر چھولے بیچنے پر مجبور ہے۔ جس کا اس کی ماں کو بے حد قلق ہے۔ بیٹی اور کاروبار یہ دونوں والے آئے دن اسے پریشان کرتے ہیں۔ ایسے میں عمیر کی ماں صرف صبر اور استقامت کا سبق دیتی ہے۔ زندگی کے اس دور میں اللہ کے سہارے زندگی کی گاڑی گھسٹ رہی ہے۔

بلال اعلا تعلیم کے لیے غیر ملک سے باہر جا رہا ہے۔ اس سے قبل فضیلہ مبشر اس کی شادی کر دینا چاہتی ہیں۔ وہ اسے لڑکی دکھانے اپنی کولیگ میڈم فوزیہ کے گھر لے جاتی ہیں۔

ناولٹ

میڈم فوزیہ کی ملازمہ خدیجہ چھٹی ہونے پر گھر واپس جا رہی ہے۔ میڈم فوزیہ ان سے اسے اسٹاپ تک چھوڑنے کے لیے کہتی ہیں۔ وہ خدیجہ کو اس کے گھر پر ڈراپ کرتی ہیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں کہ ثانیہ خدیجہ کی بیٹی ہے۔

بلال، ثانیہ سے پہلی نظر کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ بات جب میڈم فضیلہ کے علم میں آتی ہے تو وہ اپنی ساکھ بچانے کے لیے فوری انکار نہیں کرتیں بلکہ منصوبے کے تحت اسے بتاتی ہیں کہ ثانیہ کی عنقریب شادی ہونے والی ہے جس پر بلال دل، ہی، ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ سربراہ اسکے اس متعلق پوچھتا ہے، تو اسے ثانیہ کی طرف سے سخت سننے کو ملتی ہیں۔ تاہم وہ اس کی محبت اور کردار کا مزید قائل ہو جاتا ہے۔

روحیل ثانیہ کے ماموں کا بیٹا ہے۔ اپنی ماں کے مرنے کے بعد اپنے ہی گھر میں نامساعد حالات کا شکار رہا۔ سوتیلی ماں کا اس کے ساتھ روایتی سلوک ہے اور باپ بھی اسے نکما اور ہڈحرام سمجھتے ہیں۔ اس رویے پر اس کا ذہن منفی رویوں کی آماجگاہ بن گیا اور اس نے میٹرک کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ خالی پیٹ ہونے پر وہ ماں پر چھری تان لیتا ہے تو وہ خود ہی خوف زدہ ہو جاتا ہے اور گھر چھوڑ دیتا ہے۔ پھپھی خدیجہ کے یہاں پناہ لیتا ہے۔ وہ ثانیہ کے لیے خاص جذبات رکھتا ہے جس کا ثانیہ کو علم نہیں۔ وہ محض انسانیت کے ناتے اس کی دل جوئی کرتی ہے۔

خدیجہ، ثانیہ کو روحیل سے دور رہنے کا کہتی ہیں۔ خدیجہ روحیل کو بالکل قابل بھروسہ نہیں سمجھتیں۔ ان کی باتیں روحیل سن لیتا ہے اور عزم کرتا ہے کہ وہ کچھ بن کر ہی پھپھی سے ثانیہ کا ہاتھ مانگنے آئے گا۔

بلال، ماں سے ثانیہ کے معاملے میں غلط بیانی کی بابت پوچھتا ہے تو وہ سارا قصور ثانیہ پر ڈالتی ہیں۔ بلال اس بات پر انہیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کا پرپوزل ثانیہ کے گھر لے کر جائیں۔ کوئی راہ نہ پاتے ہوئے میڈم فضیلہ، ثانیہ کے آگے بلال کے بچپن کے رشتے کی جھوٹی کہانی گھڑتی ہیں اور ثانیہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان کے رشتہ لانے پر خود انکار کر دیں۔

ثانیہ، میڈم فضیلہ کے احترام میں ان کی بات مان لیتی ہے، جب وہ ماں خدیجہ کو تمام صورت حال بتاتی ہیں تو وہ چپ سی ہو جاتی ہیں۔ ثانیہ انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ اس رشتے سے انکار کر دیں لیکن وہ کوئی واضح جواب نہیں دیتیں۔ بلال اپنا پرپوزل لے کر خود میڈم فضیلہ کے ساتھ آتا ہے، اس کا بڑھ بڑھ کر بولنا فضیلہ، مبشر کو دل ہی دل میں برانگیختہ کرتا ہے۔ تاہم ان کا غصہ پریشانی میں اس وقت بدلتا ہے جب خدیجہ یہ پرپوزل قبول کرنے کا عندیہ دیتی ہیں۔ ان کا یہ فیصلہ روحیل کو بھی ساکت کر دیتا ہے۔

خدیجہ کی رشتے کے لیے منظوری میڈم فضیلہ کے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ زونیرا اس شادی کا بائیکاٹ کر دیتی ہے۔ بلال کو اس کی مطلق پروا نہیں تھی۔ حیران و پریشان تو ثانیہ بھی ہوتی ہے۔ خدیجہ اسے روشن مستقبل کے خواب دکھا کر بہلاتی ہیں لیکن وہ مطمئن نہیں ہوتی۔ روحیل کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے۔ وہ ثانیہ کو اکساتا ہے کہ وہ بلال سے مل کر خود منع کر دے۔ مگر بلال کی باتیں اسے الجھا دیتی ہیں۔ اسے میڈم فضیلہ کی ناراضی لے چین رکھتی ہے۔ پورے کالج میں مس فوزیہ کی بدولت یہ خبر نشر ہو جاتی ہے۔ سب کے سوالات ثانیہ کو روہانسا کر دیتے ہیں۔ روحیل دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا حال دل ثانیہ سے بیان کر دیتا ہے لیکن وہ اس کے جذبوں کی پذیرائی نہیں کرتی۔ روحیل کا دل بجھ سا جاتا ہے۔ میڈم فضیلہ کے گھر سے نکاح کا سوٹ آنے پر ثانیہ 'ماں سی کہتی ہے کہ وہ یہ نکاح نہیں کرے گی' اس لیے تمام چیزیں واپس کر دی جائیں۔

والد کے اصرار پر محض ان کی عزت کی خاطر ثانیہ نکاح نامے پر سائن کر دیتی ہے۔ میڈم فضیلہ، مبشر کے گھر اس کا استقبال سرد انداز میں ہوتا ہے۔ زونیرا اسے سخت نتائج کی دھمکی دیتی ہے تو وہ اندر سے سہم سی جاتی ہے۔ تاہم اپنے خلوص و محبت سے بلال اسے متوجہ کر ہی لیتا ہے۔ ولیمہ کی تقریب میں ماں خدیجہ اور بہن بھائیوں کو ہوٹل کے بجائے گھر پہنچایا جاتا ہے تو خدیجہ، بلال سے اس رویے پر احتجاج کرتی ہیں۔ بلال اپنی ماں کے سرد انداز پر سخت شرمندہ ہوتا ہے۔ چند دنوں کی رفاقت ثانیہ کو اندر تک سرشار کر دیتی ہے۔ جیسے جیسے بلال کے جانے کے دن قریب آتے ہیں، اس کا دل اندیشوں سے

الجھنے لگتا ہے۔ جاتے ہوئے بلال، ثانیہ کو جلد اپنے پاس بلانے کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ امید ثانیہ کو دوبارہ اندر سے توانا کر دیتی ہے۔

روحیل، ثانیہ کی شادی سے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔

قسمت سے روحیل کو دوبارہ زندگی کی نوید ملتی ہے، عین وقت پر دوست یوسف اسے اسپتال پہنچاتا ہے، جہاں اس کی جان بچالی جاتی ہے۔ یوسف کی ہی کوششوں سے وہ زندگی کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔

ثانیہ کے والد کی اچانک موت کچھ دنوں ثانیہ کے خاندان کو بے حال رکھتی ہے۔ خبر سنتے ہی ثانیہ بدحواس اپنے میکے چلی آتی ہے۔ میڈم فضیلہ کھڑے کھڑے پرسہ دینے آتی ہیں۔ ان کا رویہ خدیجہ اور ثانیہ کو بھی اپنی کم مائیگی کا احساس دلاتا ہے۔ کچھ روز بعد ثانیہ کی ماں ہوشیار رہنے اور حالات سے مقابلہ کرنے کی تلقین کے ساتھ واپس بھیجتی ہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں کمرے سے پیسہ اور زیور، موبائل سمیت غائب ہو چکا ہے۔ موبائل ساتھ نہ لے جانے پر اسے بلال سے سخت سننے کو ملتی ہے۔ وہ میڈم فضیلہ سے اس کے متعلق پوچھتی ہے تو وہ اسے ڈانٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ ان کا سخت رویہ ثانیہ کو ہراساں کر دیتا ہے۔ وہ تہیہ کرتی ہے کہ بلال سے کہے گی کہ اسے بھی اپنے پاس بلالے۔ بلال فون پر سخت انداز میں دریافت کرتا ہے کہ اس نے اپنا قیمتی موبائل اپنے بھائی عمیر کو کیوں دیا؟ یہ سوال ثانیہ کو خوش فہمی سے حقیقت کی دنیا میں لا پٹختا ہے۔

ثانیہ، میڈم فضیلہ، مبشر اور زونی سے اس غلط بیانی پر استفسار کرتی ہے تو زونی اس پر الزامات کی بوچھاڑ کر دیتی ہے اور ڈرامہ بازی اور جھوٹی کہانی سے بلال کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نتیجتاً ثانیہ بھی جھوٹ کا سہارا لے کر بلال کے سامنے اپنا دفاع کرتی ہے۔ ثانیہ، بلال کو اپنی محبت کا یقین دلا کر اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ جلد از جلد اسے اپنے پاس بلا لے۔ ثانیہ اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ سے شروع کرتی ہے تو زونیرا اور میڈم فضیلہ اس کا بائیکاٹ کر دیتی ہیں۔ عمیر، ثانیہ سے ملنے آتا ہے تو زونی اپنے پراپرسلیٹ اور ٹاپس کی چوری کا الزام اس پر لگا دیتی ہے۔ ابھی ثانیہ اس صدمے سے سنبھل بھی نہیں پائی کہ روحیل کی آمد پر اس کی ذات پر گھناؤنا بہتان بھی باندھ دیا جاتا ہے۔ ثانیہ اس الزام پر صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کو دکھانے پر پتہ چلتا ہے کہ ثانیہ امید سے ہے۔ ثانیہ اور بلال کے لیے یہ خوشی کسی عظیم خزانے سے کم نہیں۔ میڈم فضیلہ بھی اس خوشخبری پر مسرور ہوتی ہیں۔ لیکن یہ کہہ کر زونیرا ان کی خوشی خاک میں ملا دیتی ہے کہ وہ ثانیہ کو گھر سے نکالنے کے لیے کسی بھی آخری حد تک جائے گی اور اس بچے کا میرے بھائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میڈم فضیلہ، مبشر کو پہلی مرتبہ اس کی ذہنی کج روی اور اخلاقی پستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ زونیرا، میڈم فضیلہ کو دھمکی دیتی ہے اگر اس معاملے میں انہوں نے اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ کسی کو سکون سے نہیں رہنے دے گی۔

عمیر، ثانیہ کے گھر سے سونے کے زیورات چراتا ہے تو خدیجہ شرمندگی کے مارے راتوں رات بغیر ثانیہ سے ملے رشتہ داروں کے پاس چلی جاتی ہیں۔ عمیر، ثانیہ سے فون پر معذرت کرتا ہے تو وہ شدید صدمے سے دوچار ہو جاتی ہے۔ وہ بغیر کچھ کہے فون رکھ دیتی ہے۔ نورانی کے ذریعے خدیجہ کا نمبر ثانیہ کو ملتا ہے تو اسے خدیجہ کی خیریت کی اطلاع ملتی ہے۔ ساتھ ہی چھوٹی بہن کی بیماری کی خبر اسے پریشان کر دیتی ہے۔ چند دنوں بعد اس کی موت کی خبر ثانیہ کو ہلا ڈالتی ہے۔ اس صدمے میں وہ اپنی ماں کے پاس جانے کی درخواست میڈم فضیلہ، مبشر اور بلال سے کرتی ہے لیکن اسے اس حالت میں جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ مشکل کی اس گھڑی میں وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہے۔

یوسف کے مرنے کے بعد روحیل اس کی فیملی کو سپورٹ کرتا ہے۔ یوسف کی ماں اپنی بیٹی بسمہ کے لیے از خود رشتہ روحیل کے سامنے رکھتی ہیں تو وہ لاجواب ہو جاتا ہے۔ سنجیدگی سے غور کرنے پر وہ اس رشتے کے لیے نیم رضامند ہو جاتا ہے۔ بسمہ خود روحیل کو بتاتی ہے کہ وہ پیدائشی اندھی ہے اور وہ اسے کسی دھوکے میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتی۔ یہ صورت حال اسے ذہنی دھچکا پہنچاتی ہے۔

زونی پلاننگ کے تحت ثانیہ سے دوستی گانٹھتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ اسے روحیل سے محبت ہو گئی ہے

سلسلے میں وہ زونی کی مدد کرے ثانیہ کا ذہن اس بات کو سمجھنے سے انکاری ہے۔ روحیل سے مل کر زونی اسے یقین دلاتی ہے کہ ثانیہ ابھی بھی اس سے محبت کرتی ہے اور عنقریب بلال اور ثانیہ میں علیحدگی ہونے والی ہے۔ روحیل اس تمام صورت حال میں الجھ سا جاتا ہے۔ ایسے میں کی سچائی اور خوب صورتی اپنی جانب کھینچتی ہے۔

کالج سے واپسی پر ثانیہ کو کسی کے ساتھ دیکھ کر میڈم فضیلہ بھونچکا رہ جاتی ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

۱۰
دسویں قسط

ثانیہ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

فضیلہ مبشر گہری سرد نگاہیں اس پہ جمائے بیٹھی تھیں اور ان نظروں میں کیا تھا۔ ثانیہ کے قدم کچھ دیر کو اپنی جگہ پر جمے رہ گئے۔

"اس۔۔۔ السلام علیکم ماما!" وہ ان کی نظروں سے نگاہیں چرا کر کہتی ہوئی اندر کی طرف جانے لگی۔

"کس سے مل کر آرہی ہو؟" ان کی ٹھوس، بے لچک آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک لیے۔

"وہ میں۔۔۔ رباب کی طرف گئی تھی۔۔۔ تھوڑی دیر کے لیے۔" وہ ان کی طرف سے دانستہ رخ پھیرے ذرا سا اٹک کر بولی۔

"تم نے شاید سنا نہیں۔۔۔ میں نے پوچھا ہے کس سے مل کر آرہی ہو؟" وہ اسی بے مروت، غیر جذبی لہجے میں تحقیر لیے بولیں۔

وہ لمحہ بھر کو خاموش کھڑی رہ گئی۔

"یہ مجھ سے کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں۔ کہیں۔۔۔ نہیں نہیں تم تو کالج میں تھیں اور میں تو فقط ساڑھے تین منٹ کے لیے۔۔۔" وہ خود ہی سوچ کر خود ہی نفی کرنے لگی۔

"کیا تمہیں جواب گھڑنے کے لیے اتنا ٹائم چاہیے؟" وہ طنز سے بولیں۔

"تو ان کو پہلے سے اندازہ ہے کہ میں سچ نہیں بولوں گی، جواب گھڑوں گی اور اگر میں سچ بول بھی دوں تو کون سا انہیں یقین کر لینا ہے۔۔۔ پہلے دن سے یہ مجھے اسٹیمپ کر چکی ہیں ایک ہی جھٹکے سے۔۔۔ بے اعتبار۔۔۔ بے بھروسا۔" لمحہ بھر میں اس نے فیصلہ کر لیا۔

"میں رباب کے گھر گئی تھی تو ظاہر ہے اسی سے ملی ہوں گی اور مجھے کس سے ملنا تھا۔" اب کے وہ خوب نپے تلے لہجے میں بولی۔

"اور تم نے اتنا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ یوں گھر سے جانے سے پہلے کسی سے اجازت ہی لے لی جائے۔" ان کے ترکش میں تیروں کی کمی تو نہ تھی۔ ایک ناکام تو دوسرا تیار!

"میں نے فون کیا تھا آپ سے پوچھنے کے لیے۔" اس کے لہجے میں ڈھیر ساری تھکن اتر آئی۔ "آپ میٹنگ میں تھیں۔"

"اور تم نے فرض کر لیا کہ تم نے مجھ سے اجازت لے لی۔۔۔ ہے نا، یہی بات ہے نا!" اس کے پژمردہ انداز نے انہیں جیسے تقویت دی۔

"ایسا کیا ضروری کام تھا تمہیں رباب سے۔ جس کی وجہ سے تم نے اجازت لینے کے لیے کچھ دیر کا انتظار بھی نہ کر سکیں۔" وہ اس کے سچ نہ بولنے پہ تپ چکی تھیں۔

"بس یونہی، کچھ ایسا ضروری کام بھی نہیں تھا۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

اور انہوں نے ایک عمر اس دشت کی سیاحی میں گزاری تھی، جانتی تھیں سامنے والا نظریں کب اور کیوں چراتا ہے۔

"تو تم بتانا نہیں چاہتیں۔" وہ چلتی ہوئی اس کے پاس ذرا فاصلے پر رُک کر بولیں۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے ماما؟" وہ اسی انداز میں ذرا سا پیچھے ہٹ کر بولی۔

بھی اس کا دل اس مینارۂ علم کی قہرت میں لمحہ بھر کو سہی آنے کو ٹھہرنے کو ترسا کرتا تھا اور اب۔۔۔ اسے ان کے سائے سے بھی وحشت ہوتی تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو۔" وہ کچھ طیش میں آگئیں "تم بہت عقل مند ہو یا میں بلکہ ہم سب بہت بے وقوف اور احمق۔"

"نہیں تو۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

وہ اسے تیز نظروں سے دیکھتی رہیں۔

"جب تک تمہارا شوہر یہاں نہیں آجاتا تمہیں اپنے پاس نہیں بلا لیتا۔ تم میری ذمہ داری ہو اور تم اس طرح منہ اٹھا کر جب دل چاہے، جس سے چاہے ملنے نکل پڑو، بغیر پوچھنے کی زحمت کیے تو میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔"

"سوری ماما!" اس ٹارنگ لیکچر کا ایک ہی حل تھا فوری معذرت۔۔۔ حواس نے کرڑ ڈالی مگر ان کی تسلی نہیں ہوئی۔

"کیا تم ایگزام دینا چاہتی ہو؟" ان کے بدلے ہوئے لہجے پہ وہ چونکی۔

شاید ماما کے دل میں اس کے لیے ذرا سا رحم جاگ اٹھا ہے۔

"جی۔۔۔" وہ ذرا سی پُرجوش ہوئی مگر ان کی نظروں سے چھلکتی ہوئی نفرت اور اجنبیت دیکھ کر دوسرے لمحے سنبھل گئی۔ "نہیں تو۔۔۔ آپ نے منع جو کر دیا ہے۔" وہ نظریں جھکا کر پھیکے لہجے میں بولی۔

"گویا تم تو دینا چاہتی ہو مگر میں نے تم پر یہ پابندی لگا رکھی ہے۔ یہی مطلب بنتا ہے نا تمہارے اس جواب کا۔" وہ کسی بھی طرح سے راضی نہیں ہو پا رہی تھیں۔

اتنے دنوں میں تعلقات میں جو بہتری کی امید پیدا ہوئی تھی، ثانیہ کو لگا آج پھر سے پہلے دن کی طرح سب ختم ہو جائے گا۔۔۔ پھر وہی ذلت پھر وہی حقارت!

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ماما۔" وہ معاملہ ختم کرنا چاہتی تھی، انہوں نے مسلسل اسے کٹہرے میں کھڑا کر رکھا تھا اور وہ جیسے کھڑے کھڑے شل سی ہو گئی تھی۔

"تو رباب کے پاس تمہارے جانے کا کیا مقصد تھا؟" وہ چبا چبا کر بولیں۔ "اسے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی کتھا سنانے گئی تھیں؟" وہ کڑی سے کڑی جوڑے جا رہی تھیں۔

"نہیں۔۔۔ میں تو اتنے دنوں سے کالج نہیں گئی پھر ایگزام بھی نہیں دینا تھا تو یونہی دل اداس ہوا تو۔۔۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کسی مجرم کی طرح وہ صفائی پر صفائی دیے جا رہی تھی اور ان کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

"کس چیز کی کمی ہے تمہیں یہاں۔ ہر وہ چیز۔ ہر وہ آسائش جس کا تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ تمہیں یہاں میسر ہے پھر شوہر چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے مسلسل تم سے رابطے میں رہتا ہے۔۔۔ اپنی مرضی سے کھاتی پیتی ہو۔۔۔ دن چڑھے تک سوتی رہتی ہو۔ کوئی تمہیں روک ٹوک نہیں ہے اس کے باوجود بھی اگر تمہارا دل اداس تھا تو اس کی وجہ مجھ کم عقل کے دماغ میں تو نہیں آئی۔ تم سمجھا سکتی ہو؟" وہ اسے آج بخش دینے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

"کیا میں کسی سے مل بھی نہیں سکتی؟" بے چارگی، شکوہ، بے کسی سب ہی کچھ تھا اس کے لہجے میں۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر عاجزی۔

"نہیں بی بی! تمہیں کون روک سکتا ہے تمہارے تمام تر بنیادی حقوق سے اور میں تو بالکل بھی نہیں جس کا وجود پہلے دن سے نہ تین میں نہ تیرہ میں شمار کیا گیا۔" وہ پہلی بار اسے کوئی جاہل ساس لگی تھیں۔

وہ لمحہ بھر خاموش کھڑی سوچتی رہی کہ ان سے کن الفاظ میں معذرت کرے، کس طرح ان کی تسلی کرائے کہ فی الحال وہ اس کی جان چھوڑ کر اسے جانے کی اجازت دے دیں۔

"سوری ماما! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا ہرگز

نہیں ہوگا' آپ سے پوچھے بغیر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ حتی الامکان لہجے میں عاجزی بھر کر بولی۔

"یعنی میں نے تم پر پابندیاں لگا رکھی ہیں اور تمہیں بغیر اجازت کے کہیں جانے نہیں دیتی ابھی جا کر شوہر کے کانوں میں سب انڈیل دینا اور تم باہر جا کر کسی اور سے ملنے کے بہانے کس سے ملتی ہو' کیا کرتی ہو اس کی خبر گیری کون کرے گا....." وہ بھونچکا سا انہیں دیکھے گئی۔

"تمہیں تو شاید اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا مگر ہماری کم از کم میری شہر میں اتنی عزت' اتنا نام ہے کہ جو کچھ تم کر رہی ہو۔ وہ میرے نام کو کتنا خراب کر سکتا ہے' تمہیں اس کا اندازہ بھی نہیں۔" ان کا غصہ کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

"ماما! میں نے خدانخواستہ ایسا کچھ نہیں کیا جو آپ کی عزت یا نام کے لیے کسی خطرے کا باعث بنے۔" اس کی آنکھوں میں پھر سے آنسو آگئے۔

"مجھ سے غلطی ہو گئی آپ سے اجازت لیے بغیر جانے کی اور میں اکیلی نہیں گئی تھی۔ ڈرائیور میرے ساتھ تھا۔ آپ اس کو بلا کر پوچھ لیں میں کہاں گئی تھی اور کس کس سے ملی تھی..... شاید آپ کو اس کی بات پہ یقین آجائے..... میں تو آپ کے اعتبار کے قابل ہوں بھی نہیں۔" اسے شدت کا رونا آرہا تھا کہ ابھی پھوٹ پھوٹ کر رو دے گی۔

"ٹھیک کہا تم نے' وہ کم از کم مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گا۔" اسے توقع نہیں تھی' وہ فوراً ہی یہ کہہ دیں گی۔

"میں اس کو بلوا کر پوچھتی ہوں تم تو سچ بولو گی نہیں۔" وہ پھر سے اجنبی بن کر بولیں۔ ثانیہ لاچار سی کھڑی چہرہ صاف کر کے انہیں دیکھنے لگی۔

وہ اب سروری کو بلا کر ڈرائیور کو بلانے کا کہہ رہی تھیں۔

"اب ایک معمولی ملازم کے سامنے میری تفتیش کی جائے گی اور اس کا کہا حرفِ آخر سمجھا جائے گا میرے خدا! اور کتنی ذلت باقی ہے میری قسمت میں۔" اس کی آنکھیں پھر سے بھرنے لگیں۔

"تم جاؤ اپنے کمرے میں..... میں تمہیں تھوڑی دیر بعد بلا کر بات کرتی ہوں' پہلے بلال سے بات کر لوں کہ وہ کب تمہیں لے کر جا رہا ہے میں اس ذمہ داری سے باز آئی' کل کو کچھ ہو گیا تو سارا الزام تو اس نے مجھ پر دھرنا ہے۔" جانے انہیں اس سے کیا کر گزرنے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

وہ پریشان نظروں سے انہیں دیکھتی وہاں سے چلی آئی۔

"پتا نہیں۔ اب یہ کیا سچ جھوٹ بلال کو بتائیں گی اور اسے تو اپنی ماں کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین آجاتا ہے۔ میری محبت' میری قسمت کی طرح کمزور ہے..... اور اتنی دور بیٹھ کر تو اس محبت جیسے مفروضے پر بھی میرا ایمان اٹھ گیا ہے۔" وہ نڈھال سی جا کر بستر پر گر گئی۔

☼ ☼ ☼

بسمہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

دونوں خواتین چائے کے ساتھ لوازمات کھاتے ہوئے اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں تھیں۔

ذکیہ باری باری دونوں کی طرف آس بھری نظروں سے دیکھتی رہیں۔ کبھی ایک جھانکتی ہوئی نظر بسمہ پر بھی ڈال لیتیں۔

حسب معمول بسمہ بیٹھی ہوئی کوئی خوب صورت مجسمہ لگ رہی تھی کوئی ذرا سی کمی' ذرا سا جاذب نقش' رنگ روپ کچھ بھی تو اپنی جگہ کم نہیں تھا۔ ہر نقش ہر تاثر مکمل تھا مگر..... ان کے دل نے آہ سی بھری اس مگر سے آگے ہی تو سب سے بڑی کمی' سب سے بڑا خلا تھا' عیب کا' نقص کا' کمی اور محرومی کا۔

"ماشاء اللہ' بہت پیاری ہے آپ کی بیٹی خالہ جی.....! ہمیں تو جی جان سے پسند آئی..... کیوں سلمیٰ؟" دوسری نے پہلی کو ٹہوکا دیا جس کے چہرے پر کھوئے کھوئے سے تاثرات تھے۔

"ہاں جی بالکل..... کوئی اعتراض نہیں۔" وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

"ہمیں تو جہیز' پیسہ' زیور کچھ بھی نہیں چاہیے۔ آپ نے اپنی بیٹی ہمیں دے دی۔ سب کچھ دے دیا یوں بھی ہمارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں جو ہم کوئی فرمائش کریں۔" پہلی کی کیفیت مدعی سست گواہ چست والی تھی۔

"یوں تو ہمیں رشتوں کی بھی کمی نہیں۔ آپ کو تو خالہ جی پتا ہے آج کل ہر گھر میں یہ نوکرا بھر جوان لڑکیاں پڑی ہیں ذرا سا ہنکارا اشارہ ہی کر دو ان کی مائیں فوراً تیار ہو جاتی ہیں۔ جھٹ پھٹ کی سی کیفیت ہے پر ہمیں ذرا خدا ترسی ہے اور آپ کی خاندانی شرافت بھی..... سب جانتے ہیں ہم۔"

"یہی مہربانی آپ کی..... میں نے آپ سے کچھ چھپایا نہیں تھا۔" ذکیہ کچھ ندامت بھرے انداز میں بولیں۔

"اور ہم نے بھی سب آپ کو بتا ڈالا ہے۔" پہلی جو کہ بول رہی تھی اب کے قدرے ہوشیار ہو کر بولی' جیسے ذکیہ کے جواب کی منتظر ہو۔

"ہوں پتا ہے مجھے۔" ذکیہ کا مبہم سا جواب کلثوم کو کچھ اتنا پسند نہیں آیا ماتھے پر بل ڈال کر سلمیٰ کو دیکھا۔ اس نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"پھر ہم بات طے سمجھیں خالہ جی؟" سلمیٰ پکی رشتہ کرانے والی چولن کی طرح بات جما کر بولی۔

"ہاں ابھی تو..... مجھے دو چار دن دے دیں سوچنے کے لیے۔" ذکیہ لجاجت سے بولیں۔

"بسمہ! تم اندر جاؤ۔" ذکیہ کو احساس ہوا کہ بسمہ کے سامنے نہ کرنے والی باتیں بھی دھڑلے سے کی جا رہی ہیں۔

بسمہ آہستگی سے اٹھی اور کرسیوں میز کے بیچ سے رستہ ٹٹول ٹٹول کر دیوار کا سہارا لیتی باہر نکل گئی۔

دونوں خواتین نے اس کا خوب ٹکٹکی لگا کر جائزہ لیا۔

"ماشاء اللہ سے گھر کے سب ہی کام کر لیتی ہے۔ ادھر تو سب چیزوں کا اندازہ ہے کہاں کیا پڑا ہے تو کھانا بھی یہی بناتی ہے اور دوسرے کام بھی۔" ذکیہ نے دونوں کی توجہ ہٹانے کو کہا۔

"خیر ہم نے اس..... معاف کیجیے گا خالہ جی' ہے تو اندھی نا..... ہانڈی روٹی تو نہیں کروانی یا جھاڑو پوچھا۔ اللہ کا بڑا کرم ہے' ایک نوکرانی ہر وقت اور دوسری صبح سے شام لگ رہتی ہے' کام کاج تو ہماری کلثوم نے کبھی نہیں کیا تو ہم اس سے چاری سے کیا کرائیں گے۔"

ذکیہ متاثر سی ہو کر خاموش رہ گئیں۔

"چلیں پھر کلثوم! کافی ٹائم ہو گیا۔" سلمیٰ اسے اشارہ کر کے کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھیں آپ۔ کھانا کھا کر جاتیں۔"

"نہیں۔ آپ نے پہلے ہی اتنا کچھ کھلا دیا چائے کے ساتھ۔ کھانے کی گنجائش رہی کہاں....." سلمیٰ مسکرا کر بولی اور کلثوم کو دیکھنے لگی جو اسے کچھ اشارہ کر رہی تھی۔ سلمیٰ نے سمجھ کر سر ہلایا ہے۔

"اچھا خالہ جی بولیں؟..... ہم نے سوچا ہے اللہ کرے بات بن جائے..... بلکہ بن ہی گئی ہے نا!" ٹھٹھا

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے
بہنوں کے لیے ایک اور ناول
تتلیاں پھول اور خوشبو
راحت جبیں
قیمت ---/225 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37- اردو بازار کراچی

لگا کر ہنسی "اب انکار کی کوئی وجہ بھی تو ہو کیوں خالہ جی؟" ذکیہ مسکرا کر رہ گئیں۔

"پرسوں یا اس سے اگلے دن ہم دونوں آئیں گے بلکہ بے شک آپ بھی ساتھ میں چلی چلیے گا ذرا بسمہ کو دکھانے۔"

"کیا مطلب؟" ذکیہ چونکی "کہاں جانا ہے؟"

"اوہو! آپ جانے کیا سمجھی ہیں۔" وہ پھر سے اسی انداز میں بولی۔

"ہمارا ایک کزن ہے ڈاکٹر بڑے ہسپتال میں، اس نے بتایا تھا امریکہ سے تجربہ کار ڈاکٹروں کی ٹیم آئی ہے۔ آنکھوں کا معائنہ کرنے والی تو ہم نے سوچا ہم بسمہ کو چیک کروا دیں گے۔ کیا پتا اللہ اپنا کرم کر ہی دے، نور ذکیہ بے یقین نظروں سے دیکھتی رہ گئیں۔

"کیا دنیا میں ابھی بھی ایسے اچھے اور نیک لوگ موجود ہیں، انہیں کے دم سے تو شاید یہ دنیا چل رہی ہے۔" وہ ان کو عقیدت سے دیکھتے ہوئے دل میں اپنے رب کا لاکھ شکر ادا کرنے لگیں۔

"ٹھیک ہے، اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔ میں بھی ساتھ چلوں گی..... ایسا ہو جائے تو میں سمجھوں گی، خدا نے مجھے دنیا میں ہی میرے ہر اچھے کام کا اجر دے دیا۔ میری بچی اس دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔" وہ آخر میں تو رو ہی پڑیں۔

"نہ خالہ جی! روئیں نہیں۔ دعا کریں، ماؤں کی دعاؤں میں تو بڑا اثر ہوتا ہے، اللہ آپ کی دعا ضرور قبول کرے گا۔ بسمہ اچھی ہو جائے گی پھر پرسوں صبح آجائیں ہم دونوں؟" دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"پر ابھی رشتہ تو....." ذکیہ ہچکچا گئیں۔

"خالہ جی! رشتہ تو قسمت میں لکھا ہوا تو ضرور ہو جائے گا نہ بھی ہوا تو اگر آپ کی بیٹی کو آنکھیں مل جائیں اللہ ہمارے نصیب میں یہ نیکی لکھ دے تو ہمیں اور کیا چاہیے۔ بس آپ پرسوں بسمہ کے ساتھ تیار رہیے گا۔ کلثوم کے میاں کی گاڑی لے آئیں گے ہم اور ہسپتال بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں۔"

ذکیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا انہیں اور کیا چاہیے تھا۔

اسی وقت روحیل کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ دونوں اسے دیکھ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

"بیٹا؟ آپ کا خالہ جی؟" سلمٰی کی سب حسیات چوکنی تھیں۔

"نہیں یوسف کا دوست۔" ان کے لہجے میں جانے کیسے بغیر ارادے کے اجنبیت سی اتر آئی اور روحیل بھی کچھ حیران، کچھ شرمندہ سا کھڑا رہ گیا۔

اس دن انہوں نے اسے امی نہ کہنے پر کس طرح اسے ٹوکا تھا اور آج کیسے ایک دم سے خود ہی بیٹے کا دوست کہہ کر دیوار اٹھا دی تھی۔

"اچھا تو اس طرح....." وہ معنی خیز انداز میں کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"نہیں۔ وہ بس یوسف کے بعد ذرا..... روحیل! تم ذرا باہر بیٹھو۔" انہیں خود ہی سلمٰی کے ادھورے جملے کا پورا مطلب سمجھ میں آگیا۔

روحیل آہستگی سے مڑ گیا۔

دونوں خواتین ذکیہ سے الوداعی باتیں کرتی باہر نکل گئیں۔

وہ واپس آئیں تو روحیل اسی طرح کھڑا تھا۔

"میں آیا تھا۔ کچھ سامان آپ نے منگوانا تھا شاید۔" وہ ان کے چہرے پہ پھیلی اجنبیت کو پڑھ کر بڑے محتاط انداز میں بولا۔

"نہیں۔ کچھ ایسا خاص سامان تو نہیں تھا۔ کچھ سودا لے آیا، باقی کا میں خود جا کر لے آئی تھی۔" وہ لاتعلقی سے بولیں۔ گویا جاؤ اب تمہاری ضرورت نہیں"

وہ کچھ دیر خاموش شرمندہ سا کھڑا رہا۔

"اچھا پھر میں چلتا ہوں، کل آجاؤں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" وہ جانے کو مڑا تھا کہ وہ پیچھے سے بولیں۔ "میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا، میری جوان بیٹی ہے اور تمہارا روزانہ آنا..... مجھے اس محلے میں رہنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ سمجھتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔

"میں تمہیں منع نہیں کر رہی اپنی مجبوری بتا رہی ہوں، ہفتے میں ایک دو دفعہ آجایا کرو۔"

"جی۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

"یہ دونوں خواتین بسمہ کا رشتہ لے کر آئی تھیں بلکہ طے ہی سمجھو۔ اللہ نے میری سن لی بغیر جہیز کے، لالچ کے اور کسی فرمائش کے..... اس کا بڑا شکر ہے، جتنا بھی ادا کروں کم ہے۔"

انہوں نے شاید اسے یہی اطلاع دینی تھی۔

"چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔" وہ لمحہ بھر رکنے کے بعد کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا، ذکیہ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم روحیل سے ملنے گئی تھیں؟" ثانیہ کسی بت کی طرح خاموش بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھی کہ زونیرہ اچانک سے اندر آکر بولی۔

"نن..... نہیں تو۔ میں کیوں ملوں گی اس سے۔" وہ بری طرح سے گڑبڑا کر بولی۔ اب ماں کے بعد بیٹی کی تفتیش شروع!

"مجھے روحیل نے بتا دیا ہے۔" زونیرہ مطمئن سی کہہ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اور ثانیہ کا منہ تو جیسے کھلے کا کھلا رہ گیا اس کی بات سن کر۔

"روحیل نے؟" بہت دیر بعد اس کے منہ سے نکلا۔

"تم نے اس سے میری بات کی؟" زونیرا اس کی حیرت یکسر نظر انداز کر کے قدرے بے تابی سے بولی۔

"کیسی بات؟" ثانیہ قطعاً "نہیں" سمجھی۔

زونیرا بے یقین نظروں سے اسے دیکھنے لگی جیسے ثانیہ کے استعجاب پر اسے حیرت ہوئی تھی۔

"میں کیا بات کرتی؟" اس کے مسلسل دیکھنے پر ثانیہ بے بسی سے بولی۔

"میرے جذبات تو اس تک پہنچا سکتی تھیں۔"

"جس نے تمہیں اس سربراہ ذرا سی ملاقات کی خبر بھی دے ڈالی۔ کیا تم اس تک اپنے جذبات خود نہیں پہنچا سکتیں۔" ثانیہ دل میں جل کر سوچا۔

"تم واقعی سیریس ہو زونی؟" ثانیہ گہرا سانس لے کر بولی۔

"تو تمہارے خیال میں میں فلرٹ کر رہی ہوں یا جھوٹ بول رہی ہوں؟" وہ حسب عادت فوراً" ہی اشتعال میں آگئی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ نرمی سے بولی۔

"ہاں۔ تم جانتی ہو ناں کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے، ہوتا ہے بعض لوگوں کی سائیکی کا یہ مسئلہ کہ وہ خود تو چاہے غیش کر رہے ہوں مگر ان کے سابقہ چاہنے والے اس طرح انہیں چاہتے جائیں اور آہیں بھرتے رہیں۔" زونیرا طنز سے بولی۔ ثانیہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"ان کی چاہتیں بلا شرکت غیرے ہمیشہ ان ہی کے قبضے میں رہیں۔ ہے ناں؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" ثانیہ مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر بولی۔ "میں نے نہ پہلے نہ اب اس کے بارے میں ایسا کچھ بھی نہیں سوچا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم نے تو اسے کبھی چاہا ہی نہیں اور وہ تمہاری محبت میں پاگل ہے۔ تم اسے کچھ نہیں دے سکتیں تو اس کو چاہے جانے والا دل، محبت کرنے والا ہم سفر تو دے سکتی ہو ناں۔" وہ بلاواسطہ ایک بالکل ڈائریکٹ بات کر گئی۔

ثانیہ کے لیے زونیرا لمحہ بہ لمحہ کھل جا سم سم والا کردار ادا کر رہی تھی۔

"مگر تم ایسا کیوں کرنا چاہتی ہو؟" ثانیہ کو اس کی اس محبت کی وجہ بالکل بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"بلال بھائی نے ایسا کیوں کیا؟" وہ جواباً" بولی۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" دوسرے جواب میں طنز بھی شامل تھا۔

"وہ تمہارے قابل نہیں ہے زونی!" ثانیہ اپنے سر کوئی مصیبت نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس فضول جذباتی میلو ڈرامے کو اسے یہیں ختم کرنا ہوگا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"تم بلال بھائی کے قابل تھیں؟" کیسی منہ پھٹ

اور بے دید لڑکی تھی۔

"نہیں نا۔۔۔ ثانیہ! میں تمہیں tease نہیں کرنا چاہ رہی صرف یہ بتا رہی ہوں کہ محبت آدمی کو اس طرح سے بے بس کر دیتی ہے۔ بلال بھائی کو تمہارے علاوہ کچھ اور سوجھ سکا نہ مجھے سوجھ پا رہا ہے۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"اگر چہ میں جانتی ہوں، وہ کچھ بھی نہیں پھر بھی میرے لیے۔۔۔ سب کچھ بن گیا ہے۔" ثانیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھائے۔

"کبھی میں سب سے زیادہ کلاس کانشس ہوا کرتی تھی۔ اتنے مہینے میں نے تمہیں صرف اسی بنیاد پر تو مسلسل ریجیکٹ کیا، نفرت کی، دھتکارا اور شاید یہ انہیں جذباتی کاری ایکشن تھا یا تمہاری کوئی بد دعا میں پکڑی بھی گئی تو میں کلاس ڈیفرنس کے شکنجے میں۔۔۔ اب مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔" وہ ایک دم سے ثانیہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بے بسی سے بولی۔

"اگر ماما کو پتا چل گیا؟" ثانیہ نے اسے آخری خوفناک سچویشن کا احساس دلایا جو جلد یا بدیر پیدا ہونی تھی۔

"میں سب باتیں سوچ چکی ہوں اور میں جانتی ہوں 'ماما کا ری ایکشن کس قدر خوف ناک ہو گا۔۔۔ اور شاید بلال بھائی کا بھی۔۔۔ ہمیں خود غرضی کا بھی تو لا علاج مرض لاحق ہے۔۔۔ وہ میرے لیے ایسا کچھ بھی choose نہیں کرنے دیں گے میں جانتی ہوں۔" وہ ایک بالکل بدلی ہوئی زونیرا تھی۔

"پھر بھی تم۔۔۔؟"

"ہاں۔ پھر بھی میں پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔" وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

"روحیل کو اچھی جاب مل گئی ہے اور وہ پڑھ بھی رہا ہے۔ محنتی ہے بہت جلد سیٹل ہو جائے گا نہ بھی ہوا تو بھی میں اس کے ساتھ ہوں۔ ہم دونوں مل کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اچھی شاندار زندگی۔ محبت جس کی بنیاد ہو گی جسے کوئی ہلا نہیں سکے گا۔" وہ عجیب سی باتیں کر رہی تھی۔

اور روحیل کے متعلق وہ سب کچھ جو ثانیہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ نہ اس کی جاب کے متعلق نہ اس کی تعلیم کے متعلق نہ اس کے فیوچر پلانز۔۔۔ تو یہ سب زونی کو کیسے معلوم ہے؟"

"کیا یہ دونوں روز ملتے ہیں۔۔۔؟ تو روحیل نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔" وہ الجھن بھری نظروں سے ساکت بیٹھی زونی کو دیکھنے لگی۔

"تم یہ سوچ رہی ہو گی کہ روحیل کے بارے میں تمہاری معلومات صفر ہیں جبکہ مجھے اس کے بارے میں ساری اپ ڈیٹس معلوم ہیں تو کیا ہم روز ملتے ہیں؟" ثانیہ کو اس کی بات سن کر دھچکا سا لگا۔

"ہم روز نہ بھی ملیں ہم دونوں کے دلوں کے رابطے تو ہیں اگر چہ وہ ابھی میری طرف اس طرح سے ملتفت نہیں ہے جس طرح میں۔۔۔ پھر بھی ثانیہ! یہ میری اس پاگل محبت کا کرشمہ ہے کہ وہ مجھے تھوڑا تھوڑا Own کرنے لگا ہے۔"

اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ بے قراری سے کہہ رہی تھی۔

"ثانیہ! کیا محبت واقعی پاگل کر دیتی ہے؟ کیا یہ جذبہ واقعی کرشمہ ساز ہے؟ کیا یہ واقعی دلوں کو، روحوں کو بدل دیتا ہے؟ کل تک مجھے جس شخص کے چہرے سے کلاس سے، ہر چیز سے نفرت تھی۔ آج وہ میری زندگی کا مقصد بن چکا ہے اگر وہ مجھے نہ ملا ثانی! تو میں مر جاؤں گی۔ اس نے مجھے سارے کا سارا ہلا ڈالا ہے۔۔۔ میں کیا کروں ثانیہ! میں کیا کروں؟" وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔

ثانیہ پریشان نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"صرف تم۔۔۔ صرف تم کچھ کر سکتی ہو میرے لیے۔۔۔ بولو کرو گی نا؟" وہ خود ہی اپنے آنسو صاف کرتے سر اٹھا کر بولی۔

"میں۔۔۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔" ثانیہ کی کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا نہ اس کی دیوانگی نہ اس کی باتیں۔

"تم روحیل سے بات کرو میرے لیے۔"

"میں کروں بات؟" وہ حیران سی رہ گئی۔

"کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں؟" ثانیہ فوری طور پر انکار بھی نہیں کر سکی۔

اس نے جلدی سے سائیڈ پر پڑا سیل فون نکالا اور روحیل کا نمبر نکالنے لگی۔

"یہ نمبر تم اس کا اپنے سیل میں Save کرو اور اس سے رات میں فون کر کے میرے متعلق پوچھو، پلیز کرو گی نا!" وہ خود ہی ثانیہ کا سیل فون اٹھا کر روحیل کا نمبر فیڈ کرنے لگی۔

"نہیں زونیرا میں روحیل کو فون نہیں کروں گی۔" ثانیہ نے چند لمحوں میں ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ شاکڈ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اوکے۔ مت کرنا۔۔۔ مجھے پہلے سے پتا تھا میں نے تمہارے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا ہے جو تم میرا ساتھ دو گی، تھینک یو۔۔۔ میں آئندہ تم سے ایسا کچھ نہیں کہوں گی۔" اس نے تیزی سے اس کا موبائل واپس رکھا اور ثانیہ کے پکارنے کے باوجود باہر نکل گئی۔ ثانیہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"بہت اچھا رشتہ ہے جیسے خدا نے آسمان سے تمہارے لیے ہی اتارا ہو میں نے تو دو بار شکرانے کے نفل بھی پڑھ لیے ہیں۔" ذکیہ بہت خوش تھیں۔

"تم کیوں چپ ہو؟" وہ اس کی خاموشی سے چڑ کر بولیں۔

"آپ کو سن رہی ہوں، چپ کب ہوں۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

"اور دیکھو ایسے اچھے نیک دل لوگ ہوں گے زمانے میں۔ کہنے لگی رشتہ نا تو قسمت سے جڑے گا۔ ہم بسمہ کا علاج اگر ہو سکے تو کرا دیں گے شاید اللہ نے یہ نیکی ہماری قسمت میں لکھ رکھی ہو۔۔۔ ایسے بھلے لوگ۔ میرے تو دل سے دعائیں نکل رہی ہیں۔" ذکیہ کے لیے آج کی بلکہ عمر بھر کی سب سے بڑی خوشی یہی تھی کہ کسی نے بسمہ کا رشتہ چاؤ سے مانگ لیا اور اس کی بینائی کی امید بھی دلا دی اور اس سے بڑھ کر کیا چاہیے تھا۔

"ان کی کوئی شرط تو ہو گی امی؟" بہت دیر بعد وہ آہستگی سے بولی۔

"ایک بھی نہیں۔ ذرا بھی نہیں۔" ذکیہ جھٹ سے بولیں۔

"تو پھر چیک کر لیتا تھا آپ نے۔" بسمہ خلا میں نظریں گاڑ کر بولی۔

"کیا چیک کرنا تھا؟" ذکیہ حیرانی سے بولیں۔

"کہیں سچ مچ وہ فرشتے ہی نہ ہوں۔" وہ ہلکی پھلکی بات کرتے ہوئے مسکرائی تک نہیں تھی۔

"یہ لے پالک! لوگ بھی تو فرشتہ صفت ہوتے ہیں ہم بھی دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں تو ہوئی۔ انہیں کے دم سے قائم ہے اس کا کاروبار۔"

"ایک بات پوچھوں؟" بسمہ کو شاید ماں کی اتنی خوشی پسند نہیں آ رہی تھی۔

"وہ بچے والی کیا بات تھی؟" اور ذکیہ چند لمحے کچھ بول ہی نہ سکیں۔

"کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔ کیا سنا تھا تم نے؟"

"یہی تو آپ سے پوچھ رہی ہوں۔"

"بچے نہیں ہیں ناکلثوم اور اس کے میاں قیصر کے۔۔۔ تو اس لیے۔" ذکیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں جملوں میں ربط کیسے پیدا کریں تو دوسرے کو ادھورا چھوڑ دیا۔

"تو اس لیے کیا امی؟" بسمہ جان کر انجان بن رہی تھی یا واقعی اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ذکیہ نے جانچتی نظروں سے اسے دیکھا، اس کا چہرہ حسب معمول بے تاثر تھا۔

"اٹھارہ انیس سال ہو گئے دونوں کی شادی کو۔ تو بچہ کوئی نہیں اس لیے کوئی کمی تھوڑی ہے ان کے گھر میں۔ یہ محل جیسا عالی شان گھر، چلتا کاروبار گاڑی تو کر چاکر سب ہی کچھ تو ہے اور چاہیں تو رشتوں کی بھی کمی نہیں۔"

"تو پھر مجھ اندھی میں کیا کشش ہے ان کے لیے ..... جو مجھے سوکن بنانا چاہتی ہیں؟" وہ خود شناسی کی انتہا پر تھی شاید۔

"ایسا کیوں بولتی ہو پھر وہ تو پہلے تمہارا علاج کرانا ..!!"

"امی! جانے دیں 'میرا کوئی علاج نہیں' آپ کیا جانتیں نہیں؟"

"مایوسی کفر ہے میری بچی! اس میں کیا حرج ہے بڑا ہسپتال لیے باہر کے لائق فائق ڈاکٹر جن کی پوری ٹیم ہے کیا پتا اللہ کوئی وسیلہ بنا دے انہیں لوگوں کے ذریعے سہی اُمید تو نیک ہی رکھنی چاہیے۔" ذکیہ آج کوئی بھی بری بات برا گمان دل میں نہیں لانا چاہ رہی تھیں۔

"تو شوہر کی دوسری شادی کے لیے میں ہی کیوں' عیبی اور داغی۔"

"بسمہ!" ذکیہ کے دل کو چوٹ سی لگی۔ "خدا نہ کرے جو تو داغی ہو۔ اللہ کے کام ہیں بیٹا' نہیں تو سب۔ جس کو چاہے پورا بنائے۔ جس میں چاہے کچھ کمی چھوڑ دے۔ تم کوئی خود پیدا ہوئیں ایسی۔" وہ برا سا مان کر بولیں۔

"تو پھر بتائیں نا میں ہی کیوں؟" وہ اب بھی بضد تھی۔

ذکیہ فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکیں۔

"تم انہیں پسند جو آ گئی ہو۔" وہ لگاوٹ سے بولیں۔

"انہیں رشتوں کی کیا کمی' آپ خود ہی تو کہہ رہی تھیں۔"

"فضول بحث کیے جا رہی ہو بھولا نا تم انہیں پسند آ گئیں۔ اب میں کیا پوچھتی کہ بی بی کیوں پسند کیا میری بچی کو؟ کیا وجہ ہے؟ اب کیا جواب ہو گا بھلا اس بے تکے سوال کا۔" وہ خفگی سے بولیں۔

"بچہ چاہیے انہیں' صاف اور سیدھی بات ہے اور سوکن لانا کچھ آسان بات تو نہیں۔ اسی میں انہیں بہتری نظر آئی ہو گی..... کہ یہ اندھی ان کی سلطنت میں کیا مداخلت کرے گی۔ بچہ پیدا کر کے بچہ لیں گے اور دھکا مار باہر کریں گے..... اب بتائیں امی! اس سے بڑا مطلب اور خود غرضی اور کیا ہو گی؟"

"شاباش! میری بیٹی شاباش۔ کیسے پوری کہانی گھڑلی۔ شیطان کے ایک وسوسے سے..... ایسے خود غرض اور کمینے لوگ ہوتے تو بتاؤ وہ تمہارے علاج میں کیوں دلچسپی لیتے۔ انہیں اس سے کیا..... اور بچہ ہی چاہیے ہوتا تو تیری یہ کہانی فٹ تھی' وہ رشتے سے پہلے تیرا علاج کرانا چاہتے ہیں' اس خالی خولی ہمدردی کو کہاں فٹ کرے گی؟" وہ ناراض ہو گئیں۔

"سوجا اب' پرسوں صبح وہ آئیں گی گاڑی لے کر' اللہ بہتر کرنے والا ہے۔ خدا کرے کچھ امید پیدا ہو ہی جائے' تجھے روشنی مل جائے اور کیا چاہیے میرا تو رواں رواں انہیں ابھی سے دعائیں دے رہا ہے' ایسے نیک لوگ ..." ذکیہ لیٹتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بولے گئیں۔

"انیس بیس سال شادی کو ہو گئے۔ بیس بائیس سال کی عمر میں بھی شادی ہوئی ہو تو چالیس پینتالیس تو کہیں بھی نہیں گئے..... اور بسمہ تو ابھی انیس میں بھی نہیں لگی۔" وہ سوچنے لگیں۔

"چلو دفع کرو۔ مرد کی عمر کون دیکھتا ہے پھر جو اتنے سکھ دے رہے ہیں گھر میں نوکر چاکر' روپیہ پیسہ..... میری تو ساری فکریں ہی ختم ہو جائیں گی ورنہ کہاں سے میں اتنا جہیز جوڑتی' روپیہ اکٹھا کرتی' سرمد کے کمانے میں تو ابھی سال پڑے ہیں۔ یہ تو میرے مولا نے کوئی غیبی مدد کی ہے۔" سوچتے سوچتے جانے کب ذکیہ کو نیند آ گئی۔

بسمہ اندھیرے میں بہت دیر بیٹھی اس غیبی مدد کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر تھک کر وہ بھی لیٹ گئی۔

"اور امی نے روحیل کو کیسے نکال دیا۔ آدمی تو ہے ہی غرض کا پتلا۔ غرض کے بغیر تو وہ کسی کو منہ بھی نہیں لگاتا۔ اس نے شادی سے انکار کیا کیا' امی کی آنکھیں بدل گئیں' غرض کے لیے بیٹا بنایا اور غرض پوری نہ ہونے پہ پھر سے بیٹے کا دوست بنا ڈالا۔ واہ رے آدمی۔"

آنکھوں میں روشنی نہ ہونے کے باوجود اسے اندھیرے میں پڑے یہ معدوم سے نکتے خوب سوجھ جاتے تھے شاید انہیں کی سوجھ بوجھ پر وہ اپنا اور دوسروں کا مقام متعین کر لیا کرتی تھی..... جیسے آج روحیل کو امی نے اوپر سے نیچے پٹخا۔ شاید یہی زندگی ہے۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب سوچنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ذرا سی دیر کے لیے رباب کے گھر سے لیے گئے کچھ نوٹس فوٹو کاپی کروانے ایک شاپ کے باہر رکی تھی۔

ڈرائیور کاپی کروانے گیا اور وہ گاڑی میں بیٹھی رہی۔ پاس سے گزرتا روحیل اسے دیکھ کر بے اختیار ٹھٹکا تھا۔

ثانیہ کے دل میں اس دن کی شرمندگی تھی جب اس نے روحیل کو بے وجہ ذلیل کر کے نکالا تھا۔ روحیل کو دیکھتے ہی اسے وہ ساری شرمندگی یاد آ گئی۔ وہ اس کا حال چال پوچھنے کو گاڑی سے باہر نکل آئی۔

وہ بھی جانے کس دھیان میں تھا' بول کم رہا تھا' عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ زیادہ رہا تھا۔ ثانیہ کو الجھن سی ہونے لگی۔

اور ڈرائیور کے باہر آتے ہی وہ جلدی سے خدا حافظ کہہ کر دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اور ماما کو ڈرائیور نے بتا تو دیا ہو گا کہ دور سے اس نے روحیل کو اس کے پاس کھڑے دیکھ تو لیا تھا۔

"اور ماما نے اگر بلال سے یہ سب کہہ دیا اور وہ یقیناً کہیں گی۔ بلال نے مجھ سے پوچھ لیا؟" اسے سوچ کر ہی ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

"اور جو یہ زونیرہ مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں روحیل سے رابطہ کر کے اس کے فضول جذبوں کی میسنجر بنوں اور جو بلال کو ذرا بھی خبر ہو گئی..... نہیں نہیں۔ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔" مسلسل سوچیں تھیں جو اسے پریشان کیے جا رہی تھیں۔

کل سے بلال کا فون بھی نہیں آیا تھا۔ یہ اور بھی پریشان کرنے والا احساس تھا۔ اس نے کبھی ایک دن بھی مس نہیں کیا تھا جب دونوں کی بات نہ ہوئی ہو.....

"تو پھر ماما نے اسے بتا دیا ہو گا۔

اور اب جو زونیرہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہے' خدا خدا کر کے تو اس کا دل میری طرف سے پھرا تھا اور وہ اتنی آسانی سے بخش دینے والی ہے بھی نہیں۔ پھر سے کوئی نیا جھگڑا کھڑا کرے گی۔ ماما کو بھڑکا دے گی یا بلال کو' یا اللہ! میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ ایک کے بعد ایک مصیبت۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"اور اگر زونیرہ اپنی ضد پر اڑی رہی اور ماما اور بلال کو پتا چلا تو وہ یہی کہیں گے کہ زونیرہ کو روحیل کی طرف میں نے لگایا ہے یعنی دونوں طرف سے شامت صرف میری ہی آئے گی۔"

اس کا دماغ درد سے پھٹنے لگا۔

اسی وقت بلال کا فون آ گیا۔

وہ بڑے محتاط انداز میں اس سے بات کر رہی تھی۔ مگر بلال پہلے کی طرح خوش خوش بات کر رہا تھا۔

"یار! سمسٹر شروع ہو گئے ہیں نا۔ اب دو دن بعد ہی فون کیا کروں گا' بہت پڑھنا ہوتا ہے۔ اسی لیے تو فون نہیں کر سکا ورنہ دھیان تو مجھے لگا رہتا ہے تمہارا۔ کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟"

"میں بیمار تھوڑی ہوں بلال!" وہ چڑ کر بولی۔

"ہونا بھی نہیں۔ مجھے بیمار بیوی ذرا پسند نہیں۔"

"پہلے کتنی بھگتا چکے ہیں؟" وہ طنز سے بولی۔

"اف! ابھی تو ایک ہی کو بھگتنا مشکل ہو رہا ہے اور کیا کرتی رہتی ہو؟"

اس کا سوال سن کر ثانیہ کے دل میں پھر کچھ ٹوٹ سا گیا اس کی عمر بھر جتنی بھی عمر تھی' ایک ہی تو مصروفیت تھی' وہ بھی ان لوگوں کو گوارا نہیں ہوئی۔

"کچھ بھی نہیں..... پڑھتا ہی تھا۔ وہ بھی آپ نے منع کر دیا۔" وہ خفگی سے بولی۔

"اوہ بھئی۔ وعدہ کر تو چکا ہوں' اگلے سال تم ضرور

ایگزام دو گی۔"

"اگلا سال کس نے دیکھا ہے۔" وہ پُرمردہ لہجے میں بولی۔

"ثمانیہ!" بلال ناراضی سے بولا۔

"اس میں کچھ ایسا غلط بھی نہیں ..... آدمی کے تو اگلے پل کا نہیں پتا۔ آپ تو پھر اگلے سال کی بات کر رہے ہیں۔" اسے بلال کو تکلیف دینے میں مزہ آنے لگا۔

"تم کوئی اچھی بات نہیں کر سکتیں۔"

"میرے ساتھ اچھی باتیں ہوتی ہی نہیں تو کروں کیسے۔"

"اب کیا ہوا ہے؟" وہ ترشی سے بولا۔

"کچھ نہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کیا بات ہے، کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے کہو۔"

"آپ اتنی دور بیٹھے کیا کر لیں گے اور پہلے میرے کون سے مسئلے حل کر دیے آپ نے جو اب ....." وہ ضبط کیے بغیر بول پڑی۔

"ایسی کیا پریشانی ہے تمہیں اور میں نے کون سا تمہارا مسئلہ آج تک حل نہیں کیا۔" بلال کو بھی غصہ آنے لگا۔

"اچھا تو ایک فوری مسئلہ حل کریں میرا ..... کریں گے؟"

"کیوں نہیں۔ میں تمہارے پرابلمز سولو نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔" وہ محبت سے بولا۔

"تو پھر آجائیں ابھی اور اسی وقت میرے پاس I feel lonely" وہ بے تابی سے بولی۔

اور دوسری طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"کر سکتے ہیں میرا یہ مسئلہ حل ..... نہیں نا ..... تو پھر اتنے دعوے جھی مت کریں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی۔

"میں جانتا ہوں تمہارے دل میں غصہ ہے۔ بہت سے گلے ہیں ناراضی ہے۔ میں نے تمہیں ہر اس بات، ہر اس کام سے روکا ہے جو تم کرنا چاہتی تھیں۔ چند دن کی رفاقت اور جدائی کی اتنی کالی راتیں ..... تمہاری ناراضی حق بجانب ہے۔" وہ رُک رُک کر بولے گیا۔

ثمانیہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ بلال ابھی بھی، اتنے مہینوں کی دوری کے باوجود بھی اس کے دل پر گزرنے والی ہر قیامت سے آگاہ ہے۔

"اس کے باوجود آپ میرے ساتھ کیا کرتے رہے۔" اس کے لبوں سے شکوہ پھسل گیا۔ "کم از کم مجھے ایگزام ہی دے لینے دیتے۔ میری یہ تنہائی، یہ اکیلا پن مجھے اتنا نہ کاٹتا۔ مصروفیت مل جاتی مجھے۔"

"ماما کا خیال تھا۔ پہلی بار میں احتیاط بہت ضروری ہوتی ہے ورنہ ..... خدانخواستہ بار بار ....." وہ آگے کچھ بھی کہنے سے رُک گیا۔ منہ سے نکلا کوئی بھی لفظ کہیں قبولیت کی سند ہی نہ پا جائے ..... وہ جانے کیسے ہونے والے بچے کے بارے میں اس قدر حساس ہو گیا تھا۔

"انہوں نے کی تھی احتیاط؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"ثمانیہ!" بلال کو شاید برا لگا تھا۔ کیسا دوری کا عذاب تھا کہ وہ ایک دوسرے کے چہرے دیکھے بغیر، لہجے پڑھنے پر مجبور تھے اور مرضی کے نتائج اخذ کرنے پر۔

"انہوں نے بھی تو شادی کے بعد سب امتحانوں کے سلسلے جاری رکھے تھے۔ جاب بھی کرتی رہیں اور آپ دونوں کو پیدا بھی کیا اور پالا بھی۔" اس کے اندر بہت تلخی بھرتی جا رہی تھی۔

"ماما یہ سب کچھ تمہارے اور میرے خیال سے ..... ہماری محبت کی وجہ سے کر رہی ہیں۔"

"جبکہ وہ جانتی تھیں پہلے سے ..... مجھے علم سے تعلیم سے محبت نہیں عشق ہے پھر بھی بلال انہوں نے ..... یہ میرا کیسا خیال کیا۔" اس کے منہ سے سسکی سی نکل گئی ..... "اور یہ کیسی محبت ہے جو میرے دل کو بنجر کرتی جا رہی ہے۔"

"تم نے اس ذرا سی بات کو دل پر ہی لے لیا ہے۔ دیکھو زندگی خدانخواستہ اس ایک امتحان پر آکر ختم تو

نہیں ہو گئی یار رک تو نہیں گئی۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

"میرے لیے یہ رک بھی گئی ہے اور سمجھیں، ختم بھی ہو جائے گی اگر ....." وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"میں فون بند کر رہی ہوں پھر بات کریں گے ....."

اس وقت اس کے منہ سے کچھ بھی ٹھیک نہیں نکل سکتا تھا۔ اس نے بلال کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ اتنے انتظار کے بعد اس کا فون آیا اور اس نے بند کر دیا۔

پہلے ماما نے دل دکھایا پھر زونیرا کی دکھ دینے والی باتیں اور اب بلال ..... اسے لگا۔ آج اس کا دل شدت غم سے پھٹ ہی تو جائے گا اس کے ہاتھ اس شادی سے کیا آیا تھا بلکہ اس کی پہلی بے مایہ زندگی کی چند انمول معصوم خوشیاں تھیں۔ وہ بھی اس کی مٹھی سے پھسلتی چلی گئیں۔ اب صرف یہ طعنے ذلت اور دھمکیاں رہ گئی تھیں اور وہ روتی بھی نہیں۔

☆ ☆ ☆

"زونیرا کہتی ہے، ثمانیہ مجھ سے ابھی بھی محبت کرتی ہے اور ثمانیہ اس کے تو کسی انداز سے نہیں لگا کہ اس کے دل میں ایسی کوئی بات ہے بھی ..... تو پھر زونیرا مجھ سے یہ سب کیوں کہہ رہی ہے۔ وہ اتنی مغرور، جھگڑالو بدتمیز لڑکی کیسے ثمانیہ کی ہمدرد اور خیر خواہ ہو سکتی ہے۔"

وہ شہر سے باہر بوڑھے راوی کنارے بیٹھا تھا جس کا گدلا پانی چاند کی روشنی میں ٹمٹماتا سا لگ رہا تھا اور کبھی کبھی کوئی لہر کروٹ لیتے ہوئے چاند کے عکس میں ڈوب جاتی۔

ایک طرف آدھی رات کی تاریکی میں ڈوبا شاہدرہ کا قصبہ تھا تو دوسری طرف موٹروے کو جاتی ہوئی کشادہ سڑکیں جن پر کبھی کبھی گزرتی ٹریفک کا شور اسے چونکا دیتا۔

"مگر اس نے اتنے دنوں میں بلکہ مجھے اپنے گھر سے ذلیل کر کے نکالنے کے بعد پہلی بار اتنی مروت سے بات کی ..... وہی مروت جو اس کی شخصیت کی سب سے نمایاں خوب صورتی ہے اور میں تو بس اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ پوچھ ہی نہ سکا۔ اس کے چہرے، اس کی آنکھوں میں اس محبت کی کھوج لگاتا رہا جو زونیرا نے مجھ سے بیان کی تھی۔

شاید ایک وفا شعار بیوی کی طرح وہ بلال کے رویے کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اور کرتی بھی کیوں ..... میں اس کا کون ہوں، کوئی بھی تو نہیں۔" اس نے مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر راوی کے سست روپانیوں میں پھینکا۔

"میں نے اس سے کچھ پوچھا بھی تو نہیں۔ بلال کے بارے میں بھی کچھ نہیں، شاید وہ کچھ بول ہی پڑتی اور زونیرا جو مجھے اس کا سیل نمبر دے کر گئی ہے کہ میں اس سے بات کر کے اپنے دل کی تسلی کر لوں۔ اب میں اسے کیا بتاؤں میں تو اس سے بات کیے بغیر بھی برسوں پہلے سے مطمئن تھا کہ وہ میری ہے اسے مجھ سے کوئی نہیں چرا سکتا۔ اب جب وہ کسی اور کی ہو چکی ہے تو میں اس سے کیا بات کروں۔ کیا پوچھوں؟" وہ بے چین سا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اور یوسف کی امی ان کا رویہ کسی قدر بیگانہ تھا جیسے وہ مجھے جانتی بھی نہیں۔ ناراض ہونے میں وہ حق بجانب ہیں اب کوئی فالتو میں تو اپنی محبتیں نہیں لٹاتا پھرتا انہوں نے مجھے یونہی تو اپنا بیٹا نہیں بنا لیا تھا۔"

"بسمہ کے لیے ..... اور بسمہ وہ کیوں بار بار میرے خوابوں میں آتی ہے۔ کیا اس کا حسن ثمانیہ کی محبت پر غالب آ جا رہا ہے، جو میری پریشان نیندیں اس کے خیال سے ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہیں ..... میں کیا کروں، یہ سب عذاب کس سے بیان کروں۔"

اس وقت اس کا سیل فون بج اٹھا۔

دوسری طرف زونیرا تھی۔

"تمہیں ثمانیہ نے فون کیا؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"نہیں تو۔" وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔

"اس نے مجھ سے تمہارا نمبر لیا تھا شام میں۔"

"میرا نمبر ....." روحیل کو لگا اس کا دل بند ہو جائے

گا۔

"اور سچی بات ہے میں نے تم سے رابطہ تمہارا نمبر سب کچھ ثانیہ کے لیے ہی تو کیا تھا..... بہت دکھ ہوتا ہے مجھے اس کی حالت دیکھ کر۔ وہ خود پر جبر کر رہی ہے اور جبر کی انتہا پر ہے، خدانخواستہ اس کے ساتھ کچھ ہو نہ جائے اگر ثانیہ کا فون نہیں آتا تو پلیز آپ خود اس کو فون کر لینا، شاید اس دل کو کچھ ڈھارس مل جائے۔"

روحیل بے دھیان سا سنے جا رہا تھا۔

"کرو گے فون اسے؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہوں..... دیکھوں گا۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"کب تک؟ جب وہ خدانخواستہ خود کو کچھ کر لے گی۔" وہ جتا کر بولی۔

"نہیں..... نہیں۔" بے ساختہ روحیل کے منہ سے نکلا۔

"تو پھر اسے فون کرو..... اس سے بات کرو اور پلیز میرے بارے میں مت بتانا کہ میں نے تم سے کہا ہے فون کرنے کو..... ورنہ وہ تم سے بات نہیں کرے گی میرا کوئی بھی ریفرنس نہیں دینا بہت بچی ہو رہی ہے وہ ان دنوں۔ کاش میں تمہیں سمجھا سکتی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔" وہ ہولے سے بولا۔

"تو کرو گے اس کو فون؟" وہ اس سے اثبات میں جواب چاہ رہی تھی۔

"دیکھوں گا۔" وہ متذبذب سا بولا۔

"ہاں تو ابھی کر لو نا بے شک چند منٹ کے لیے کر لینا، صرف اسے یہ فیل ہو کہ اس کا خیال رکھنے والا بھی تو کوئی ہے، ورنہ بلال بھائی کے طعنوں نے تو اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا ہے۔"

"مگر آپ کے بھائی نے تو اس سے پسند کی شادی کی تھی۔"

"یہی تو مسئلہ ہے بلال بھائی کی پسند ان کا جنون سب وقتی ہوتا ہے، جیسے ہی ٹائم گزرتا ہے ان کی اپنی پسند ان کے لیے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہم تو ان کی اس عادت سے پریشان تھے ہی ثانیہ بے چاری کی تو زندگی برباد ہو گئی۔" وہ رنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

وہ چار ادھر ادھر کی باتوں کے بعد زونیرا نے فون بند کر دیا۔

روحیل کچھ دیر سوچتا رہا۔

پھر ارادہ کر کے اس نے ثانیہ کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف فون بند تھا۔ وہ فون بند کر کے واپسی کے لیے مڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

"زونیرا بی بی تو شاید اپنی کسی دوست کی طرف گئی ہوئی ہیں اور ثانیہ بی بی سو رہی ہیں۔" سروری نے رباب کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے بتایا۔

"آپ ثانیہ کو اٹھا دیں اور میرا بتا دیں وہ اٹھ جائے گی۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

"جی اچھا۔" سروری کہہ کر نکل گئی۔

رباب اپنے بیگ سے ثانیہ کا ایڈمیشن فارم اور دوسری چیزیں نکالنے لگی، وہ ایک جگہوں پر اسے ثانیہ سے کچھ معلومات چاہیے تھیں فارم فل کرنے کے لیے اور دو جگہوں پر اس کے سائن۔ اس لیے اسے آنا پڑا۔

ثانیہ نے خود سے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ ابھی تک فضیلہ میڈم کا موڈ اس دن اس کے جانے والی بات پر خراب تھا۔ وہ کوئی نیا رسک نہیں لینا چاہ رہی تھی باہر قدموں کی آواز آئی، رباب نے سب چیزیں نکال کر میز پر رکھ دیں کہ ابھی ثانیہ سے فل کروا کے وہ زیادہ دیر بیٹھے گی نہیں اس کا ڈرائیور قریب کی مارکیٹ تک گیا تھا۔

اور دوسرے لمحے وہ بھونچکی سی رہ گئی۔

میڈم فضیلہ میڈم اندر آ چکی تھیں۔

سلام دعا کے بعد وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"زونیرا تو شاید گھر میں نہیں۔" وہ اس کی آمد کا یہی مقصد سمجھی تھیں۔

"جی میں نے کہا! تھوڑا ویٹ کر لیتی ہوں یا اگر ثانیہ اٹھی ہو تو اس سے ذرا گپ شپ ہو جائے۔" وہ ان کی نظریں بچا کر وہ پیپرز دوبارہ بیگ میں رکھنا چاہ رہی تھی۔

"یہ ثانیہ کا ریسٹ کرنے کا ٹائم ہوتا ہے، سروری! کچھ لے کر آؤ نا رباب کے لیے۔" انہوں نے سامنے سے گزرتی سروری کو آواز لگائی۔

"یہ کیا ہے؟" رباب جو پیپرز سمیٹنے لگی تھی انہوں نے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بس..... وہ فارم ہے میرا..... ایڈمیشن کا۔" وہ ہکلا کر بولی۔

"تمہارا فارم۔" انہوں نے مصنوعی حیرت ظاہر کرتے ہوئے فارم اٹھا لیا اور پڑھنے لگیں۔ رباب کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

"تم تو کہہ رہی تھیں، یہ میرا فارم ہے مگر اس پر تو....." اسی وقت ثانیہ اندر داخل ہوئی۔

"یہ تو شاید ثانیہ کا فارم ہے..... ہے نا؟" ثانیہ کے قدم وہیں برف ہو گئے۔ رباب خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

انہوں نے جتلاتے کو فارم رباب کے سامنے لہرایا۔

"وہ..... وہ غلطی سے شاید میرے فارم کی جگہ ثانیہ کا آ گیا۔" وہ بمشکل بول پائی۔

"مگر ثانیہ تو ایگزام ہی نہیں دے رہی تو فارم کہاں سے فل ہو گیا۔"

وہ ثانیہ کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"جی۔" رباب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔

"جی ماما! میں ایگزام نہیں دے رہی مگر یونہی فارم فل کر دیا کہ اگر موڈ بنا تو شاید دے بھی دوں، ورنہ رہنے دوں گی۔" ثانیہ خود کو سنبھالتے ہوئے قدرے متوازن لہجے میں کہتی آگے بڑھی۔

"اس دن رباب کی طرف گئی تو یہ اپنا فارم فل کر رہی تھی تو میں نے بھی۔"

"مگر رباب کا فارم کالج کی طرف سے جا چکا ہے اور یہ....." وہ پھر سے جتا گئیں۔ ان کو جل دینا بہرحال آسان نہیں تھا۔

"جی یہ پرائیویٹ امیدواروں کے لیے ہے۔" ثانیہ اعتماد سے بولی۔

"کالج کی طرف سے آپ نے مجھے ایگزام میں بیٹھنے سے منع کر دیا تھا تو میں نے سوچا کمپوزٹ ایگزام....."

وہ اس کی بات پوری ہوئے بغیر کھڑی ہو گئیں۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا امتحان دینے سے جب کہ تم نے خود بلال کی اور میری منتیں کی تھیں کہ تم امتحان نہیں دینا چاہتیں۔ اس لیے تمہیں مجبور نہیں کیا جائے، ورنہ میں جس نے خود آٹھویں ماہ کے بچے کے ساتھ ایگزام دیے ہوں تمہیں منع کروں گی اور الٹا تم مجھے ہلیم کر رہی ہو، نمبت افسوس ہوا مجھے تم پر۔"

وہ تیز تیز کہتی کمرے سے نکل گئیں۔

رباب اور ثانیہ لب بستہ، ہراساں نظروں سے انہیں جاتا دیکھ کر بیٹھی رہ گئیں۔

"ثانی! اب کیا ہو گا؟" بہت دیر بعد رباب سرگوشی میں بولی تھی اور ثانیہ سے جواب میں کچھ بھی نہیں بولا گیا۔

☆ ☆ ☆

"پہلے سے ہی پتا تھا مجھے پھر بھی دل کو آس سی لگ گئی تھی کہ شاید اللہ کوئی معجزہ دکھا دے، ہم جیسوں پر بھی اس کا کرم ہو جائے۔ میری بچی کو آنکھیں مل جائیں۔ مجھے دو جہان کی دولت مل جائے گی پر..... ایسے نصیب کہاں اپنے۔" ڈکیہ گہرا سانس لے کر بولیں۔

بسمہ بالکل چپ تھی۔

"کتنے ڈاکٹر تھے وہاں چیک کرنے والے؟" وہ جواب میں خاموش رہی۔

"گونگے کا گڑ کھا کر آئی ہے، مجھے تو انہوں نے ساتھ جانے ہی نہیں دیا کہ خالہ جی! ہم خود ہی چیک کرا لیں گے۔ تو کچھ نہیں بتا رہی۔" وہ جھلا گئیں۔

"کیا بتاؤں؟" بسمہ کی آواز جیسے کسی کنوئیں سے آئی۔

"کیا کہا ڈاکٹروں نے..... آنکھیں بھی تو نئی لگ جاتی ہیں آپریشن سے..... لوگ مرتے وقت دے جاتے ہیں وصیت میں..... ان باہر کے ڈاکٹروں کے

پاس تو ایسے عطیہ کا اشتاک ہوتا ہے۔ کچھ تسلی کی بات تو کی ہوگی انہوں نے۔"

"کیسے کرتے تسلی کی بات؟" بسمہ خلا میں دیکھ کر بولی۔

"کیوں کچھ نہیں تھا ان کے پاس تو پھر کمبخت نے بلایا کیوں تھا معائنہ کے لیے' مذاق کیا تھا۔" ذکیہ کو غصہ سا آگیا۔

"امی! قسمت ہم غریبوں کے ساتھ ایسے مذاق تو کرتی رہتی ہے اس میں غصہ کرنے والی کون سی بات ہے۔" بہت دیر بعد اس نے اتنا مکمل جملہ بولا تھا۔

"بسمہ! کیا بات ہے؟" ذکیہ اس کے لہجے پر چونکیں۔

"کوئی بات ہوئی وہاں؟"

"نہیں امی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"پھر بھی۔" ذکیہ کو بسمہ کی مسلسل خاموشی الجھا رہی تھی۔

"امی آپ کو پتا ہے' ہم ابھی جس ہسپتال میں گئے وہ کون سا تھا؟"

"ہاں پتا ہے' مجھے ہر بیماری کا علاج ہوتا ہے وہاں۔"

"وہ دونوں مجھے آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس نہیں لے کر گئی تھیں' قدرے توقف سے بسمہ بولی۔

"پھر۔۔۔ پھر کہاں لے کر گئی تھیں؟" ذکیہ کا دل زور سے دھڑکا۔

"گائنی ڈاکٹر کے پاس۔" بسمہ نے جیسے دھماکا کیا۔

"کیا مطلب۔۔۔ وہاں کیوں۔۔۔ کس لیے؟"

"میرا مکمل چیک اپ کرانے کے لیے۔" وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے بولی۔

"میرے اندر کوئی نقص' کوئی خرابی' کوئی کمزوری تو نہیں جو بچہ پیدا کرنے میں رکاوٹ بنے۔" وہ رک رک کر بولی۔

"کیا۔۔۔" ذکیہ بھونچکی سی رہ گئیں" اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔" وہ جیسے خود سے بولیں۔

دونوں خاموش ہو گئیں۔

ذکیہ دل میں اپنی کم عقلی کو کوس رہی تھیں تو بسمہ قسمت کے اس نئے کھیل کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اور امی! وہ دونوں۔۔۔ جب ڈاکٹر مجھے چیک اپ کے لیے اندر لے گئیں۔۔۔"

"تو وہ دونوں۔۔۔ کیا کہا انہوں نے؟" ذکیہ بے تابی سے بولیں۔

"بچہ پیدا ہوتے ہی طلاق کا کاغذ اس کے منہ پر مارنا اور بچہ لے کر چلتا کرنا اسے۔۔۔ پہلے سے طلاق نامے پر دستخط کرا لینا۔" وہ اپنی بہن کو سمجھا رہی تھی۔ بسمہ خلا میں نظریں گاڑے کہہ رہی تھی۔

اور ذکیہ کے کانوں میں اپنے ہی جملوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔

"یہ دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی ان ہی کے دم سے قائم ہے۔۔۔

"بے وقوف کچھ لوگ فرشتہ صفت ہوتے ہیں بڑے بھلے نیک لوگ۔"

وہ سوچتی جا رہی تھیں اور اپنے ہی اندر کہیں گم ہوتی جا رہی تھیں اور انہیں پتا بھی نہیں چلا کب بسمہ اٹھ کر وہاں سے چلی بھی گئی۔

☆ ☆ ☆

"تو تم نے ماما کو دھوکا دیا' مجھے دھوکا دیا۔ ہم سب کے اعتماد کو دھوکا دیا ثانیہ! تم ایسی نکلو گی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" رات میں ہی دھماکا ہو گیا۔

"یہ ماں بیٹی مجھے اس گھر میں ٹکنے نہیں دیں گی ثانی! میری یہ بات لکھ لے۔" اس کے کانوں میں خدیجہ کی بات گونجی۔

"تم نے سارے میں ماما کی ریپوٹ خراب کی کہ ہم تم پر سختی کر رہے ہیں۔ تمہیں امتحان میں بیٹھنے نہیں دیتے۔ تمہیں گھر سے نکلنے نہیں دیتے۔ اتنا ظلم ہو رہا ہے تم پر اس گھر میں کہ تم دوسروں سے کمپوزٹ ایگزام کے فارم منگوا کر جمع کروا رہی ہو۔۔۔ یہ تھیں تم اصل میں۔" وہ کیسے تیر پر تیر چلائے جا رہا تھا اسے جواب کا

موقع دیے بغیر۔

"اصل کی بات مت کریں بلال۔۔۔ اصل تو یہاں کسی کا بھی حقیقی نہیں سب ڈھونگ ہے' ڈرامہ' دکھاوا۔"

وہ اندر تک ہرٹ ہوئی تھی بلال کی باتوں سے چاہتے ہوئے بھی ضبط نہ رکھ سکی۔

"اوہ تو ہم سب ڈھونگی ہیں۔ ڈرامہ باز' رنگ باز دکھاوا کرنے والے۔۔۔ میں' میری ماں۔۔۔ ہمارا گھر۔۔۔ میری محبت سب ڈھونگ تھا' دکھاوا تھا۔۔۔ ورنہ تو حقیقت میں ہم انتہائی دھوکے باز' گرے ہوئے لوگ ہیں۔ یہی کہنا چاہتی ہو ناں تم؟" وہ زور سے چیخا تھا۔

"پلیز بلال۔۔۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا؟" وہ بری طرح سے ڈر گئی۔

"سب کچھ کہہ کر' بکواس کر کے تم معصوم بن جاتی ہو کہ تم نے ایسا کچھ نہیں کہا؟" وہ غصے میں بے قابو ہو رہا تھا۔

"مجھے' میری ماں کو ڈرامے باز' ڈھونگی کہہ کر تم کہتی ہو تمہارا یہ مطلب نہیں تھا۔ الو کا پٹھا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے۔"

اگر وہ اس کے سامنے ہوتی تو جانے وہ اس کا کیا حشر کرتا۔

"بلال پلیز! میری بات تحمل سے سنیں میں نے تو صرف۔۔۔" وہ گڑگڑائی۔

"تحمل سے؟ کیسے سن سکتا ہوں میں کچھ بھی تحمل سے۔ تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے ایسی بیچ گری ہوئی حرکتیں۔۔۔

I dont believe all this

میں نے تمہاری خاطر کیا کیا نہیں کیا۔" اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔

"اپنی ماں بہن کو ناراض کیا اس معاشرے سے بغاوت کی' صرف تمہیں پانے کے لیے تم پہ اعتماد کیا اور ہر بار اپنی اتنی قابل عزت' پیار کرنے والی ماں کو جھٹلایا۔ سچی محبت کرنے والی بہن کا دل توڑا اور تم نے مجھے کیا صلہ دیا یہ۔۔۔ یہ ذلت اور یہ القاب کہ میں ڈھونگی ہوں' دکھاوا کرتا ہوں۔"

وہ اتنی زور زور سے چیخ رہا تھا۔ ثانیہ نے گھبرا کر سیل فون کان سے ہٹا لیا۔

"آپ پلیز میری بات تو سنیں بلال! اچھا آئی ایم سوری' آئی ایم ریئلی سوری پلیز۔" آخر میں بھی تو اسے معذرت ہی کرنی تھی۔ کاش شروع میں ہی اس نے زبان نہ چلائی ہوتی۔۔۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

Dont say sorry"

وہ دھاڑا۔

"I dont need your sorry مجھے تمہاری معذرت کی ضرورت نہیں وہ پاگل ہو رہا تھا۔

"آج مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی دکھ نہیں ہو رہا کہ میرا انتخاب غلط تھا میں نے جو کچھ کیا اپنی ماں' بہن کی مخالفت کے باوجود غلط۔۔۔ کیا' برا کیا اور اسی کی سزا مجھے مل رہی ہے جو تم جیسی چھوٹے ذہن اور دل کی لڑکی جس کے قدموں میں میں نے دنیا کی ہر آسائش ڈالی اس نے مجھے یہ صلہ دیا۔ ثانیہ مجھے بہت دکھ ہے' بے حد افسوس مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہم دونوں کے بیچ۔۔۔"

"پلیز۔۔۔ پلیز بلال! کچھ ایسا ویسا مت بولیے گا۔۔۔ میں' میں مرجاؤں گی آپ کے بغیر' خدا کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔ میں کبھی ایگزام کا نام بھی نہیں لوں گی۔ آپ کی ماما کے سامنے کبھی ایک لفظ بھی نہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے
آسیہ سلیم قریشی کے 3 دلکش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ نٹکھٹی سی دیوانی سی	-/450 روپے
آرزو مچھر آئی	-/400 روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	-/400 روپے

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ -/45 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

بولوں گی فارگاڈ سیک بلال میں....."

مگر دوسری طرف شاید وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔

ثانیہ کی آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیل گئیں۔

دوسرے لمحے سیل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ تیورا کر نیچے گر گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت دنوں بعد بہت دل سے تیار ہوا تھا۔

آج اسے ثانیہ سے ملنے جانا تھا۔ زونیرا نے اسے گھر پر بلایا تھا۔

"میں تم دونوں کی ملاقات کروا دوں گی۔ ماما آج کالج سے دیر سے لوٹیں گی تم اس سے سب کچھ پوچھ لینا اور کہہ لینا..... اور کچھ نہیں تو اپنی محبت کا یقین ہی دلا دینا۔ وہ بہت ڈسٹرب ہے شاید تمہارا ساتھ اسے تقویت دے۔"

زونیرا کی باتوں نے بالآخر اسے پھر سے پیچھے بہت پیچھے جا کر سوچنے پہ مجبور کر دیا تھا یوں بھی وہ ثانیہ کو پانے کے لیے کچھ نہیں کر سکا مگر اسے خوش کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔

اور اگلی صبح ثانیہ کا فون بھی تو آ گیا تھا اس کے لیے اگرچہ اس نے کچھ ایسا خاص تو نہیں کہا تھا مگر اس کا حال چال پوچھا تھا۔

"وہ کیا کر رہا ہے کیا کرنا چاہتا ہے مستقبل کے پلانز اور بہت کچھ..... تو ان سب کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے، وہ اس میں انٹرسٹڈ ہے تو وہ یہ سب جاننا چاہتی ہے ورنہ اس سے پہلے بھی تو وہ ملے تھے۔ ثانیہ نے کبھی اس سے اس کے بارے میں بات نہیں کی تھی۔

اسی وقت اس کے سیل فون پر میسج ٹون آئی۔

میسج زونیرا کا تھا پڑھ کر لمحہ بھر کو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

دوسرے لمحے اس نے O.K کر کے Send کر دیا۔

"تو گویا قدرت نے زونیرا کے دل میں میرے لیے رحم ڈال دیا جس کی وجہ سے وہ یہ سب کر رہی ہے۔"

وہ مسرور سا پرنیوم لگاتے ہوئے اپنا آخری جائزہ لینے لگا۔

وہ کئی دنوں سے یوسف کے گھر بھی نہیں گیا تھا اور اب تو اس کی نیند بسمہ کی وجہ سے ڈسٹرب بھی نہیں ہوتی تھی۔

اس کی محبت روز اول سے ثانیہ ہی تو تھی اور اب وہ اسے مل رہی تھی یا نہیں مگر اس کی قربت تو ملنے کی امید تھی..... وہ سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔

اس کا سیل فون پھر بج اٹھا۔

کوئی اجنبی نمبر تھا۔

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کال ریسیو کر لی اور دوسرے لمحے وہ شاکڈ سا کھڑا رہ گیا۔

فون بند ہو چکا تھا۔ وہ نڈھال سا ہارے ہوئے انداز میں کرسی پر گر گیا۔

"یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔" اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

زونیرا تیز میوزک لگائے شوخ دھن کے ساتھ خود بھی گنگناتی ہوئی ڈرائنگ روم کی سٹنگ ٹھیک کر رہی تھی۔

دوسری طرف لگے آئینے میں رک کر خود کو دیکھتی اور مسکرانے لگتی۔ وہ اس وقت کتنی خوش تھی۔ کاش کوئی جان سکتا۔

باہر گیٹ پر بیل بجی تھی۔

اس نے پراعتماد نظروں سے کمرے کی سٹنگ پر آخری نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے استقبال کرنے والے انداز میں ہاتھ میں گلاب کی ادھ کھلی کلی لیے داخلی دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

اور دوسرے لمحے گلاب کی کلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔

یہ بات تو اس کے گمان میں تھی بھی نہیں۔

(باقی آئندہ ماہ)

قانتہ رابعہ

دھوپ کے ساتھ ساتھ

ماحول پر کُلّی طور پر سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ ماہم، نازیہ، امی، ندا، اس کا بیٹا سب موجود تھے۔ مگر کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رو رو کر ندا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

لباس کے بال بکھرے اور چہرے پر وحشت ہی وحشت تھی۔

کبھی کبھار حنوط کی سسکی ماحول کے سناٹے کو چیرتی، کمرے سے چند قدم کے فاصلے پر کچن تھا، جہاں کام والی ماسی برتن دھونے میں اور بلیحہ کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ کافی دیر کے بعد امی نے ماحول کی سوگواری کو ختم کیا۔

"ندا! چلو اٹھو، ہاتھ منہ دھو لو، کپڑے چینج کرو، بلکہ وضو کر کے شکرانہ ادا کرو، اللہ رحمان نے بہت بڑی رحمت کی ہے، سوچو اگر حسن نہ ملتا تو؟"

ماں کی بات سنتے ہی ندا دوبارہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ بار بار ایک ہی فقرہ کہہ رہی تھی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" ساتھ ہی وہ گود میں لیٹے حسن کا منہ چوم لیتی۔

"جو حالات ندا کے ہیں' خود سوچیں' اگر حسن نہ ملتا تو کیا قیامت بیت جاتی ہم سب کے ساتھ۔" ماہم نے کہا۔ "ہاں' جو ہوا تقدیر میں لکھا تھا۔ تقدیر کے لکھے کو ہم کسی طور ٹال نہیں سکتے' لیکن آئندہ کے لیے سبق تو سیکھ سکتے ہیں۔" امی نے کہا۔

"چلو اٹھو سب ہی شکرانے کے نوافل ادا کرو۔ آج پتا نہیں کیسا دن طلوع ہوا تھا' صبح سے کوئی کام سیدھا نہیں ہو پا رہا ہے۔ ہر کام الٹ جاتا ہے' پہلے نازیہ کی ساس کے قصے سن سن کر دماغ کھولتا رہا' پھر ندا کا مسئلہ آن ٹپکا۔ پتا نہیں کون سی خطا سرزد ہو گئی تھی' اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے حسن مل گیا' خود سوچو اگر ٹرین چل پڑتی تو کیا ہوتا؟" ندا نے بے اختیار جھرجھری لی۔

"اور کیا۔ اللہ نہ کرے۔ تم سب بھی نوافل ادا کرو' مجھے لگتا ہے یہ سب اس صدقے کا کمال ہے جو صبح اٹھتے ہی اللہ مجھ گناہ گار کے ہاتھوں سے دلواتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے امی۔" نازیہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

واقعی امی کی یہ خوبی تھی کہ اپنے بچوں اور ان کی آل اولاد کے لیے خیر و عافیت سے دن گزرنے کے لیے نوافل صبح ادا کرتیں' ساتھ ہی تھوڑی بہت رقم صدقے کی بھی نکالتیں اور یہ مشاہدے کی بات تھی کہ کئی آئی بلائیں گھر کے دروازے سے ہی ٹل جاتیں۔

"اور ماہم۔" امی نے ماہم کو مخاطب کیا۔ "چلو تم کچن میں جاؤ۔" صبح میکے سے آئی ہے اور آتے ہی کچن میں گھس گئی۔ اتنی گرمی میں تو جی دار سے جی دار کا دل بھی گھبرا جاتا ہے اس کے ساتھ مدد کرواؤ۔"

"... وقوہ۔ امی کروائی ہی ہوں' وہ تو آج نازیہ کے رونے دھونے سننے بیٹھ گئے تو وقت گزرنے کا پتا نہ چلا۔ بعد میں آپ سب کو پتا ہی ہے کہ حسن کی گمشدگی نے ہوش اڑا دیے تھے۔" ماہم نے وضاحت کی۔

"بہرحال کچن کا باقی کام سنبھالو۔ کھانے کے لیے تو پوری بارات جمع ہو جاتی ہے' پکانے کے لیے وہ اکیلی جان... یاد ہے کی..." امی نے دبے لفظوں میں کہا۔

"واہ... کتنا خیال ہے امی کو اپنی بہو کا۔" نازیہ نے بظاہر ہنس کر کہا۔ "کاش ہمیں بھی ایسی ساس نصیب ہوتی' ہماری ساس تو ایسا شاہکار ہیں قدرت کا کہ جتنا مرضی کام کر کے ان کو راضی کرنے کی کوشش کرو' ان کا منہ ٹیڑھا ہی رہے گا۔"

امی نے اس پر خاص ردعمل کا مظاہرہ نہ کیا' نازیہ کو جیسے پتنگے لگ گئے۔

"ارے میری پیاری امی! آپ کو کیا علم جب میں میکے آتی ہوں سارا جلوس وہاں جمی تو جمع ہوتا ہے' تینوں نندیں' ان نندوں کی اولادیں' دیورانیاں' جٹھانیاں اور ان کے بچے اوپر سے ساس بھی اپنے چھوٹے بھائیوں کو گھر والوں سمیت مدعو کر لیتی ہیں۔ مجال ہے کوئی کام کے وقت قریب پھٹکے' گرمی میں پسینہ بہہ بہہ کے فرش تک جا لگتا ہے' کبھی ساس کو ہمدردی کے دو بول بولنے کی توفیق نہیں ہوتی۔"

"میری بات سنو نازیہ!" امی نے اپنے مخاطب کیا۔ گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتے ہی تم میکے آ جایا کرو اگر ایک آدھ دن پکا بھی لیتی ہو تو کوئی ایسی بات نہیں جس پر واویلا کیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ بہاولپور اور کراچی کے موسم میں بہت فرق ہے۔"

"گویا میں غلط کہہ رہی ہوں' آپ بہو کی ہی حمایت کریں گی۔ سب کو پتا ہے اس بات کا۔" نازیہ نے عجیب بات کی۔ امی ہکا بکا اس کا منہ تکتی رہیں۔ مزید بولنا فضول تھا' سو چپ رہیں' البتہ ماہم خاموشی سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

ندا نے سوئے ہوئے حسن کے منہ پر ایک دفعہ پھر پیار کیا اور اسے بستر پر لٹایا۔ خود وضو کرنے چلی گئی۔ آئینے پر نظر پڑا لیتے ہی وہ خوف زدہ ہو گئی۔

"رو رو کے صحیح معنوں میں حلیہ خراب ہو گیا تھا۔ آنکھیں سوجی اور سرخ' اس نے بسم اللہ پڑھ کر وضو شروع کیا' ساتھ میں سوچ کا سفر بھی دوبارہ شروع ہوا۔

"میرے ساتھ ہر دفعہ ایسے کیوں ہوتا ہے؟ افتخار' حسن کا خیال رکھنے کی جتنی تاکید کرتے ہیں'

اتنا ہی وہ دل دہلا کے رکھ دیتا ہے۔ ابھی میکے پہنچے چوتھا دن ہے اور گیارہ واقعات ایسے ہو چکے ہیں کہ ایک کا بھی اگر افتخار کو علم ہو جائے تو الٹے پیر واپس آنے کا حکم جاری کر دیں۔ جاہل عورت' لاپروا' ست الوجود کے القابات الگ' آتے ہوئے ٹرین کی رفتار تیز ہونے تک ان کا "حسن نامہ" جاری رہا۔

"دیکھو اپنے دھندوں میں حسن کا دھیان رکھنا۔"

"سنو' حسن کو دھوپ میں مت پھرنے دینا' لو لگ جائے گی۔"

"اور یہ نہ ہو کہ خود شاپنگ یا ملنے ملانے کے لیے نکل جاؤ" اور پلیٹ فارم پر جب گاڑی آئی تو سامان اٹھانے کی فکر نہیں تھی' بس یہ ہی فکر سر پر سوار تھی۔

"آم زیادہ نہ کھلانا' گرمی ہو جائے گی۔"

"اور ہاں کالا پیلا مت کر کے لانا' کہیں اسے کھلانا پلانا بھول جاؤ۔"

ندا کے جی میں آئی کہ تڑاخ سے جواب دے' گرم علاقوں میں شادی کی ہے تو کالے پیلوں کے لیے تیار رہنا چاہیے مگر میکے جاتے جاتے وہ لڑائی کا بوجھ نہیں سہار سکتی تھی لہٰذا صبر کا گھونٹ پی کر چپ ہو رہی' دو بیگ' کارٹن' کولر' ٹیپ' سامان' ٹرین میں رکھتے ہوئے ندا کو پچھلا سفر یاد آیا۔ حسن بمشکل سوا سال کا تھا اور ڈھیروں سامان کے ساتھ وہ میکے پہنچی تھی۔ دوسرے دن ہی حسن کو الٹیاں' موشن شروع ہو گئے۔ اس نے افتخار کے دن میں کئی کئی دفعہ فون سنے' لیکن بیماری سے لاعلم رکھا۔ افتخار تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہتا۔

"میری حسن سے بات تو کرواؤ۔"

"کیسے بات کرواؤں وہ سو رہا ہے۔"

کبھی بہانہ بناتی۔ وہ اوپر چھت پر کھیل رہا ہے ہارون اور ماموں کے ساتھ۔ کبھی کہتی نیچل سیر کے لیے لے گیا ہے۔ خود آنسو پیتی اور اسپتال میں حسن کے ساتھ خون جلاتی رہی۔ ڈرپ پر ڈرپ لگتی رہی' انٹی بایوٹک انجکشن کے کئی کئی کورس ہوئے' مگر اب بخار کی بھی مصیبت سر پر آ گئی' ساتھ میں پیٹ پھولنا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹرز نے سی ایم ایچ ریفر کر دیا۔

نہ میکے آنے کا مزہ نہ رشتہ داروں سے ملنے کا ہوش' بس وہ تو حسن کی تیمارداری کرتے کرتے آدھی ہو گئی۔ سی ایم ایچ میں حسن بہتر ہونا شروع ہوا۔ الٹی رکی تو آنکھیں کھلیں' خوراک اندر گئی' طاقت' توانائی نے جسم کو چلنے پھرنے کے قابل کیا' ایسے میں سیل فون کی بیٹری آف تھی۔ گھر پر افتخار نے فون کیا تو کسی بچے نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"انکل' حسن تو اسپتال میں ہے۔"

افتخار چلایا۔ "اسپتال میں کیوں؟"

"انکل آپ کو نہیں پتا وہ تو بہت بیمار ہے' ہر وقت انجکشن لگتے ہیں اس کے۔"

افتخار نے کسی بڑے سے تصدیق کے بجائے پی آئی اے کا ٹکٹ لیا اور افتخار کراچی سے ندا اسپتال ... یہ آگے پیچھے پہنچے اندر آتے ہی ندا نے پوچھا۔

"افتخار کا یہاں فون تو نہیں آیا؟"

"میرے علم میں تو نہیں۔" امی نے کہا۔

"کسی نے بتایا تو نہیں حسن کی بیماری کا؟" اس نے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ گھر کا کوئی فرد بتاتا' دھڑ سے دروازہ کھلا' رنگ برنگی آوازیں آئیں۔

"افتخار خالو آ گئے۔"

"امی! جلدی سے آئیں افتخار پھوپھا آئے ہیں۔"

ندا کا تو کانوں تو لو نہیں والا حال ہو گیا۔

اس کا رنگ فق اور پورا وجود کانپنے لگا۔

"حسن بیمار تھا' مجھے کیوں نہیں بتایا؟" اس نے عدالت لگائی' ندا خاموش رہی' امی نے جواب دیا۔

"بیٹا! تم پریشان ہو جاتے۔"

"واہ... پریشانی سے بچانے کے لیے سگے باپ کو بتانا ضروری نہ سمجھا' کیا منطق ہے۔"

"اور کب سے بیمار ہے؟" حسن' بابا کہتا گو کہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر اب کافی حد تک رونق تھی' لیکن افتخار کو دنیا جہان میں سب سے زیادہ لاغر' بیمار اور کمزور اپنا بچہ لگ رہا تھا۔ غصے سے کہنے لگا۔

"میری چار گھنٹے کی ہدایات کا یہ حال کیا تم نے۔"

ندا کی مونی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ امی اپنی لاڈلی چھوٹی بیٹی کی مدد کو آئیں اور ہنس کر ماحول کے ٹینشن کو کم کرنا چاہا۔

"افتخار بیٹا! زندگی موت کی طرح' بیماری اور شفا بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے' جان بوجھ کے تو کوئی بیمار نہیں ہوتا۔"

"یہ ہی کہہ رہا ہوں میں خالہ جان!" افتخار نے چبا چبا کر خالہ جان پر زور دیا کہ ضرور اس نے بچے کا دھیان نہیں رکھا ہوگا۔ وہاں تو کبھی اتنا بیمار نہیں ہوا۔" ندا نے امی کو مزید بولنے سے اشارۃ منع کردیا۔ خوب بول بال کے بعد افتخار نے حکم سنایا۔

"چلو واپسی کی تیاری کرو۔"

"ک۔ کیا۔ واپسی؟" سب حق دق رہ گئے۔

"بیٹا! حسن تو اب ٹھیک ہے اب کاہے کی واپسی؟" ماہم نے بہنوئی کے حضور نرمی سے سوال کیا۔

"ٹھیک ہے یا نہیں یہ تو اللہ ہی جانے' لیکن آئندہ بھی یہ ایسے ہی کرے گی' دھیان نہیں رکھے گی۔" جلے کٹے لہجے میں افتخار نے کہا۔

"پورے سال کے بعد ندا آئی ہے اور چار دنوں میں واپس چلی جائے؟" امی نے سوال کیا۔

"بہت سی لڑکیاں شادی کے بعد سالوں میکے کا منہ نہیں دیکھتیں۔" لائق' فائق' خوب صورت' ذہین و فطین داماد نے ساس کا منہ بند کیا۔

حسن مسلسل باپ سے اٹکھیلیاں کررہا تھا۔ اس کی کسی حرکت سے بیماری ظاہر نہیں ہورہی تھی' لیکن آرڈر از آرڈر۔

"سنا نہیں تم نے' میں نے پی آئی اے سے واپسی کا ٹکٹ لے لیا ہے۔" اس نے بریکنگ نیوز سنا کر سب کو چاروں شانے چت کیا۔

جب ندا کا سامان گاڑی میں رکھا جارہا تھا تو ندا کا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار کر روئے۔

"ہائے ابھی تو میں نے سامان کھولا بھی نہیں؟"

ابو سے تو بس دو' چار باتیں ہی کیں۔

سہیلیوں' بہنوں کی تو شکل بھی نہیں دیکھی۔

شاہی بازار کی فروٹ چاٹ' دہی بھلے۔

ندا بس کوکی بن کر تیاری میں مشغول تھی۔ اس کی تھکن سے بری حالت تھی۔ آتے ہی دوسرے دن تو حسن بیمار ہوگیا تھا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر وہ خود کمزور ہوگئی تھی۔

اس کا دکھ اس کی بیماری کون دیکھتا۔

جب گھر سے روانہ ہوئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

گھر میں سارے ہی غم زدہ تھے' امی نے دکھی دل سے کہا۔

"اتنا تو وہ رخصتی کے وقت بھی نہیں روئی تھی۔"

ندا نے لمبا سانس لیا اور ماضی سے حال میں آئی۔

"یا الٰہی! اس دفعہ کرم کرنا' یہ سامان ایسے ہی بند کا نہ بند نہ آجائے۔"

سارے راستہ وہ حسن کو سمجھاتی آئی۔

"حسن بیٹا! آپ نے نانو کے گھر سے کوئی الو لی پوپ' کوئی بسکٹ یا چپس نہیں لینے۔"

"امی! میں نانو کے دھل بھوتا رہوں گا؟" (امی! میں نانو کے گھر بھوکا رہوں گا۔) حسن نے آنکھیں پٹپٹا کر پوچھا۔

"نہیں میری جان! میں نے اتنی زیادہ چیزیں لے رکھی ہیں آپ کے لیے۔" اس نے کارٹن کی طرف اشارہ کیا۔ جو کے منرل واٹر کی بوتلوں' بسکٹ' چاکلیٹ پر مشتمل تھا۔

"اور حسن جانو! آپ نے نانو کے گھر چھت پر بھی نہیں جانا سیڑھیوں سے گر جاؤ گے۔ باہر بھی نہیں جانا' اسٹیشن قریب ہے پکڑنے والے رہتے ہیں وہاں۔"

اس نے بچے کو ڈرایا' حسن معصوم بنا کچھ سمجھ اور کچھ نا سمجھی میں جی امی' جی امی' کہتا رہا۔

بہاولپور سے ٹرین ابھی کافی فاصلے پر تھی' اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا' میرا شہر۔

میرا سکھ' میرا سکون' میری سکھیاں تو ساری یہیں ہیں۔ سسرال میں گزرا سال اسے قید خانے کی طرح محسوس ہورہا تھا۔ جو حالت ایک قیدی کی جیل

سے باہر وسیع دنیا میں آتے وقت ہوتی ہے وہی اس کی تھی۔

اللہ اللہ کر کے بہاولپور کا اسٹیشن آیا۔ تلیروں کی بھاگ دوڑ' گرم چائے' نان پکوڑے' ٹھنڈی بوتل کی رنگ برنگی آوازیں سنے اسے مدتیں بیت گئی تھیں۔

سارے گھر والے اس کے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے' وہ سب کے گلے مل رہی تھی' لیکن پیاسی آنکھیں ان بھاگتے دوڑتے مناظر کو دیکھ کر اس کو سکون پہنچا رہی تھیں۔

گھر میں داخل ہوتے وقت سب سے پہلے نانو نے حسن کے کان کھینچے۔

"حسن جان! اس دفعہ امی کو پریشان نہیں کرنا۔" حسن مسکرایا۔

"چھوٹے نے حسن کے لیے خاص کمرہ بنوایا اور سجایا ہے' مالکہ اس کا دل یہیں لگا رہے۔" نازیہ کی بیٹی بولی۔

اس سے پہلے کہ حسن کمرہ دیکھنے بھاگتا' ملیحہ ٹھنڈی تھار بوتلیں لے آئی' ندا نے حسن کا گلاس ہاتھ میں لے کر چیک کیا اور بولی۔

"ارے یہ تو بہت ٹھنڈا ہے۔"

"لائیں میں دو' چار دفعہ دوسرے گلاس میں پلٹنا ہوں' ٹھنڈ ذرا کم ہوجائے گی۔" نازیہ نے کہا۔

حسن نے گلاس پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے کیا' مگر ٹیک سے پکڑ نہ سکا تھا کہ گلاس اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا' حسن نے بوکھلا کر اس کے ٹکڑے سمیٹنے چاہے تو کانچ اس کے ہاتھ میں چبھ گیا۔ اس کی انگلی سے خون کے دو' تین ننھے منے قطرے قالین پر گرے۔

"میرے خدا۔" ندا تیزی سے اس کی طرف لپکی۔ جلدی سے ملیحہ سنی پلاسٹ لائی۔

"آتے ہی ممما کا خون سکھا دیا۔" ماہم نے حسن کو ڈانٹ پلائی۔

"ابتدا تو اچھی نہیں' آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ اس دفعہ تو والد صاحب نے اس کا وزن تک نوٹ کر کے ڈائری میں لکھا ہے کہ ننھیال والے اس کا وزن نہ چرا لیں۔" زہر خند لہجے میں ندا نے کہا تھا۔

امی نے سنا تو دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"قد بھی لکھوا دینا تھا ندا پھوپھو! کہیں وہ چھوٹا نہ ہوجائے۔" ملیحہ کی بیٹی زارا نے ہنس کر کہا۔

"اور یہ ڈائٹ چارٹ ہے حسن کا' جو اس کے والد محترم نے مجھے بنا کر دیا ہے۔" ندا نے ہینڈ بیگ سے لمبا چوڑا کاغذ نکال کر لہرایا۔

"صبح چھ بجے فیڈر' (نوٹ' دھلا ہونے کی صورت میں بھی فیڈر ایک دفعہ پھر بوائل کیا جائے' اور پینے ہی پھر بوائل کیا جائے گا۔) ساڑھے چھ بجے کارن فلیکس' سات بجے بوائل انڈہ' آٹھ بجے بریڈ اور جیم' نو بجے فیڈر۔"

"اف۔" نازیہ' ماہم' امی نے سر تھام لیا۔ "یہ تو چوبیس گھنٹے تم یہی کرتی ہوگی۔"

"جی بالکل۔" ندا نے کہا۔

"ندا! دولہا بھائی کہیں کچھ کھسکے ہوئے تو نہیں۔" ڈرتے جھجکتے ماہم نے کہا۔ "جب حسن نہیں تھا اس وقت کیا کرتے تھے؟"

"اس وقت کام والیوں کی اور میری شامت آتی تھی۔ پانچ منٹ کم سونا تھا' سالن میں نمک زیادہ کیوں ہے' دو دن سے ایک ہی سوٹ کیوں پہنا ہے' ساتھ میں ان کی اماں حضور کی کمک شامل ہوتی۔" امی کو ندا کے چہرے پر دکھ ہی دکھ نظر آیا۔

"پھر کیا کرتی ہو سارا دن' کیسے گزارتی ہو؟" نازیہ نے پوچھا۔ ندا پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ "میں نے کیا کرنا ہے' کرنا تو اس شیر یادشاہ نے ہے۔" سارے ہنس دیے' لیکن ہنسی کی کھنک میں ندا کے لیے دلی ہمدردی تھی۔ ندا نے سوتے ہوئے حسن کو بیڈ پر لٹایا۔ سنی پلاسٹ اتاری اور صوفے پر لیٹ گئی' امی اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہیں' ساری بہنیں اس کے اردگرد جمع تھیں۔

"خرچ دیتے ہیں افتخار بھائی۔" ماہم نے پوچھا۔

"خرچہ مہینے میں جتنا مرضی کروالو' لیکن دیتے نہیں۔ دل بہت تنگ ہے۔ پانچ ہزار کا سوٹ یہ سند کروں

یا چار ہزار کا جوتا فوراً" لے دیں گے' پیسے مانگوں گی تو ماتھے کے بل گننا مشکل ہوجاتے ہیں۔ زبان سے غلیظ فقرے اگلنے لگتے ہیں۔" ندا کی آنکھوں کے کنارے گیلے ہورہے تھے پھر تو امی کے سینے سے لگ کے اس نے دو سالوں کی جمع شدہ بھڑاس نکالی۔ میاں اور ساس کی ایک ایک عادت اپنا ایک ایک دکھ امی اور بہنوں کے کانوں میں منتقل کیا۔ "لوگ ندا کی نئی سے نئی ڈریسنگ' جیولری دیکھتے ہیں' ندا کا زخم کسی کو نہیں دکھائی دیتا" روتے روتے وہ ہلکان ہورہی تھی۔

ایک دم' دھم سے کسی کے گرنے کی آواز آئی۔

"ارے حسن بیڈ سے گر گیا۔" سب کی آوازیں آئیں۔

"ہائے میں مرگئی۔" کہتے ہوئے تیزی سے ندا اس کی جانب لپکی' دھیان ہی نہ رہا۔ حسن کی آنکھیں بند تھیں' لیکن رو رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ سو گیا۔ اسے صہیب کی کاٹ میں لٹا کر وہ کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی' امی نے اسے آواز دی۔

"باتوں میں دھیان ہی نہ رہا' دوپہر کے کھانے کا وقت بھی نکل گیا' ملیحہ تو میکے چلی گئی ہے' کھانا کس نے بنانا ہے؟ بچے تو ابھی بھوک سے ریں ریں کریں گے' بھوک کے کچے ہوتے ہیں نا۔"

نازیہ' ماہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' واقعی ندا کی دکھ بھری داستان سنتے سنتے اتنا وقت گزر گیا' اب کھانے کا کیا کریں۔

"ملیحہ بڑی ذمہ داری سے سارے کام نپٹا لیتی ہے۔ سال میں ایک دفعہ ندیں جمع ہوں تو پکا پکایا سامنے رکھ دیتی ہیں"' امی نے بہو کی تعریف کی۔

"ایسا کرو جلدی بننے والا کھانا بنالو۔" امی نے مشورہ دیا۔

انڈوں کا خاگینہ گرمیوں میں نہیں کھایا جاسکتا۔ دال کل بنی تھی' آج کیا بنائیں یہ سوالیہ نشان سب کے سامنے۔

"ہوٹل سے منگوا لیتے ہیں۔" ندا نے دبی زبان میں کہا۔ بیس' پچیس لوگوں کا کھانا منٹوں میں گھر میں بن بھی نہیں سکتا تھا' اس لیے امی نے پیسے دیے۔

"چلو جلدی سے منگوالو۔ کھانا آنے تک دسترخوان بچھاؤ' پلیٹیں وغیرہ رکھ لو۔ پانی کی بوتلیں بھی فریج سے نکال رکھو۔" باتوں سے فارغ ہوئے تو بھوک ایک دم چمک اٹھی۔ ظہر' عصر کی نمازیں بھی ان باتوں میں یاد نہ رہیں۔ امی کو دو نمازوں کے قضا ہونے کا بھی دلی صدمہ تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن حسن اور ندا دیر تک سوتے رہے۔ امی نے جگانا مناسب نہ سمجھا' ماہم کا گھر ساہیوال کے گاؤں میں تھا۔ وہ سال میں ایک دو زائد چکر لگانے کی وجہ سے میکے سے زیادہ واقف تھی۔ کچن میں کھسی وہ ہی رہنمائی کررہی تھی۔

آملیٹ کے لیے زیرہ نہیں مل رہا۔ قصوری میتھی کے دو' چار پتے' کالی مرچ پسی اور دودھ کے ایک چمچ سے آملیٹ بہت مزے کا بنتا ہے۔ اب میزبانی کے فرائض ماہم ہی انجام دے رہی تھی۔ ڈبل روٹی کے توس' آملیٹ' جیم اور چائے کا ناشتا تیار ہوا تو ندا بھی نیند پوری لے چکی تھی۔ باتوں باتوں میں اب تک نازیہ اپنی ساس' نندوں کے بہت سے قصے سنا چکی تھی۔

ناشتا دوپہر کا کھانا دونوں نازیہ' ماہم نے تیار کیے اور رات کے کھانے کی ذمہ داری ندا نے لے لی۔

"جب تک ملیحہ نہیں آتی رات کا کھانا میں بنالیا کروں گی۔"

"ملیحہ تو کل آجائے گی۔ اس کی بھتیجی کے خسرہ نکلا تھا' اس کی خبر گیری کے لیے گئی ہے' بلکہ میں نے بھیجا ہے۔" امی نے کہا۔

ناشتے کے بعد پھر کچھ فراغت تھی۔ حسن بھی نیند پوری کرکے کمرہ سے آیا' امی نے اسے کچھ پڑھ کر پھونک ماری اور کہا۔

"اللہ کی حفظ و امان میں' ندا اسے اپنی نظروں میں رکھنا' کل بیڈ سے گر چکا ہے' انگلی میں شیشہ لگ گیا ہے' آج اللہ ہی خیر کرے۔"

نازیہ' ماہم اور ملیحہ کے بچے آپس میں کھیل کود میں مصروف تھے' کبھی چھت پر' کبھی نیچے' کبھی اندر' کبھی باہر' حسن بھی ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے بار بار مچلتا۔ ندا آگے بڑھ کے اسے قابو کرتی۔

"صہیب' زارا' نیچے آؤ۔ حسن کے ساتھ یہیں کھیلو اسے سی والے کمرے میں۔"

"آئے پھوپھو! آئے خالہ!" کی آوازیں آتی رہیں' لیکن دونوں اوپر ہی رہے' خدا جانے کب حسن نظر بچا کر نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔ ندا' کراچی سے لائے بہن' بھابھی ان کے بچوں کے لیے تحائف دکھا رہی تھی۔

"یہ سیٹ تو بہت قیمتی ہے۔" امی نے نفیس سا مگوں کا سیٹ ہاتھ میں لے کر کہا۔

"ہاں تو' افتخار نے لے کر دیے ہیں۔ میں نے تو نہیں خریدا۔" ندا نے کہا۔

"عجیب دھوپ چھاؤں والا مزاج ہے تمہارے میاں کا۔" امی نے حیرانی سے کہا۔

نازیہ ہنسی۔ "ہمارے میاں صاحب کو دیکھ لیں نری دھوپ ہی دھوپ ہیں' آتے ہوئے میں نے کہا میرا دل چاہتا ہے ہلکے پھلکے تحائف لے جاؤں تو پتا ہے کہ کیا کہنے لگے؟ کہا کہ کبھی تو میکے والوں کو نواز نے کا موقع دیا کرو۔"

ماہم نے بھی اپنی کسی سوچ کو زبان تک لانا چاہا' لیکن حسن اور ماہم کا چھوٹا بیٹا ریان فٹ بال کی طرح لڑھکتے لڑھکتے سیڑھیوں سے نیچے گرے۔ سیڑھیوں سے گرتے گھر والوں کی چیخوں کی آواز سن کر امی تو بس اٹھ سی گئیں۔

سب کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔

"اللہ کا شکر ہے ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی۔" بہت دیر بعد بچے سہمے رہے اور بچوں سے بڑھ کر ان کی مائیں۔

نازیہ نے ندا کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"یہ دیکھو۔ تم تو اسے گود میں لے کر بیٹھ جاؤ' کہیں ہمارے میاں نے ہڈیوں کا سائز تک ناپ کے رکھا ہو۔"

"حسن کہاں ہو؟" اس کی آواز میں اب گھبراہٹ

امی نے آج ایک دفعہ پھر صدقہ' مدرسے میں بھجوایا اور نماز کی نیت باندھ لی۔

رات دیر تک بہنیں اپنے حالات' ڈسکس کرتی رہیں۔ سوتے سوتے رات دو بج گئے' امی کہتی ہی رہیں۔

"بچو! سو جاؤ صبح کی نماز قضا ہوجائے گی۔"

"امی! سال میں ایک دفعہ تو یوں مل بیٹھنے کا موقع ملتا ہے دن میں تو کام ہی ختم نہیں ہوتے۔" جماہی پر قابو پاتے ہوئے ماہم نے کہا۔

☆ ☆ ☆

"امی آگئیں' امی آگئیں۔" ملیحہ کو دیکھتے ہی اس کے بچے استقبال کو آگے بڑھے۔

بڑی خوشدلی سے ملیحہ سب سے ملی۔ وہ صبح جلدی اٹھنے کی عادی تھی' ناشتا کرکے چکیے سے آئی تھی' یہاں ابھی ناشتا کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ وہ گاؤن اتار کر کچن میں گھسی۔

ماہم اور ندا بھی اس کی مدد کو پہنچیں۔ اتنے میں ملیحہ آٹا گوندھنا شروع کرچکی تھی۔

"آپ بچوں کو سنبھالیں اور دسترخوان لگائیں' ناشتا ابھی تیار ہوجائے گا۔" ملیحہ نے انہیں باہر روانہ کیا۔

دسترخوان لگنے تک گرما گرم پراٹھے اور کسی بن چکی تھی۔ ندا نے رات کا سالن گرم کیا۔ انڈے فرائی کیے' چائے دم پر رکھی اور ناشتا کروانے والوں میں شامل ہوگئی۔ امی ملیحہ کو کام نپٹاتے دیکھ کر نہال ہورہی تھیں۔

"ندا! احسن کو بھی ناشتا کروا دیتیں۔" ملیحہ نے کہا۔

"بھابھی! وہ سو رہا ہے۔" ندا نے اطلاع دی۔

"نہیں پھوپھو جانی! حسن تو بہت دیر کا اٹھا ہوا ہے۔" زارا نے اطلاع دی۔

"ہائیں وہ اٹھا ہوا ہے۔" ندا کمرے کی طرف بھاگی۔ "میں نے تو تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا وہ سو رہا تھا۔"

تھی۔ امی ناشتا ادھورا چھوڑ کر حسن کو ڈھونڈنے کی مہم میں شامل ہو گئیں۔

"یہیں ہوگا' مل جائے گا! آپ ناشتا تو پورا کرلیں۔" ملیحہ نے کہا۔

"حسن۔۔۔ حسن۔" ندا کی آواز چاروں اور گونج رہی تھی۔ سارے واش روم دیکھ لیے' اسٹور روم میں جھانکا' اوپر چھت پر گئی' گھر کے باقی افراد تھوڑا بہت ناشتا کر کے حسن کو تلاش کرنے نکل گئے۔

امی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتیں۔

"اللہ نہ کرے اگر جو افتخار کا فون آئے تو کوئی مناسب سا بہانہ کردیں۔" ندا نے چھت سے آنے کے بعد کہا اور چادر لے کر گھر سے باہر نکل گئی۔

گھر کے دائیں جانب ریلوے اسٹیشن اور بائیں جانب پُر رونق شہر تھا۔

نازیہ اور ابرار بھائی شہر والے حصے میں نکل گئے اور ندا' ماہم ریلوے اسٹیشن والی سائیڈ پر' راستے میں ہر دکان میں جھانکتے گئے۔

ریلوے اسٹیشن پر خاص رش نہ تھا۔ ندا بھی شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔ ایک ایک پل صدیوں پر بھاری تھا۔ ہر سانس اندر خوف لے کر جاتا' اور نامراد لے کر آتا' ہر نیلی شرٹ والے بچے پر اسے حسن کا گمان ہوتا۔

"میرے اللہ۔۔۔ میرا حسن۔" تھک کر وہ مچھلی کی دکان کے باہر بچھے بینچ پر بیٹھ کر رو دی۔

نازیہ آپی نے کہا؟ "مساجد میں اعلان کروادیں؟"

"ہرگز نہیں۔" ندا چیخی "سب دوست احباب معلوم کرنے آئیں گے' کسی نہ کسی طرح افتخار کے کانوں میں خبر پہنچ جائے گی۔" افتخار کا نام ذہن میں آتے ہی ندا کے ہوش و حواس اڑ گئے۔

"میرے اللہ میری مدد کر۔" اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

ابرار بھائی کے کہنے پر دوبارہ وہ ان کے ساتھ ریلوے اسٹیشن گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی دھند نے ہر چیز کے آگے چادر تان دی تھی۔

"یہ ٹرین پچھلے گھنٹے سے وسل بجا رہی ہے' ہلنے کا نام نہیں لے رہی۔" ابرار بھائی نے ملت ایکسپریس کو پلیٹ فارم نمبر 2 پر رکے دیکھ کر کہا۔

"اس کا انجن خراب ہے اور اے سی میں آگ لگ گئی تھی۔" پاس سے گزرنے والے لڑکے نے اپنی معلومات ان تک منتقل کیں۔ ایسے ہی ایک آدمی دروازے میں کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔

"یہ تو انوار پچا لگتے ہیں۔" ابرار بھائی نے کہا۔ سلام دعا کے لیے لپک کر وہاں پہنچے۔

"اوہ۔۔۔ نظر کا دھوکا' شکل کتنی ملتی۔۔۔ ابرار بھائی' حسن۔۔۔ سرگودھا والی بوگی کے دروازے میں ایک عورت نے حسن کی انگلی پکڑی ہوئی تھی۔

دونوں چھلانگیں لگاتے ٹرین کے پاس پہنچے۔

"حسن۔۔۔ حسن۔" ندا چیخی۔

حسن نے دونوں بازو پھیلا دیے' ابرار بھائی نے حسن کو پکڑا تھا کہ ٹرین رینگنا شروع ہوگئی۔ وہ عورت مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

"حسن۔۔۔ آپ نے کیا کیا؟" ندا روتے روتے بے حال ہو چکی تھی' ابرار بھائی نے سیل فون پر امی کو حسن کے ملنے کی اطلاع دی۔ جوس لے کر ندا کو بلایا۔ اس کے ہوش و حواس قابو میں آئے تو ابرار بھائی دونوں کو لے کر گھر روانہ ہوگئے۔

☆ ☆ ☆

بہت دیر تک ندا روتی رہی' آنسو پونچھتی رہی' اسے چپ کراتے کراتے امی بھی ہلکان ہو رہی تھیں۔

"پتا نہیں' بندہ جس بات سے ڈرتا ہے یا اس کی چھٹی حس جس بات سے خبردار کرتی ہے وہ ہو کے کیوں رہتی ہے۔" نازیہ آپی نے کہا۔

حسن فیڈر پی کر آرام سے ماں کی گود میں سو رہا تھا۔ امی مسلسل ندا کو سنبھال رہی تھیں۔

"شکر ادا کرو اللہ کا' اللہ نے بہت بڑی آزمائش سے ٹال دی' یہ صدقے اور درود شریف پڑھنے کی برکت ہے' تم بھی ان کا نافلہ نہ کیا کرو' کیا وہاں بھی حسن ایسے ہی کرتا ہے؟" امی نے پوچھا۔

"شرارتیں تو وہاں بھی بہت کرتا ہے۔ لیکن ایسی جان لیوا شرارتیں نہیں کرتا۔"

"یہ سیون اپ دودھ لے لو' تھوڑی سی طاقت آئے گی۔" اتنے میں ملیحہ نے دودھ سوڈے کا گلاس ندا کو تھمایا اور بولی۔

"کتنی پیلی زرد رنگت ہوگئی ہے تمہاری۔"

"بھابھی آپ مجھے بتائیں' آپ میکے جاتی ہیں کیا' آپ کے ساتھ ایسے ہوتا ہے؟"

ملیحہ ہنسی "نہیں۔"

"زارا' ارمغان' صہیب' تینوں حد درجہ شرارتی ہیں' کیا انہوں نے آپ کو میکے میں کبھی ایسے پریشان کیا؟"

ملیحہ نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"آپ تو ماشاء اللہ چہیتی بہو جیسے ہنستی کھیلتی جاتی ہیں' ویسے ہی واپس آتی ہیں۔ میرے ساتھ ایسے کیوں ہوتا ہے؟ اگر مجھے معلوم ہے کہ تمہارے انگوٹھے پر چوٹ نہیں لگنی چاہیے تو میرے انگوٹھے پر ہی کیوں چوٹ لگتی ہے؟ اگر میرا میاں کے حسن کو بخار نہ ہونے دینا' اسے بخار ہی کیوں ہوتا ہے۔ آپ کو ابرار بھائی نے کبھی ڈرایا دھمکایا نہیں اس لیے' اب کے ملیحہ بول اٹھی۔

"یہ بات نہیں ندا! میرے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا تھا' لیکن میرے اللہ نے مجھے فوراً وجہ سمجھا دی تھی' میں آئندہ کے لیے محتاط ہوگئی' اس لیے۔ بات یہ نہیں کہ ابرار ڈراتے نہیں' تم سب جانتی ہو میری شادی کو بارہ سال گزر گئے ہیں' شادی کے بعد ابرار تم لوگوں میں' میں نے خوبیوں کا پلڑا بھاری دیکھا۔ اس میں بہت اچھی ساس ثابت ہوئیں' لیکن آپ جانتے ہیں فرشتہ تو کوئی نہیں ہوتا۔ یا یوں کہو کہ میکہ ہی ہوتا ہے' گھنی چھاؤں' چھتنار درخت' سسرال اگر میکے کی صحیح قدر ہوتی ہے۔ شادی کے بعد ایک دو دفعہ میں میکے گئی' واپسی میں ابرار ساتھ ہی لیتے آئے۔ میں اس بات کو بہت محسوس کرتی تھی۔"

"بھابھی! آپ کا میکہ بھی تو قریب ہے' دو گھنٹے کی مسافت پر۔ ہماری طرح تو نہیں کہ کوا ہڈی نہ لا سکے۔" اللہ جانے کب سے سنا دادی اماں کا محاورہ نوک زبان پر آیا۔

"نہیں' بات قریب یا دور کی نہیں' بات اس تعلق کی ہے جو میکے کے در و دیوار سے اس کے چپے چپے سے ہو جاتی ہے' ننگی سکھیاں' دوست احباب سب میکے کی ٹھنڈی میٹھی یاد دلاتے ہیں' پھر میں نے نوٹ کیا جوں ہی میں میکے جانے کا نام لیتی ہوں' ابرار کا موڈ خراب ہو جاتا ہے' بہانے بہانے سے مجھے جانے سے روکتے۔"

"کیوں یہاں دل نہیں لگتا' میکے بھاگتی ہو۔" کبھی کہتے۔ "ابھی پچھلے ہفتے تو مل کر آئی تھیں' بات کیا ہے؟" رو دھو کر مناتی' چلے جاتے' بمشکل دو' چار گھنٹے رہنے کی اجازت ملتی' جب ارمغان ہونے والا تھا میں نے بہت منایا' لیکن مانے ہی نہیں' بولے اب پہلے والے رسم و رواج کو کوئی نہیں مانتا' آرام سے اپنے گھر رہو۔ پھر کہتے' مجھے راضی رکھو رب خود ہی راضی ہو جائے گا' جنت کا ٹکٹ مل جائے گا۔ سچی بات ہے' میرا دل ایسے ہی بھرا ہوا تھا' جیسے تم لوگوں کا بھرا ہوتا ہے' جب ارمغان ایک ماہ کا ہوا میں نے امی سے مدد لی' انہیں بتایا کہ ابرار میرے میکے جانے سے بہت چڑتے ہیں' امی نے مجھے نصیحت کی' بس تم اب کچھ نہ کہنا' میں خود ہی اجازت لے دوں گی۔ اب یہ تو اللہ جانتا ہے یا امی۔" ملیحہ نے مسکرا کر ساس کو دیکھا کہ امی نے انہیں کیا کہا' لیکن جس روز ارمغان سوا مہینے کا ہوا' امی نے کہا۔

"ملیحہ! سوا مہینے کے بعد امی کی طرف جاتے ہیں' آج بازار جا کر چھوٹی بہنوں کے لیے تحفے تحائف لے آنا' اور تیاری کرلینا۔ ہم دونوں چھوڑ آئیں گے۔"

ابرار نے ناشتا کرتے کرتے کپ پٹخا' اور بولے "یہ کس حدیث میں لکھا ہے کہ سوا مہینہ نہا کر ضرور ہی

میکے جاتے ہیں؟"

امی ہنس پڑیں۔ میں نے کہا ہے اور یہ میرا حکم ہے' یاد رکھو اگر تمہاری رضا میں ملیحہ کی جنت ہے تو تمہاری جنت کس کی رضا میں ہے؟ یہ مت بھولنا حکم حاکم مرگ مفاجات' ابرار کو حکم تو ماننا پڑا' لیکن مجھے میکے چھوڑ کر آئے تو بہت خفا ہوئے۔ میں سارا دن روتی رہی' اپنی امی کے پاس اور بہنوں کے پاس دل کے پھپھولے پھوڑتی رہی' میری نظر میں ابرار سے زیادہ ظالم شوہر کوئی نہیں تھا' جس نے بیوی کو قید خانے میں قید کر رکھا ہے۔ خوب بڑھا چڑھا کر میں نے داستان سنائی۔ رات کو جب سونے لیٹی تو ارمغان کو بخار تھا' صبح تک بخار نمونیے میں بدل گیا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے' اتنا چھوٹا معصوم سا بچہ کس بری طرح تڑپ رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ روتی آنسو بہاتی رہی۔ میری امی نے دم کیا' ڈاکٹر سے دوا لی اور مجھے اپنے پاس بٹھا کر ایک ہی نصیحت کی' کہنے لگیں۔

"میری بیٹی جو مسئلے تمہیں اب دنیا کے سب سے بڑے مسئلے لگ رہے ہیں' کل آنے والے دن میں تمہیں یہ یاد بھی نہیں ہوں گے اور یاد رکھنا نہیں بلکہ ان سے بھی سنگین مسائل کا سامنا کر کے ہم نے گھر آباد کیے ہیں۔ آج تو تم نے میرے پاس ابرار کی برائیاں کیں' آئندہ مت کرنا' ایک کام جس سے اللہ' رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا۔ مردہ بھائی کا گوشت کھانے کی مکروہ تشبیہ دی۔ وہ حرام کا کام کر کے تم کیسے امید رکھو گی کہ تم بالکل ٹھیک رہو۔ دیکھو اس معصوم سے بچے پر کتنی سخت مصیبت آگئی۔"

"لیکن امی! میں کس کو بتاؤں۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "بتاؤ' جو دکھ جو پریشانی' جو مسئلہ ہے اس سے شیئر کرو' جاء نماز بچھانے کا' ہاتھ پھیلانے کا موقع نہیں ملتا تو نہ ملے' چمچہ چلاتے ہوئے' آٹا گوندھتے ہوئے اس سے راز و نیاز کر لو' میں نے تمہاری یہ تربیت نہیں کی کہ ساری عبادتوں ریاضتوں کو سمیٹ کر ماں کے گھر آؤ تو غیبتوں کا کوڑا کرکٹ بنا لو۔ کیا ماں ہی وہ بد نصیب ہستی ہے جس کے گلے لگ کر دکھ سنانے کے بہانے سارے گناہ اس کے کانوں میں انڈیل دو؟ اگر ایسے کرو گی تو پھر خود ہی سوچو کیا ہونا ہے۔ چلو اٹھو اور اللہ سے معافی مانگو۔ اس وقت کی توبہ نے اب تک میری لاج رکھی ہے۔ نہ سسرال کے کیڑے میکے جا کر نمائش میں رکھے جاتے ہیں اور نہ ہی آزمائے جاتے ہیں' تم بھی آزما کر دیکھ لو' میکے شاد آؤ گی' شاد باد واپس سسرال میں جاؤ گی۔"

"سچ بھابھی؟؟" ندا کی آنکھیں پھٹنے کو تھیں۔

"تو اور کیا' سولہ آنے سچ۔" امی نے اپنی بہو کو سینے سے لگایا "یہ ہی بات تو میں تمہیں سمجھا نہ سکی۔" ندا اپنے آنسو پونچھ رہی تھی' جب نازیہ نے دسترخوان لگایا۔

"واہ..." سب نے بے ساختہ ناک سکوڑی۔

"بریانی کی کیا زبردست خوشبو ہے اور دوسری ڈش میں کیا ہے؟" ماہم نے پوچھا۔

"زردہ..." ملیحہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ "افتخار کو بہت پسند ہیں میٹھے چاول۔"

"میں نے حسن کے ملنے کی خوشی میں بنائے ہیں' سب کا منہ میٹھا ہو جائے گا کھا کر۔" ملیحہ خوش دلی سے بولی۔

"اور ایک خوشی اور۔" امی نے کہا۔

"اتنا اچھا سبق سیکھنے کی خوشی... آئندہ چوٹوں پریشانیوں سے بچنے کی قیمتی نسخے کی۔" وہ ملیحہ کا جتنا شکریہ ادا کرتی... سب سے زیادہ خوشی امی کے چہرے پر تھی۔ بار بار کہہ رہی تھیں۔

"ہمارے ابا میاں کہتے تھے' دودھ بھی گر جائے تو سوچو اعمال میں کیا کمی کوتاہی ہو گئی۔ یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔"

سب کے چہروں پر خوشی اور اطمینان تھا' جبکہ کھانا سرو کرتی ملیحہ کے چہرے پر نور ہی نور تھا۔ نازیہ' ماہم' ندا کو تو اس کے چہرے پر الوہی رنگ نظر آرہا تھا۔ واقعی سینہ بے کینہ' حسد' غیبت' چغلی سے پاک دل کا عکس' سب سے پہلے چہرہ پر پڑتا ہے' پھر یہ پاکیزگی اور برکت اعمال میں شامل ہو جاتی ہے' جیسے بھابھی ملیحہ کے۔

نبیلہ ابر دالجہ

ہم جو مٹ بھی گئے

سعید الدین کی پانچ اولادیں عاشر احمد، یاسر احمد، حسان احمد، جلال احمد اور ایک بیٹی ایمن ہیں۔ سعید الدین کے تمام بیٹے علاوہ حسان احمد کے ان کے کاروبار کو سنبھالتے ہیں۔ حسان احمد اپنی کلاس فیلو کو پسند کرتے تھے لیکن والدین کے دباؤ ڈالنے پر وہ خاندان میں ہی کنزہ سے شادی کر لیتے ہیں لیکن کنزہ کو کبھی وہ عزت دے نہیں پاتے جو ان کا حق ہے۔ کنزہ صلح جو اور صابر طبیعت کی حامل ہیں۔ سعید الدین بیٹوں کے متعلق تمام فیصلوں سے مطمئن ہیں۔ صرف حسان احمد کی بغاوت اور غیر اخلاقی سرگرمیاں انہیں پریشان رکھتی ہیں۔ اسی دوران کنزہ اور حسان احمد کے یہاں ننھی آبدار کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی معصوم قلقاریاں بھی حسان احمد کا دل موم نہیں کر پاتیں۔ ایک حادثے میں حسان احمد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ کنزہ کی رہی سہی ہمت ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔ صرف سعید الدین کے سہارے وہ بیٹی کے ساتھ بیوگی کے دن گزار رہی ہیں۔ تائی عائلہ اور چچی رحمہ اور صوفیہ چچی کا رویہ آبدار اور کنزہ کے ساتھ ہتک آمیز ہے۔ جس سے آبدار بظاہر خود سر ہو چکی ہے۔ وہ الا ابالی طبیعت رکھتی ہے اور اپنی نسوانیت سے لاپروا رہتی ہے۔

سالوں بعد ایمن اپنے بیٹے کے ساتھ پاکستان آتی ہیں۔ وجہ تسمیہ بیٹے ابوبکر کے لیے لڑکی ڈھونڈنا ہے۔ ابوبکر کینیڈا میں سرجری کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس کی نظر انتخاب آبدار پر ٹھہراتی ہے۔ اس کی خواہش پر رشتہ فی الفور طے کر دیا جاتا ہے اور منگنی دھوم دھام سے اگلے سال ہونا قرار پاتی ہے۔ سب چچیوں اور کزن عزہ اور وریشہ بھی آبدار سے شدید حسد محسوس کرتی ہیں۔ تایا عاشر کے بیٹے باسط احمد شادی شدہ ہے اور آبدار پر بری نظر رکھتے ہے۔ وہ آبدار کو دھوکے سے اپنے کمرے میں بلا کر اپنے شیطانی جذبے کی تسکین چاہتا ہے۔ آبدار کے واویلا کرنے پر باسط احمد تمام الزام آبدار پر ڈال

منجھلا ناول

دیتا ہے۔ سارے ثبوت اس کے خلاف جاتے ہیں۔ مائی جان اور باسط سب کے سامنے آبدار کو بری طرح مارتے پیٹتے ہیں اور کنزہ بیٹی کی اس غلطی کو معاف کرنے کو تیار نہیں۔ گھر کی خواتین کے طفیل تمام کمائی مرچ مسالے کے ساتھ تمام خاندان تک پہنچ جاتی ہے۔ ایمن پھپھو کی آمد پر انہیں بطورِ خاص یہ خبر دی جاتی ہے۔ وہ آبدار اور کنزہ سے اس کے متعلق پوچھتی ہیں تو آبدار تمام سچائی ان کے سامنے دھرا دیتی ہے۔ سعید الدین کی طرح انہیں بھی آبدار پر لگے الزام کا یقین نہیں تمام حقیقت جان کر ابوبکر' آبدار سے شادی سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ صدمہ آبدار کو توڑ ڈالتا ہے۔ وہ سعید الدین' کنزہ اور ایمن پھپھو کے سامنے قرآن پر اپنی سچائی کا حلف لیتی ہے۔ سعید الدین اس معاملے میں کچھ کرنے سے قاصر ہیں ابوبکر کی منگنی دریشہ سے دھوم دھام سے ہو جاتی ہے۔ اسی محفل میں سعید الدین کے دوست چوہدری فاروق اپنے پوتے یاور چوہدری کے لیے عزہ کو پسند کرتے ہیں۔ وہ رشتے کا عندیہ دیتے ہیں تو یاور کو دیکھتے سعید الدین گاؤں جاتے ہیں۔ ان کا شاہانہ رہن سہن اور یاور کا خاندانی انداز اور وجاہت دیکھ کر وہ چوہدری فاروق کو گرین سگنل دے دیتے ہیں۔ گھر آکر جب وہ اپنے بیٹے جلال احمد اور بہو رحمہ سے عزہ کے رشتے کی بات کرتے ہیں تو رحمہ ہتھے سے اکھڑ جاتی ہیں۔ وہ مختلف حیلے بہانوں سے یہ رشتہ منع کر دیتی ہیں اور بظاہر ہمدرد بن کر اس رشتے کا رخ آبدار کی جانب موڑ دیتی ہیں۔ ان کے خیال میں گاؤں کی یہی زندگی اور ذمہ داریوں میں پسنے کے لیے آبدار کا وجود کافی ہے۔

چوہدری فاروق کا بڑا بیٹا غالب کم عمری میں ناگہانی موت کا شکار ہوا۔ دوسرا بیٹا یاور تعلیم کے لیے شہر میں مقیم تھا لیکن حادثے کے بعد اب مستقل چوہدری فاروق کے ساتھ گاؤں میں مقیم ہے۔ یاور کی ماں حاجرہ خانم ہڈیوں کے کینسر میں مبتلا ہیں اور بستر پر ہیں۔ جبکہ غالب کے دونوں بچوں تابش اور حرا کی تمام تر ذمہ داری بھی اب اس کے سر ہے۔ والد حارث چوہدری بھی نوجوانی میں انتقال کر چکے ہیں۔ ایسے میں چوہدری فاروق کو یاور کے لیے ایسی دلہن کی تلاش ہے جو اس کی ذمہ داریاں بانٹ سکے۔ سعید الدین از خود اپنی عزیز پوتی آبدار کا رشتہ ان کے آگے رکھتے ہیں تو وہ دوستی کا بھرم رکھتے ہوئے بغیر آبدار کو دیکھے رشتہ کے لیے حامی بھر لیتے ہیں۔ سعید الدین کے یہاں جب چوہدری فاروق اور ان کے گھرانے کی خواتین آتی ہیں تو ان کا رکھ رکھاؤ اور تام جھام دیکھ کر سب دنگ رہ جاتے ہیں۔ چوہدری فاروق کو گم صم سی آبدار اپنے پوتے کے لیے پسند آجاتی ہے۔ آبدار نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا ہے۔ اسے غم ہے تو اس بات کا کہ وہ باسط اعظم کا اصل چہرہ سب کو نہیں دکھا پائی۔

(اب آگے پڑھیے)

دوسری اور آخری قسط

ادھر سے جانے کے بعد وہ سب گاؤں گئے تھے۔ حاجرہ خانم کے پاس ان کی بہن اور بہو بیٹھی ہوئی تھیں۔ یاور پہلے سے ہی ان کے کمرے میں موجود تھا۔ حاجرہ بہت خوش تھیں کہ لڑکی کا انتخاب کر لیا گیا تھا۔ چوہدری فاروق نے یاور کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ لوگ جلد آئیں گے اور اس کے بعد ہمیں جانا ہے' تمہیں لڑکی دیکھنی ہے تو چلے جانا۔ اس کے ہونٹوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"آپ نے پسند کر لیا ہے یہ ہی کافی ہے۔ آپ جو بھی کریں مجھے منظور ہے۔"

اتنا سا احتجاج اس کا حق بنتا ہی تھا۔ اپنی خوشی میں چوہدری فاروق اس بات کو بھولے نہیں تھے اور ان کا رویہ یاور کے ساتھ دوستانہ ہی تھا۔

☆ ☆ ☆

گل پری یک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ یاور نے اسے بتا دیا تھا کہ بابا جان بات فائنل کر آئے ہیں۔

"بس یہ ہی تھی تمہاری محبت۔" گل پری نے بمشکل خود کو رونے سے باز رکھا ہوا تھا۔

"تم میرے لیے اتنا سا بھی نہ کر سکے۔ لوگ محبت میں کیا کچھ کر جاتے ہیں۔"

"مجھے الزام نہ دو۔ میں نے تم سے ہر بات کلیئر کر دی تھی' ساری صورتِ حال تمہارے سامنے تھی۔ تم حویلی آکر بابا جان سمیت امی جان سے بھی ملیں۔ غالب بھائی کے دونوں بچوں کو تم نے دیکھا۔ بابا جان سو فیصد راضی تھے' پھر جب شادی کا وقت آیا تو تم ایک چھوٹی سی بات کو انا کا مسئلہ بنا کر بیٹھ گئیں۔"

"بس بس' چپ کر جاؤ۔" گل پری چڑ گئی۔ "تم اس لیے آئے ہو کہ میرا دل جلاؤ' یہ بتا کر کہ بابا جان نے لڑکی پسند کر لی ہے۔"

"گل پری! تم اگر اب بھی راضی ہو تو میں انکار کر دیتا ہوں۔" اس نے جاتی گل پری کا بازو پکڑ کر زبردستی بٹھا دیا۔ لیکن اس نے غصے سے چھڑا لیا۔

"اگر تمہیں میری شرائط منظور ہیں تو بابا جان کو انکار کرو۔ میں گاؤں میں چودھرائن بن کر تمہارے بھائی کے بچے نہیں پال سکتی۔ میں کوئی گورنس یا آیا نہیں ہوں۔"

"گل پری! اس کے بعد ایک لفظ نہ کہنا۔ میرے بھائی کے بچے لاوارث نہیں ہیں جو تم انہیں بار بار طعنہ دیتی ہو' تمہارے دل میں ذرا سی بھی نرمی نہیں ہے۔ میں صرف اور صرف حرا اور تابش کی خاطر بابا جان کے کہنے پہ گاؤں واپس گیا ہوں' ورنہ یہ تمہیں بھی پتا ہو گا کہ میری سی ایس ایس کی تیاری کتنی اچھی تھی۔ اپنے لیے سب جی لیتے ہیں۔"

"بہرحال تم جو بھی کہو' میں تمہاری بات سے متفق نہیں ہوں۔ ابھی بھی وقت ہے تمہارے پاس' جس کا انتخاب کرنا ہے کر لو۔ دوسروں کے بچے سنبھالو یا پھر مجھے حاصل کرو۔"

گل پری کی کھٹ کھٹ کرتی ہیل کی آواز دور ہوتے ہوتے معدوم ہوتی چلی گئی۔ وہ اس ہوٹل کے ٹیلی فون بوتھ میں اکیلا بیٹھا تھا۔ گل پری کب کی جا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

گل پری سے اس کا تعلق چار سالوں پہ محیط تھا۔ وہ جس یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا تھا۔ گل پری بھی وہیں زیرِ تعلیم تھی۔ وہ اس کی کلاس فیلو حمنہ کی دوست تھی۔ اکثر و بیشتر ان ہی کے ڈپارٹمنٹ میں پائی جاتی۔ یاور سے بھی ہلکی پھلکی ہیلو ہائے بھی ہو جاتی تھی۔ گل پری کو اونچا لمبا کڑیل سا یاور شہری لڑکوں کے برعکس بہت اچھا لگتا تھا۔ کب یہ پسندیدگی محبت میں ڈھلی اسے پتا بھی نہیں چلا' حمنہ اس کے رازِ دل سے واقف تھی۔ اس کے دل کا حال حمنہ نے ہی یاور تک پہنچایا۔ گل پری کا تعلق بہت ہی اونچے گھرانے سے تھا۔ یاور اس کے گھر آتا جاتا تھا اور سب گھر والوں پہ گل پری کی پسندیدگی بھی عیاں تھی۔

غالب کی اچانک وفات بہت بڑا سانحہ تھی۔ حاجرہ خانم کو اپنی زندگی میں شوہر کی ناگہانی موت کے بعد جوان بیٹے کی موت کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ تابش نے بہت اثر لیا تھا۔ وہ انجانے سے خوف کے زیرِ اثر تھا۔ راتوں کو چیخیں مار مار کر جاگ پڑتا۔ ادھر معصوم سی حرا تھی۔ اس کے ذہن پہ بھی برے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ حاجرہ خانم خود دوسروں کی محتاج تھیں۔

فاروق احمد بڑھاپے کے آخری منزل پہ کھڑے تھے' اس صدمے نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ تابش اور حرا ان کے لیے بہت بڑا امتحان تھے۔ یاور کو اپنے فیوچر پلان سب بھول بھال گئے۔ اب یاد تھا تو صرف یہ ہی کہ غالب بھائی کے بعد اب اسے ہی سب کچھ دیکھنا ہے بابا جان اس گھر کی دیکھ بھال کے لیے ایک عورت کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ تب انہوں نے یاور کی شادی کی تجویز سامنے رکھی۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ انکار بھی نہ کر سکا۔ اس کے سامنے گل پری کی ہی صورت تھی' سو اس نے بابا جان کو کھل کر بتا دیا۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بس وہ اتنا چاہتے تھے کہ یاور بیوی کے ساتھ گاؤں میں رہے اور یہاں کا سب

لیے کسی ایسے ویسے لڑکے کو پسند کر سکتا تھا۔ تم نے خود دیکھا ہے یاور کو۔ بلکہ اب تو سب نے دیکھ لیا ہے۔" مارے دکھ کے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"اصل میں ابا جان اس کے ذہن میں گاؤں کا کچھ تصور اور تھا جس کی وجہ سے یہ سب ہوا۔ اب تو وہ پچھتا رہی ہے بہت بری طرح۔"

جلال نے سچ بولنے کی گویا قسم کھالی تھی۔

"پچھتا تو میں بھی رہا ہوں۔ خیر چھوڑو چوہدری فاروق کو منگنی کے لیے آنا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ منگنی کے بجائے براہ راست نکاح کر دیا جائے اور دو ماہ بعد رخصتی کر دی جائے۔"

"ابا جان! جیسے آپ کی مرضی۔"

"تم یاسر اور عاشر کو میرے پاس بھیجو۔ میں ان سے انتظامات کا کہہ دوں۔" وہ بہت عجلت میں نظر آرہے تھے۔

اس اچانک نکاح کے پروگرام پہ جلال سمیت وہ دونوں بھائی بھی حیران تھے۔

نکاح میں صرف قریبی رشتہ دار ہی مدعو تھے۔ جمعہ کی شام بڑے ابا کی طبیعت اچانک بگڑی تھی۔ ان کے سینے میں شدید درد اٹھا تھا۔ جب بھی ان کی طبیعت خراب ہوتی کرنل شہریار ہی ان کا علاج کرتے تھے۔ رات کے ان چند گھنٹوں میں آبدار پہ قیامت گزر گئی تھی۔ بڑے ابا کا وجود گھنی چھاؤں کی مانند تھا۔ ان سے جدائی کا تصور بھی محال تھا۔ ڈاکٹر نے لمبے سفر سے منع کیا تھا لیکن وہ فاروق کی طرف تین بار گئے تھے۔ انہیں ٹینشن اور پریشانی سے دور رکھنا ضروری تھا مگر گھر میں ہونے والی جوڑ توڑ ایک دوسرے سے حسد انہیں آپ سیٹ ہی رکھتا۔

گھر آنے کے بعد ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ وقت کو پر لگا دیتے۔ انہیں اب ادراک ہوا تھا کہ آبدار کی منگنی کی جگہ اس کے نکاح کا خیال ان کے دل میں کیوں آیا تھا اور جلال سے بات کرنے کے بعد تو یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔ اور آج لگ رہا تھا انہوں نے جو کام کیا وہ ٹھیک ہے۔

☆ ☆ ☆

یاور کے خاندان میں نکاح کے وقت لڑکی کا سنگھار نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ صرف کلدار چادر اوڑھائی جاتی تھی وہ چادر ساتھ لے کر آرہے تھے مگر سعید الدین آبدار کو سجی سجائی دلہن کے روپ میں دیکھنے پہ بضد تھے۔

مولوی صاحب کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے نکاح نامے پہ سائن کر ڈالے۔

مرد مولوی صاحب کے ساتھ اٹھ کر باہر جا چکے تھے۔ اب صرف یہاں عورتیں اور بڑے ابا ہی تھے۔ یاور کی خالہ نے اس کے چہرے سے چادر سرکائی۔ سب عورتیں باری باری مبارک باد دے رہی تھیں۔ بڑے ابا خاموشی سے ڈرائنگ روم کی طرف گئے تھے جہاں سب مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے فاروق کے کان میں کچھ کہا تھا۔

دس منٹ کے بعد یاور، فاروق اور سعید الدین کے ساتھ اس طرف آیا جہاں آبدار رشتہ دار عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ سعید الدین نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر آبدار کے برابر لا بٹھایا۔ ان دونوں کو اکٹھے دیکھنے کی آرزو پوری ہوئی تھی۔

ٹو پیس میں ملبوس جاذب نظر سا یاور سب ہی عورتوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یاور کی خالہ نے آبدار کے چہرے سے دوپٹہ سرکا کر اسے دلہن دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ سرخ آنکھوں والی آبدار ہونٹ دبائے ہوئے بمشکل اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"فاروق! میری پوتی اب تمہاری امانت ہے۔ میں نے بہت لاڈ سے پالا ہے اور یاور مجھے پوری امید ہے تم اس کا بہت خیال رکھو گے۔" بڑے ابا باری باری دونوں سے مخاطب ہوئے اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"ارے کیسی بات کرتے ہو، تمہیں ہماری طرف

سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" فاروق نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ تو انہیں کچھ تسلی ہوئی۔

آبدار سے ملنے کے بعد فاروق اور دیگر مہمان واپسی کی تیاری میں تھے۔ سعید الدین ان کے جانے کے بعد بھی کافی دیر گیٹ پہ ہی کھڑے رہے۔

رات انہوں نے چمڑے کا ایک بیگ کنزہ کو دیتے ہوئے کہا کہ اسے سنبھال کر رکھنا۔ وہ کافی دیر آبدار کے پاس بیٹھے رہے۔ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے۔ کنزہ نے دو بار کھانے کا کہا مگر انہوں نے بھوک نہ ہونے کا عذر کیا۔

اپنے کمرے میں آنے سے پہلے انہوں نے آبدار کو گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما۔

"میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔ میں نے تمہارے اچھے نصیب کی اپنے ربّ سے بہت التجائیں کی ہیں۔ اپنے گھر میں آباد اور سکھی رہو۔"

اسے دعا دے کر وہ اپنے کمرے میں آئے۔ وضو کر کے عشاء کی نماز پڑھی اور بہت دیر سجدے میں جا کر دعائیں مانگتے رہے۔ جب وہ جائے نماز لپیٹ کر اٹھے تو ان کا چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ لیکن ان کا دل بہت مطمئن تھا۔ انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اپنے بستر پہ لیٹ کر انہوں نے درود شریف کی تسبیح پڑھنی شروع کی اور پھر پڑھتے پڑھتے ہی سو گئے۔ تسبیح ان کے ہاتھ سے پھسل کر تکیے کے پاس گر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آبدار کے سر کے درد میں کوئی کمی نہیں ہو رہی تھی۔ رات اس نے سوتے جاگتے گزاری تھی۔ صبح کنزہ نے ناشتے کے ساتھ سر درد کی ٹیبلٹ دینی چاہی تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے صرف چائے پی تھی، آدھا سلائس دانتوں سے کتر کر چھوڑ دیا تھا۔ کنزہ نے برتن بھی نہیں اٹھائے تھے کہ وہ سیدھی بڑے ابا کی طرف آگئی۔ ادھر سناٹا طاری تھا۔ برآمدے میں پڑی کرسی ویران تھی۔ ورنہ اس وقت وہ یہیں پائے جاتے تھے۔ آبدار نے پورے گھر میں طائرانہ نظر دوڑائی۔ کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ بڑے ابا کے بیڈ روم کی طرف آگئی۔ دروازے پہ ہاتھ مارا تو کھلتا چلا گیا۔ زیرو پاور کی لائٹ جل رہی تھی۔

"بڑے ابا آپ ابھی تک سو رہے ہیں۔" اس نے آوازیں دیں اور پھر قریب چلی آئی۔ وہ پُرسکون انداز میں آنکھیں موندے سو رہے تھے پھر تو وہ گھبرا کر آوازیں دینے اور جھنجھوڑنے لگی۔ اسی کی چیخ و پکار سے گھبرا کر سب ادھر جمع ہو گئے تھے۔ طلحہ گاڑی میں فوراً پاس والے ڈاکٹر شعیب کو لے آیا۔ اس نے موت کی تصدیق کر دی۔

چوہدری فاروق کے آنے کے بعد سعید الدین کی تدفین ہوئی۔ قبر پہ مٹی ڈالی جا چکی تھی۔

فاروق کو تو ان کی سب باتیں ایک ایک کر کے یاد آرہی تھیں۔ اپنی پوتی آبدار کے معاملے میں وہ بہت حساس اور پریشان تھے۔ ان سے کھل کر کہہ دیا تھا کہ نکاح کے بعد رخصتی میں زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے۔ فاروق نے کہا تھا۔

"میری طرف سے دیر نہیں ہوگی، تم جب کہو گے میں بارات لے آؤں گا۔" وہ ایک ماں کی طرح منتظر نظر آرہے تھے۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی۔

☆ ☆ ☆

قل پہ فاروق احمد نہیں آسکے تھے۔ ان کی طبیعت خراب تھی۔ دور کا سفر اس حال میں ان کے لیے ممکن نہیں تھا، سو یاور کو اکیلے ان کے بغیر آنا پڑا۔ کنزہ آنٹی ان عورتوں میں نظر نہیں آرہی تھیں، وہ ان سے بھی تعزیت کرنا چاہتا تھا۔ رحمہ سن کر بد مزہ سی ہو گئیں۔ کنزہ سپارہ پڑھ رہی تھیں۔ رحمہ خود کنزہ کے پاس چھوڑ کر گئیں۔ ان کی آنکھیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ کنزہ نے آبدار کو سپارہ لے جانے کے لیے آواز دی۔ اس نے بھی سفید دوپٹہ ماتھے تک اوڑھا ہوا تھا اور کنزہ کی طرح اس کی آنکھیں بھی شدت گریہ سے

سوچی ہوئی تھیں۔ مما کے پاس اجنبی صورت براجمان تھی۔ وہ تیزی سے سیپارہ لے کر نکل گئی۔ کنزہ نے جب نام لے کر آواز دی تھی تو فطری طور پہ وہ متوجہ ہوا تھا۔ پر ادھر تو اسے اجنبی سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی، وہ ملگجر سا ہو گیا۔

کنزہ کو غصہ آگیا۔ آبدار نے سلام تک نہیں کیا تھا۔ وقت موقع ایسا تھا کہ یاور کے سامنے وہ اسے کچھ کہہ نہیں سکی تھیں۔ لیکن اس کے جانے کے بعد کنزہ نے اس کی خوب کلاس لی۔

آبدار کو ہرگز نہیں پتا تھا کہ مما کے پاس جو اجنبی بیٹھا تھا وہ یاور تھا۔ اس نے تو غور ہی نہیں کیا تھا شکل وصورت پہ۔

"آبدار! کیوں میری مشکلات بڑھانے پہ تلی ہو۔ کیوں کرتی ہو ایسا۔ یاور کیا سوچتا ہو گا۔"

"مما! مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ کون ہیں، ورنہ میں ضرور حال احوال پوچھتی۔" کنزہ سر پکڑ کر بیٹھی تھیں۔ ابھی نکاح کو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا۔ آبدار کی بے وقوفیاں جانے کیا رنگ دکھانے والی تھیں۔ وہ تو ہر وقت ہولتی ہی رہتی تھیں۔ پہلے بڑے ابا کی موجودگی سے ان کی ڈھارس بندھی ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ سہارا بھی نہیں رہا تھا۔ خوب پھونک پھونک کر قدم آگے کرنا تھا۔

سعید الدین کی وفات کو دو ہفتے سے زائد ہو چکے تھے۔ زندگی معمول پہ آرہی تھی۔

ایمن پھوپھو ایک ہفتے کے لیے اکیلی پاکستان آئی تھیں۔ کوشش کے باوجود وہ ابا جان کا آخری دیدار نہیں کر پائی تھیں۔ ان کے آنے کے بعد گھر کا ماحول تناؤ زدہ ہو گیا تھا۔ ایسا کیوں تھا، آبدار کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔

لیکن تایا جان، تائی جان کے ساتھ غیر متوقع طور پہ ان کے پورشن میں چلے آئے۔ کنزہ کو یقین نہیں آرہا تھا، کیونکہ اس واقعے کے بعد ادھر سے کسی فرد تک نے ادھر آنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ان کا انداز راز دارانہ تھا۔ تائی نے آبدار کو گلے لگا کر بڑی محبت سے ماتھا چوما۔ وہ حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ آج کیسے کایا پلٹ گئی تھی۔ انہوں نے تو جینا مرنا ختم کا اعلان کر دیا تھا۔

تایا جان کافی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ درمیان میں انہوں نے سرسری سا سوال کر دیا۔

"بھابھی! ابا جان نے آپ کو کوئی کاغذ وغیرہ تو نہیں دیا تھا مرنے سے پہلے۔"

"نہیں بھائی جان! ایسا تو انہوں نے کچھ نہیں دیا، لیکن کچھ روز پہلے انہوں نے مجھے چمڑے کا بیگ دیا تھا۔ میں نے کھول کر نہیں دیکھا ذرا رکیے میں لاتی ہوں۔" کنزہ بیگ لانے چلی گئیں۔

عائلہ نے معنی خیز نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا۔ آبدار پاس نہیں تھی، سو انہیں کوئی خوف نہیں تھا۔ کنزہ بیگ لے آئیں۔

عاشر احمد نے بے تابی سے ان کے ہاتھ سے لیا۔ اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ وہ چھپا نہیں پائے تھے۔ انہوں نے بیگ کی زپ کھولی۔ اندر کچھ کاغذات تھے۔ کنزہ کو تو خاص سمجھ نہیں تھی۔ کیونکہ وہ انگریزی زبان میں تھے۔ عاشر احمد نے ایک ایک کر کے پڑھنا شروع کیا۔ ان کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

"کنزہ بھابھی! یہ میری نئی گاڑی کے کاغذات ہیں۔ اس روز جب میں گاڑی لے کر ابا جان کے ساتھ آرہا تھا تو گاڑی میں ہی پڑے رہ گئے تھے۔ ابا جان نے غلطی سے مجھے دینے کے بجائے آپ کو دے دیے۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان! لے جائیں آپ کی چیز ہے۔ میں نے کیا کرنا ہے۔" سادہ دل کنزہ نے اپنی عقل کے مطابق جواب دیا۔

واقعی عاشر احمد نے کچھ روز پہلے نئی گاڑی لی تھی اور ابا جان بھی ساتھ تھے۔ کنزہ کے دل میں کسی بھی قسم کا منفی خیال نہیں آیا تھا۔ وہ تو بہت خوش تھیں کہ جیٹھ اور جیٹھانی ان کے گھر آئے ہیں اور پہلے کی طرح ہنس بول رہے ہیں۔

عاشر احمد بیوی کے ساتھ چلے گئے۔ کاغذات دیکھنے کے بعد زیادہ دیر بیٹھے نہیں تھے۔

☆ ☆ ☆

دن پر لگا کر اڑ رہے تھے۔

سعید الدین کے چالیسویں پہ چودھری فاروق، یاور کے ساتھ آئے۔ درمیان میں دو بار یاور اکیلا آیا تھا، کیونکہ ان کی طبیعت کافی خراب رہی تھی۔ چالیسویں کی دعا وغیرہ ہو چکی تھی۔ وہ کنزہ کی طرف چلے آئے۔ انہوں نے فوراً "ڈرائنگ روم کھلوایا۔ آبدار عورتوں کی طرف تھی۔ آئینہ کو بھیج کر اسے بلوایا۔ ڈرائنگ روم میں وہ جونہی داخل ہوئی کنزہ نے نگاہوں کی زبان میں کچھ کہا۔ پتا نہیں وہ سمجھی کہ نہیں، لیکن پاس آکر بڑے ادب سے سلام کیا اور فاروق چودھری کی خیریت دریافت کی پھر اسی یاور بیٹھا تھا۔

آبدار نے پہلی بار اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اسی کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے فوراً نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔ بہرحال آج اس نے یاور چودھری کو دیکھ لیا تھا۔ کیمل کلر کے کھدر کے شلوار سوٹ میں ملبوس ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھا پہلی نگاہ میں آبدار کو وہ کافی مغرور لگا تھا۔

کنزہ آبدار کی ہچکچاہٹ کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھیں۔ چائے لانے کے بہانے باورچی خانے میں آگئیں۔

فاروق، آبدار کو پاس بٹھائے باتیں کرنے لگے۔ کالج کی پڑھائی سے ہوتے ہوئے گفتگو کا رخ بڑے ابا کی ذات کی طرف مڑ گیا۔ پھر آبدار کو اپنے آنسوؤں پہ کوئی اختیار نہیں رہا۔ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ فاروق کو تو سمجھ میں ہی نہیں آرہی تھی کہ اسے کیسے چپ کروائیں۔

"دیکھو بیٹا! میں بھی تمہارے بابا کی طرح ہوں۔ تم بھی یاور کے ناتے سے مجھے عزیز ہو۔ میں یہ دعوا تو نہیں کرتا کہ سعید الدین جیسا پیار تمہیں دے سکوں گا، لیکن تم مجھے محبت کرنے میں تخیال رکھنے میں اپنے بڑا ابا سے کم نہیں پاؤ گی۔ جب ہمارے گھر آؤ گی تو تمہیں خود اس بات کا احساس ہو گا۔" انہوں نے خود سے وابستہ نئے رشتے کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی۔

یاور گاہے بگاہے نظر موڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ آبدار نے بڑے سلیقے سے دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ یاور کو اس کی پوری شخصیت میں اس کا دوپٹہ اوڑھنے کا اسٹائل اچھا لگا۔ کان تک نظر نہیں آرہے تھے۔ اور بال بھی سمٹے ہوئے تھے۔ یاور کو یہ خبر نہیں تھی کہ خود کو اس طریقے سے سنبھال کر رکھنے کے طریقے سے اسے کس نے آشنا کیا ہے اور اس کے پیچھے کتنی تاریک کہانیاں ہیں۔

☆ ☆ ☆

دن بہت گھٹے گھٹے اور رُک رُک کر گزر رہے تھے۔ کوئی سرگرمی اور کوئی خوشی نہیں تھی۔ آبدار اکثر غیر ارادی طور پہ بڑے ابا کے کمرے میں چلی جاتی، جب احساس ہوتا تو اپنی غائب دماغی پہ ہنس پڑتی، بڑے ابا کے کمرے میں ان کی خوشبو رچی بسی تھی۔

آج بھی دوپہر میں اس کا دل گھبرایا تو وہ بڑے ابا کی اسٹڈی کی طرف چلی آئی۔ دن کا بیشتر حصہ وہ کتابیں پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ اسٹڈی روم کا دروازہ نیم وا تھا اور لائٹ جلتی نظر آرہی تھی۔ وہ دیکھنے کے لیے آگے ہوئی۔ نیم وا دروازہ ہاتھ سے دھکیلا۔ باسط جو درازوں میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔ عجلت میں پیچھے مڑا۔ آبدار سامنے تھی۔ اطمینان بھری سانس اس کے سینے سے خارج ہوئی۔ آبدار کے چہرے پہ تنفر ابھر آیا۔ وہ الٹے قدموں واپس مڑی۔

"بہت خوب! یاور چوہدری سے نکاح کے بعد چار چھ ماہ میں بہت خوب صورت ہو گئی ہو۔" باسط کی نظریں اس پر پھر جمی تھیں، اسے اپنے جسم پہ چیونٹیاں رینگتی محسوس ہوئیں۔ اور کھلے دروازے سے تیزی سے باہر نکلی۔ ہینڈل سے دوپٹہ الجھا۔ اس نے تیزی سے کھینچا اور باہر آگئی۔ سامنے برآمدے میں رحمہ چچی عزہ کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی باسط نکلا۔

آبدار تو اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی اور باسط ان دونوں کو دیکھ کر ٹھہرا سا گیا۔ اسے خوف محسوس ہوا' کہیں وہ عمارہ کو دی چھ لگا کر نہ بتائیں۔

"میں ایک کتاب ڈھونڈ رہا تھا' سوچا بڑے ابا کے اسٹڈی روم میں جا کر دیکھ لوں' مگر اوپر سے یہ آگئی۔ سکون سے کتاب بھی نہیں ڈھونڈی گئی' میں باہر آگیا ہوں کہ پھر کبھی دیکھ لوں گا۔" باسط نے بڑی تیزی سے خود کو کمپوز کیا۔ رحمہ دل ہی دل میں کچھ حساب کتاب کر رہی تھیں۔ باسط کے دل میں چور تھا' وہ کافی دیر ادھر بیٹھا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں ہے وہ تب وہاں سے ہٹا۔

ادھر باسط کے جانے کے بعد رحمہ نے اپنی کرسی گھسیٹ کر عزہ کے قریب کرلی تھی۔

"تم نے دیکھا پہلے آبدار اور پھر باسط اس کے پیچھے باہر آیا۔ اور گھبرایا ہوا بھی کتنا' جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔"

"ہاں مما مجھے بھی فیل ہوا کہ باسط بھائی ہمیں دیکھ کر پریشان سے ہو گئے ہیں اور آبدار ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھی اپنے پورشن میں گھس گئی۔ لگتا ہے دال میں کچھ کالا ہے۔"

"دھول جھونک رہی ہے سب کی نگاہوں میں۔ تمہارے بڑے ابا اس کی بڑی سائیڈ لیتے تھے۔ جاتے جاتے نکاح بھی کروا گئے۔ بڑا رو رہے تھے نکاح کے دن گلے لگا کر لاڈلی بوتی کو اور پوتی نے تو کفن میلا ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا اور اپنی حرکتوں پہ اتر آئی۔ دیکھ لینا کوئی چاند چڑھا کر رہے گی' پھپھر تا چلے گا سب کو۔"

رحمہ کو لفظ لفظ سے آبدار کے لیے نفرت ٹپک رہی تھی۔ عزہ مسلسل سر ہلا رہی تھی۔ آبدار سے تو ویسے بھی شروع سے ہی اس کی نہیں بنتی تھی۔ مما نے اس کی بڑی کھناؤنی تصویر کشی کی تھی۔ مما نے یہ سب کہا تھا تو کوئی غلط تو نہیں تھا نا کچھ بھی۔ مما کی کہی ہر بات اس کے لیے حرفِ آخر کا درجہ رکھتی تھی۔

☆ ☆ ☆

سعید الدین کی موت کو چار' پانچ ماہ گزر گئے تھے۔

اس دوران آبدار کی طرف سے کوئی بھی فاروق چوہدری کی طرف نہیں گیا۔ وہ پریشان سے تھے کہ اُدھر سے کسی نے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ آخر ان سے رہا نہیں گیا تو ڈرائیور کو لے کر شہران کی طرف چلے آئے۔ ان کے دل میں بہت سے خدشات بیک وقت جمع ہو گئے تھے۔ کنزہ بڑی محبت اور احترام سے ملیں۔ ان کے رونے میں کسی تبدیلی کے آثار نہیں تھے۔ پر سعید الدین کے بڑے دونوں بیٹوں کا رویہ بہت رسمی اور فارمل سا تھا۔

"عاشر بیٹا! سعید الدین کو ہم واپس تو نہیں لا سکتے۔ تمہارا غم بھی یقیناً" ابھی تازہ ہو گا' لیکن سعید الدین کی خواہش تھی کہ آبدار کی رخصتی جلدی کر دی جائے۔ میں اسی لیے آیا ہوں کہ فائنل کر کے مجھے بتاؤ' تاکہ میں بھی تیاری کروں۔" انہوں نے عاشر احمد سے بات کرنے کا آغاز کیا۔

"انکل! ابھی ابا جان کو مرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ہم اس طرح کی خوشیاں منانا شروع کر دیں۔ اور پھر آبدار کی کون سا اتنی عمر ہو گئی ہے یا وہ بوڑھی ہو گئی ہے جو اتنی جلدی کر دیں رخصتی۔ آپ حوصلہ رکھیں' کچھ ٹائم گزرنے دیں' ہمیں دو' تین ماہ دیں' جب تک تیاری بھی ہو جائے گی اور ہمارے دلوں کو بھی ابا جان کی طرف سے کچھ سکون آجائے گا۔"

یاسر احمد نے معقول انداز میں بات کی تھی۔ فاروق چوہدری نے بحث کرنی مناسب نہیں سمجھی اور مان گئے۔ دو' تین ماہ گزرنے میں کتنا ٹائم لگتا ہے۔ جہاں اتنا انتظار کیا وہاں کچھ انتظار اور سہی۔

وہ کنزہ اور آبدار سے مل کر واپس آگئے۔

☆ ☆ ☆

سعید الدین کی وراثت اور جائیداد وغیرہ کی تقسیم ہو رہی تھی۔ ایمن تک بھی تفصیلات پہنچ گئی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ حسان احمد کے حصے کی تمام جائیداد آبدار یا کنزہ کسی کے نام بھی نہیں تھی۔ بلکہ کنزہ جس گھر میں رہ رہی تھیں' صرف وہی پورشن ان

کے نام تھا۔ بزنس میں عاشر احمد' یاسر احمد اور جلال احمد ہی حصہ دار اور وارث بنے تھے۔ حالانکہ حسان احمد بھی حصہ دار تھے' لیکن پتا نہیں وہ سب کہاں گیا تھا۔

کنزہ بری طرح پریشان تھیں' کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے بینک فون کر کے اپنے اکاؤنٹ کی تفصیل معلوم کی تو اور بھی پریشان ہو گئیں۔ وہاں صرف تین' چار لاکھ تھے۔ باقی کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے آبدار کی شادی کرنی تھی اور سعید الدین کے بڑے ارمان تھے کہ آبدار کو شان دار جہیز دے کر رخصت کیا جائے۔

ان کی ٹینشن بڑھتی جا رہی تھی۔ آبدار دیکھ رہی تھی کہ کنزہ بہت اَپ سیٹ رہنے لگی ہیں۔ وہ رات کو اپنے کمرے میں بیٹھی پیپرز کی تیاری میں مصروف تھی کہ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ رات کے سناٹے میں یہ آوازیں بڑی واضح تھیں۔ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ ان آوازوں کا مرکز مما کا کمرہ تھا۔ اس نے کتاب بند کر دی۔ آبدار نے آہستگی سے مما کے کمرے میں داخل ہو کر لائٹ جلا دی۔ آوازیں ایک دم' دم توڑ گئیں۔ اسے یوں لگا جیسے کانوں نے دھوکہ کھایا ہو۔ کنزہ کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ بظاہر وہ محوِ خواب ہی لگ رہی تھیں۔ پھر بھی آبدار نے قریب جا کر ان کا جائزہ لیا۔ کنزہ نے ایک دم آنکھیں کھول دیں جو آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"مما! کیا ہوا ہے' آپ کیوں رو رہی ہیں؟" وہ ان کے قریب بیڈ پہ ہی بیٹھ گئی۔ کنزہ کے رونے میں شدت آگئی۔ آبدار ہولے ہولے انہیں تھپکنے لگی۔ خوب رو چکنے کے بعد کنزہ خاموش ہوئیں اور پھر اسے اپنی پریشانی بتا دی۔ سن کر آبدار بھی متفکر ہو گئی۔

"مما! بڑے ابا بتاتے تھے کہ بیاہ کا تمام جائیداد میں حصہ ہے۔ پھر وہ سب کہاں گیا' جب ہمیں بھی نہیں ملا تو...؟"

"میں بھی تو یہ ہی سوچ کر پریشان ہوں کہ وہ سب کہاں گیا۔" کنزہ نے بے بسی سے نشانے اچکائے۔

"مما بڑے ابا نے آپ کو ایک بیگ دیا تھا کہ سنبھال کر رکھ لو' وہ کہاں ہے؟" اسے بروقت یاد آیا تھا۔

"وہ تو میں عاشر بھائی کو دے چکی ہوں۔ ان کی گاڑی کے کوئی کاغذات تھے اس میں۔"

"مما! آپ کو کیسے کنفرم ہوا کہ اس میں تایا جان کی گاڑی کے کاغذات تھے۔ اگر وہ ان کے تھے تو بڑے ابا نے ہمیں کیوں دیے۔" آبدار کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"بیٹا! عاشر بھائی خود پوچھنے آئے تھے۔ میں نے بیگ دے دیا تو بولے کہ میری گاڑی کے کاغذات ہیں' غلطی سے بڑے ابا نے آپ کو دے دیے ہیں۔" انہوں نے سادگی سے بتایا تو آبدار سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"میں صبح تایا جان سے پوچھوں گی۔" وہ بہت اَپ سیٹ ہو گئی تھی۔

"ارے نہیں' عاشر بھائی سے مت پوچھنا' یہ غلطی نہ کرنا' انہیں غصہ آئے گا' اتنی مشکل سے تو عائلہ بھابھی کا موڈ اچھا ہوا ہے۔ میں سب کچھ اپنی کسی چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے بھی خراب نہیں کر سکتی۔" آبدار، سادہ لوح ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔

بہت زیادہ ہوشیاری تو اس میں بھی نہیں تھی' لیکن تھوڑی بہت تعلیم نے اسے کسی حد تک زمانہ شناس ضرور بنا دیا تھا۔ اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کو عاشر احمد کھانا سب گھر والوں کے ساتھ مل کر کھاتے تھے۔ اس معمول کا آبدار کو اچھی طرح علم تھا۔ سو وہ بڑی خاموشی سے مما کو بتائے بغیر ادھر پہنچ گئی۔ اسے دیکھ کر سب نے کھانا موقوف کر دیا۔ عمارہ کے چہرے پہ اسے دیکھ کر غصہ طاری ہو گیا۔ باسط فوراً" کھسک گیا۔ "آؤ آؤ کھانا کھاؤ۔"

عائلہ نے تقریباً" زبردستی ہی آداب میزبانی نبھائے تھے۔ اس کے دل میں وسوسے پیدا ہو گئے تھے۔ وہ خود سے یہاں کیوں آئی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔

"میں کھانا کھانے نہیں آئی تائی جان! بلکہ تایا جان سے چند باتیں پوچھنی ہیں۔"

اس نے یہاں قدم تو رکھ دیا تھا' پر اب ڈر بھی رہی تھی کہ بات کیسے کرے۔ پہلے مرحلے پہ تو بہادری دکھا دی تھی' اب قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کا انداز بڑا پراسرار تھا۔

"ہاں بیٹا! پوچھو کیا بات ہے؟" عاشر احمد کی بھوک ایک دم سے مر گئی تھی۔

"تایا جان! جائیداد میں سے میرے پپا کا حصہ کہاں ہے؟" اس نے یکدم ان کے حواسوں پہ بم گرایا تھا۔

"تمہارے پپا کا حصہ بھابھی کے نام ہے۔" عاشر احمد کے ہاتھوں کے طوطے ایک ثانیے کے لیے اڑ ہی گئے تھے۔

"میرے پپا کا حصہ صرف ایک مکان ہے تایا جان؟" وہ پرانی والی سرکش نڈر کسی سے نہ دبنے والی آبدار لگ رہی تھی۔

"تمہیں کسی نے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی آبدار؟ تمہاری یہ جرأت کہ آکر سوال کرو۔" عائلہ کو آگ لگ گئی تھی۔

"ارے بلاؤ کوئی کنزہ کو جا کر' اس کو آکر دیکھے۔" وہاں تو واویلا شروع ہو گیا۔ اس صورت حال کا اس نے تصور نہیں کیا تھا۔ اتنے میں کنزہ بھی آ گئیں۔ آبدار کو یہاں دیکھ کر ان کی ٹانگیں کانپنا شروع ہو گئیں۔ انہوں نے سمجھا کہ آبدار سے پھر کوئی غلطی ہو گئی ہے۔

"یہ ہی تربیت کی ہے تم نے اس کی۔" عاشر احمد بڑی حقارت سے اس کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"کک کیا ہوا ہے بھائی جان! آبدار سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔" سدا کی کمزور اور بزدل کنزہ کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"کنزہ بی بی! اسے سمجھاؤ۔ مجھ سے سوال جواب کرنے چلی ہے۔" تایا جان میں نے کب بدتمیزی کی' صرف اتنا ہی تو کہا کہ کیا ہمارا حصہ اتنا ہی ہے۔ صرف ایک مکان' میں بھی پپا کی اولاد ہوں' میرا حصہ کہاں گیا؟"

"تمہارا حصہ بھی وہی مکان ہے۔ کنزہ کے بعد تمہارا ہو جائے گا۔" عائلہ نے سنگ دلی کی انتہا کر دی تھی۔

"چلو آبدار! آؤ۔" کنزہ نے موقع کی نزاکت بھانپ کر اسے یہاں سے لے جانا چاہا' اس نے بازو چھڑا لیا۔

"تایا جان! پپڑے کے اس بیگ میں کیا تھا جو بڑے ابا نے مما کو دیا تھا۔" عاشر احمد کے چہرے پہ ایک رنگ سا آ گیا۔

"بیگم! جاؤ وہ بیگ لا کر اسے دکھاؤ۔" وہ پوری قوت سے دھاڑے۔ کنزہ بری طرح ڈر گئیں۔ ڈر تو آبدار بھی گئی تھی۔ عاشر احمد اور عائلہ تائی کے زور زور سے بولنے پہ ساتھ والے پورشن سے صوفیہ' رحمہ اور یاسر بھی نکل آئے۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" وہ پوچھ رہے تھے۔

"ہونا کیا ہے ایمان داری کا صلہ مل رہا ہے۔" عاشر احمد اس کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ کنزہ کونے میں پریشان سی کھڑی تھی۔ عائلہ نے پپڑے کا وہ بیگ لا کر آبدار کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"لو دیکھ کر اپنا اطمینان اچھی طرح کر لو۔" عائلہ نے بیگ اس کے ہاتھ میں پکڑایا۔

اندر واقعی گاڑی کے کاغذات اور اسی نوعیت کے کچھ اور کاغذ تھے۔ آبدار کی ساری طاقت ہوا ہو گئی۔

"آج سے میں تمہارا تایا نہیں ہوں۔ مجھے اس رشتے سے نہ پکارنا۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو کنزہ تڑپ گئیں۔

"بھائی جان! آپ کے سوا ہمارا کون ہے یہ نادان ہے' کم عقل ہے' آپ بڑے ہیں' مانتی ہوں اس کا قصور ہے' لیکن آج معاف کر دیں' آئندہ یہ ایسے نہیں کرے گی' اسے غلط فہمی ہو گئی تھی۔" کنزہ روتے ہوئے اس کی صفائیاں دے رہی تھیں۔ آبدار الٹے قدموں وہاں سے نکلی۔ مما کو ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتے دیکھنا اس کے بس سے باہر تھا۔

عاشر احمد کے ساتھ باقی سب بھی اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے' انہیں تو موقع چاہیے تھا۔

"کنزہ! آبدار پہ نظر رکھو' نہیں تو کوئی بڑا نقصان اٹھاؤ گی۔ نکاح کے بعد تم بالکل ہی غافل نہ ہو جاؤ۔" رحمہ نے بڑے معنی خیز انداز میں عائلہ اور عمارہ کی طرف باری باری دیکھ کر کنزہ سے کہا۔ کنزہ سب کے سامنے یہ وار بھی بڑے حوصلے سے سہہ گئیں۔ عاشر بھائی نے آج دھمکی بھی دے دی تھی۔ اس عمر میں وہ گھر سے بے گھر نہیں ہونا چاہتی تھیں۔

لے دے کر ان کے پاس آبدار ہی تھی۔ سوان کا سارا غصہ آبدار پہ اترا۔ انہیں احساس تھا کہ وہ غلط کر رہی ہیں' پر اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

چوہدری فاروق پھر عاشر احمد کے پاس آئے تھے۔ اس بار ان کا رویہ کچھ اور تھا۔

"آبدار کے انگیزامز ہو رہے ہیں۔ بعد میں اس بارے میں سوچا جائے گا۔"

انہوں نے سرد مہری سے بات کی تھی۔ فاروق' سعید الدین کے سب سے گہرے دوست تھے۔ ایک لحاظ سے وہ بھی عاشر احمد کے لیے باپ جیسے ہی تھے مگر ان کا رویہ سراسر ناانصافی والا تھا۔

فاروق کچھ کھائے پیے بغیر واپس آئے تھے۔ انہیں بہت جلد اس مسئلے کا حل سوچنا تھا۔ گویا سعید الدین کے خدشات بالکل درست تھے۔ انہوں نے جو کہا تھا ٹھیک کہا تھا۔ ان کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

یاور دو دن کے لیے لاہور گیا ہوا تھا۔ اچھا تھا وہ یہاں نہیں تھا' ورنہ اس کے ساتھ اپنی پریشانی لازمی شیئر کرنی پڑتی اور وہ جانے کیا سوچتا۔ فاروق چوہدری کو اچھی طرح احساس تھا کہ صرف وہ ان کے کہنے پر نکاح کے لیے راضی ہوا ہے' اب وہ اسے کیدیہ خاطر ہونے یا بے زاری کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔

☆ ☆ ☆

عائلہ صوفیہ' رحمہ کے ساتھ ان کے شوہر بھی ایک جگہ اکٹھے بیٹھے تھے۔ یہ میٹنگ عاشر احمد کے گھر ہو رہی تھی۔ موضوع گفتگو فاروق چوہدری کی خاص مقصد کے لیے آمد تھی۔

"آپ نے آبدار کی بے خوفی دیکھی ہے' اسے کوئی لحاظ نہیں ہے' کل کو وہ ہمارے سروں پہ چڑھ سکتی ہے۔ کس طرح کہہ رہی تھی کہ میں بھی اپنے پپا کی اولاد ہوں' میرا بھی حصہ بنتا ہے۔" عائلہ نے از سر نو اس مسئلے کا ذکر کر کے پریشانی بڑھا دی تھی۔

"اس کا کون سا حصہ ہے' کل کو شادی کر کے یہاں سے چلی جائے گی۔ اسے کون سے حصے کی ضرورت ہے۔ اس کی سسرال خود اتنی امیر ہے۔" صوفیہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اپنی رائے دی تو رحمہ اس کے قریب کھسک آئیں۔

"یاور کا رشتہ پہلے عزہ کے لیے آیا تھا۔ جو میں نے اپنی بے وقوفی سے گنوا دیا۔ مگر اب بہت پچھتاتی ہوں۔" عائلہ چپکے چپکے ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر خود بھی ادھر تک گئیں۔

"تو تم یہ چاہتی ہو کہ عزہ کے لیے دوبارہ یاور کا رشتہ آئے۔" انہوں نے ان کے منہ کی بات چھین لی تھی۔

"آپ نے سنا نہیں فاروق انکل کہہ رہے تھے کہ ہمیں خاندانی لڑکی کی ضرورت ہے۔ اس کی شرافت ہی سب کچھ ہوگی۔ آبدار میں جتنی شرافت ہے' مجھ سے زیادہ کس کو پتہ ہے۔" رحمہ انہیں دونوں واقعات کے بارے میں بتانے لگیں' جن میں سے ایک پرانا اور ایک نیا تھا۔

"اس کے سارے کس بل نہ نکالے تو میرا بھی نام نہیں۔ ویسے بھی نکاح کے بعد یہ بہت خوب شے سمجھنے لگی ہے خود کو' شادی ہو گی تو اس کی ہمت بڑھ جائے گی۔" عائلہ زہر خند ہو رہی تھی۔

رحمہ نے تو ابھی یہ بات کی تھی۔ انہیں پہلے ہی عائلہ دبے دبے لہجے میں عاشر احمد سے شادی ملتوی کرنے کا کہہ چکی تھیں' انہیں بھی ڈر تھا کہ شادی کے بعد آبدار طاقتور ہو جائے گی۔ اپنی زمین اور اپنے آسمان کی موجودگی عورت میں غرور کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ یاور خود اچھی خاصے خوش حال خاندان سے تھا۔ ان کی بے ایمانیاں چھپ نہیں سکتی تھیں۔

انہیں اس کا حل سوچنا تھا۔

"اب فاروق انکل آئیں تو انہیں صاف انکار کردیں۔ آبدار گزارا نہیں کرپائے گی۔ میں نہیں چاہتی غیر خاندان میں جاکر اپنی حرکتوں سے ہمارا نام بدنام کرے۔ رحمہ نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس پہ غور کریں۔" عائلہ نے مردوں کو بھڑکانے کی کوشش کی مگر ان تینوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی' کیونکہ باسط خود کو جتنا شریف ظاہر کرتا تھا اتنا تھا نہیں۔ عاشر احمد نے بیوی کو ادھر ہی ٹوک دیا۔

"عائلہ! فضول باتیں نہ کرو۔ میں پہلے ہی بہت آپ سیٹ ہوں۔" وہ اپنا سامنہ لے کر بیٹھ گئیں۔ رحمہ بھی بدمزہ تھیں۔ وہ تو بہت دور کی سوچ رہی تھیں کہ کسی طرح عزہ کی بات بن جائے' کیونکہ ان کے ماموں نے خود اپنے منہ سے بار بار بے شرموں کی طرح کہنے کے باوجود ابھی تک کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں دیا تھا۔

"بھابھی! ایک حل ہے میرے پاس۔" صوفیہ کو ان سے ہمدردی سی ہوئی۔

"وہ کیا؟" عائلہ اور رحمہ دونوں نے اسے دیکھا۔

"اب کی بار جب فاروق انکل آئیں تو ان سے کہا جائے کہ آبدار نکاح کے لیے راضی نہیں ہے' بے شک باسط کے ساتھ آبدار کے پکڑے جانے کا بھی بتا دیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے' کنزہ یا کوئی اور بتادے گا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے' کنزہ تو رخصتی کے لیے مری جارہی ہے۔"

"کنزہ سے ملاقات ہی نہیں ہونی چاہیے فاروق انکل کی۔ ان کی آمد پہ کنزہ کو کہیں بھجوادیا جائے۔ پھر فاروق انکل اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں کہ سب کچھ جان سن کر بھی آبدار کو بیاہ کرلے جائیں۔"

صوفیہ نے تو جیسے ہر سوال کا جواب سوچا ہوا تھا۔ رحمہ کچھ کچھ متفق تھیں پر عائلہ نہیں تھیں' کیونکہ آبدار کے ساتھ کوئی باسط کا نام لے انہیں گوارا نہیں تھا۔ آبدار کے ساتھ باسط کی بھی تو بدنامی تھی۔

"اتنا لمبا کھڑاک پالنے کی کیا ضرورت ہے' صاف صاف کہہ دیں گے کہ آبدار راضی نہیں ہے۔ بہت سے بہانے بنائے جاسکتے ہیں۔ اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔"

"ہاں بھابھی! کہتی تو آپ ٹھیک ہیں' کیونکہ آبدار کی شادی کی صورت میں سب سے زیادہ نقصان شاید آپ کو ہی ہو۔" صوفیہ نے کھل کر چوٹ کی۔ عائلہ تلملا ہی تو گئیں۔

☆ ☆ ☆

آبدار کے امتحانات بخیر و خوبی ختم ہوگئے تھے۔ رمضان کا آغاز ہوچکا تھا۔ فاروق چوہدری پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے کہ اس بار بات فائنل کرکے ہی جائیں گے۔ عاشر احمد نے تو انہیں حیران کردیا تھا۔

"آبدار اب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہے۔"

مگر میں سعید الدین کو اپنی مشکلات سے آگاہ کرچکا تھا۔ وہ میری مجبوریوں سے واقف تھا۔ آبدار کو اگر تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہے تو باور سمیت کوئی بھی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔" انہوں نے معقول بات کی تھی۔

"میں اس سے بات کرچکا ہوں' بلکہ کنزہ سے بھی میں نے بات کرکے صلاح دی تھی کہ اب اس کی رخصتی ہوجانی چاہیے۔ پر آبدار خود بھی راضی نہیں ہے۔"

"کمال ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے' میں کنزہ بیٹی سے بات کرتا ہوں خود۔"

"انکل! کنزہ گھر پہ نہیں ہے۔ آبدار کے ساتھ اپنے بھائی کے گھر گئی ہوئی ہے۔" اتنے عرصے میں عائلہ نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

"عاشر ٹھیک کہہ رہے ہیں' آبدار کا دل خود ہی بدل گیا ہے۔" عائلہ نے ان کی طرف جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ اتنے میں صوفیہ' رحمہ اور یاسر بھی چلے آئے' جلال گھر پہ نہیں تھا۔

"انکل! آپ نے پہلے عزہ کے لیے بات کی تھی۔ پھر آپ کا ارادہ بدل کیوں گیا؟" صوفیہ نے انجان بنتے

کی کمال اداکاری کی تھی۔ فاروق نے حیران ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھا' پر وہ سوالیہ نگاہوں سے انہیں ہی تک رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے آپ سب کو پتا ہوگا' میں نے عزہ کے لیے ہی کہا تھا' پر سعید میرے پاس معذرت لے کر آیا کہ ان کے علم میں نہیں تھا کہ عزہ کا رشتہ اس کی ماں ماموں کے بیٹے سے تقریباً" طے کرچکی ہیں۔ سعید نے کہا میری دوسری پوتی آبدار بھی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں' اصل میں بڑے ابا آبدار کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے آپ سے یوں کہا' ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔" اپنے جھوٹ پہ صوفیہ نے داد طلب نگاہوں سے بیک وقت یاسر اور رحمہ کی طرف دیکھا۔

"مگر یہ بات تھی' لیکن سعید الدین کو اس غلط بیانی کی کیا ضرورت تھی؟" یہاں تو ایک نئی داستان شروع ہورہی تھی۔ جو ان کے وہم و گمان سے بھی پرے تھی۔

"بس انکل! آبدار کے سامنے انہیں باقی پوتیاں نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ تو جلد از جلد اس بوجھ کو اتارنے کی فکر میں تھے۔ اور انہوں نے آپ کے سر منڈھ دیا۔"

صوفیہ تو کہہ کر چلتی بنیں۔ مگر وہ سوچتے سوچتے نڈھال ہورہے تھے کہ ان باتوں کا کیا مطلب ہے۔ وہ شام کو کافی لیٹ آئے تھے۔ اس لیے سب نے ہی رکنے پہ اصرار کیا۔ ویسے بھی افطاری میں کم وقت باقی تھا۔ انہوں نے خود کو میزبانوں کی مرضی پہ چھوڑ دیا۔

☆ ☆ ☆

یاور نوٹ کررہا تھا کہ فاروق چوہدری جب سے واپس آئے ہیں' کافی اپ سیٹ سے ہیں۔ خود سے پوچھنا اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ وہ انتظار میں تھا کہ شاید وہ خود ہی بتادیں۔ وہ اسی کشمکش میں تھا کہ فاروق خود ہی اس کے پاس چلے آئے۔ وہ ساتھ والے گاؤں سے ابھی ہی واپس آیا تھا۔ نوکر نے پیغام دیا کہ چوہدری صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ یاور نے چینج بھی نہیں کیا اور ادھر چلا آیا۔ وہ بہت تناؤ کا شکار نظر آرہے تھے۔

"بابا جان' کیا بات ہے آپ نے بلوایا ہے مجھے۔ خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت ہی تو نہیں ہے' تمہارے سسرال سے فون آیا ہے کہ تمہاری منکوحہ طلاق کا مطالبہ کررہی ہے۔"

"تو بابا جان میں ان کا مطالبہ پورا کردیتا ہوں' پریشانی کی کیا بات ہے۔" ان کی نسبت وہ بہت مطمئن اور پرسکون تھا۔ فاروق نے بے بسی سے اس کی سمت دیکھا۔

"میں پہلے دو بار گیا تو مجھے کہا گیا ابھی سعید الدین کو مرے اتنا عرصہ نہیں ہوا کہ وہ شادی جیسی خوشی منا سکیں۔ دوسری بار گیا تو امتحانات کا عذر کرکے ٹال دیا گیا۔ ابھی تین دن پہلے گیا تو مجھے کہا گیا کہ آبدار یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہے اور ابھی صبح عاشر کی بیوی کا فون آیا کہ آبدار طلاق کا مطالبہ کررہی ہے۔ تم بتاؤ میں کیا کروں۔ ہمارے پورے خاندان اور دوست احباب کو خبر ہے کہ میں نے تمہارا نکاح دوست کی پوتی سے کردیا ہے اور بہت جلد رخصتی متوقع ہے۔" ان کی پریشانی حد سے سوا تھی۔

"بابا جان! میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ میں ابھی شادی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ مجھے سکون سے امتحان کی تیاری کرنے دیں مگر آپ نے تو کن میرے سر پہ رکھ دی۔ آپ کی ضد میں نے پوری کردی۔ اب آپ ہی بھگتیں۔ میرا تو یہاں کوئی قصور نہیں ہے نا!"

یاور بہت تلخ ہورہا تھا۔ اسے حیرت بھی تھی کہ وہ ڈری سہمی سی لڑکی جسے اس نے ٹھیک طرح دیکھا بھی نہیں تھا۔ طلاق کا مطالبہ بھی کرسکتی ہے۔ اس سے بہتر تو یہی تھا کہ وہ گل پری کی بات مان کر شہر منتقل ہوجاتا اور اس کے ساتھ من پسند زندگی گزارتا۔ کم سے کم اس ذلت اور بے عزتی سے تو محفوظ رہتا' جس کا مژدہ بابا جان نے اسے ابھی ابھی سنایا تھا۔

"بابا جان! میرے لیے کیا حکم ہے؟" وہ تمسخرانہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ فاروق اسے ٹوک بھی نہ سکے۔

"میرے ساتھ شہر چلنے کی تیاری کرو۔"

"سوری بابا جان! میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتا مجھے معافی رکھیں۔ یہ آپ کا دردِ سر ہے۔ مجھے صرف سائن ہی کرنے ہوں گے۔ پیپرز دے دیجیے گا۔ میں مطلوبہ جگہ دستخط کردوں گا۔" وہ طنز کے تیر اچھالتا باہر چلا گیا۔ فاروق بے بسی سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

☆ ☆ ☆

کنزہ' آبدار کی رخصتی کی وجہ سے پریشان تھیں۔

صبح نو بجے کے قریب کنزہ نے فاروق چودھری کو کال کی۔ دعا سلام کے بعد انہوں نے اصل بات کی۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموشی سے ہوگئے۔

"کنزہ! میں نے تمہیں اور آبدار کو اپنی اولاد کی طرح تصور کیا مگر میرے ساتھ یہ ہوگا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں خود یاور کے ساتھ آرہا ہوں۔ جو بات بھی ہوگی۔ روبرو ہوگی۔ میں نہیں چاہتا کہ یاور کی زندگی خراب ہو۔ آبدار پہ زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ماں کی حیثیت سے میں تمہارے جذبات اچھی طرح جان سکتا ہوں۔ زبردستی کے رشتے پائیدار نہیں ہوتے۔ پھر بھی تمہارے پاس وقت ہے سوچ لو۔" وہ کیسی باتیں کررہے تھے۔ کنزہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"انکل! کھل کر بتائیے آپ غصے میں لگ رہے ہیں مجھے۔"

"اور کھل کر کیا بولوں۔ اگر راضی نہیں تھی آبدار تو کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی؟" بیلو ہیلو کرتی رہ گئیں فاروق رابطہ منقطع کرچکے تھے۔ کتنی دیر ریسیور تھامے وہ ٹوں ٹوں کی آواز سنتی رہیں۔

☆ ☆ ☆

یاور کا چہرا غصے سے تنا ہوا تھا۔ وریشہ اور عزہ دونوں پاس پاس بیٹھی اسی کے بارے میں باتیں کررہی تھیں۔

"ایک دم اینگری ینگ مین لگ رہا ہے۔" عزہ نے وریشہ سے سرگوشی کی۔ ان کے تعلقات اب بحال ہوچکے تھے۔ کیونکہ ممانے عزہ کو بتایا تھا کہ تمہاری صوفیہ چچی نے تمہاری خاطر کتنا "بڑا کام" کیا ہے۔ سو اس کا ممنون ہونا لازمی تھا۔

"یہ اینگری ینگ مین تمہارا بھی ہوسکتا ہے اگر چچی جھوٹ سے کام نہ لیتیں۔" وریشہ کو پرانے حساب چکانے کی ضرورت تھی اور چپ رہنا عزہ کی مجبوری سو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

یاور اور فاروق ابھی ابھی پہنچے تھے۔ یاسر' عاشر اور جلال میں سے کوئی بھی گھر پہ نہیں تھا۔ رحمہ انہیں اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئی تھیں۔ یاور نے بیٹھتے ہی پوچھا کہ "جلال انکل کب تک آئیں گے" وہ ہر گز انتظار کرنے کے موڈ میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بار بار کلائی میں بندھی رسٹ واچ دیکھ رہا تھا۔ رحمہ' صوفیہ کو بلالائی تھیں۔ ایک سے دو بھلے تھے۔ صوفیہ کے ساتھ وریشہ بھی چلی آئی۔

یاور دونوں لڑکیوں کی نگاہوں سے الجھن سی محسوس کررہا تھا۔ فاروق' کنزہ کی طرف جانا چاہ رہے تھے پر رحمہ نے بٹھالیا تھا اور اسی وقت کھانے کے انتظام میں لگ گئی تھیں۔ صوفیہ کے پاس موقعہ اچھا تھا۔ فاروق' آبدار کے تایا' چچا اور کنزہ کی موجودگی میں بات کرنا چاہ رہے تھے پر صوفیہ نے جان کر یہ موضوع چھیڑ دیا تھا۔ فاروق سنتے جارہے تھے۔ اب تو یاور بھی متوجہ تھا۔

"عاشر بھائی کیا کرتے۔ کتنی بار کنزہ سے کہا کہ اب عزت سے رخصتی کردو۔ پردہ بے چاری بھی کیا کرے جب اولاد ہی قابو میں نہ ہو تو۔ شروع سے ہی منہ زور ہے۔ ماں کو کچھ سمجھتی ہی نہیں ہے۔ شروع سے اپنی مرضی کرتی آئی ہے۔ اب یہاں بھی اڑ گئی ہے کہ شادی نہیں کرنی۔"

یاور کے چہرے پہ غصے کی سرخی پھیلتی جارہی تھی۔ وہ جلد سے جلد یہ قصہ ختم کرنا چاہتا تھا۔

"بابا جان! میں فیصل کی طرف جارہا ہوں۔ جب میری ضرورت پڑی کال کرلیجیے گا۔" وہ انہیں باتوں میں مصروف ہکا بکا چھوڑ کر ڈرائنگ روم سے باہر آگیا۔ رحمہ آنٹی کے سرونٹ کوارٹرز میں آرام کرتے ڈرائیور سے گاڑی کی چابی لی اور اسٹارٹ کرکے گیٹ تک لایا۔ چوکیدار گیٹ کھولنے لگا۔ آبدار اپنی ایک دوست کے گھر سے واپس آرہی تھی۔ وہ گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھتے اس چہرے کو وہ باآسانی شناخت کرسکتی تھی۔ یاور نے اپنی دھن میں اس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا ورنہ نظر پڑ ہی جانی تھی۔ وہ حیران سی ہوتی اپنے پورشن میں آئی۔

کنزہ معمول کے کاموں میں لگی ہوئی تھیں۔

"مما! فاروق بابا تو نہیں آئے؟" اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو میں نے تو نہیں دیکھا نہ مجھے پتا ہے۔"

"مما میں نے ابھی ان کی گاڑی گیٹ سے نکلتے دیکھی ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو وہ یہاں تک آئے اور پھر چلے گئے' مجھے کسی نے بتایا تک نہیں۔"

"مما فاروق بابا نہیں بلکہ وہ یاور تھے۔ گاڑی گیٹ سے نکال رہے تھے میں خود دیکھ کر آرہی ہوں۔" اس نے کچھ توقف کے بعد بتایا۔ کنزہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ "میں جاکر پوچھتی ہوں۔" وہ جوتے پہن کر بڑی جلدی میں نکلیں۔

فاروق چودھری ڈرائنگ روم میں تھے۔ ادھر یاور نکلا ادھر عاشر اور یاسر بھی آگئے' صوفیہ نے فون کرکے فیکٹری سے بلوایا تھا۔

"السلام علیکم فاروق انکل! آپ کب آئے ہیں؟" کنزہ کو تو جیسے اندھیرے میں روشنی کی کرن نظر آئی تھی۔

"میں کافی دیر سے آیا ہوا ہوں۔ آبدار کے تایا اور چچا کا انتظار کررہا تھا۔ اچھا ہوا تم بھی ادھر ہی آگئیں۔" فاروق چودھری کا لہجہ ٹھنڈا ٹھار تھا۔ اس میں کسی بھی گرم جوشی اور اپنائیت کی رمق نہیں تھی۔ صوفیہ کنزہ کو یہاں دیکھ کر سرپیٹ لینے کو جی چاہا۔ کم بخت سارا کھیل بگاڑنے چلی آئی تھیں۔

"خیریت تو ہے؟"

"اب کون سی خیریت ہے طلاق کا مطالبہ تو تمہاری طرف سے آگیا ہے۔"

کنزہ کے سر پہ منوں پہاڑ آگرا تھا۔ عاشر اور یاسر بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"انکل! آپ کیا کہہ رہے ہیں طلاق کا مطالبہ میں بھلا ایسے کیوں کروں گی؟" حیران ہونے کی باری اب فاروق کی تھی۔ ان دونوں کے سوا باقی سب نفوس ایک دوسرے سے نگاہیں چرا رہے تھے۔ یاور بھی آگیا تھا۔ فیصل اس کے ساتھ تھا۔ وہ وکیل تھا۔ یہاں آنے سے پہلے ہی یاور نے اسے طلاق کے کاغذات تیار کرنے کو کہہ دیا تھا۔ وہ اپنی تیاری مکمل کرچکا تھا۔ یاور اسے ساتھ لے کر واپس آیا تھا کہ اس کی موجودگی میں طلاق کی کارروائی مکمل ہو۔ وہ محترمہ کی خوشی پوری کرکے یہاں سے جانا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

گھر میں کام کرنے والی زبیدہ نے آبدار کو یہ خبر ابھی ابھی سنائی تھی کہ ادھر ڈرائنگ روم میں آپ کی طلاق کی باتیں ہورہی ہیں اور بیگم صاحبہ رو رہی ہیں اور کھانا سرو کرنے کے دوران یہی باتیں ہورہی تھیں اور وکیل بھی آگیا تھا۔ برتن اٹھانے تک یہی موضوع زیرِ بحث تھا۔ کنزہ رو رہی تھیں۔ اس کی بے بسی پہ زبیدہ کا دل بھی بھر آیا تھا۔

ڈرائنگ روم کا آنکھوں دیکھا حال اس نے آبدار کو بتادیا تھا۔

☆ ☆ ☆

آبدار بڑے مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی آئی تھی۔ سب کی نگاہیں بیک وقت اس کی طرف اٹھی تھیں۔ یاور سائن کرنے کو تیار بیٹھا تھا۔ پین اس کے ہاتھ میں تھا اور پین کی کیپ وہ کھول چکا تھا۔ کنزہ سے کچھ بولا ہی نہیں جارہا تھا۔ وہ بس روئے جارہی تھیں۔ آبدار کے بارے میں کیا کیا کچھ کہا جارہا تھا۔

اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
آبدار سیدھی یاور کی طرف آئی۔
یاور کے سامنے ٹیبل پہ پیپرز پڑے تھے جس پہ اس نے صرف سائن کرنے تھے۔ اس نے جیتے جیسی پھرتی سے یاور کے سامنے پڑے موت کے پروانے کو اپنے قبضے میں لیا اور اس کے چار ٹکڑے کرکے پھینکا۔
"بابا جان! مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ میں ابھی اسی وقت آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔ آپ مجھے لے جاسکتے ہیں۔ جیتے جی مجھے اور میری مما کو مت مارییے۔"
جتنی تیزی سے وہ آئی تھی اس سے بھی زیادہ تیزی سے بات مکمل کرکے ہٹی تھی۔
فاروق چودھری کے سینے سے پُرسکون سانس خارج ہوئی۔
"کنزہ بیٹی! تم رخصتی کے لیے تیار ہو؟" اس نے صرف سرہلانے پہ اکتفا کیا۔
"عام حالات میں ہمیں آبدار کو دھوم دھام سے رخصت کرا کے لے جانا تھا، اب وقت نہیں ہے تم نے جو بھی تیاری کرنی ہے کرو۔ میں جب تک گاؤں فون کرکے بتادوں فضل کو۔" انہوں نے اپنے دست راست کا نام لیا۔
"آبدار کا باپ نہیں ہے تو کیا ہوا۔ ہم سب تو ہیں نا! اسے ایسے رخصت نہیں کریں گے۔" عاشر کو شرمندگی کی وجہ سے بڑی دیر بعد بولنے کا خیال آیا تھا۔
"چلیں ٹھیک ہے لیکن زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں آپ کو صرف ایک ہفتہ دوں گا۔"
"ٹھیک ہے انکل! جو آپ کا حکم۔" یاسر سعادت مندی سے بولا۔
ادھر ساہ ہی الٹ گئی تھی۔ فاروق چودھری اور یاور کے سامنے مارے شرمندگی کے وہ سر ہی نہیں اٹھا پا رہے تھے۔ آبدار نے کھیل ہی بگاڑ دیا تھا۔ فاروق نے کوئی وضاحت نہیں مانگی نہ ہی کریدنے کو شش کی۔ کھیل کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آرہا تھا۔
آج کا میدان آبدار کے ہاتھ میں رہا تھا۔ وہ خود بھی اپنی جرأت پہ حیران تھی کہ کتنا حوصلہ یکدم اس کے اندر سرایت کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

فاروق نے کھل کر منع کر دیا تھا کسی بھی قسم کے جہیز کے لیے۔ انہوں نے کنزہ کو سختی سے کہا تھا کہ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمیں کچھ بھی نہیں چاہیے۔ پھر بھی ان کے پاس جو بنک بیلنس تھا انہوں نے "تھوڑا" آدھے سے زیادہ آبدار کے نام ٹرانسفر کرادیا تھا۔ سونے کا ایک ہلکا سا سیٹ بنا ہوا تھا ایک انہوں نے اپنی شادی کا نکال کر از سرنو پالش کروا کر آبدار کو دینے کے لیے رکھ دیا اور ساتھ سونے کے دو کنگن بنوائے۔ ان کے پاس یہی سرمایہ تھا۔ اب وہ کسی سے کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ آبدار کے بولنے اور شکوہ کرنے کا نتیجہ وہ دیکھ چکی تھیں۔
مہمانوں کی لسٹ بنانے کا مرحلہ آیا تو عاشر احمد نے صاف صاف کہہ دیا کہ باہر سے کسی مہمان کو نہیں بلایا جائے گا، صرف خاندان کے قریبی لوگ شامل ہوں گے۔ یہ مشورہ عائلہ نے ہی دیا تھا کہ زیادہ لوگوں کو بلوانے کی ضرورت نہیں ہے۔
کنزہ کو دہلیز کی اس کے پاس ایک اور چال تھی۔ آبدار کی بدنامی کے قصے چھیڑ کر وہ مطلوبہ نتائج حاصل کرسکتی تھیں۔ پھر کنزہ تو دہلیز بھی برسوں کی دبی دبائی عورت تھی اس پہ زیادہ محنت کی ضرورت ہی نہیں پڑنی۔
رخصتی سے ایک رات پہلے آبدار کی مہندی تھی۔ اس میں کنزہ کی طرف سے صرف اس کے بھائی اور بھابھی ہی شریک ہوئے تھے۔ مارے بندھے آبدار کی تائی اور دونوں چچیاں بھی آگئی تھیں۔ منہ پھر بھی سب کے پھولے ہوئے تھے۔ نہ ڈھولک بجی نہ دھوم دھام سے مہندی آئی نہ کوئی رسمیں ہوئیں اور آبدار کی مہندی بھی ہوگئی۔ وہ گھر کے سادہ سے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ عائلہ، رحمہ اور صوفیہ تینوں ٹولی بنا کر الگ بیٹھی تھیں۔ آج کل تینوں میں بہت ایکا تھا۔

"ہماری بھی بیٹیاں ہیں، پر ایسی بے شرم پیدا ہوتی دیکھی نہ سنی، کس بے حیائی سے منہ پھاڑ کر سب کے سامنے کہہ دیا کہ آپ مجھے جب چاہیں لے جاسکتے ہیں۔ جب ماں کو بیٹی کے یہ کرتوت پتا تھے کہ جوانی سنبھالی نہیں جارہی ہے تو پہلے ہی رخصت کردیتی۔" صوفیہ کی زبان اور لہجہ جاہل عورت سے بھی گیا گزرا تھا۔
"اچھا ہے وفعان ہو رہی ہے۔" رحمہ نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولیں۔
"سارے کس بل نکل جائیں گے آبدار بی بی کے۔ لڑکا بھی جاگیرداروں کے خاندان سے ہے۔ بہت غصے والا اور مغرور لگتا ہے۔ اس روز جب سب باتیں کررہے تھے تو اس کے چہرے کا رنگ کیسے کیسے بدل رہا تھا۔"
"عائلہ بھابھی! آپ ٹھیک کہتی ہیں اچھا بھلا طلاق نامہ پہ سائن کرنے لگا تھا جب یہ آفت کی پرکالہ وہاں آگئی۔ منہ سے ہی کہہ دیتا کہ میں نے طلاق دی تب بھی ہمارے پاس گواہی ہوتی پر اب تو۔۔۔"
صوفیہ اچھی خاصی افسردہ تھی۔ "مجھے نہیں لگتا یہ وہاں گزارا کرپائے گی۔ دو، دو بچے وہ بھی پرائے۔ جب سنبھالنے پڑیں گے تو لگ پتا جائے گا۔ دال آٹے کا بھاؤ۔ اوپر سے چودھری یاور۔۔۔ کڑیل مرد ہے پورا۔۔۔ ہاہاہا" رحمہ کے ہر لفظ سے تنفر ٹپک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آبدار باتھ روم میں آئی۔ رگڑ رگڑ کر ہاتھ پاؤں سے مہندی کا لیپ چھڑایا۔ کنزہ اندر زیورات نکال کر بیٹھی تھیں۔ وہ فجر کی نماز پڑھ کے اس تشغل میں مصروف تھی۔ سورج طلوع ہوچکا تھا۔ آبدار منہ ہاتھ دھو کر لان میں آگئی۔ آج اس گھر میں اس کی آخری صبح تھی۔ وہ سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ اسے وہاں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی ہوگی کہ اپنے پیچھے اسے آہٹیں سنائی دیں۔ اس کے مڑ کے دیکھنے سے پہلے ہی وہ سامنے آگئے۔ عمر آئینہ اور شاہ میر تینوں اکھٹے تھے۔ کچھ بولنے سے پہلے شاہ میر نے اس کی طرف ہاتھ سے بنا "آئی ایم سوری" کا کارڈ بڑھایا۔ وہ اب ان کی مشکلات سمجھنے لگی تھی لہٰذا کوئی شکوہ نہیں کیا۔ تینوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔
"آبدار! ہم تمہیں بہت مس کریں گے۔"
"میں بھی بہت یاد کروں گی تمہیں۔" ایک دکھ نے گرفت میں لے لیا تھا۔
"میں نے بہت دفعہ تم سے بات کرنی چاہی پر مما سے ڈر لگتا تھا۔" شاہ میر نے حقیقت بتائی۔
"مجھے پتا ہے۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔
"ہم سب تمہیں بہت یاد کرتے تھے تمہارے بغیر کسی کھیل میں مزا نہیں آتا تھا۔" شاہ میر ان سب کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔
"میں نے تمہارے بغیر کوئی کھیل کھیلا ہی نہیں۔" آبدار نے شاہ میر کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
آج وہ ان سے لڑ جھگڑ نہیں رہی تھی نہ شور مچا رہی تھی۔ بس خاموشی سے انہیں تکے جارہی تھی۔ "آبدار! تم آیا کروگی نا ما کہتی ہیں تم کبھی واپس نہیں آؤ گی۔" آئینہ نے اس کے گھٹنے سے سر اٹھا کر پوچھا۔
"میں ضرور آؤں گی تم سے ملنے کے لیے۔ اپنے فرینڈز سے ملنے کے لیے۔"
"تم نہ آئیں تو میں خود تمہارے پاس آجاؤں گا۔" شاہ میر کی دھمکی پہ اس کے آنسو نکل آئے۔
"میں تم سب کا انتظار کروں گی۔" اس کی آنکھوں میں سے دو آنسو لڑھک کر اس کے گھٹنے پہ لیٹی آئینہ کے سر پہ گرے تھے۔
"میں منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کرکے سیدھا تمہارے پاس آتا ہوں، آخر کو تمہیں رخصت بھی تو کرنا ہے۔" شاہ میر نے رعب جھاڑنے کی کوشش کی۔
"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو بالکل تمہارے جیسا ہوتا۔"
"میں تمہارا بھائی ہی تو ہوں۔" شاہ میر آج بہت بڑا بڑا لگ رہا تھا۔
آبدار کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمک

اٹھے۔ اس بار وہ اکیلی نہیں بلکہ وہ تینوں بھی اس کے ساتھ رو رہے تھے۔ بڑوں کے مقابلے میں ان کے دل ہر قسم کے کھوٹ سے پاک تھے۔ بے ریا اور محبت سے بھرپور دل، ان کی دوستی پتھر سے مضبوط ہو گئی تھی۔

آبدار کو لگ رہا تھا ان کے درمیان کبھی کوئی دوری اور خلیج حائل ہوئی ہی نہیں تھی۔ پر اب بچھڑنے کی گھڑی سر پہ کھڑی تھی۔ ان تینوں دوستوں کی معصوم دعائیں آبدار کے ہمراہ تھی۔ اس نے کسی خزانے کی طرح ان چاہتوں کو دل کے نہال خانوں میں محفوظ کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فاروق چوہدری اسے اپنے ساتھ لے کر پہلے حاجرہ خانم کے پاس لائے۔ اپنا کمزور سا ہاتھ اس کے سر پہ رکھ کر انہوں نے بہت سی دعائیں دیں۔ کمزور وجود اور مشفق چہرے والی حاجرہ خانم آبدار کو اچھی لگی تھیں۔ وہ خود سے اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتی تھیں۔ لیٹے لیٹے اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ یاور کی معصوم سی دلہن حاجرہ خانم کو بہو کے روپ میں بہت پسند آئی تھی۔

تابش اور حرا مسلسل اس کے ساتھ تھے۔ حرا اس کی گود میں چڑھنے کی کوشش میں تھی اور تابش اس کا دوپٹہ ٹھیک کرنے کی فکر میں تھا۔ حاجرہ خانم کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ انہیں یہ منظر بڑا بھرپور لگا تھا۔ اپنائیت میں رچی بسی اپنی سی خوشبو تھی اس میں۔

اس کے جانے کے بعد حاجرہ خانم فاروق چودھری سے آبدار کے بارے میں پوچھنے لگیں، کیونکہ وہ اسے بتا چکے تھے کہ سعید الدین آبدار کے معاملے میں کسی پہ اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

یاور صوفے پہ ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ فاروق جو لیٹ چکے تھے اٹھ کے بیٹھ گئے تھے۔ یاور اس وقت بے وجہ ان کے پاس نہیں آیا تھا۔

"بابا جان! آپ نے آبدار کے گھر میں سب کی باتیں سنیں اور پھر کنزہ آنٹی کی پراسرار خاموشی بھی گواہ تھی کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، ورنہ وہ جھٹلاتیں ان باتوں کو۔"

"بیٹا! اس نے احتجاج کیا تھا، تمہیں یاد ہو تو..."

"بابا جان اس کمزور سے احتجاج کی کیا حیثیت تھی؟ وہاں سب ایک ہی راگ الاپ رہے تھے۔"

"یاور، سعید الدین کو پہلے ہی خوف تھا، کیونکہ آبدار کا باپ نہیں ہے۔ میں رخصتی کے لیے بات کرنے جب بھی گیا ٹال مٹول سے کام لیا گیا۔ آخر میں وہاں سے کہا گیا کہ آبدار طلاق مانگ رہی ہے۔ تم خود دیکھ لو۔ وہاں کیا کچھ ہوا، شکر ہے کہ میں اپنے دوست کی روح کے آگے شرمندہ ہونے سے بچ گیا ہوں۔"

"بابا جان! آپ اپنے تمام بوجھ میرے سر پہ ڈال رہے ہیں۔" اس نے شکایتی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بے نیاز بن گئے تھے۔ اسے تاؤ آگیا۔

"بابا جان! آپ کو اپنے دوست کی روح کا اتنا خیال ہے، میں آپ کا بیٹا ہوں، میرا بھی کوئی خیال ہے آپ کو۔"

"کیوں نہیں خیال، غالب کے بعد تم ہی تو میری امیدوں کا مرکز ہو۔ میرے جینے کی امید ہو، غالب کے منفی خیالات کو ذہن سے جھٹک کر نئے سفر کا آغاز کرو۔"

"ہونہہ نیا سفر۔" اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔ فاروق چوہدری ان باتوں کو اہمیت نہیں دے رہے تھے، کیونکہ وہ اس سارے معاملے کو الگ ہی تناظر میں دیکھ رہے تھے۔

"میری منکوحہ کے بارے میں وہ جو جو باتیں کہہ رہے تھے، میرا خون ابھی تک کھول رہا ہے۔"

"پلیز یاور، کول ڈاؤن! محسوس تو میں بھی کر رہا ہوں کہ کچھ غلط ہوا ہے، لیکن آبدار کی طرف سے نہیں۔" ان کا لفظ لفظ یقین میں ڈوبا ہوا تھا۔

یاور کو سخت غصہ آرہا تھا۔

وہ کافی دیر بائیں باغ میں بیٹھا اندر ونی جلن پہ قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ سگریٹ وہ نہیں پیتا تھا، کبھی کبھار شغل کر لیتا تھا۔ آج تو وہ ساری کھولن سگریٹ کے دھوئیں میں کم کر لینا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

حرا، آبدار کے گھٹنے پہ سر رکھے آنکھیں بار بار بند کر رہی تھی، جبکہ تابش بھی جمائیاں لے رہا تھا۔ یاور نے دروازے سے ہی یہ منظر دیکھا۔ وہ اپنا سلیپنگ سوٹ لینے آیا تھا۔

"اٹھو حرا اور تابش میں آپ لوگوں کو اپنے روم تک چھوڑ آؤں۔" اس کے لہجے میں سختی تھی۔ آبدار سٹ سی گئی۔

"میں دلہن آنٹی کے پاس سوؤں گا۔" تابش جو نیند سے لڑ رہا تھا، اس کی آمد پہ فریش ہو گیا۔

"میں بھی۔" حرا کیوں پیچھے رہتی۔ جھٹ چمک کر بولی۔ ان کی موجودگی میں وہ آبدار کو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے تم دونوں سوؤ۔ میں ساتھ والے روم میں جا رہا ہوں۔" وہ الماری سے اپنا نائٹ سوٹ نکالنے لگا۔

"چاچو! آپ ہمارے بیڈ روم میں سو جائیں نا۔" حرا نے معصومیت سے مشورہ دیا۔ اتنے میں کھلے دروازے سے حاجرہ خانم کی بہن کی بہو اندر آئیں تو انہیں دیکھ کر حرا اور تابش دونوں آبدار کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کوشش میں آبدار کا بھاری دوپٹہ سر سے نیچے آرہا۔ وہ بڑی مشکل سے دونوں کو لے کر گئیں۔

آبدار سے بھاری دوپٹہ سنبھالا ہی نہیں جا رہا تھا۔ ہر پن چبھ رہی تھی۔ یاور ڈریسنگ ٹیبل کے پاس بیٹھا تو آبدار کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"آپ تو بڑی بہادر ہیں، کوئی گولڈ میڈل ملنا چاہیے آپ کو۔" یاور کے ذہن میں ایک ہفتہ پرانا منظر تازہ تھا، جب وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح آئی، اس کے سامنے پڑے پیپرز کو اٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کیا اور واپس چلی گئی۔

آبدار کے ماتھے پہ پسینے کے قطرے ابھر آئے۔

"کچھ بولتی کیوں نہیں آپ، سنا ہے کہ بڑوں بڑوں کی بولتی آپ کو دیکھ کر بند ہو جاتی ہے۔" آبدار نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ یاور کے چہرے کے تاثرات دوستانہ نہیں تھے۔

"میں کاٹھ کا الو نہیں ہوں۔ اپنی عزت اور غیرت کے معاملے میں، میں کسی بھی قسم کا کمپرومائز نہیں کرتا۔ بابا جان کی محبت اور ان بچوں کی محرومی کے سامنے میں ہار گیا ہوں۔"

آبدار اتنی بچی نہیں تھی کہ اس کی باتوں کا مطلب اخذ نہ کر پاتی۔ مائی جان اپنے رویے کا کچھ نہ کچھ زہر اس کے کانوں میں ضرور انڈیل چکی تھیں۔

اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ یاور نے کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید وہ کچھ بولے۔ مگر وہ لبوں پہ چپ کے تالے ڈال چکی تھی۔

وہ اس کے پاس سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ وہ مطمئن تھا۔ رات بڑی پُرسکون نیند آئی تھی۔

آبدار اس کے رویے کے بارے میں پریشان تو تھی پر اتنا نہیں، کیونکہ اسے پہلے ہی یقین تھا کہ اس کی بدنامی کے قصے اس کی سسرال تک ضرور پہنچیں گے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ مائی جان ان دونوں کو خوش دیکھ سکتیں۔

☆ ☆ ☆

صبح وہ قدرے دیر سے بیدار ہوا اور اٹھتے ساتھ ہی تابش اور حرا کی طرف گیا۔ دونوں جاگ چکے تھے اور آبدار کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ جاگنگ کے لیے چلا گیا۔ واپس آیا تو فاروق چوہدری اس کے انتظار میں تھے اور ٹھیک ٹھاک غصے میں تھے۔ کیونکہ وہ لیٹ آیا تھا۔

"ایک دن جاگنگ کے لیے نہ جاتے تو تمہاری صحت پہ کوئی اثر نہیں پڑتا تھا، نہ تمہارے مسلز سکڑ جانے تھے۔ گھر میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے، ناشتے پہ، نئی دلہن کیا سوچے گی۔"

انہوں نے شاید ہی کبھی زندگی میں پہلے اس پہ اتنا غصہ کیا ہو۔

"میں کسی کی خاطر اپنی روٹین ڈسٹرب نہیں کر سکتا۔" وہ مزے سے کہہ کر واش روم میں گھس

گیا۔

اس کے آنے پہ ناشتا شروع ہوا۔

حرا آبدار کی گود میں چڑھی ہوئی تھی اور تابش اس کے ساتھ والی چیئر پہ بیٹھا دلیہ کھا رہا تھا۔ خاندان کی عورتیں اور یاور کے خالہ زاد بھی موجود تھے۔ قدرتی طور پہ سب کی توجہ آبدار ہی کی طرف تھی۔ وہ نروس سی تھی۔ پر حرا جو اس کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی بہت خوش تھی۔ یاور کے لیے آبدار کے ساتھ والی چیئر خالی رکھی گئی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی خالہ کی بہو بڑے معنی خیز انداز میں کھانسیں۔ پر یاور نے معمول کے مطابق ناشتا کرنا شروع کر دیا۔

اجنبی جگہ' اجنبی ماحول اور اجنبی لوگوں کی موجودگی میں آبدار سے تو کچھ کھایا پیا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے آدھا سلائس کھا کر رکھ دیا۔ حالانکہ بڑا پر تکلف ناشتا تھا۔ یاور نے تو خوب ڈٹ کے کھایا۔

دن کا ولیمہ تھا۔ یونین شہر سے بطور خاص دلہن کو تیار کرنے کے لیے بلوائی گئی تھی۔

یاور کے دوستوں سمیت فاروق چوہدری نے اس موقع پہ تقریباً" سب دوست احباب کو مدعو کیا تھا۔ آبدار کی بارات کے برعکس ولیمہ پہ خوب رونق تھی۔ ایک میلہ سا تھا۔ یاور بڑی خوش دلی سے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

آبدار نے سکون کا سانس لیا' جب مما آ کر اس کے قریب بیٹھیں۔ اس کا خیال تھا کہ میکے سے مما کے سوا شاید ہی کوئی آئے' پر وہاں سے تو سب ہی آئے ہوئے تھے اور تو اور باسط بھائی کی بیگم عمارہ بھی موجود تھی۔ آبدار کے چہرے پہ رونق سی آگئی تھی۔ وریشہ اور عزہ کی نگاہ اس کے ولیمہ کے جوڑے اور پہنے ہوئے زیورات ہی کی طرف تھی۔ اور آج پورے لوازمات سے سجی بنی اس شاہانہ جوڑے میں ملبوس وہ خود بھی بہت شان دار لگ رہی تھی۔ ان کے چہرے اتر سے گئے تھے۔

"ویسے ایک بات کہوں ابوبکر بھائی کی پرسنالٹی یاور چوہدری کے سامنے اتنی خاص نہیں لگے گی۔" عزہ کا ریمارک وریشہ کو بھڑکا گیا' پر یہ موقع اسے دوبدو جواب دینے کا نہیں تھا۔

وہ سب لیٹ پہنچے تھے' اس لیے فاروق چوہدری نے انہیں رکنے کے لیے کہا' سچ تو یہ ہی تھا کہ لڑکیوں کا دل بھی کر رہا تھا رکنے کا' تاکہ آبدار کے سسرال والوں سے تھوڑا اور بھی تعاون ہو جائے۔

مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہو رہے تھے۔ عمارہ' وریشہ' عزہ' عائلہ کی دونوں بڑی بیٹیاں حویلی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آبدار کے بیڈ روم کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں رشک و حسد کے تاثرات با آسانی محسوس کیے جا سکتے تھے۔

"رونمائی میں کیا ملا ہے آبدار تمہیں؟" وریشہ کو زبردست تجسس تھا دیکھنے اور جاننے کا۔

"سب کچھ عزت و محبت' چاہت' مان' احترام' اعتبار۔" اس کا جواب بہت عجیب سا تھا۔ وریشہ نظر چرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

یاور بھی ان کے گھیرے میں تھا۔ کنزہ پر سکون و مطمئن آبدار کو دیکھ کر بہت خوش تھیں۔

لگتا تھا اس نے سب کچھ پا لیا ہے۔ ہنسی بات بے بات اس کے لبوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

وہ دل سے اس کی خوشیوں کے لیے دعا گو تھیں۔

"یاور بیٹا! آبدار تھوڑی ضدی اور قدرے جذباتی بھی ہے۔ بڑے ارمانے اس کی ہر بات پوری کی' بہت لاڈ سے پالا۔ بس کوئی غلطی ہو بھی جائے تو پیار سے سمجھا دینا' یہ سمجھ جائے گی۔" وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھیں۔

"آنٹی! آپ فکر نہ کریں' آپ جیسا چاہیں گی ویسا ہی ہو گا۔"

وہ انہیں بھرپور یقین دلا رہا تھا۔ کنزہ نہال سی ہو گئیں۔ آبدار کے چہرے پہ سجی مسکراہٹ اور یاور کے بھرپور یقین دلانے کے انداز نے ان کی ساری پریشانیوں اور فکروں کو ختم کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

آبدار کی تقریباً" ساری فیملی حویلی میں موجود تھی۔ یاور نے الگ بیڈ روم میں سونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسے بابا جان پہ رحم سا آگیا تھا۔ یقیناً" وہ جگ ہنسائی سے ڈرتے تھے اور اپنی انسلٹ اسے بھی گوارا نہیں تھا۔

آج تابش اور حرا دونوں اس کے پاس نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ اکیلی تکیہ گود میں رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر تکیہ پیچھے رکھ دیا۔ یاور کی بھرپور نگاہیں خود پہ جمے دیکھ کر وہ کسمسا کر رہ گئی۔ وہ دوسرا تکیہ اٹھا کر سائیڈ پہ دراز ہو گیا اور لیٹے لیٹے ہی سگریٹ سلگایا۔

"سنا ہے آپ کو اسلحے وغیرہ سے بڑی رغبت ہے۔" وہ اس کی طرف گھومی۔

"جی!" وہ اس کی طرف گھوما۔

"جی ہاں اس میں حیرانی کی کیا بات ہے کہ اگر آپ کو کسی زمانے میں نشانے بازی کی مشق کا شوق رہا ہے' اس کے علاوہ آپ کے کیا کیا مشاغل ہیں؟" وہ دوستانہ لہجے میں مخاطب تھا۔ جس میں کسی طنز کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"میرے کوئی خاص مشاغل نہیں تھے' بس کالج سے آنے کے بعد تھوڑا کھیل کود لیتی تھی۔" اس نے بھی سادگی سے بتا دیا۔

"وہ کھیلنا بھی آپ کے مشاغل میں تھا۔" اس نے لفظ کھیلنا پہ خاصا زور دے کر کہا۔

"جی ہاں میں' شاہ میر' آئمہ اور عمر اکٹھے کھیلتے تھے۔ عزہ اور وریشہ سے میری کبھی نہیں بنی' میرا ان تینوں کے ساتھ گروپ بنا ہوا تھا۔ گھر میں عزہ وریشہ کے سوا اور کوئی بھی میرا ہم عمر نہیں تھا۔ لیکن ان کے ساتھ میری دوستی نہیں تھی۔"

"اوہ اچھا اچھا۔"

"اور پڑھائی میں آپ کیسی تھیں؟"

آبدار ذرا دیر کے لیے خاموش سی ہو گئی۔ یہ اس کا کمزور پہلو تھا۔ یاور نے بولتے بولتے کروٹ لی تو بے دھیانی میں جلتی سگریٹ کا سرا آبدار کے بازو پہ جا لگا۔ ہلکی سی سسکاری اس کے لبوں سے برآمد ہوئی۔ اچھا خاصا نشان پڑ گیا۔

"وہ میں نے دیکھا ہی نہیں۔ ذرا دکھائیں تو..." دیکھتے دیکھتے سگریٹ دوبارہ آبدار کے بازو سے مس ہوا۔ اس بار یاور نے بڑی بے دردی سے سگریٹ اس کے بازو سے رگڑا تھا۔ پہلی بار غلطی سے ایسا ہوا تھا' مگر دوسری بار غلطی نہیں تھی۔ اس کا بازو دو جگہ سے جل سا گیا تھا۔ وہاں آبلہ بن گیا تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو رہی تھیں۔

"آپ تو اتنی بہادر ہیں۔ ذرا سی تکلیف پہ اتنی بزدلی۔" وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ آبدار نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کر ڈالے۔

"میں اتنی بھی کمزور اور بزدل نہیں ہوں جتنی آپ نے تصور کیا ہے۔"

"پھر آپ کتنی کمزور ہیں خود ہی بتا دیں۔" آبدار صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"وہاں کیوں چلی گئی ہیں آپ۔"

"اس گھر میں' میں اپنی مرضی سے آئی ہوں' لائی نہیں گئی ہوں۔"

"ویری گڈ! آپ تو بہت زیادہ حقیقت پسند ہیں آبدار صاحبہ!"

"حالات کی تلخی اچھے اچھوں کو حقیقت پسند بنا دیتی ہے۔" اسے اب بازو میں ہونے والی تکلیف بالکل بے معنی لگ رہی تھی۔ جبکہ چند منٹ پہلے تک اسے رونا آ رہا تھا۔

یاور نے اس کی آنکھوں کی سرکشی کو واضح طور پہ محسوس کیا تھا۔ کسی کے آگے نہ جھکنے اور ہار نہ ماننے کا تہیہ کرنے والی چمک دار بے ریا آنکھیں۔

"آپ میں تو بہت ساری خوبیاں ہیں۔ خیر آہستہ آہستہ ہم بھی واقف ہو جائیں گے۔"

وہ کپڑے بدل کر آ چکا تھا۔ سفید نائٹ شرٹ۔ جس کے بٹن لگانے کی اس نے ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

براؤن ماتھے پہ آئے بال جنہیں وہ بار بار ہاتھوں سے پیچھے کررہا تھا۔ آبدار کو حیا سی آگئی۔ اس نے بڑی جلدی نگاہ موڑی تھی۔ لیکن وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔

"آپ وہاں اتنی دور چلی گئی ہیں۔ بیڈ پہ خاصی جگہ ہے' دو بندے آرام سے سوسکتے ہیں۔" وہ اس کے پاس چلا آیا۔ آبدار صوفے پہ پہلے ہی سمٹ کر بیٹھی تھی۔ مزید جگہ نہیں تھی۔ وہ سر پہ کھڑا تھا۔

"نن نن۔۔۔ نہیں۔ میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔"

"آپ ادھر ہی تو ٹھیک نہیں ہیں۔" کھڑے کھڑے جھک کر اس نے آبدار کے ماتھے پہ آئے بالوں کی ایک لٹ انگلی سے چھیڑی۔ وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح بدک گئی۔ وہ بڑی دلکشی سے مسکراتا اس کے پاس گیا' اور صوفے کی بیک پہ بازو پھیلا دیا۔ اپنے پسندیدہ کلون اور باڈی اسپرے کا اس نے فراخ دلی سے استعمال کیا تھا۔ نیم مدہوش کرتی خوشبو نے آبدار کے گرد بڑی تیزی سے اپنا حصار مضبوط کیا تھا۔

"اوہ آپ تو ڈرتی بھی ہیں۔" یاور نے دائیں ہاتھ کی انگلی اس کے رخسار پہ پھیری۔ آبدار نے ڈر کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے گلابی نیم وا لب دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔ یاور کی انگلی اس کے ہونٹوں پہ آٹھہری۔

"واقعی لگ رہا ہے کہ میں ہی۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ آبدار کی تو سانس ہی سینے میں اٹک گئی۔ یہ آنکھیں بہت شفاف اور بے ریا ہیں۔ یاور کا بولتا لمس اس کی آنکھوں پہ جا ٹھہرا تھا۔ انگلی کے نیچے سے اس کی پلکوں کا لرزنا وہ واضح طور پہ محسوس کرچکا تھا۔ یاور نے اب اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھنا شروع کردیا۔

"یہ ہاتھ میں نے ہی پکڑا ہے نا؟"

وہ جانے کیا تصدیق چاہ رہا تھا۔ اس کا نازک مخروطی لابنی انگلیوں والا ہاتھ یاور کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ حالانکہ موسم اتنا گرم بھی نہیں تھا اور کمرے میں اے سی بھی چل رہا تھا۔ وہ پے در پے اس کا امتحان لے رہا تھا۔ آبدار کا ہاتھ اس نے اپنے سینے پہ رکھ لیا تھا۔ وہ اس کے دل کی دھک دھک انگلیوں کی پوروں تلے محسوس کرسکتی تھی۔

"آبدار!" اس کا نام سرگوشی کی طرح یاور کے لبوں پہ سرسرایا۔ آبدار نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالا تو سارا طلسم ایک ثانیہ میں ٹوٹ گیا۔ وہ بھی جیسے چونک کر ہوش کی دنیا میں واپس آیا۔

آبدار اٹھ کر واش روم میں آئی تو آئینے میں اپنی آنکھیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سوجی سوجی لال آنکھیں۔

"کمال ہے میں روتی رہی ہوں اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔" ایک بار پھر اس کے گالوں پہ آنسو لڑھک آئے۔ اسے یوں لگا جیسے یاور کی انگلیاں ابھی تک اس کے رخساروں پہ دھری ہیں۔

آگہی کا در صرف چند منٹ پہلے ہی اس پہ وا ہوا تھا کہ مرد ایسا بھی ہوسکتا ہے جو دل سمیت پورا وجود مٹھی میں لے لے اور پھر بے بسی کا تماشا دیکھے۔

☆ ☆ ☆

آبدار بڑی سنجیدگی سے اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہونے کے چکر میں تھی۔ مگر دعوتیں پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔

آج بھی فاروق چوہدری کے ایک دوست کے ہاں وہ ساتھ والے گاؤں میں انوائیٹ تھے۔ یاور تیار ہورہا تھا۔ اس کے کپڑے بیڈ پہ ہینگر میں پڑے ہوئے تھے۔ آبدار اس سے پہلے ہی اپنی تیاری مکمل کرکے باہر نکل گئی تھی۔

یاور کلون کی بوتل ہاتھ میں پکڑے خود پہ اسپرے کررہا تھا' جب اس کا سیل فون مدھر دھنیں فضا میں بکھیرتے ہوئے اسے متوجہ کرنے لگا۔ گل پری کی کال تھی۔ یاور نے سیل ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسے حیرت سی ہورہی تھی۔ وہ دو' ڈھائی ماہ بعد رابطہ کررہی تھی۔ آخری بار جب دونوں میں بات ہوئی تھی تو لگتا تھا کہ سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ کیونکہ نہ گل پری اس کی ماننے کے لیے تیار تھی اور نہ وہ اس کی شرائط پہ راضی

تھا۔ سو دل کی خواہشات اس نے دل میں ہی ختم کردی تھی۔ لیکن ابھی ابھی گل پری کی مانوس آواز سن کر اسے اپنے بچکانہ خیالات پہ ہنسی آنے لگ گئی تھی۔ بھلا خواہشات کو مارنا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے' وہ تو دوبارہ سے زندہ ہو کر سر اٹھانے لگتی ہیں۔

"کہاں ہو تم اتنے ماہ سے؟" گل پری کی آواز میں چاہت بھرا غصہ تھا۔

"میں تو ادھر ہی ہوں۔ تم کہاں ہو؟"

وہ رسان سے بولا۔ اپنے اور اس کے مابین تعلق کی مضبوطی اس پہ ابھی ابھی ظاہر ہوئی تھی۔ وہ منظر سے غائب تھی تو یاور کو احساس تک نہ تھا۔ وہ پھر سامنے آگئی تھی تو پرانی باتیں بھی ایک ایک کرکے یاد آنے لگی تھیں۔

"میں بھی بس ادھر ہی ہوں تمہاری دنیا میں۔ یہ بتاؤ بابا جان وغیرہ ٹھیک ہیں۔"

"ہاں سب خیریت ہے۔"

"کیا کررہے ہو؟"

"میں تیار ہورہا ہوں۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"ایک دعوت میں انوائیٹ ہوں۔ بابا جان کے دوست کے گھر۔"

"اوہ اچھا اچھا۔۔۔ اور کون کون جارہا ہے؟"

"میں اور میری وائف۔" اس نے عام سے انداز میں کہا' پر دوسری طرف پری گل پہ حیرت اور صدمات کے پہاڑ بیک وقت ٹوٹے تھے۔

"تت تت۔ تم نے شادی کرلی اور مجھے بتایا تک نہیں۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ پری گل کے آنسو وہ دیکھ نہیں سکتا تھا' لہٰذا فون بند کردیا۔ دوسری طرف پری گل کو ابھی بھی اپنی سماعتوں پہ دھوکہ محسوس ہورہا تھا۔

غم و غصے اور حسد کے ملے جلے جذبات سے اس کی بری حالت تھی۔ وہ تو یاور پہ صرف اور صرف اپنا حق تصور کرتی تھی۔ پھر یہ دوسری کون تھی جسے یاور نے اپنی زندگی میں شامل کرلیا تھا۔

بہت سے مان ریزہ ریزہ ہورہے تھے۔ جن کی کرچیاں دل تک اتر گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

آبدار کو یقین نہیں آرہا تھا کہ امتحان میں اس کے اتنے اچھے مارکس آئے ہیں۔

دس بہترین طلبا کی فہرست میں اس کا نام بھی موجود تھا۔ یہ خوش خبری سب سے پہلے اسے اس کی کلاس فیلو نے سنائی اور پھر کزنز نے فون کرکے رزلٹ کا بتایا۔ دل چاہ رہا تھا خوشی سے ناچ اٹھے۔ اس کے پاس حرا کھیل رہی تھی۔ اس نے حرا کو گود میں بھر کر بہت سا پیار کیا۔

"حرا! میں بہت خوش ہوں' بہت زیادہ۔" وہ اسے پکڑ کر گول گول چکر دینے لگی۔

خوشی کے مارے اسے خود پہ' اپنی حرکات پہ' اپنی آواز پہ کوئی قابو ہی نہیں رہا تھا۔ کمزور سے زور سے چکر کھانے کی وجہ سے حرا تو گھبرا کر رونے لگی۔

یاور اس کے رونے کی آواز سن کر تیزی سے اندر آیا۔ آبدار اسے دونوں بازوؤں سے پکڑے گول گول گھما رہی تھی۔ اسے اب خود بھی چکر آنے لگے تھے۔ ہر چیز نگاہوں کے آگے چکرا رہی تھی۔ یاور آگے ہوا کہ اسے حرا کو لے سکے۔ جو گھبرا کر روئے جارہی تھی۔

"کیا ہورہا ہے یہ؟" وہ کڑک کر بولا۔ آبدار کے ہاتھ سے حرا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ یاور سے ٹکرائی اور زمین بوس ہوگئی۔ حرا اس کے اوپر تھی۔ یاور نے حرا کو اٹھالیا تھا۔

آبدار کے حواس ذرا دیر سے قابو میں آئے۔ کارپٹ پہ پڑا دوپٹہ اٹھا کر اپنے گرد لپیٹا وہ قدرے شرمندہ سی تھی۔

"میں آپ سے اس پاگل پن کی وجہ پوچھ سکتا ہوں' جو آپ سب کچھ بھول گئی ہیں۔"

"میرا رزلٹ آؤٹ ہوگیا ہے۔ میرے مارکس بہت اچھے ہیں۔" وہ کچھ دیر پہلے والی شرمندگی بھی بھول گئی تھی۔ وہ آنکھوں میں چمک لیے اسے بتا رہی

تھی۔

"میں بابا جان کو بھی بتادوں۔" ان ہی قدموں وہ بابا جان کی طرف بھاگ گئی۔

"تمہاری دلہن آنٹی بھی کمال ہیں۔" وہ سر پہ ہاتھ پھیر کر رہ گیا تھا۔

فاروق چوہدری اس کی خوشی میں خوش ہو رہے تھے۔ آبدار نے گھر کے ایک ایک فرد کو یہ خوش خبری سنائی۔ پھر حویلی میں کام کرنے والے ملازمین کی باری آئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک ایک بندے کو پکڑ کر بتائے۔

"مارکس آپ نے بہت اچھے لیے ہیں۔ میں نے تو کچھ اور ہی سنا تھا کہ آپ کو پڑھائی وغیرہ سے دلچسپی نہیں ہے۔ پر آپ کے مارکس تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہے ہیں۔"

"آپ نے ٹھیک ہی سنا تھا۔ مجھے بہت دیر بعد عقل آئی۔ میں نے ٹھوکر کھا کر ہی سمجھا۔" آبدار یک لخت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس کا خوشی سے چمکتا چہرہ بجھ سا گیا تھا۔

اس اچانک تبدیلی کا راز یاور نہیں سمجھا تھا۔

فاروق چوہدری نے اس کی کامیابی کی خوشی میں گھر میں چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں بہت خاص لوگ ہی شریک تھے۔ اور ان خاص لوگوں میں کنزہ بھی شامل تھیں۔ انہیں فاروق چوہدری کا ڈرائیور لے کر آیا تھا۔ آبدار کی خوشی دوبالا ہو گئی تھی۔ وہ ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی، پر کنزہ نے نرمی سے منع کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"رزلٹ تو آپ کا آگیا ہے مارکس بھی بہت اچھے ہیں۔ اب مزید کیا ارادے ہیں آپ کے۔" وہ کنزہ کو ڈرائیور کے ساتھ بھجوا کر اندر آرہے تھے۔ چلتے چلتے یاور نے پوچھا۔

"میرے ارادے بھلا کیا ہونے تھے۔ تیرہ سال اپنی کم عقلی کی نذر کر دیے۔ اب جا کر عقل آئی ہے، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کروں؟" اس نے سچائی سے بتایا۔

"آپ نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہیں لینا کیا؟"

"میں بھلا کیسے ایڈمیشن لے سکتی ہوں۔"

"کیوں آپ کیوں نہیں لے سکتیں۔ کس نے آپ سے کہا ہے کہ آپ نہیں لے سکتیں۔"

"گاؤں میں کوئی یونیورسٹی تو نہیں ہے نا!" اس نے جیسے یاور کی حماقت کا ماتم کیا۔

"مجھے بھی پتا ہے کہ گاؤں میں کوئی یونیورسٹی نہیں ہے، مگر شہر میں تو ہے نا۔"

"میں شہر نہیں جاسکتی۔"

"کیوں؟"

"یہاں کچھ لوگوں کو میری ضرورت ہے، میں نے ایڈمشن لے لیا تو پڑھائی کو وقت دینا ہو گا اور میں ان سب پر توجہ نہیں دے سکوں گی۔ حرا اور تابش مجھ سے بہت زیادہ پیار کرنے لگے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنے کم وقت میں وہ میرے اتنے قریب آجائیں گے۔ بابا جان مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہنے لگے ہیں۔ پڑھائی کا کیا ہے عمر پڑی ہے۔ بس زندگی کی حقیقتیں بہت دیر سے کھلی ہیں مجھ پہ۔" یاور بہت غور سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

"پر آپ کو شوق تو ہو گا کہ آپ نے مارکس اتنے اچھے لیے ہیں تو اچھی سی یونیورسٹی میں ایڈمشن بھی لیں۔" وہ جانے کیا جاننا چاہ رہا تھا۔

"دل تو جانے کیا کیا چاہتا ہے۔" یہ فقرہ اس نے مکمل غائب دماغی کی حالت میں کہا تھا۔ یاور نے اسے بہت گہری نگاہ سے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اب میں روز آپ کے پاس سویا کروں گی، کیسا؟" حرا اور تابش کے پاس اس خوشی کو ظاہر کرنے کے لیے معصوم اور بے ریا سی مسکراہٹ ہی تھی۔ دونوں اس سے لپٹ گئے تھے۔ "دلہن آنٹی پھر ہمیں ڈر نہیں لگے گا۔ بہت مزے کی نیند آئے گی پھر تو، آپ ہمیں

کہانیاں بھی سنائیں گی نا؟"

"جی ہاں۔ مجھے بہت ساری کہانیاں آتی ہیں۔ میں روز سنایا کروں گی آپ کو۔ جب میں آپ جتنی تھی تو میرے پاس بہت ساری اسٹوریز بکس تھیں۔ وہ ساری کہانیاں مجھے ابھی تک یاد ہیں۔"

"آپ ہمیں رات کو ماریں گی تو نہیں نا، گالو تو نہیں گھونٹیں گی نا!" تابش امید اور خوف کی ملی جلی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ارے نہیں نہیں میری جان تم نے یہ کیسے سوچ لیا۔ تم اتنے پیارے ہو۔ کون تمہارا گلا گھونٹے گا۔ میں اتنی بری نہیں ہوں کہ آپ کا گلا گھونٹوں۔ میں تو آپ دونوں سے بہت پیار کرتی ہوں۔ بہت زیادہ، کیونکہ میری طرح آپ کے پپا بھی تو نہیں نا!"

آبدار نے تابش کو بے اختیار ہا نہوں میں بھر کر سینے سے لگا لیا تھا۔

"ہمیں تو مما بھی چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ وہ حرا کا اور میرا گلا گھونٹتی تھیں، ہمیں بہت زیادہ مارتی تھیں۔ ایک بار انہوں نے مجھے آگ لگانے کی کوشش بھی کی تھیں۔ پپا جب نہیں ہوتے تھے نا تو وہ مجھے اور حرا کو کمرے میں بند کر دیتی تھی۔" تابش کے گالوں پہ آنسو لڑھک آئے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہو تابش؟" آبدار کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ "تم نے شاید کوئی مووی دیکھ لی ہے، ہے نا!"

اسے اس بچے کی بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔ شاید باپ کی وفات نے اس کا دماغ ہلا دیا ہے جو اس طرح کی باتیں کر رہا ہے۔ "نہیں میں نے مووی نہیں دیکھی۔ میں سچ بول رہا ہوں۔"

"حرا! تم بھی تو دلہن آنٹی کو بتاؤ نا ممالکا۔"

وہ اس کی بانہوں کا حصار توڑ کر کھلونوں سے کھیلتی حرا کی طرف بڑھا۔ پر اس کا دھیان ان دونوں کی طرف نہیں تھا۔ وہ بے نیازی سے بھائی کی طرف دیکھ کر از سر نو اپنی باربی ڈول کے بال ٹھیک کرنے لگی۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ آؤ میں بھی آپ کے ساتھ کھیلتی ہوں۔" تابش کی روئی روئی آنکھیں اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔ وہ اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔

"دلہن آنٹی! میں کرکٹ کھیلوں گا۔ میں ٹوائز کے ساتھ نہیں کھیلتا۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں، اس لیے کرکٹ ہی کھیلوں گا۔"

"اوہ اچھا جی بڑے میاں! آئیں باہر چلتے ہیں، وہاں کھیلیں گے۔"

آبدار اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب رہی تھی۔ لیکن دل ہی دل میں وہ تابش کی کہی گئی باتیں ہی سوچ رہی تھی۔ شروع میں جب فاروق چوہدری عزہ کی رشتے کی بات کرنے آئے تھے اور بڑے ابا نے رحمہ چچی اور جلال چچا سے ذکر کیا تھا تب چچی نے بڑا شور مچایا تھا کہ میں اپنی عزہ کو برائے بچوں کی آیا نہیں بناؤں گی۔ شروع میں وہ یہ ہی سمجھی تھی کہ شاید بچے اسی شخص کے ہیں، جس کا رشتہ مانگا جا رہا ہے۔ بعد میں یہ غلط فہمی بہت جلد دور ہو گئی تھی۔ یہ سب کو ہی پتا تھا کہ بچوں کا باپ نہیں ہے۔ اس نے از خود فرض کر لیا تھا کہ ماں بھی فوت ہو گئی ہو گی۔ کبھی اس طرف اس کی سوچ گئی ہی نہیں تھی۔ کسی نے تابش اور حرا کی مما کا ذکر کیا ہی نہیں تھا جو وہ دھیان دیتی یا پوچھتی۔

تابش کیسی باتیں کر رہا تھا؟ اگر ان کی ممانزندہ تھی تو کہاں تھی۔ اگر نہیں ہیں تو کبھی کسی نے بتایا کیوں نہیں۔ اس کا ذہن اسی چیز کے گرد گھوم رہا تھا۔ وہ تابش کے ساتھ کھیل تو رہی تھی، مگر اس کا دھیان کہیں اور تھا۔

☼ ☼ ☼

آبدار نے الماری سے اپنے سارے کپڑے نکال لیے تھے۔ اب وہ باتھ روم سے اپنی کچھ چیزیں اٹھا رہی تھی۔ یاور بغور اس کی سرگرمیاں ملاحظہ کر رہا تھا۔ ہینگ کیے ہوئے کپڑے وہ دونوں بازوؤں میں اٹھا کر باہر چلی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ باقی رہ جانے والی چیزیں اٹھانے آئی۔ یاور اس کے پیچھے باہر تک آیا۔ وہ تابش اور حرا کے بیڈ روم کی طرف گئی تھی۔

"میں اپنے کپڑے لے آئی ہوں۔ اب میں آپ

کے پاس ہی رہوں گی۔"

"دلہن آنٹی! اپنے کپڑے اس الماری میں رکھ دیں۔" تابش نے دیوار گیر الماری کی طرف اشارہ کیا۔

"اوکے بارنٹر۔" وہ سعادت مندی سے اس کی ہدایات پہ عمل کرنے لگی۔ تابش بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔

"لو جی ہمارا سامان سیٹ ہو گیا۔" وہ دونوں ہاتھوں سے فرضی گرد جھاڑ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"اب کتنا مزہ آئے گا نا! آپ ہمارے پاس رہیں گی تو۔"

"ہاں مجھے بھی بہت مزہ آئے گا۔"

"دلہن آنٹی! چاچو کو ڈر تو نہیں لگے گا نا اکیلے سوتے ہوئے؟" حرا کو اپنے چاچو کی فکر لاحق ہوئی۔

"نہیں حرا! ہمارے چاچو بہت بہادر ہیں۔ روز ایکسائز کرتے ہیں جم میں۔ وہ نہیں ڈرتے کسی سے۔" تابش نے اپنی معلومات جھاڑی تھی۔

"دلہن آنٹی! میں آپ کو کل چاچو کا جم دکھاؤں گا۔ اتنا بڑا ہے، میں بھی چاچو کے ساتھ جم میں ایکسرسائز کروں گا، پھر میرے مسلز بھی چاچو جیسے ہو جائیں گے، اور پھر میں مما کے بھی نہیں ڈروں گا۔ وہ پھر بے شک مجھے ماریں۔"

بولتے بولتے تابش کی ذہنی رو پھر بھٹک گئی تھی۔ آبدار کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر خاموش ہو گئی۔ دونوں بچے تھے، ان سے پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ "اور دلہن آپی! آپ بھی چاچو کے جم میں روز ویٹ لفٹنگ کرنا، آپ کے مسلز بھی چاچو جیسے ہو جائیں گے۔" آبدار کے لبوں سے ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔ تابش نے بات ہی ایسی کی تھی۔

"لگتا ہے، آپ کو باڈی بلڈنگ سے بہت دلچسپی ہے۔" اس نے تابش کی ناک دونوں انگلیوں سے دبائی۔

"ہاں۔ میں بڑے ہو کر یاور چاچو جیسا بنوں گا، مسٹر پاکستان بنوں گا، چاچو کے پاس اتنے کپ اور ٹرافیاں ہیں۔"

"اوہ اچھا اچھا۔ اب تو چاچو نایہ بند کر دو۔" آبدار مسلسل اس کا ذکر سن کر بور ہو گئی تھی۔

"آؤ۔ میں کہانی شروع کروں۔" دونوں اس کے قریب کھسک آئے۔ آبدار کہانی سنا رہی تھی اور وہ پوری طرح اس میں کھوئے ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

حرا کا سر اس کی گود میں دھرا تھا۔ تابش کا بازو آبدار کے کندھے کے گرد حمائل تھا۔ وہ خود نیم دراز پوزیشن میں تھی۔ وہ دونوں کو اپنی بچپن کی شرارتوں کے قصے سنا رہی تھی۔ یاور بے آواز طریقے سے دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ تینوں آپس میں مگن تھے۔

"اوہ تو آپ یہاں محفل ہو گئی ہیں۔"

یاور کے اس طرح دبے قدموں اندر آکر اچانک بولنے سے وہ اچھل ہی تو پڑی۔

"چاچو! آپ ادھر آجائیں ہمارے پاس۔" تابش خوش ہو گیا تھا۔ یاور بھی ان تینوں کے پاس بیٹھ گیا۔ آبدار نے ٹانگیں سمیٹ لی تھی۔ اس کی موجودگی میں وہ کانشس ہو رہی تھی۔

"میرا بیڈ روم آپ کو پسند نہیں آیا کیا؟" اس نے بہت آہستگی سے پوچھا۔ تابش اور حرا سن نہیں پائے تھے۔

"وہ آپ کا بیڈ روم تھا۔ میری وجہ سے آپ بے آرام ہو رہے تھے۔"

"آپ بے آرام ہو رہی تھیں کہ میں؟" یاور کے سوال پہ اس نے نظریں جھکا لی تھی۔

"بولو جواب دو۔" اس نے ان دونوں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر آبدار کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"سنو، میں ویٹ کروں گا۔ آؤ گی نا؟" یاور کا لہجہ سرگوشی میں ڈھل گیا تھا۔ آبدار کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"اوکے حرا اور تابش گڈ نائٹ۔" اس نے باری باری دونوں کا ماتھا چوما۔

"آپ کیوں ڈر رہی ہیں۔ آپ کو تو میں گڈ نائٹ

نہیں کہنے والا۔" وہ مخصوص جان لیوا انداز میں ہنسا۔

آبدار نے دروازہ لاک کر دیا۔

تابش اور حرا کہانی سننے کے بعد سو گئے تھے۔ گھڑی کی ٹک ٹک اور سوئیوں کی حرکت وقت گزرنے کا احساس دلا رہی تھی۔ اسے اپنے نیند کی آغوش میں جانے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔

☆ ☆ ☆

آبدار، حرا کے لیے چمک دار سلکی بالوں کی پونیاں بنا رہی تھی۔ جب یاور نے اس کے ہاتھ سے برش لیا۔

"حرا! آپ باہر جا کر کھیلو۔ مجھے ان سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔" آبدار نے مضبوطی سے حرا کو پکڑ لیا تھا۔ وہ اسے باہر جانے نہیں دے رہی تھی اور یاور اسے یہاں سے جانے کا کہہ رہا تھا۔ بچی عجیب مشکل میں گرفتار تھی۔

"آپ نے جو باتیں کرنی ہیں، ادھر ہی کر لیں، حرا باہر نہیں جائے گی۔" آبدار اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"مجھے آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔"

"میں حرا کے ساتھ بزی ہوں۔" اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"سوچ لیں آپ ہی کے فائدے کی بات ہے۔" اس نے کچھ دیر سوچا۔ حرا اس کا ہاتھ جھٹک کر اچھلتی کودتی چلی گئی تھی۔

"جی بولیں۔"

"یہ میں آپ کے لیے ایڈمیشن فارم لایا ہوں۔"

"مگر ان کی کیا ضرورت ہے۔ میں یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہیں لے سکتی، آپ کو اس دن بھی بتایا تھا میں نے۔" یاور خاموش ہو کر سوچنے لگا تھا کچھ۔ "آپ کی مرضی ہے میں تو کچھ سوچ کر ہی لایا تھا، خیر اٹس اوکے، بابا جان کہہ رہے تھے کہ آپ کو کنزہ آنٹی سے ملا لاؤں۔"

"واقعی!" وہ خوش ہو گئی۔

"جی ہاں۔ آپ کو جانا ہے تو تیاری کر لیں۔"

"ٹھیک ہے میں بابا جان اور امی جان کو بتا دوں پہلے۔" اب اس کے ذہن سے ہر چیز نکل گئی تھی۔ یاد تھا تو صرف یہ ہی کہ اسے مما سے ملنے جانا ہے۔

☆ ☆ ☆

کنزہ ان دونوں کو دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں بظاہر مگر اندر سے پریشان تھیں۔ انہیں احساس تھا کہ آبدار کی رخصتی سے کسی کو خوشی نہیں ہوئی ہے۔ بہت سارے تلخ حقائق سے انہیں آگاہی ملی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ آبدار یہاں آئے۔ بڑے ابا کے وکیل کے پاس پیشہ ورانہ اسرار و رموز سے آگاہی کی خاطر ایک جونیئر وکیل کام کرتے تھے۔ کنزہ ایک بار بڑے ابا کے ساتھ ان کے آفس گئی تھیں تو وہاں ان سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ وہی جونیئر وکیل بازار میں اتفاقاً" شاپنگ کرتے ہوئے مل گئے۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم تھیں۔ وکیل صاحب کنزہ کو پہچان گئے تھے۔ انہوں نے بڑے ابا کی وصیت کے بارے میں چند باتیں چلتے چلتے کیں۔ پھر اپنا فون نمبر دیا۔ کنزہ گھر آگئیں۔ اسی دن واپس آکر انہوں نے وکیل صاحب کا نمبر ڈائل کر دیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ کنزہ بیگم بہت خوش حال زندگی بسر کر رہی ہوں گی۔ بڑے ابا کے وکیل نے عاشر احمد کے ساتھ مل جل کر ان کی وصیت میں جو گڑبڑ کی تھی۔ وہ ان جونیئر وکیل کے علم میں تھی۔ لیکن وہ اس حد تک گر جائیں گے یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ عاشر احمد نے کچھ سادہ کاغذات پہ کنزہ بیگم سے جھوٹ بول کر دستخط لیے تھے۔ ایک اسٹامپ پیپر پر بھی انہوں نے یہ ہی عمل دہرایا تھا۔

اب حالت یہ تھی کہ بڑے ابا نے وصیت کی کہ وہ کنزہ ہے جس جائیداد کا حق جاری بنایا تھا وہ عاشر احمد کی ہو گئی تھی۔ پاور آف اٹارنی تک ان کے نام تھی۔ کنزہ کی سادہ لوحی سے عاشر احمد سمیت یاسر اور جلال نے بھی بھرپور فائدہ حاصل کیا تھا۔ آبدار کو مکان بڑے ابا نے گفٹ کیا تھا اس کا کہیں کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔

یہ ساری باتیں کنزہ کو اس جونیئر وکیل سے پتا چلی

تھیں۔ اس نے مخلصانہ مشورہ دیا کہ آپ اپنے شوہر کے بھائیوں پہ فراڈ اور دھوکہ دہی کا مقدمہ دائر کردیں۔ انہوں نے یہ مشورہ سن کر کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔ جو لوگ اس حد تک جاسکتے تھے ان سے کوئی بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ وہ آبدار کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

آبدار کے میکے میں یاور کی خوب آؤ بھگت ہوئی تھی۔ عاشر احمد اس کے خیالات جان کر بے حد متاثر ہوئے۔ وہ فردا" فردا" سب سے ملا۔ جلال احمد اور یاسر احمد سے اس کی گفتگو بزنس اور زمینوں تک ہی محدود رہی۔ ان دونوں کو اس موضوع سے دلچسپی تھی، مگر یاور بوریت محسوس کرنے لگا تھا۔

آبدار اس کے ساتھ عاشر احمد کے پورشن تک آئی۔ اعتماد سے اٹھی گردن اور چمکتی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ پہلے والی آبدار ہرگز نہیں ہے۔ باسط غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عمارہ یہاں نہیں تھی اور وہ اس کی غیر حاضری کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس وقت یاور، باسط کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

"اور آبدار! اب تو تمہارا نشانہ بالکل پکا ہوگیا ہوگا نا!" درمیان میں یاور سے بات کرتے کرتے باسط، آبدار کو مخاطب کر بیٹھا تو ایک ثانیے کے لیے وہ ڈر سی گئی، پر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"مجھے اب یہ شوق نہیں رہا ہے۔" وہ سختی سے بولی۔

"یہ نشانہ پکا کرنے کا کیا سلسلہ ہے، میں پہلے بھی سن چکا ہوں اس بارے میں؟" یاور کی یادداشت بہت اچھی تھی، اسے یاد تھا کہ آبدار کی تائی اور وریشہ نے اس حوالے سے ایک بات کی تھی۔ اس بات کی تہہ ابھی تک اسے محسوس ہوتی تھی۔

"یاور! تمہیں نہیں پتا، تمہاری بیگم کو عجیب عجیب کام کرنے کے شوق ہیں۔" باسط بڑی بے تکلفی سے یاور سے بولا۔ باسط جانے کیا کہہ دے، وہ ڈر رہی تھی۔

عائلہ تائی کھانے کے لیے بلانے آئیں تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

☆ ☆ ☆

کنزہ سونے جاچکی تھیں۔ یاور، آبدار کے کمرے کو دیکھ رہا تھا جو سادگی اور خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ کنزہ نے فرنیچر کی ترتیب نہیں چھیڑی تھی۔ کنزہ خود صفائی کرتی تھیں۔ اس لیے ہر چیز صاف ستھری تھی۔

آبدار صرف ایک رات کے لیے آئی تھی کنزہ نے خاصا لمبا لیکچر دیا تھا کہ اب اپنے سسرال میں دل لگاؤ۔ یہاں روز روز آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ سر ہلاتی رہی تھی۔ ابھی باسط بھائی کی باتوں اور نگاہوں نے اسے باور کرادیا تھا کہ ممانے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہی ہیں۔ باسط کی نگاہوں اور دل میں میل تھا۔ یاور کھٹک بھی سکتا تھا۔ ممانان دونوں کو آرام کرنے کا کہہ کر خود چلی گئی تھیں۔ یاور اس کے بیڈ پہ ٹہل کے لینا ہوا تھا۔

"تو یہ ہے آپ کا کمرہ، جہاں شادی سے پہلے شب و روز آپ نے گزارے۔"

"جی ہاں یہ ہی ہے میرا کمرہ۔" وہ مختصرا" جواب دے کر خاموش ہوگئی۔

"لگتا ہے آپ کا ارادہ جاگ کر رات گزارنے کا ہے، جب ہی تو وہاں اتنی دور بیٹھی ہیں۔" اس نے آبدار پہ چوٹ کی۔

"آپ سوئیں۔ میں کسی اور کمرے میں سو جاتی ہوں۔" وہ جوتے پاؤں میں ڈال کر باہر جانے لگی تھی کہ یاور اس کی راہ میں حائل ہوگیا۔

"اپنا اور میرا تماشا بنانے کا ارادہ ہے۔ میں کنزہ آنٹی کی اپنی امی جان کی طرح عزت کرتا ہوں۔ آپ کے اس عمل سے جانے وہ کیا سمجھیں۔"

یاور کی بات واقعی ٹھیک تھی۔ آبدار دوسرا تکیہ اٹھا کر صوفے پہ آگئی تھی۔ یاور اگلے آدھے گھنٹے میں سوچکا تھا۔ پر آبدار کو نیند نہیں آرہی تھی۔

اسے اچھی طرح احساس تھا کہ یاور چوہدری اس کے ساتھ "بلی چوہے" کا کھیل، کھیل رہا ہے۔ وہ پہلے

اپنے شکار کو اچھی طرح نڈھال اور بے دست و پا کر کے ساری طاقت چھین لینا چاہتا تھا۔ اور آبدار کو ابھی اپنی تمام توانائیاں محفوظ کر کے رکھنی تھی۔

☆ ☆ ☆

بہت دن بعد یاور کی پری گل سے ملاقات ہوئی تھی۔ معمول کے مطابق وہ سرینہ ہوٹل میں ملے تھے۔ پری گل کی طرف سے اس ملاقات کے لیے بہت اصرار تھا۔

بیرے کو آرڈر نوٹ کروا کے وہ پری گل کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اداس اور پہلے کے مقابلے میں کمزور لگ رہی تھی۔

"کیا حال بنالیا ہے تم نے اپنا۔ فاقے کر رہی ہو کیا؟" یاور نے جان کر ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔

"زندگی مجھے بہت مشکل لگنے لگی یاور! ایک ایک کر کے خواب ٹوٹ گئے ہیں۔"

"تو کیا اپنے خوابوں کی تباہی کا ذمہ دار تم مجھے سمجھ رہی ہو؟"

"تم اتنی جلدی شادی کرلو گے، مجھے یقین ہی نہیں آتا۔ یاور! میں نے تمہاری ہمراہی کے کتنے خواب دیکھے تھے۔ تم نے سب کتنی آسانی سے کسی دوسری عورت کی جھولی میں ڈال دیے۔"

"پری گل! میری پوزیشن تمہارے سامنے تھی۔ خواب میری وجہ سے نہیں ٹوٹے، بلکہ تمہاری ضد اور بے جا ہٹ دھرمی کی وجہ سے ٹوٹے ہیں۔ میں نے تمام حالات تمہیں بتائے اور بار بار کہا کہ اپنے فیصلے پہ نظر ثانی کرلو، مگر تمہاری ایک ہی رٹ تھی کہ میں ایسا نہیں کرسکتی، آخر مجھے بابا جان کے سامنے ہار ماننا پڑی۔" یاور نے تصویر کا دوسرا رخ اس کے سامنے رکھا تو وہ نظر چرا گئی۔

"یاور! چھوڑو پرانی باتوں کو، کوئی فائدہ نہیں دہرانے کا۔ ہم میں سب کچھ پہلے جیسا بھی تو ہوسکتا ہے نا؟"

"سب کچھ پہلے جیسا کیسے ہوگا پری گل! وقت گزر چکا ہے۔" ایک دم تھکن اس کے لہجے میں در آئی تھی۔

وہ اس کی بچکانہ بات پہ تلخی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

"ہونہہ۔" اس نے سر جھٹکا۔

"یاور! تم نے کہا تھا نا کہ تمہیں گاؤں میں رہنا ہوگا۔ مکمل طور پہ ایک جاگیردار گھرانے کی بہو بن کر تو میں تیار ہوں۔ تم جب بھی کہو میں ڈیڈی کو راضی کرلوں گی۔ بس تم اپنے بابا جان کو لے کر آجاؤ۔ میں بہت سا خوب صورت وقت پہلے ہی اپنی حماقت کی وجہ سے ضائع کرچکی ہوں اب اور نہیں کرسکتی۔"

یاور نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"یاور! یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے کہ وہ تمہاری بانہوں میں ہوگی۔ تمہاری تمناؤں، تمہاری قربتوں، تمہاری خلوتوں میں شریک ہوگی، تمہارا یہ فراخ سینہ جس پہ میں نے سر رکھ کر سونے کے خواب دیکھے تھے۔ وہ اب یہاں سوئی ہوگی، اس کے لب تمہاری میں بہت سی ان کہی کہانیاں رقم کرتے ہوں گے، میں سوچ سوچ کر پاگل ہونے لگتی ہوں۔ میرے دن رات عذاب میں کٹتے ہیں۔ نہ جیتی ہوں، نہ مرتی ہوں، یاور! تمہیں پتا تو تھا کہ میں تمہیں کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کرسکتی، پھر کیوں کیا تم نے ایسا، بولو جواب دو۔"

پری گل بالکل جنونی ہو رہی تھی۔ آس پاس کے لوگ انہیں دیکھنے لگ گئے تھے۔

"پری گل! گھر جاؤ، شاباش، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں بعد میں گھر آؤں گا، اوکے۔" اس نے بمشکل تمام سمجھا کر پری گل کو یہاں سے اٹھایا۔ وہ زور زور سے رونے لگی تھی۔ یاور نے بمشکل خود کو کمپوز کیا تھا۔ پری گل کی حماقت نے تماشا بنوانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

فاروق پشت پہ دونوں ہاتھ باندھے اضطراری انداز میں کمرے میں چکر لگا رہے تھے۔ تابش سہما سہما ادھر ہی بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی روبی بیگم کی کال آئی تھی۔

اتفاق کی بات تھی کہ تابش بھی ان کے پاس بیٹھا کھیل رہا تھا۔ روبی نے تابش سے بات کرانے کا مطالبہ کیا۔ فاروق چودھری نے اشارے سے تابش کو پاس بلا کر ریسیور اس کے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ وہ خاموشی سے دوسری سمت سے آنے والی آوازیں سنتا رہا۔ ایک دم اس کے معصوم چہرے پہ خوف کے سائے رقص کرنے لگے تھے۔ پھر اس نے فون چودھری صاحب کو دے دیا۔ حالانکہ روبی بیگم نے صرف خیر خیریت ہی پوچھی تھی۔ اس کے بعد تابش صوفے پہ جا کر بیٹھ گیا تھا۔ فون اس نے بند نہیں کیا تھا۔

"چودھری صاحب! میں اپنے بچوں کو لے کر جاؤں گی۔ میرے بچے میرے سپرد کردیں خاص طور پہ میری حرا کو۔" اس کے لہجے میں بدتمیزی کا عنصر پہلے سے بھی زیادہ تھا۔

"بچوں کو بھول جاؤ ـــ وہ ہمارے پاس ہیں اور ہمارے پاس ہی رہیں گے۔ آئندہ فون مت کرنا۔ ہم بڑی مشکل سے سنبھلے ہیں۔"

فاروق چودھری کا لہجہ غیظ و غضب سے کانپ رہا تھا۔ آبدار تابش کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ کافی دیر سے نظر نہیں آرہا تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں وہ سہما سہما بیٹھا تھا۔ آبدار کی نظر فاروق چودھری پہ نہیں پڑی تھی۔ وہ قدرے اوٹ میں تھے۔ وہ تابش کے قریب آئی تب ان کی آواز کان میں پڑی۔ وہ فون پہ کسی سے بات کررہے تھے۔

"چودھری صاحب! آپ نے میرے بچوں کے دل و دماغ میں میرے حوالے سے نفرت و حقارت کا جو زہر بھرا ہے وہ میں کبھی نہیں بھولوں گی، نہ معاف کروں گی۔ نگینہ بیگم کی بیٹی ہوں میں بھی۔ جس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔"

"چپ ہو جاؤ۔ ہماری مہربانیوں کا خراج تم غالب چودھری کی موت کی صورت میں وصول کرچکی ہو اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے ہمارے پاس۔ ہماری زندگیوں سے نکل جاؤ اور زہر گھولنا چھوڑ دو۔"

فاروق چودھری نے ریسیور کریڈل پہ تقریباً پٹخنے کے انداز میں رکھا تھا۔ اور وہیں پاس رکھی کرسی پہ گر سے گئے تھے۔

"بابا جان! کیا ہوا ہے۔ آپ اتنے پریشان کیوں ہیں۔ کس کی کال تھی؟" آبدار نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر انہیں دیا۔

فاروق چودھری کے چہرے پہ غصے کی سرخی تھی۔ پانی کا گلاس انہوں نے ایک سانس میں پی لیا۔ انہوں نے خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔ آبدار ان کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے پانی کا گلاس لے کر رکھا۔ تابش کے خوف اور فاروق چودھری کے شدید غصے کے پیچھے یقیناً" اسی کال کا ہاتھ تھا۔ یہ آبدار کا اندازہ تھا۔

"آبدار بیٹی! تابش کو یہاں سے لے جاؤ۔" انہوں نے آہستہ آواز میں کہا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی تابش کو باہر جھولوں کی طرف لے آئی۔

"تابش! حرا کہاں ہے؟" تابش سے اس نے پوچھا۔

"دلہن آنٹی وہ چاچو کے ساتھ تھی۔"

"تمہارے چاچو کہاں ہیں؟" اس نے بہت آہستگی سے پوچھا۔

"چاچو اپنے جم میں ہوں گے۔"

"او ڈھونڈیں حرا کو جانے وہ کہاں ہے۔ اتنی دیر سے نظر نہیں آرہی ہے۔"

"اچھا میں دیکھتا ہوں چاچو کے جم میں، آپ بھی میرے ساتھ آئیں۔"

"او کے آؤ۔" آبدار نے تابش کا ہاتھ پکڑ لیا۔ حویلی کے اس حصے کی طرف وہ پہلے نہیں آئی تھی اور نہ کبھی اندر سے دیکھا تھا۔ ویسے بھی درختوں کی جھنڈ میں بیچوں بیچ بنا ہوا تھا۔

تابش کی ہمراہی میں اس نے دروازے سے اندر قدم رکھا۔ تیز میوزک کے شور نے ان کا استقبال کیا۔ یاور دیوار میں نصب مشینوں کے ساتھ مخصوص کسم کی ایکسرسائز میں مصروف تھا۔ ہلکی سی بنیان اور ٹراؤزر میں ملبوس اس کا کسرتی جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ آبدار نے تو ایک بار دیکھنے کے بعد نظر ہٹالی تھی۔

"دراصل میں میں نے حرا کو کافی دیر سے نہیں دیکھا ہے۔ سارے گھر میں ڈھونڈا ہے وہ نہیں ہے۔" لگ رہا تھا وہ ابھی رو دے گی۔

"آپ نے میرے بیڈ روم میں دیکھا ـــ تو وہ میرے ساتھ باتیں کرتے کرتے ادھر ہی سو گئی تھی۔ اور آپ ہرات پہ پریشان نہ ہو جایا کریں۔ اچھا خاصا دل بے ایمان ہونے لگتا ہے۔"

آخری جملہ تابش کی موجودگی کی وجہ سے اس نے بہت آہستگی سے ادا کیا۔ آبدار مزید وہاں نہیں رکی اور سیدھا اس کے بیڈ روم میں آگر جھانکا۔ حرا واقعی ادھر ہی سو رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی۔ وہ اسے اٹھانے لگی۔

وہ حرا کے اوپر جھکی ہوئی تھی کہ ایک دم سیدھی ہو گئی۔ یاور وارڈ روب سے کپڑے نکالنے آیا تھا۔ حرا آنکھیں ملتی بالآخر اٹھ بیٹھی۔ آبدار کو اپنی موجودگی یہاں فضول لگ رہی تھی۔ یاور سیٹی پہ جانی پہچانی دھن گنگنا رہا تھا۔

چلیے تھے ساتھ مل کے چلیں گے ساتھ مل کر

تیسرے کے ہزارویں حصے میں اسے کچھ یاد آیا تھا۔ ابوبکر کا اس کے کمرے میں آنا ہنسی مذاق باتیں۔ آبدار کی اپنی میوزک کلیکشن دکھانا، رائے لینا۔ اپنائیت کا مانوس سا احساس۔ سب کچھ ہی تو اسے یاد آگیا تھا۔

"کیا خیال ہے؟ میری آواز سن کے رُک جائیں گی۔" وہ جان بوجھ کر مذاق کررہا تھا۔ اس سوال میں چھپے مسخرے کو جتنی اچھی طرح اس نے محسوس کیا تھا اسے ہی پتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دلہن آنٹی دلہن آنٹی! آپ کو یاور چاچو بلا رہے ہیں۔" تابش جانے کہاں سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔

"وہ کہاں ہیں وہ اور کیوں بلا رہے ہیں۔" وہ اوپری منزل پہ گیلری میں کھڑی تھی۔

"اپنے روم میں ہیں جلدی آئیں۔" تابش جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے واپس بھی چلا گیا۔ آبدار اس کی پھرتی پہ حیران رہ گئی۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ جانے اس نے کیوں بلوایا تھا۔ بغیر کسی کام یا غرض کے تو وہ اسے مخاطب بھی نہیں کرتا تھا۔

یاور بندوق کی نال کھول کر کچھ چیک کررہا تھا۔ ایک جدید ریوالور اور شاٹ گن اس کے سامنے تپائی پہ دھری تھی۔

"آپ نے بلوایا؟" وہ اس کے سامنے پڑے ہتھیاروں کو ناقدانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"جی ہاں میں نے ہی بلوایا ہے ذرا یہ سامنے پڑا ریوالور تو دیں مجھے بلکہ مجھے نہ دیں۔ اس کا چیمبر کھول کر چیک کریں کہ کتنی گولیاں پڑی ہیں۔"

"مجھے تو نہیں پتا کہ کتنی گولیاں پڑتی ہیں۔" وہ سچ مچ خوف زدہ ہو گئی تھی یہاں ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ تابش بھی بھاگ گیا تھا اور یاور نے دروازہ بند کردیا تھا۔

"آپ کو کیوں نہیں پتا کہ کتنی گولیاں پڑتی ہیں۔ نشانے بازی کی مشق تو آپ کرتی ہیں۔ یہ نہیں پتا آپ کو۔"

"بس اتنی خاص مشق نہیں کی تھی۔" اس کا لہجہ لڑکھڑا گیا تھا۔

"پھر تو آپ کو ریوالور چلانا بھی نہیں آتا ہوگا۔"

"نن ـــ نن ـــ نہیں۔" اس نے بوکھلاہٹ میں نفی میں سر ہلایا۔

"میں سکھا دیتا ہوں یہاں تو آئیں۔" وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی یاور خود اس کے پاس آیا۔

"یہ لیں پکڑیں اسے ـ مضبوطی سے پکڑیں نا۔ ایسے نہیں۔" یاور نے زبردستی اس کے ہاتھ میں سیاہ جدید طرز کا مہلک ہتھیار تھمایا تو اس کے کانپتے ہاتھوں سے چھوٹ کر وہ کارپٹ پہ گر گیا۔

"آپ کے ہاتھوں میں تو جان ہی نہیں ہے۔" یاور زمین پہ جھکا ریوالور اٹھا کر سیدھا ہوا اور دوبارہ اس کے ہاتھ میں پکڑایا۔

"آبدار صاحبہ! اس پہ سائلنسر لگا ہے گولی کی آواز نہیں آتی۔ ٹرائیگر پہ انگلی رکھیں۔" یاور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آبدار کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"میں کل شکار پہ جا رہا ہوں۔ آپ کو بھی لے کر جاؤں گا اور یہ آپ کے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں۔ اتنا ڈرتی ہیں آپ۔"

یاور کے ہاتھوں میں دبا اس کا دائیں ہاتھ پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ کی پشت پہ جیسے کسی نے وہ کتا انگارہ دھرا تھا۔ یاور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ یہی عمل دہراتا آبدار نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی۔

"میں شکار پہ نہیں جا رہی اور آپ... آپ اٹھائیں یہ چیزیں یہاں سے۔ مجھے نہیں دلچسپی ان سے۔"

"آپ کو نہیں ہے... حیرت ہے... لیکن مجھے ہے... آپ کو دلچسپی لینا ہوگی۔" وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"یہ ڈبل بیرل شاٹ گن تو اٹھائیں۔" اس کا مزاج مکمل طور پہ حاکمانہ تھا۔

"مجھ سے نہیں اٹھائی جاتی۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"میں اٹھا دیتا ہوں۔ چلانے کا طریقہ بھی بتاتا ہوں۔" وہ اس کی پشت پہ کھڑا تھا۔

آبدار اس کی گرفت میں آگئی تھی۔ کوئی جانا پہچانا منظر نگاہوں کے سامنے سے گزرا تھا۔

"نہیں... نہیں۔" اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑی اور گن نکل کر نیچے گر گئی بشکر کہ اس کے پاؤں پہ نہیں لگی۔

"کیا نہیں... نہیں۔" یاور نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ اس نے آبدار کو زبردستی اپنی طرف موڑا تھا۔

"مجھے جانے دیں، میں نہیں سیکھتی۔" یاور کی قہر تھا اسے خائف کر رہی تھی۔

"کیوں جانے دوں۔ برا لگ رہا ہے۔" اس کے الفاظ سرگوشی بن گئے۔

"میرا مطلب ہے کہ اگر آپ نہیں سیکھنا چاہتیں تو ٹھیک ہے۔" وہ بھی ایک کائیاں تھا۔ فوراً پینترا بدلا۔

"آپ جا سکتی ہیں۔ لیکن یاد رکھیے گا کہ کل آپ کو ہر صورت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ مضبوطی سے بولی۔

"کیوں؟"

"تاکہ آپ وہاں آرام سے مجھے مار سکیں۔ ریوالور پہ سائلنسر لگا ہے۔ کسی کو آواز بھی نہیں جائے گی۔ آپ گھر آکر کوئی بہانا بنا دیں گے۔ آپ بار بار مجھے گن اور ریوالور پکڑا رہے ہیں۔ اب ان پہ میرے فنگر پرنٹس آگئے ہیں۔ آپ تو صاف بچ جائیں گے مجھے مار کر۔"

آبدار نے بڑے آرام سے پورا منصوبہ بتا دیا تھا۔ یاور نے زبردست قسم کی حیرت کو چھپا لیا۔

"ویری گڈ! آپ تو بہت زیادہ اسمارٹ ہیں۔ لیکن آپ کو ایسے نہیں مارتا۔ اتنی آسانی سے نہیں۔"

"وہ تو مجھے پتا ہے کہ آپ مجھے اتنی آسانی سے نہیں ماریں گے۔ آپ کی ذہنیت ہی اذیت پسند ہے۔" آبدار کی بدگمانی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ دیکھ کر رہ گیا۔

"میں اتنی بھی کمزور نہیں ہوں۔ آج تک بابا جان کو آپ کے رویے کا نہیں بتایا مگر مزید ناانصافی برداشت نہیں کروں گی۔"

"ایک بات یاد رکھیے گا بابا جان کو بتائیں یا کسی اور کو۔ میں آپ کو چھوڑوں گا پھر بھی نہیں۔" یاور نے بڑے زور سے اس کے بالوں کی جھولتی لٹ کھینچی تھی۔ وہ سی کر کے رہ گئی۔

"چھوڑیں مجھے۔"

"آپ تو کمزور نہیں ہیں۔ چھڑا لیں۔" آبدار کا نازک وجود اس کی گرفت میں مچل گیا۔

یاور کی پر سحر قربت سے رہائی اتنی آسان نہیں تھی۔ لیکن اس نے اپنے حواس کو بہکنے نہیں دیا اور اس کا گھیرا توڑ دیا۔

"کیا کروں، آپ حرا اور تابش کے بیڈ روم میں چھپ کے بیٹھ گئی ہیں۔"

باہر نکلتے نکلتے اس نے پیچھے سے یاور کا شرارتی جملہ سنا۔ مگر دوبارہ پیچھے پلٹنے کی حماقت نہیں کی۔

☆ ☆ ☆

چٹ کی آواز کے ساتھ کمرا روشن ہوگیا۔ اور روشنی میں سب کچھ واضح ہوگیا۔ تابش، حرا اور آبدار تینوں سو رہے تھے۔ اس نے لائٹ جلائی کوئی بیدار نہیں ہوا۔ لگتا تھا کہ گہری نیند میں ہیں۔ یاور کھڑے ہو کر کچھ دیر دیکھتا رہا۔ اس کی بے ایمانی پہ وہ سلگ سا گیا۔

اب یہاں پہ سونے کی جگہ تو نہیں تھی۔ صوفے پہ سونے کا وہ عادی نہیں تھا۔ نما کر چینج کیا اور برابر والے کمرے میں آگیا۔

آبدار نے اس کے جانے کے بعد سکون کا سانس لیا۔ اسے نیند کہاں آنی تھی۔ کب سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کے آنے پہ وہ سوتی بن گئی تھی۔ شکر تھا کہ یاور نے زیادہ غور نہیں کیا تھا ورنہ اس کی پلکوں کا لرزنا ضرور یاور کے علم آجاتا۔

یاور سے پہلے اس کی زندگی میں صرف ابوبکر آیا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی مضبوط رشتہ، تعلق بننے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا تھا۔ اس تعلق کے ٹوٹنے کا اسے دکھ تھی ہوا تھا۔ لیکن اپنی بدنامی کا دکھ ناحق الزام تراشی کا دکھ اس دکھ پہ حاوی ہو گیا تھا۔ یاور کے ساتھ عجیب حالات میں شادی ہوئی تھی۔ اور یاور کے رویے نے اسے اپنی بے توقیری کا احساس دلایا دیا تھا۔ اس نے دل میں امیدوں کو جگہ نہیں دی تھی نہ خوش فہمیوں کی بارش میں بھیگی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک نرم و نازک جذبات رکھنے والی لڑکی بھی تو تھی۔ یاور کی شخصیت چھا جانے والی تھی۔ اسے دلوں پہ حکمرانی کرنے کا ہنر آتا تھا۔ آبدار کو خبر بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ دل پہ قابض ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فاروق چودھری کی طبیعت یک دم بگڑ گئی تھی اور اس کے پیچھے روبی بیگم کا ہاتھ تھا۔ اس نے فون کر کے براہ راست دھمکیاں دی تھی۔

"وہ یہ سب سن کر برداشت نہیں کر پائے تھے۔ ان کے تو اعصاب جواب دے گئے تھے۔ یاور انہیں شہر کے ہسپتال لے آیا تھا۔ آبدار نے بھی چلنے کی ضد کی تھی۔ پر یاور نے اسے گھر میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ وہ سوائے رونے کے اور دعا کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ فون کر کے فاروق چودھری کی خیریت کا پوچھ رہی تھی۔ یاور نے جھنجلا کر سیل ہی آف کر دیا۔ فاروق چودھری کو شدید قسم کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ وہ خود بہت اپ سیٹ تھا۔

اوپر سے فون پہ آبدار کی روئی روئی پریشان آواز سن کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ تابش اور حرا کی الگ ٹینشن تھی۔ اس نے حویلی کے تمام ملازموں کو الرٹ رہنے کو کہا تھا۔ ان کی ذرا سی غفلت اسے بہت بڑے نقصان سے دوچار کر سکتی تھی۔ ادھر بابا جان اکیلے تھے۔ ان کے پاس بھی کسی نہ کسی کا ہونا ضروری تھا۔

☆ ☆ ☆

دو دن بعد اپنے قابل اعتماد ملازم منیر کو بابا جان کے پاس چھوڑ کر خود حویلی آیا۔

آبدار اس کے آتے ہی صورت حال جاننے بابا جان کی طبیعت کا پوچھنے بھاگتی آئی۔ وہ اس وقت بھی ازحد پریشان تھی۔

"بابا جان کی طبیعت کیسی ہے؟ وہ ٹھیک تو ہیں نا؟ پاس کون ہے ان کے؟" ایک سانس میں اکھٹے کتنے سوال اس نے پوچھ ڈالے تھے۔

"بابا جان پہلے سے بہتر ہیں اور آپ کے لیے پیغام دیا ہے کہ آپ پریشان مت ہوں، وہ جلد آئیں گے اور ان کے پاس خاندان کے اور لوگ موجود ہیں وہ اکیلے نہیں ہیں۔"

اس نے بے حد رسان سے جواب دیا۔

"آپ دوبارہ کب جائیں گے؟" وہ امید بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں تین چار گھنٹے بعد دوبارہ جاؤں گا آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔"

"اگر آپ اپنے ساتھ مجھے بھی لے جائیں تو۔۔۔؟"

"نہیں آپ گھر پہ ہی رہیں تابش اور حرا کا خیال رکھیں۔ وہ بھی اکیلے ہیں۔ گھر کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ میرے کپڑے نکلوادیں کسی ملازم سے کہہ کر۔ میں جب تک امی جان کو دیکھ لوں۔"

آبدار نے اس کے کپڑے نکال کر اسے پکڑوائے۔

"یہ روبی بیگم کون ہیں؟ اس دن بھی ان کی کال آئی تھی تو بابا جان بہت غصے میں تھے اور اگر آپ کو جلدی نہ ہو تو آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" یاور اس کے منہ سے "روبی" کا نام سن کر ٹھٹک گیا۔ اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

"آپ بات کریں مجھے جلدی نہیں ہے۔" یاور نے کپڑے ادھر ہی رکھ دیے تھے۔

"آپ پہلے ہی بہت پریشان ہیں' یہ بات شاید آپ کی پریشانی میں اور اضافہ کردے۔"

"آپ فکر نہ کریں میری پریشانی کی اپنی بات کریں۔" اس کے غیر معمولی انداز سے لگ رہا تھا کہ ضروری بات ہی ہے۔

"اصل میں تابش کی طرف سے میں کچھ آپ سیٹ ہوں۔ وہ اپنی مما کا ذکر کرتا ہے۔ بعض اوقات رونے لگتا ہے ان کی مار پیٹ اور تشدد کا ذکر کرتا ہے اور بھی کچھ باتیں ہیں۔ میں لاعلم ہوں۔ تابش اور حرا کی مما کہاں ہیں؟"

"وہ ادھر ہی ہیں اور زندہ ہیں۔" یاور آہستگی سے بولا۔ اس کے لہجے میں تھکن در آئی تھی۔

"لگتا ہے میری باتوں سے آپ کو دکھ پہنچا ہے۔ یقین کریں' میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہے۔" یاور کے تاثرات نے آبدار کو نادم کردیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ مجھے دکھ پہنچا ہے۔ میں نے بھی حقیقت کو فیس کرنا سیکھ لیا ہے اور آپ کو فضول میں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کوئی ایسی۔۔۔۔"

یاور کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ اس کا سیل فون گنگنا رہا تھا۔ گل پری کی کال تھی۔ اس نے سیل آن کردیا۔

"کیسی ہو گل پری؟ میں بھی بس ٹھیک ہی ہوں۔ بابا جان ہسپتال میں ہیں بس یہی وجہ تھی۔ ہاں ہاں تم ٹینشن نہ لو پلیز!"

یاور کے لہجے میں اتنی اپنائیت اور فکر مندی تھی کہ آبدار اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ کچھ دیر بات کرکے اس نے فون بند کردیا۔ اب وہ بالکل فریش نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر پہلے والی تھکن کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یقیناً" کال کرنے والی ہستی بہت خاص الخاص تھی۔ آبدار اس کے بارے میں کچھ منفی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ پھر بھی خیالات تھے کہ ہلچل مچا رہے تھے۔

غالب چودھری' عارف چودھری کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ان کا لاڈلا۔ اس کی ہر خواہش پوری کی گئی تھی۔ ویسے بھی ضد اور منہ زوری اس کی عادات میں شامل تھی۔ زمانۂ طالب علمی میں اظفر ملک سے اس کی دوستی ہوئی تھی۔ اظفر ملک بھی اس کی طرح جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے بااثر باپ نے شہر میں پڑھنے کی غرض سے اسے اپنا بنگلہ لے کر دیا تھا۔ جہاں آئے دن پارٹیز اور ہنگامے ہوتے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی غالب چودھری اسی کی راہ پہ چل پڑا۔

انہی پارٹیز میں اظفر نے اس کی ملاقات روبی سے کروائی' مقبول اس کے کہ روبی کو ماڈلنگ اور ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے۔ اظفر ملک نے اس کے خاندان کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ روبی اظفر ملک کی ہر محفل' ہر گیدرنگ' ہر فنکشن میں آتی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ان محفلوں کا لازمی حصہ ہے۔ غالب کو پتا بھی نہیں چلا اور وہ آہستہ

آہستہ اس کا اسیر ہوتا گیا۔ اس کی دلچسپی دن بہ دن بڑھتی گئی۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی اس نے روبی کو شادی کی آفر کردی تھی۔ وہ بھی اتنی انجان اور بے خبر نہیں تھی۔ مگر وہ اس کے خاندان کا حصہ نہیں بن سکتی تھی۔ اظفر ملک کو پتا چلا تو اس پہ چڑھ دوڑا۔ پر غالب کسی بات کو بھی خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ اسے روبی کی ماں کے بیک گراؤنڈ یا اس کے باقی خاندان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دلچسپی تھی بھی تو روبی سے۔ عشق کی پٹی آنکھوں پہ بندھی تھی۔ اسے سوائے روبی کے کچھ اور نظر آتا بھی نہیں تھا۔ روبی کی والدہ محترمہ نگینہ بیگم نے شرط لگادی کہ اپنے گھر والوں کو راضی کرو عیں تب شادی کروں گی ورنہ پیچھے ہٹ جاؤ۔

غالب اس مشن پہ لگ گیا۔ گھر میں بھونچال آگیا پر وہ بھی اپنی ضد پہ اڑا ہوا تھا۔ ضد پوری نہ کرنے کی صورت میں خودکشی کی دھمکی تک دے ڈالی۔ حاجرہ خانم شوہر کی موت کا صدمہ اٹھائے ہوئے تھیں' جوان بیٹے سے محرومی گوارہ نہیں کرسکتی تھیں۔ ڈرتے ڈرتے فاروق چودھری سے درخواست کی کہ غالب کی ضد مان لی جائے۔ اندر سے وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ انہوں نے عزت اسی میں سمجھی کہ غالب کی بات مان لی جائے مگر انہوں نے یہ بات واضح کردی تھی کہ روبی کا شادی کے بعد اس کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہوگا نہ وہ ان سے ملے گی۔ خیر شادی دھوم دھام سے ہوئی سب کی موجودگی میں۔ غالب' روبی پہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ وہ اسے کتنا چاہتا ہے۔ وہ اسے اپنے لیے باعث عزت تصور کرتا ہے نہ کہ باعث رسوائی۔

غالب نے اس کی ضد پہ شہر میں خوب صورت گھر لیا دیا۔ جس کا فرنیچر' پردے' کارپٹ اور ہر چھوٹی بڑی چیز روبی کی پسند پہ خریدی گئی۔

شادی کا پہلا سال بہت اچھا گزرا' روبی نہ چاہتے ہوئے بھی تابش کی ماں بن گئی۔ اتنی جلدی ماں بننے پہ وہ جھنجلا رہی تھی پر غالب بہت خوش تھا۔ روبی بات بے بات لڑنے لگتی بغیر کسی وجہ کے۔ وہ اس کی ہر بات مانتا۔ خوش رکھنے کی کوشش کرتا' پھر بھی وہ اداس اور منہ پھلائے ہوئے رہتی۔ گھریلو حالات میں چخ چخ کی وجہ سے غالب اپنی توجہ کاروبار پہ مرکوز نہیں کرپا رہا تھا۔ ان ہی حالات میں غالب' حرا کا باپ بنا اور یہیں سے اس کے گھر کی مکمل تباہی کا آغاز ہوا۔

روبی نے چپکے چپکے اپنے خاندان سے تعلقات بحال کرلیے اور دونوں بچوں کو بھی ساتھ لے جانے لگی۔ گھر میں بھی اس کے پرانے کرم فرما آنے جانے لگے اور وہ' وہ خود بھی ایسی محفلوں کا پھر سے حصہ بننے لگی۔ غالب نے پیار سے ڈانٹ ڈپٹ سے سختی سے ہر طریقے سے سمجھایا پر روبی باز آنے والی نہیں تھی۔ غالب کی ان پابندیوں کا غصہ وہ تابش اور حرا پر ہاتھ اٹھا کر نکالتی۔ تابش سے تو اسے خدا واسطے کا بیر ہو چلا تھا۔ غالب کی غیر موجودگی میں تابش اس کے ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنتا۔

غالب کو کبھی کبھی اس کی ممتا پہ شک ہونے لگتا۔ روبی کی ماں نگینہ بیگم کو ایک دن گھر پہ ہاکے وہ چراغ پا ہوگیا۔ ان کے مطالبات پورے کرتے کرتے وہ عاجز آگیا تھا۔ روبی سے شادی کے موقعے پر بھی اس نے ان کے مطالبات پورے کیے تھے۔ اب وہ پھر سے منہ پھاڑ کر طلب کررہی تھی۔ غالب کی مالی حیثیت کافی اچھی تھی۔ نگینہ بیگم اس میں سے آدھا حصہ طلب کر رہی تھیں گھر کے سکون کے لیے' وہ یہ بھی کرنے کے لیے تیار تھا لیکن روبی بیگم کو اس نے ایسی حالت میں دیکھا کہ سب کچھ بھول گیا۔ روبی طلاق کا مطالبہ کررہی تھی مگر غالب اپنی محبت کے ہاتھوں ابھی بھی مجبور تھا۔ وہ اس کے بچوں کی ماں تھی اس کی پہلی محبت تھی وہ اسے خود سے الگ کرنے کا حوصلہ نہیں پاتا تھا۔

غالب ایک میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور دو دن پہلے واپس آگیا۔ یہاں روبی' اکبر سلطان کے ساتھ موجود تھی وہ بزنس لائن میں نیا نیا آیا تھا۔ روبی دوستی کے بہانے قریب ہوئی تھی۔

غالب کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ دونوں بچے بیڈ روم میں بند تھے اور دروازہ ہاہر سے لاک تھا۔ غالب

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

سیدھا اپنے بیڈ روم میں آیا۔ الماری کے نچلے خانے سے اپنا ریوالور نکالا۔ جو فلی لوڈڈ تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے روبی نے اکبر سلطان کو چلتا کیا اور خود چھپ گئی۔

غالب نے ریوالور اپنی کنپٹی پہ رکھا اور زندگی کی قید سے چند ثانیوں میں ہی خود کو آزاد کر دیا۔ روبی سخت خوف زدہ تھی۔ اس نے وہیں سے ٹیکسی لی اور نگینہ بیگم کے پاس آگئی۔ دونوں بچے اور غالب کی لاش اسی حال میں پڑی تھی جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ بعد میں حرا اور تابش کی چیخوں اور شور نے پڑوسیوں کے چوکیدار کو متوجہ کیا۔ کیونکہ روبی نے گھر کے تمام نوکروں کو دو دن کی چھٹی دی ہوئی تھی۔

خون میں لت پت غالب کو ہسپتال پہنچایا گیا اور ساتھ ہی فاروق چودھری کو بھی اطلاع دے دی گئی۔ بہت بڑا سانحہ تھا۔ اپنی عزت اچھلنے کے خوف سے فاروق چودھری نے پولیس کو بھاری رقم دے کر اس خودکشی کو طبعی موت میں بدل دیا تھا۔ یاور کو بھی شروع میں یہی بتایا گیا کہ غالب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور وہ ہسپتال میں ہے۔ روبی غالب کا آخری دیدار بھی نہ کر سکی۔

یاور پاگلوں کی طرح روبی کو ڈھونڈ پھر رہا تھا۔ نگینہ بیگم نے اسے دبئی بھجوا دیا تھا' غالب سے اس نے اتنا کچھ سمیٹا تھا کہ بڑے آرام سے دبئی جیسے پُرتعیش شہر میں چار پانچ سال کچھ بھی کیے بغیر گزار سکتی تھی۔

حالات معمول پر آئے تو نگینہ بیگم نے ہی بیٹی کو مشورہ دیا کہ تمہارے بچے ان کی تحویل میں ہیں تم اب بھی ان سے بہت کچھ سمیٹ سکتی ہو۔ سو وہ واپس آگئی۔ اب وہ کال کر کے حویلی والوں کی پُرسکون زندگی کو پھر سے اجیرن کرنے کے درپے تھی۔

فاروق چودھری پرانے زمانے کے وضع دار انسان تھے' جبکہ یاور کی رگوں میں جوانی کا جوش اور خون تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا اگر روبی بیگم اس کے سامنے آگئی تو وہ چھوڑے گا نہیں۔ فاروق چودھری اسی بات سے ڈرتے تھے۔ غالب کے بعد وہ اسے گنوانا نہیں چاہتے تھے' روبی فی الحال صرف دھمکیاں دے رہی تھی' ابھی اس نے کوئی ڈیمانڈ نہیں کی تھی۔ آخری حد تک پہنچا کر اس نے ڈیمانڈ کرنی تھی اور یقیناً" فاروق چودھری نے تابش اور حرا کی خاطر اس کی ڈیمانڈ پوری کر دینی تھی۔

وہ ان کی حفاظت پہ سخت توجہ دے رہے تھے۔ گن مین اور باڈی گارڈ کے ساتھ وہ اسکول جاتے۔ ان کی نارمل بچوں والی سرگرمیاں ختم ہو گئی تھیں۔ یاور اس بات پہ اندر ہی اندر کڑھتا۔ ادھر یاور چودھری محسوس کر رہے تھے کہ بچوں کو ایک عورت کے وجود اور محبت کی بھی ضرورت ہے۔ حاجرہ بیگم خود معذور تھیں وہ کمزور تھے۔ یاور گھر میں چوبیس گھنٹے بیٹھ کر انہیں ٹائم نہیں دے سکتا تھا۔ ان کے ذہن میں یاور کی شادی کی تجویز آئی۔

حرا اور تابش گزشتہ حالات کے خوف کے زیرِ اثر تھے۔ فاروق چودھری نے اس کی توجہ اس سمت دلائی تھی۔ وہ کیا کر سکتا تھا۔ پہلے ہی اتنے دکھی اور مایوس تھے۔ انکار کر کے انہیں اور زیادہ دکھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گل پری اس کی زندگی میں آکر حرا اور تابش کے ساتھ اس کے خوابوں کی بھی تکمیل کرے گی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

پھر اس نے خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ دیا تھا۔

آبدار اس کی زندگی میں مضبوط حوالہ لے کر داخل ہوئی تھی۔ اور اب گل پری سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ٹوٹے خوابوں کا سلسلہ پھر سے جوڑنا چاہتی تھی۔ اور یاور کی زندگی ابھی بھی پھولوں کی سیج نہیں تھی۔ فاروق چودھری روبی کی دھمکیوں سے خائف تھے۔ انہیں ہر پل یہی دھڑکا لگا رہتا کہ وہ غالب کی نشانیوں کو ان سے چھین لے گی۔ یاور اپنے تعلقات استعمال کر کے روبی سے کڑا انتقام لے سکتا تھا۔ فاروق چودھری نے یاور کے آگے ہاتھ جوڑ کر ایسی کسی بھی کارروائی سے منع کر دیا تھا۔ وہ نگینہ جیسی بدفطرت عورت کے خوف سے یاور کو بچوں سمیت شہر

بھی منتقل ہونے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

تابش' حرا اور آبدار کے بچپن کے حالات محرومیوں کے سلسلے میں ایک جیسے تھے۔ شاید اس لیے بھی وہ بہت جلد جذباتی طور پہ آپس میں قریب آئے تھے۔ اس قربت نے فاروق چودھری کو جتنا سکون بخشا تھا وہ ہی جانتے تھے۔

☆ ☆ ☆

فاروق چودھری گھر آچکے تھے۔

"بابا جان! موسم بدل رہا ہے۔ میں نے آپ کے گرم کپڑے نکلوا دیے ہیں اور یہ گرم پانی کی بوتل بھی لے آئی ہوں ٹکور کے لیے۔" وہ ان کے بیڈ پہ بیٹھ گئی تھی۔ فاروق چودھری' یاور کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ بوتل تھما کر چلی گئی تھی۔

"تم نے دیکھا آبدار کتنا خیال رکھ رہی ہے میرا اور بچوں کا بھی۔ تم نے دیکھے میرے فیصلے کے دور رس ثمرات۔" انہوں نے یاور سے تائید چاہی۔ وہ فقط سر ہلا کر رہ گیا۔ آبدار کا ذکر جب بھی اس کے سامنے اچھے الفاظ میں کیا جاتا وہ یوں ہی بیگانگی کا مظاہرہ کرتا تھا۔

انہیں خبر نہیں تھی کہ یاور آج کل اندر ہی اندر کس مشکل کا شکار ہے۔ آبدار کے بارے میں اسے ہلکے پھیکے لفظوں میں جو کچھ بتایا گیا تھا اس نے اسے مشکوک کر دیا تھا' پھر طلاق کا مطالبہ کیا گیا اس کی وجہ بھی سامنے نہیں آئی تھی۔

یاور نے اتنے عرصے میں اس کے کردار میں کوئی جھول نہیں پایا تھا۔ دوسری طرف گل پری تھی اس سے محبت کی دعوے دار اور سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار۔

وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کی پریشانی کسی کے علم میں نہ آنے پائے۔

☆ ☆ ☆

ویک اینڈ تھا۔ تابش اور حرا ہلے گلے کے موڈ میں تھے۔ ناشتے کے بعد وہ آبدار کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کھڑے ہو گئے۔ یاور دیر تک سوتا رہا تھا۔ آبدار بولنگ کرا رہی تھی تابش کھیل رہا تھا۔

یاور نے ناشتہ کمرے میں ہی منگوایا۔ اس کا سر بھاری بھاری اور طبیعت کسلمندی کا شکار تھی۔ ناشتے میں صرف چائے لینے کے بعد وہ پھر لیٹ گیا۔ اس کی کھڑکی کے راستے آبدار کے ساتھ ساتھ تابش اور حرا کی آوازیں بھی یہاں تک آرہی تھیں۔ وہ مل کے انجوائے کر رہے تھے۔ کافی دیر وہ سنتا رہا' آخر رہا نہیں گیا تو کھڑکی میں کھڑے ہو کر آبدار کو آواز دی۔ دوپٹہ کمر کے گرد باندھے الٹی کیپ پہنے اپنے تئیں وہ بڑی عظیم پلیئر بنی ہوئی تھی۔

"لوک فرینڈز! میں آپ کے چاچو کی بات سن کر آتی ہوں جب تک آپ کھیلیں۔" آبدار نے بیٹ تابش کو پکڑا دیا۔ یاور سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ وہ پورے دس منٹ بعد آئی تھی۔ یاور کو یہ دس منٹ کا انتظار کچھ زیادہ ہی محسوس ہوا تھا۔

"مل گیا آپ کو ٹائم میرے لیے۔" یہ جارحانہ پن' یہ غصہ' یہ انداز آبدار کے لیے نیا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ میری طبیعت کچھ اپ سیٹ ہے میں تنہائی محسوس کر رہا تھا۔" آبدار کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کر اس نے فوراً" وضاحت دی تو اسے ہنسی آگئی۔

"آپ سب کے ساتھ اگر بیٹھیں' یوں اکیلے کمرے میں بند رہ کر اپ سیٹ ہی ہوں گے آپ۔" پہلی بار آبدار نے اس کے ساتھ بزرگانہ انداز اپنایا تھا۔ یاور غور سے دیکھنے لگ گیا۔ پنک پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس دوپٹہ بالوں کی الجھی لٹوں سمیت وہ اپنی طرف سے کافی لاپرواسی لگ رہی تھی۔ یاور کی نگاہوں نے ہی اسے احساس دلایا تھا کہ وہ کھلتے کھلتے جس حال میں تھی اسی حال میں اٹھ کر چلی آئی ہے۔ جلدی سے دوپٹہ کھول کر اوڑھا اور کیپ اتار کر پرے رکھی۔

"بال آپ کے کافی خوب صورت اور لمبے ہیں۔" اس کی تعریف میں سچائی تھی۔ آبدار شرما سی گئی۔

"گل پری کے بال آپ کی طرح لمبے نہیں ہیں مگر

خوب صورت ہیں۔" شاید بے دھیانی میں گل پری کا ذکر اس کے لبوں پہ آیا تھا۔ آبدار جی جان سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "یہ گل پری صاحبہ کون ہیں؟" اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے لہجے سے دلچسپی نہ ظاہر ہو۔

"میری کلاس فیلو رہی ہے۔ اور میری محبت بھی ہے میں بہت جلد شادی کرنے والا ہوں گل پری سے۔"

یاور بہت عام انداز میں بتا رہا تھا۔ جیسے ٹی وی پہ موسم کی خبروں کا احوال سنا رہا ہو۔ آبدار کے دل کو دھچکہ سا لگا۔

"اگر آپ کو ان سے محبت تھی تو آپ نے پہلے ان سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"شادی میں نے اسی سے کرنی تھی وہ اپنے اور میرے درمیان کسی تیسرے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی جبکہ بابا جان ایسی لڑکی کی تلاش میں تھے جو تابش اور حرا کی محرومیوں کا خلا پر کردے۔ وہ اس کے لیے راضی نہیں تھی۔ وہ مجھے کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرسکتی تھی۔ شادی کے بعد زندگی کا ہر پل میرے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔"

یاور آرام سے بتا رہا تھا۔ آبدار اس زاویے پہ بیٹھی تھی کہ کھڑکی سے آتی دھوپ کا سایہ اس کے چہرے پہ پڑ رہا تھا۔ اور اس کا چہرا دل کی کہانی سنا رہا تھا۔

"پھر اس کے بعد؟" آبدار نے آنسو اپنے اندر ہی اتار لیے۔

"پھر اس کے بعد یہ کہ بابا جان اور حرا، تابش کی محبت جیت گئی اور آپ سے بابا جان بہت خوش ہیں۔ آپ نے ہمارے گھر کو سمیٹ لیا ہے۔ اماں جان آپ سے خوش ہیں۔" یاور نے جان کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ آبدار کی آنکھوں میں پھیلتی نمی اس کی نگاہوں سے محفوظ نہیں رہی تھی۔

"گویا آپ مجھے ایک ضرورت کے تحت اس گھر میں لائے تھے ہے نا؟" یاور کی خاموش نگاہوں نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

"آپ اور آپ کی گل پری دونوں محبت کرتے تھے بلکہ کرتے ہوں گے۔ تو کیا آپ دونوں میں جو محبت تھی اس محبت کے واسطے آپ انہیں مجبور نہیں کرسکتے تھے شادی کے لیے۔"

"اب وہ راضی ہوگئی ہے۔" یاور نے خوشی سے بتایا۔

"وہ بچوں کو برداشت نہیں کرسکتی تو مجھے کیسے کریں گی؟"

"اس کا انتظام بھی ہوگیا ہے۔ میں گل پری کو یہاں نہیں رکھوں گا۔ آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اس کے بدلے میں بھی آپ کے لیے بہت کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ بھلا میرے لیے کیا کرسکتے ہیں۔" اس کی آنکھوں کی نمی اب آواز میں بھی در آئی تھی۔

"آپ بتائیں تو سہی۔"

"میں اسی گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس نام نہاد رشتے سے آزاد مت کیجیے گا۔ یہ رشتہ مجھے یاور کے سکون کا سانس لیا ہے۔ میں ان کے سکون کو تباہ نہیں کرسکتی۔ یوں لگا ہے واقعی میں اور میری عزت یہاں محفوظ ہے۔ باسط بھائی کے عفریت سے میری جان چھوٹ گئی ہے۔ وہاں اب بڑے ابا نہیں ہیں جو میری حفاظت کریں گے۔ ممانی خود کمزور عورت ہیں۔ ابو کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی ممانی ڈر ڈر کے زندگی گزاری۔ مجھے بھی یہی درس دیا۔ ممانی اور چچیوں سے دبتی آئی ہیں۔ پھوپھو میرا رشتہ مانگ رہی تھیں۔ رحمہ چچی اور صوفیہ چچی دونوں سے برداشت نہیں ہوا۔" پھر آہستہ آہستہ وہ سب بتاتی چلی گئی۔

"تمام حالات آپ کے سامنے ہیں۔ آپ ضرور شادی کریں لیکن مجھے ادھر ہی پڑا رہنے دیں۔ حرا اور تابش پہلے کی طرح میری ذمہ داری ہی رہیں گے۔"

آبدار کی زبان سے نکلے انکشاف در انکشاف نے یاور کے دماغ کو ماؤف سا کر ڈالا۔ وہ آج اس پر منکشف ہوئی تھی۔ جانے آج کس کمزور لمحے کی گرفت میں آکر اس نے اپنا آپ عیاں کر ڈالا تھا۔

"اور میری آپ سے درخواست ہے کہ میری سچائیوں کو میرے لیے سزامت بنا دیجیے گا۔" آبدار اب ان سے زیادہ صبر کا مظاہرہ نہیں کرسکتی تھی۔ سو اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔

وہ بند دروازے کو حیرت سے تک رہا تھا۔ فریق ثانی کی زبان سے آج اس نے تصویر کا دوسرا رخ دیکھا تھا۔ بھیانک رخ۔

یاور کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ گل پری فون پر فون کیے جا رہی تھی۔ اس نے جھنجلا کر سیل فون کارپٹ پہ دے مارا۔ اس وقت وہ کسی سے بھی بات کے موڈ میں نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

پلوشہ بھی گل پری کے ساتھ تھی۔ یاور ان کے پاس سے اٹھ کر جا چکا تھا۔ پلوشہ کے بازو گل پری کے گرد حمائل تھے۔ وہ اس کے کان میں دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہی تھی لیکن گل پری کو اس کا کوئی بھی لفظ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ رات سے یاور کو مسلسل تنگ کر رہی تھی۔ وہ پلوشہ کے کہنے پہ آیا تھا۔ گل پری کو اپنی جیت پہ سو فی صد سے بھی زیادہ یقین تھا۔ وہ خوب مچ سنور کے آئی تھی۔

"یاور! مجھے پتا تھا کہ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بہت غرور سے دیکھ رہی تھی۔ یاور کے تصورات میں دو آنسو سے بھری لرزتی کانپتی آنکھیں زندہ ہوگئیں۔ اس نے سر جھٹک کر ان آنکھوں کے سحر سے بہ مشکل خود کو نکالا اور گل پری کی طرف متوجہ ہوا۔

"یاور تمہیں اپنی بیوی کو طلاق دینی ہوگی ہم تب ہی ایک ہوسکیں گے۔"

یاور کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"گل پری میں تم سے شادی نہیں کرسکتا اس لیے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں بہت دن سے تم سے یہی بات کہنا چاہ رہا تھا۔ درمیان میں بابا جان کی طبیعت خراب ہوگئی ورنہ میں تمہیں پہلے ہی انفارم کردیتا۔ دو دن پہلے ہی میں نے تمہیں یہ بات فون پہ کہہ دینی تھی مگر پھر مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے خود آیا ہوں تم کسی بھی اچھے سے شخص سے شادی کرسکتی ہو۔ میں بابا جان، آبدار، تابش و حرا سمیت کسی کو بھی اپنی لائف سے نہیں نکال سکتا۔ اس معصوم اور سادہ دل لڑکی نے مجھ سے مطالبہ نہیں کیا ہے۔ میں نے یہ بات اسی سے سیکھی ہے کہ صرف اپنے لیے اپنی ذات کی خاطر نہیں جینا چاہیے۔ اپنی ذات سے باہر نکل کر دیکھو۔ اس حد سے آگے بھی بہت کچھ ہے۔"

گل پری کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یاور اس سے یہ سب کہہ کر گیا ہے۔

وہ جا چکا تھا۔ پلوشہ اسے واپس گاڑی تک لائی۔ پلوشہ کو یقین تھا کہ یاور نے اسے جو آئینہ دکھایا ہے۔ اس آئینے میں اسے اپنی خود غرضی ضرور نظر آئے گی اور شاید وہ اپنا احتساب کرسکے۔ اس احتساب کے بعد ایک نئی گل پری کو جنم لینا تھا۔

"رات کو پاپا نے فرحان کو ڈنر پہ انوائٹ کیا ہے۔ پاپا کے دوست کا بیٹا ہے۔ کہتے ہیں اس سے مل لو پھر مجھے بتانا کہ تمہیں کیسا لگا ہے۔ پاپا کہتے ہیں اس کا فیوچر بہت شان دار ہے۔" گل پری نے ہاتھ کی پشت سے آنکھ میں آنسو صاف کر ڈالے تھے۔

گل پری، یاور کے خیال کو جھٹکتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔ گاڑی واپسی کا سفر کر رہی تھی۔ واپسی کا سفر گل پری کے لیے مشکل تو تھا مگر ناممکن نہیں۔

یاور پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت مطمئن اور پرسکون تھا۔ گل پری نے تو آج اور ابھی کچھ دیر پہلے آبدار کو طلاق دیے جانے کا مطالبہ کیا تھا لیکن اس سے پہلے ہی یاور گل پری کا صاف جواب دینے کی سوچ رہا تھا کہ وہ اسے اپنی زندگی میں شامل نہیں کرسکتا۔

پری گل کی خود غرضی اور سفاکی نے بہت کچھ بتا ڈالا تھا۔

اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ اب اس کے دماغ اور

اعصاب پہ کوئی دباؤ نہیں تھا۔ وہ آبدار کو مکمل اور بھرپور چاہتوں سمیت اپنانے کے لیے تیار تھا۔

☆ ☆ ☆

روبی کھل کر سامنے آگئی تھی۔ وہ توغصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ "میں اس عورت کو نہیں چھوڑوں گا۔ غالب بھائی اسی کی وجہ سے موت کے منہ میں گئے۔ اب یہ کیا چاہتی ہے۔"

"ایزی بیٹا! ہوش سے کام لو۔ ان جیسی عورتوں کا مقصد صرف اور صرف پیسہ ہوتا ہے۔ وہ اگر پیسے لے کر ہماری زندگیوں سے نکل جائے تو یہ خوشی کی بات ہے۔ میں ان بچوں کا صدقہ سمجھ کر دے دوں گا؟" فاروق رسمان سے بولے۔

"لیکن بابا جان!" اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر خاموش کروادیا۔

"تمہیں کیا پتا کتنی محبتوں سے تمہیں پروان چڑھایا۔ بخدا میں روبی یا نگینہ بیگم جیسی بدقماش عورتوں سے نہیں ڈرتا صرف اور صرف اپنی عزت سے ڈرتا ہوں۔ ورنہ ان عورتوں کا انتظام کرنا مشکل نہیں ہے۔ مت بھولو کہ روبی غالب کی محبت وچاہت اور بیوی تھی۔ وہ جیسی بھی ہے بھابھی ہے تمہاری۔ اسی وجہ سے میں کمزور پڑ جاتا ہوں۔ غالب خود موت کے منہ میں چلا گیا لیکن روبی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ تو میں بھی روبی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہو سکتا ہے ایک دن اسے خود ہی احساس ہو جائے۔ شاید اس بار وہ سمجھ جائے۔"

ان کی خوش فہمیوں کی کوئی بھی حد نہیں تھی۔ یاور دیکھ کر رہ گیا۔ انہوں نے اس کی نگاہوں میں ڈولتی بے اعتباری بھانپ لی تھی۔

"ٹھیک ہے بابا جان! آپ جو بھی کریں لیکن میں اپنے بھائی کی قاتل کو معاف نہیں کر سکتا۔"

☆ ☆ ☆

فاروق چودھری حیرانی سے اخبار دیکھ رہے تھے۔ نگینہ اور روبی کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ روبی نے غالب کے بعد ایک اور شادی کر لی تھی۔ وہ دبئی میں رہتا تھا۔ شادی کے بعد بھی پرانی عادتیں کہاں چھوٹنے والی تھیں۔ دربردہ کچھ اور لوگوں سے بھی اس کے تعلقات تھے۔ وہ یہاں فاروق چودھری سے ملنے آئی تھیں۔

یہاں آنے کے بعد اس کے پرانے عاشق بھی آنے لگے تھے۔ اس کا شوہر دبئی سے اچانک آیا تو اس نے روبی کو اس کے عاشق کے ساتھ نازیبا حالت میں دیکھا تو برداشت نہ کر سکا اور اس کو گولی مار دی۔ نگینہ سامنے آئی تو وہ بھی نشانہ بن گئی۔

فاروق چودھری کے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا ہے؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے یاور کو دیکھ رہی تھی۔ جو اس کی طرف کچھ بڑھا رہا تھا۔

"ایڈمیشن فارم ہے۔ میں نے یونیورسٹی میں آپ کا ایڈمیشن کروایا ہے۔"

"لیکن کیوں؟ میں نے آپ کو کہا بھی تھا کہ میں نہیں پڑھ سکتی فی الحال۔ میں نے بابا جان اور اماں جان کو بھی دیکھنا ہوتا ہے۔ حرا اور تابش بھی ہیں۔ اور جب میری ذمہ داریاں کچھ کم ہوں گی میں پرائیویٹ طور پہ تیاری کر کے امتحان دے لوں گی۔ فی الحال نہیں۔" وہ قطعیت سے بولی۔

"آپ بات پوری سنتی نہیں ہیں بولنا شروع ہو جاتی ہیں۔ آپ کا ایڈمیشن بطور پرائیویٹ امیدوار ہوا ہے ریگولر نہیں۔ حرا اور تابش کے لیے جو کچھ کر رہی ہیں وہ کافی ہے۔ آپ کا بوجھ کم کرنے کی میں نے کوشش کی ہے اور ان کے لیے ٹیوٹر کا انتظام کیا ہے۔

اور سب سے ضروری بات کرنا تو میں بھول گیا ہوں۔ آپ اب حرا اور تابش کے روم میں سونا چھوڑ دیں۔ بابا جان کو پتا چل گیا ہے۔" آبدار پریشان ہو گئی تھی۔ اپنی طرف سے تو وہ پوری پوری کوشش کرتی تھی کہ کسی کو بھی خبر نہ ہو۔ پتا نہیں کیسے یہ بات ان

تک پہنچی تھی۔

"یہ وقت سوچنے کا نہیں ہے۔ اس پرابلم کا حل ڈھونڈیں۔" یاور اسے ڈرا رہا تھا۔

"لیکن حرا اور تابش میرے بغیر کیسے رہیں گے۔ انہیں عادت پڑ گئی ہے میری۔" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"عادت تو کسی اور کو بھی آپ کی پڑ گئی ہے نہ چاہتے ہوئے بھی۔" یاور بہت آہستہ بولا تھا۔ وہ سن ہی نہیں پائی۔

"اب میں کیا کروں؟"

"آپ اپنا سامان اٹھائیں اور چلیں اپنے بیڈ روم میں۔ میں ڈیکولا نہیں ہوں، جو آپ کا خون پی جاؤں گا۔"

"جی۔" اس نے حیرانی سے نگاہیں اٹھائیں۔ یاور کی بے باک شریر نگاہیں اسی پہ جمی تھیں۔ اس کی دھڑکنیں صرف ایک کہانی کے لیے قابو سے باہر ہوئیں۔

"مگر حرا اور تابش..." اس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"آپ جائیں۔ میں انہیں سمجھا لوں گا۔"

"اچھا!" وہ خاصی بددل لگ رہی تھی۔ یاور نے بہ مشکل اپنے قہقہے کا گلا گھونٹا۔

☆ ☆ ☆

اپنی مما کے بلانے پر آبدار گھر آئی تو ادھر سناٹا بول رہا تھا۔ وہ ہول سی گئی۔ کوئی بھی سامنے نظر نہیں آرہا تھا سوائے چوکیدار کے۔ وہ مما کی طرف آئی۔ وہ پریشان سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ یاور نے اسے راستے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مما نے بتایا کہ تایا اور دونوں چچا کی فیکٹریوں کو حادثاتی طور پہ رات کو آگ لگ گئی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ تینوں کی تینوں فیکٹریوں کو اٹھتے آگ لگی تھی۔ ان میں موجود کروڑوں کا سامان اور مشینری جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ آگ پر ابھی بھی قابو نہیں پایا جا سکا تھا۔

فیکٹریوں اور مشینری کی انشورنس بھی نہیں ہوئی

موٹاپے سے نجات

کہا جاتا ہے کہ ہر بیماری کی جڑ پیٹ کی خرابی ہے، موٹاپا اور پیٹ کا بڑھ جانا خواتین کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اسی طرح چہرے پر مہاسے، کیل، جھائیاں بھی پیٹ کی خرابی سے ہوتی ہیں۔

خواتین کے ان تمام مسائل کا حل موٹاپا، پیٹ کا بڑھ جانا، معدے کی گرانی و تیزابیت۔ کیل مہاسے، چھیپ، جھائیاں دور کرے

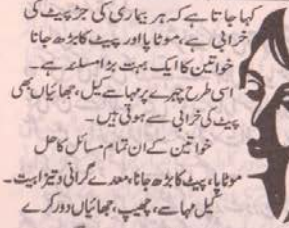

نایاب جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ

WAHID's

JAUHAR-E-HAZAM®

واحد کا جوہر ہاضم

قیمت =/80 روپے

کراچی

خواجہ اسٹور ایس مارکیٹ صدر
بزم اتحاد ہومیو طبیہ ایوان سعید آباد
صدر ریڈیو پاکستان ایس مارکیٹ
گلشن میڈیکل اسٹور نیپل روڈ
سلیٹی پبلی اسٹور نیو ٹی 8637859
ہادی ہومیو اسٹور نارتھ ناظم آباد
ال آبادیہ کوئین لائن کراچی گلستان جوہر
پاک طبی دواخانہ مولیٰ گوٹھ گلشن اقبال
ظفر ریڈ و اسٹور
عرفان تاری دواخانہ ایس مارکیٹ لالو کھیت
ال سید میڈیکل ہالم نمبر 2
ہمدرد دواخانہ
ماہر دواخانہ ابراہیم زرد پریس روڈ
مطاہر میڈیکل ہومیو ٹی 8 واحد ایس مارکیٹ
سکھر
یونانی حکیم محمد رضا صافی محلہ
شفیق نظامی ٹیم کی چاڑی
جمیل دواخانہ پان منڈی گھنٹہ گھر
صادق بک
العاصر جنرل اسٹور فیصل بازار
خان ہومیو کارنر
پبلک ہومیو میڈیکل اسٹور
نیو ہمدرد دواخانہ
جہانگیر
الہ دین ہومیو ہال لیلیٰ فرنیچر
چاند ہمدرد دواخانہ مین بازار

رحیم یار خان

شافی دواخانہ نشتر بازار
طاہر ہومیو اسٹور ہاتو بازار
جہانگیر
شیر دواخانہ شاہی بازار
سلیم
سپر ہومیو اسٹور گھنٹہ گھر
الحفاظ بکاری ایریا گھنٹہ گھر
گلزار دواخانہ حسین آگاہی چوک
بابا فرید دواخانہ
ابن سینا دواخانہ پاک کی گھنٹہ گھر
ہمدرد دواخانہ
عرفان دواخانہ
ایم رضوان پنسار خوارہ چوک
خان دواخانہ
حیات دواخانہ کچہری بازار
سلیم دواخانہ
الفرید ہومیو ہاؤس اسٹریٹ
چشتیہ دواخانہ صدر بازار
فضل
جناب ہومیو میڈیکل بازار گھنٹہ گھر
نیو ہمدرد دواخانہ
قدیر ہومیو طبی دواخانہ کچہری بازار
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ اسماعیل مارکیٹ
شہید ہمدرد

لاہور

خان جی اسٹور بازار منڈی شالامار گیٹ
خان پبلک اسٹور نیلا پک انکھین روڈ
طیب جاوید دواخانہ صدر روڈ کینٹ بازار
علی ہومیو اکیمرہ شاپنگ سینٹر
ایس ایس الکبرا 22 گلبرگ اتھال روڈ
عمر اللہ بخار پرچک شیخم خانہ بازار
ہمدرد
بازار شادمان نمبر D3/89 ہربرٹ بازار
0333--5203553
ہمدرد دواخانہ ہمدرد روڈ
سلیم ہومیو کارنر خانوں بازار
علی ہومیو سنٹر ہمدرد وحدت روڈ
ہمدرد دواخانہ ہمدرد روڈ
ہمدرد دواخانہ ہمدرد روڈ
ہمدرد دواخانہ ہمدرد

تھی، ورنہ شاید اتنا نقصان صرف مالکوں کو ہی نہ برداشت کرنا پڑتا۔

اس حادثے سے عاشر احمد کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ جلال اور یاسر کی حالت بھی ان سے الگ نہیں تھی۔ سارا سرمایہ ڈوب گیا تھا آگ میں راکھ ہو گیا تھا۔ کنزہ کو بہت افسوس ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایک کو تسلی دے رہی تھیں۔

پولیس میں اس واقعے کی رپورٹ درج کروا دی گئی تھی۔ اب تک کی تفتیش کی روشنی میں جو سامنے آیا تھا اس نے بہت کچھ واضح کر دیا تھا۔ فیکٹریوں میں آگ عاشر احمد، یاسر احمد اور جلال احمد کے مشترکہ کاروباری حریف نے لین دین کے تنازعے پہ انہیں سبق سکھانے کے لیے خود لگوائی تھی۔ وہ اب اپنے اہل خانہ کے ساتھ روپوش تھا اور اس بات کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ سامنے آکر اپنا جرم قبول کرے گا۔ کیونکہ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ ملک سے باہر جا چکا ہو گا۔

☆ ☆ ☆

اسے اپنی ممما کے گھر آئے کافی دن ہو چکے تھے۔

وہ سو رہی تھی جب آوازوں سے اس کی آنکھ کھلی۔ تابش اس کے دروازے سے جھانک رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ تابش اندر آ رہا تھا۔

"دلہن آنٹی! ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔" وہ محبت سے اس سے لپٹ گیا۔ آبدار نے بھی بڑی محبت سے اس کا ماتھا چوما۔

"اور کون کون آیا ہے؟"

"میں حرا اور بابا جان آئے ہیں۔" اسے مایوسی سی ہوئی۔ تابش اچھلتا کودتا باہر بھاگ گیا تھا۔

آبدار منہ ہاتھ دھو کر بابا جان کے پاس چلی آئی۔ وہ اس کی غیر حاضری پہ گھر کی اداسی سے پریشان تھے۔ اس لیے خود چلے آئے تھے۔ آبدار نے رات کا کھانا تیار کیا۔ وہ کچن میں ہی تھی۔ تائی اماں کی آواز آ رہی تھی۔ فاروق چودھری فیکٹریوں میں آگ لگنے والے حادثے کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔ آبدار نے سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد عشاء کی نماز پڑھی۔ دعا مانگنے کے بعد ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا تھا۔

آبدار اپنی ممما کو گڈ نائٹ کہہ کر واپس مڑ رہی تھی، جب انہوں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ تکیے کے پاس سے کوئی چیز اٹھا کر انہوں نے اس کی طرف بڑھائی۔ تب آبدار نے دیکھا یہ وہی چمڑے کا بیگ تھا جو بڑے ابا نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے کنزہ کو دیا تھا۔

آبدار، کنزہ کے بغیر کچھ بولے ہی بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ یہ ان کا حق تھا جو انہیں واپس مل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

صبح ناشتے کے بعد فاروق چودھری نے جانے کی تیاری کر لی تھی۔ ڈرائیور ان کے انتظار میں تھا۔ آبدار جا کر سب سے ملی۔ تائی اماں، باسط بھائی، عمارہ بھابھی، رحمہ اور صوفیہ چچی سمیت دونوں چچا، جنک نادم اور شرمندہ سے تھے۔ مگر اس کے دل میں کوئی کدورت، میل اور ناراضی نہیں تھی۔

آج یاسر احمد اور جلال احمد نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر دعائیں دے کر بیٹی کی مانند رخصت کیا تھا۔ عاشر احمد، ثایا ابو ابھی تک ہسپتال میں ہی تھے۔ ورنہ ان سے بھی وہ لازمی مل کر جاتی۔ کنزہ نے حفاظت کی دعا پڑھ کر پھونکی۔ ڈرائیور اور فاروق چودھری انہیں دیکھ رہے تھے۔ آبدار گاڑی میں بیٹھ گئی۔ کنزہ کے ساتھ ساتھ گیٹ پہ دونوں چچا، تائی اماں، رحمہ اور صوفیہ چچی بھی کھڑی تھیں۔

سارا منظر بہت بھرپور اور مکمل تھا۔

☆ ☆ ☆

واپسی پہ یاور کا بیڈ روم لاک ملا۔ جانے سے پہلے وہ اپنے استعمال کی تمام چیزیں نکال کر ادھر رکھ کر گئی تھی یاور کا انتظار کرنا تھا۔ وہ حاجرہ خانم کی طرف آ گئی۔ ان کی خیر خیریت پوچھی اور باتیں کرتی رہی۔ تابش نے ہی آ کر بتایا کہ چاچو آ گئے ہیں۔ اس نے

سکون کا سانس لیا۔

دروازہ ابھی تک لاک تھا۔ وہ بند دروازے کے سامنے کھڑی اس کا سبب سوچ رہی تھی۔ جب یاور کی جانی پہچانی مخصوص قدموں کی چاپ اس کے قریب آ رکی۔ "دروازہ لاک کیوں ہے؟"

"دعا نہ سلام آتے کے ساتھ ہی سوال؟" یاور کی گہری نگاہیں اس کا طواف کر رہی تھی۔ اتنے دنوں بعد دیکھا تھا۔ آبدار ڈسٹرب سی ہو گئی۔

"کیسے ہیں آپ؟" اس نے لٹھ مار انداز میں پوچھا۔

"کچھ ہی گھنٹوں کی بات ہے پھر آپ کو سب بتاؤں گا۔"

"جی..."

"ہاں جی۔" اس کے ہونق بننے پہ یاور کھل کے ہنسا۔ "میں آپ ہی کے انتظار میں تھا۔"

"کیوں میرے انتظار میں کیوں؟"

"اصل میں آج رات میں نے نکاح کا فیصلہ کیا ہے تو اس میں آپ کو بھی لازمی شرکت کرنی ہو گی۔ تیاری کرنی شروع کریں۔ میں آپ کے لیے ایک سوٹ بھی لایا ہوں۔ ساتھ والے کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ آپ کو ادھر ہی تبدیل کرنا ہو گا۔ کیونکہ نئی دلہن کو میں اپنے بیڈ روم میں لاؤں گا تو اسی کی آمد پہ دروازہ کھلے گا۔"

اس کی حالت سے بے خبر وہ اپنی خوشیوں میں مگن تھا۔ آبدار کے چہرے پہ دکھ کا سایہ پھیلا تھا اور آنکھوں سے آنسو چھلکے تھے۔

"یہاں پہ کوئی پارلر نہیں ہے، آپ خود ہی میک اپ کر لیجیے گا۔ مگر میک اپ کے بغیر بھی آپ بہت خوب صورت لگتی ہیں۔ بس مہندی لازمی لگانی ہے آپ نے ہاتھوں میں اور بال بھی کھلے چھوڑنے ہیں۔"

"کیوں؟" اسے غصہ آ گیا تھا۔

"میرے لیے، میرا مطلب ہے کہ آپ کو میرے نکاح میں جانا ہے تو خوب اچھی طرح تیار ہونا ہے نا!" یاور نے وضاحت کی۔ وہ اس کے آنسوؤں کو خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا۔

آبدار اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ وہ تنہائی میں کھل کے رونا چاہ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کمرہ بند ہونے کے باوجود گھٹی گھٹی رونے کی آواز باہر آ رہی تھی۔ یاور اسے تیار ہونے کا کہنے آیا تھا۔ آوازوں نے اسے بے چین کر دیا۔ دستک پہ دروازے کا بولٹ گرا اور آبدار روئی روئی حالت میں سامنے آئی۔ یاور کا دل بے اختیار خود کو ملامت کرنے لگا، دروازہ کھلتے ہی وہ اس کا بازو پکڑ کر اندر لے آیا۔

"ویسے اگر آپ ایک بار کہہ دیں کہ شادی نہ کرو تو میں نہیں کروں گا۔"

"کیوں میں کیوں کہوں کہ شادی نہ کریں۔" جواباً وہ اتنا ہی تپ کر بولی تو یاور جو اسے روتے دیکھ کر اسے مزید تنگ کرنے کا ارادہ بدلنے کا سوچ رہا تھا، پھر سے ڈٹ گیا۔

"ٹھیک ہے آبدار صاحبہ! انا آپ میں انتہا درجے کی پائی جاتی ہے تو بھگتیں پھر۔"

وہ دل میں اس سے مخاطب ہوا۔

"لو کے نہ سہی میں آپ کی بھلائی کی سوچ رہا تھا۔ آپ نہیں چاہتی تو نہ سہی۔ چلیں ٹھیک ہے۔"

اسے یوں لگا اگر یاور کچھ دیر اور اس کے سامنے اسی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے
نسیم سحر قریشی کے 3 خوبصورت ناول
ستاروں کا آنگن قیمت -/400 روپے
تو شریک سفر رہا قیمت -/300 روپے
میرے دل، میرے مسافر قیمت -/250 روپے
پارسل منگوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ -/45 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32216361

طرح کھڑا رہا تو وہ اس پہ پل پڑے گی اور اس کا حشر کردے گی۔ لیکن شکر ہوا کہ وہ اسے دوبارہ تیار ہونے کا کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

آبدار بے دلی سے تیار ہوئی۔ یاور میرون کلر کا بہت خوب صورت سوٹ لایا تھا۔

جو یقیناً "کسی مہنگے بوتیک سے خریدا گیا تھا اس پہ لگا ٹیگ یہی بتا رہا تھا۔

میک اَپ سے اسے دلچسپی نہیں تھی اور کرنا آتا بھی نہیں تھا۔ صرف لپ اسٹک لگائی۔ اور بال یاور کی خواہش پہ کھلے چھوڑے۔ وہ اب یاور کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یہاں بٹھا کر جانے خود کہاں غائب ہو گیا تھا۔ صوفے سے سر ٹکائے ٹکائے اسے نیند آنے لگی تھی۔ تھکا ہارا جسم آرام مانگ رہا تھا۔ اس کی پلکیں خود بخود ہی مند گئی۔

دوبارہ اس کی آنکھ یاور کی آواز پہ کھلی وہ اسے ہلا رہا تھا۔ نیند سے مندی مندی آنکھیں ایک دم الرٹ ہو گئیں۔ آئیں "اب چلیں۔" آبدار جوتے پہن کر اس کی معیت میں باہر تک آئی۔ وہ اپنے بیڈ روم کے دروازے پہ ٹھہر گیا۔ "ایک منٹ مجھے ایک کام ہے پھر چلتے ہیں۔" وہ لاک کھول کر اندر چلا گیا۔

"آئیں آپ بھی۔" وہ دوبارہ باہر نکلا۔

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ میری دلہن ہی اندر قدم رکھے گی۔" وہ ہچکچائی۔

"آؤ تو سہی۔" یاور نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ معمول کی طرح اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔ یاور نے لائٹ جلائی۔ پھولوں کی مدھم مدھم بھینی خوشبو کو اس کی حسِ شامہ پہلے ہی محسوس کر چکی تھی۔ یہاں سے وہاں تک پھول ہی پھول بکھرے تھے۔

"میں تمہیں اپنی زندگی میں خوش آمدید کہتا ہوں۔" گشت بدنداں آبدار کے ہاتھ میں اس نے زبردستی ننھی سی کلی تھمائی۔

یاور نے پہلی بار اسے تم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی یہ سب کیا ہے۔ اس کی عقل میں جو آ رہا تھا وہ بہت انوکھا اور انجانا سا تھا۔ اور دل اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے خوف زدہ تھا۔ کہیں یہ خواب نہ ہو۔ ٹوٹ ہی نہ جائے۔

یاور اس کی کیفیت محسوس کر چکا تھا۔ بڑی نرمی سے اسے تھام کر پاس پڑے صوفے پہ بٹھا دیا۔ وہ کرنے والی ہو رہی تھی۔

"یار! ہنس تو دو۔ لگتا ہے میرا سرپرائز تمہیں پسند نہیں آیا۔" آبدار کی آنکھوں سے نمی چھلکی وہ بڑی توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "نہیں اب بالکل نہیں رونا۔ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔" اس نے اٹکا آنسو ہاتھ سے صاف کیا۔

"مجھے محسوس ہوا کہ ہم ازل سے ایک دوسرے کے لیے بنے تھے بس مجھے سمجھنے میں دیر لگی لیکن باخدا میں تمہاری طرف سے کبھی بھی بے خبر نہیں رہا۔"

یاور کی نگاہوں سے بڑے خوب صورت جذبے چھلک رہے تھے' اب وہ جان کر انجان نہیں بن سکتی تھی۔ یاور اس کے بالوں کو چھیڑ رہا تھا۔ اس کی شدتِ نگاہوں کا پیغام واضح تھا۔ وہ پل بھر میں سب فاصلے مٹانے کے درپے تھا۔

آبدار کو خبر تھی اس کی شدتوں سے راہِ فرار نہیں ہے۔ اور وہ فرار چاہتی بھی کب تھی۔ اس نے یاور کے ہاتھ پہ اپنا نازک سا ہاتھ رکھ کر اس کے جذبوں کو پذیرائی بخش دی تھی۔ یاور نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

یاور کی گرفت میں محبت کا مان' اعتماد اور اختیار تھا۔ یاور کے سنگ ایک نئے سفر کا آغاز ہو رہا تھا۔ آبدار کو یقین تھا یہ سفر بہت خوش گوار ہو گا کیونکہ اب یاور کی محبت جو اس کے ہمراہ تھی۔

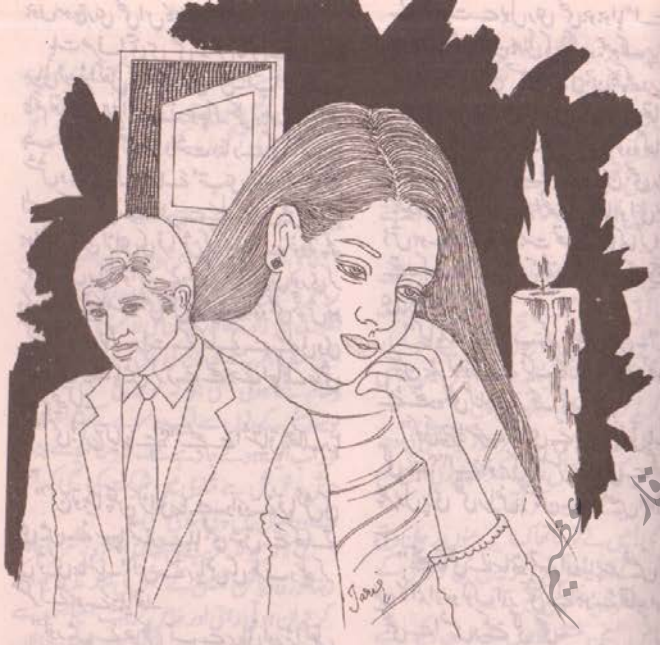

مصباح گل

اس سو دو تالے کی بات میں

اس کا خیال تھا کہ زندگی کی بساط پر اگر ہمت' حوصلہ' استقامت اور محبت کے مہرے آپ کے ہاتھ میں ہیں تو آپ کسی میدان میں شکست نہیں کھا سکتے اور یہی مہرے اس نے ساری زندگی اپنا ہتھیار بنائے رکھے اور اب آ کے جب وہ یہ سمجھنے لگی تھی کہ وہ کامیاب ہو گئی ہے تو اسے بتایا گیا کہ وہ تو ناکام ہے سراسر ناکام اور یہ بتانے والا کوئی اور نہیں بلکہ اس کا اپنا شوہر تھا ریاض حسین۔ جس نے چند لمحے قبل ایک ہی جھٹکے میں اس کی پچیس سالہ ریاضت بے مول' بے ثمر کر دی تھی اور وہ بھی اتنی معمولی بات پر۔۔۔۔ وہ جوں

جوں سوچ رہی تھی اس کا ذہن ماؤف ہوتا جارہا تھا۔

بات صرف اتنی سی تھی کہ کل عاشی نے اس سے بریانی اور ٹرائفل کی فرمائش کی تھی۔ اب اس وقت تو ٹائم تھا نہیں لہٰذا اس نے سوچا کہ کل بنادے گی، مگر جب اگلی صبح اٹھی یاد داشت دغا دے گئی۔ اب وہ شش و پنج میں کہ کیا بنائے، تب ہی داؤد نے (جو ایم ایس کے فائنل سیمسٹر سے پہلے چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا) چکن کڑاہی کی فرمائش کردی۔ اسے خود تو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا تو اس نے داؤد کی فرمائش ہی پوری کر دی۔ کھانے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا اور داؤد بھی خوش ہو گیا۔ اب وہ لوگ رات کے کھانے سے پہلے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب اچانک عاشی نے پوچھ لیا۔

"ممی! آج کیا بنا ہے؟" لہجے سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔

"آج تو بیٹا چکن کڑاہی بنا ہے۔ داؤد نے فرمائش کی تھی میں نے سوچا تمہارے بابا بھی شوق سے کھاتے ہیں تو یہی بنا لیا۔" اس نے ریاض کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

"اور میں نے جو کل آپ سے بریانی اور ٹرائفل کے لیے کہا تھا وہ۔۔۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے یاد دہانی کروائی تو ساحرہ نے بے اختیار اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

"سوئی ایم سوری جانو یقین کرو بالکل بھول گئی۔ تم تو جانتی ہو یہ بڑھاپے کا عالم کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ ابھی پرسوں ہی دیکھ لو تمہارے بابا نے بلیو شرٹ استری کرنے کو کہا اور میں نے براؤن کردی۔ بہرحال تم اداس بالکل نہ ہو، میں کل ہی اپنی بیٹی کو اس کی پسند کی چیزیں بنا دوں گی، ٹھیک ہے؟" اس نے تسلی دیتے ہوئے پیار سے اس کا گال چھوا تو وہ پل میں مسکرا دی۔

"اٹس اوکے ممی ڈونٹ وری۔۔۔ چلیں اسی بہانے اس کٹ کھنے بلے کی فرمائش پہلے پوری ہو گئی ورنہ ہر وقت روتا ہی رہتا تھا کہ کوئی میرے لاڈ نہیں اٹھاتا، میری فرمائش کوئی پوری نہیں کرتا۔"

وہ ساحرہ کے کاندھے پر سر رکھے داؤد کو چڑانے کے لیے شرارت سے بول رہی تھی جو جواباً اسے منہ چڑا رہا تھا۔ دونوں بہن بھائی کی نوک جھونک پر مسکراتی ساحرہ کی نظر ریاض حسین پر پڑی جن کا کچھ دیر پہلے ہنستا مسکراتا چہرہ اب بلا کی سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ جبھی بچوں نے بھوک، بھوک کا شور مچا دیا تو وہ کھانا لگانے کے لیے اٹھ گئی۔ کھانے کے دوران بھی ریاض کا سنجیدہ چہرہ مسلسل اسے الجھاتا رہا تھا جو اپنی مرغوب ڈش ہونے کے باوجود بہت تھوڑا کھانا کھا کر اٹھ گئے تھے۔ کھانے کے برتن سمیٹتی وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی چلی آئی۔

"کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان ہیں۔" ریاض حسین بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے لیٹے تھے وہ بھی کنارے پر ٹک گئی۔

"کوئی چیز ڈسٹرب کر رہی ہے یا میری کوئی بات بری لگی ہے؟" اپنے شوہر کی مسلسل خاموشی سے گھبرا کر وہ پھر بول پڑی تھی ریاض حسین نے آنکھیں کھول دیں۔

"مجھے عاشی کے ساتھ تمہارا رویہ پسند نہیں آیا۔" ان کا انداز دو ٹوک اور سختی لیے ہوئے تھا۔ ساحرہ نا سمجھی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"سب کچھ جاننے کے باوجود بھی کبھی عاشی نے تمہیں یہ احساس نہیں دلایا کہ تم اس کی سوتیلی ماں ہو، ہمیشہ وہی احترام اور محبت تمہیں دیا جو اگر اس کی سگی ماں ہوتی تو وہ اس کو دیتی مگر تم نے آج داؤد کی فرمائش کو اس کی فرمائش پر فوقیت دے کر اسے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ تمہاری سوتیلی بیٹی ہے حالانکہ پہلے عاشی نے فرمائش کی تھی تو اصولاً پوری بھی اسی کی ہونی چاہیے تھی مگر تم نے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کیا ہے ورنہ تمہاری عمر اتنی بھی زیادہ نہیں ہے کہ تمہیں کچھ یاد ہی نہ رہے۔" الفاظ تھے یا نشتر، وہ جیسے اپنی جگہ جم سی گئی۔ اس کے تو سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پچیس سالہ ازدواجی زندگی کے پل پل کا گواہ اس کا شوہر اتنی معمولی بات پر اسے یوں کٹہرے میں کھڑا کردے گا۔

وہ حیرت اور بے یقینی سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس نے ایک ستائش بھری نظر ایک محبت کا پل بھی اپنی زندگی سے اسے نہیں بخشا تھا اور اس نے اپنی ساری زندگی اس شخص کی بیٹی پر محبتیں نچھاور کرنے میں گزار دی تھی۔ وہ۔۔۔ اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ اس نے اس کی بیٹی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ سکتے میں تھی۔

"اسی لیے میں دوسری اولاد کے حق میں نہیں تھا۔ جانتا تھا فرق ضرور ہو گا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک عورت اپنی اولاد اور اپنی سوتن کی اولاد کو ایک جیسا پیار دے۔ اگر آج تمہارا اپنا بیٹا نہ ہوتا تو تم اس طرح عاشی کو ڈی گریڈ کرنے کا کبھی سوچتی بھی ناں۔"

وہ بیٹا جسے ہمیشہ اس نے نظر انداز کیا عاشی کی وجہ سے جس کی ہر خواہش عاشی کے بعد پوری ہوئی۔ وہ بیٹا جو اکثر اس سے شکایت کرتا تھا۔

"ممی! میں نے تو سنا تھا کہ مائیں بیٹوں پر جان دیتی ہیں، ان کے لاڈ اٹھاتی ہیں مگر میری ممی کو تو بیٹی کے سامنے اپنا اکلوتا بیٹا نظر ہی نہیں آتا۔"

ریاض حسین منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے کہ شاید وہ اپنی صفائی میں کچھ کہے مگر وہ خاموش تھی کیا کہتی؟ اس کے پاس کہنے کے لیے بچا ہی کیا تھا۔

وہ ساحرہ ریاض جس نے اپنی تمام عمر تیاگ دی اس کوشش میں کہ کوئی اسے "سوتیلی ماں" نہ کہہ سکے۔ جو قطرہ قطرہ محبت بن کر پگھل گئی کہ کوئی اس پر انگلی نہ اٹھا سکے۔

وہ ساحرہ ریاض، جس نے اپنی ذات تج کر صرف ایک لبادہ اوڑھ لیا "عاشی کی ماں" کہ ہر کوئی اس کی مثالیں دینے لگا۔

"بھئی اتنے لاڈ تو ہم نے اپنی سگی اولاد کے نہیں اٹھائے جتنے ساحرہ، عاشی کے اٹھاتی ہے۔"

خاندان کے بچے کہتے۔ "ممی ہوں تو ساحرہ آنٹی جیسی۔"

"تو کیا وہ ہار گئی۔۔۔"

"اس کی پچیس سالہ مسافت فقط اک سراب ثابت ہوئی۔۔۔؟"

وہ اپنی شکستہ ذات لیے ٹی وی لاؤنج کے اندھیرے کونے میں بیٹھی سوچ رہی تھی اور ایک ایک کر کے تمام منظر اس کی آنکھوں کے دریچوں سے جھانکنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

عاشی تب صرف اٹھائیس دن کی تھی جب وہ بیاہ کر ریاض حسین کے آنگن میں آئی۔ ریاض اس کے اکلوتے تایا زاد تھے اور یہ ان کی دوسری شادی تھی۔ ابھی سال بھر پہلے ہی ان کی پہلی شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی تھی جو کہ لو میرج تھی۔ دونوں یونیورسٹی کے دنوں سے ایک دوسرے کے دیوانے تھے اور اب ایک ہونے جارہے تھے۔ خود ساحرہ نے بڑے جوش و خروش سے شادی میں شرکت کی تھی کہ اس کے دو دھیال میں پہلی شادی تھی۔

تایا کا گھر چونکہ قریب ہی تھا لہٰذا اکثر و بیشتر آنا جانا لگا رہتا اور وہ ریاض حسین کے عشق کی شدتیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہتی اور خاص کر جب انیتا امید سے ہوئی تب تو ریاض نے اسے ہتھیلی کا چھالا ہی بنا ڈالا۔ ساحرہ جاتی اور جلد ہی لوٹ آتی کہ اس کے تایا زاد کو عشق میں دنیا کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔۔۔ مگر اس بے خودی کی مدت بہت مختصر ثابت ہوئی جب بچی کی پیدائش پر انیتا نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ اور شاید اسی لیے ریاض حسین نے اس مختصر عرصے میں اسے اتنا زیادہ چاہ لیا تھا جتنا کہ لوگ شاید سالوں میں چاہتے ہیں کیونکہ تقدیر نے ان دونوں کا ساتھ بہت تھوڑا لکھا تھا۔

اب مسئلہ نومولود بچی کا تھا۔ ریاض کو تو اپنا ہوش نہیں تھا بچی کو کیا سنبھالتے اور تائی جان جوڑوں کے عارضے میں مبتلا اٹھنے بیٹھنے سے بھی عاری تھیں ایسے میں قرعۂ فال ساحرہ کے نام نکلا۔ ساحرہ کی منگنی دو سال قبل ٹوٹ چکی تھی۔ اس کے والد امین صاحب اوسط سا کماتے تھے اور مرد قسمتی سے سسرال والے لالچی نکلے

لہٰذا دال گلتی نہ دیکھ کر رشتہ ہی توڑ دیا۔

اب پچھلے دو سال سے وہ رشتے کے انتظار میں بیٹھی تھی مگر کوئی مناسب رشتہ مل کے ہی نہیں دے رہا تھا تبھی تائی جان ریاض حسین کا پیغام لیے وارد ہوئیں۔ گھر والوں کی تو ہانڈی لاٹری ہی نکل آئی۔ پڑھا لکھا، ہینڈسم اور کھاتا پیتا لڑکا..... نند دیور کا جھنجھٹ بھی کوئی نہیں، باقی بچی ساس تو وہ بے چاری ویسے ہی اٹھنے بیٹھنے سے تنگ۔ جہیز اور شادی کے اخراجات بھی ایسی ایمرجنسی میں نہ ہونے کے برابر۔ ایسا رشتہ ایک پچیس سالہ لڑکی کے لیے جو ایک منگنی بھی تڑوا چکی ہو، کسی نعمت سے کم نہیں تھا اور کفرانِ نعمت کرنا اس کے گھر والوں کے نزدیک گناہِ کبیرہ تھا۔ رہا بچی کا مسئلہ تو وہ بے چاری کسی کو کیا کہتی..... شادی کے بعد اپنے بچے تو پالنے ہی تھے ساتھ وہ بھی پل جاتی۔

یہ سارے مسئلے دوسروں کے لیے بہت معمولی تھے مگر ساحرہ ہی جانتی تھی کہ وہ کس پل صراط پر قدم رکھے جا رہی ہے۔ انتہا کے لیے ریاض حسین کی دیوانگیوں کی وہ چشم دید گواہ تھی لہٰذا اس کے حصے میں تھوڑا بہت کیا آئے گا وہ نہیں جانتی تھی مگر بہت جلد یہ آگہی اس پر عذاب بن کر اتری کہ تھوڑا بہت تو کیا اس کے لیے تو ایک بوند بھی نہیں بچی..... جب شادی کی پہلی ہی رات ریاض حسین نے سنگلاخ تاثرات کے ساتھ اسے جتا دیا تھا۔

"انتہا میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ اس کے بعد میری زندگی میں کسی عورت کے لیے کوئی گنجائش نہ ہے اور نہ ہوگی۔ تمہارے دل میں بھی اگر کسی قسم کی کوئی خوش فہمی ہے تو اسے نکال دو..... تم یہاں صرف اور صرف عاشی کے لیے لائی گئی ہو لہٰذا تمہارے دن رات اسی کے لیے ہونے چاہئیں۔ جب تک اس کے حقوق میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی تمہارا بھی دانہ پانی اس گھر میں چلتا رہے گا۔ میری کوشش ہو گی کہ تمہاری تمام ضروریات بروقت پوری ہوں، یہ پورا گھر تمہارا ہے..... سوائے میرے، اور مجھ سے ٹکرانے کی کوشش بھی نہ کرنا..... ریزوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ عاشی ساتھ والے کمرے میں آیا کہ پاس ہے، بہتر ہے کہ تم وہیں سو جاؤ۔"

اس کے بعد اس کے وہاں بیٹھنے کی کوئی تک نہیں تھی، وہ خاموشی سے اٹھی اور اپنا سامان لے کر ساتھ والے کمرے میں چلی آئی۔ اس دن کے بعد اس نے کبھی خود کو ریاض حسین کی بیوی نہیں سمجھا، وہ سرلا ماں بن گئی..... عاشی کی ماں۔ اس کا کھانا پینا، سونا جاگنا، پہننا اوڑھنا، ہنسنا رونا ہی ساحرہ کی زندگی کا مقصد بن گیا۔ اپنی ذات، شخصیت، آرزوئیں، خواہشیں، ازدواجی زندگی کی خوشیاں، شوخیاں سب فراموش کر دیا بس یاد رکھا تو صرف اتنا کہ وہ عاشی کی ماں ہے۔

پورا ایک سال وہ عاشی کو لے کر دوسرے کمرے میں سوتی رہی کہ ایک دن جانے کیسے تائی جان کو خبر ہو گئی، پھر تو انہوں نے وہ واویلا مچایا کہ اسے اور عاشی کو ریاض کے کمرے میں بھیج کر ہی دم لیا۔ بعد میں بھی کتنے ہی دن بڑبڑاتی رہیں۔

"غضب خدا کا! بنتی نویلی دلہن کو سال بھر سے الگ کر رکھا ہے نہ کوئی لحاظ نہ شرم..... دیوروں کا پانی ہی ڈھل گیا ہے۔ ابھی تو وہ بچی صابر ہے منہ سے اُف تک نہیں نکالی..... مگر تم تو اس کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہو۔ ارے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے یا نہیں..... سب ہی کہتے ہیں بھئی وقت ہی بڑا عجیب آگیا ہے۔"

اور یوں شادی کے ایک سال بعد اسے اپنے شوہر کے کمرے میں سونا نصیب ہوا تھا مگر یہاں سے اس کی ایک اور آزمائش شروع ہوئی۔ ہر دم خیال رکھنا پڑتا کہ موڈ کیسا ہے..... کہیں کوئی بات بری نہ لگ جائے، ڈسٹرب تو نہیں ہو رہے۔ اکثر جب عاشی رات کو اٹھ کر روتی تو وہ ان کے آرام کے لیے کتنی کتنی دیر اُسے لاؤنج میں ٹہلتے گزار دیتی۔ یوں اس کی مسلسل کوششیں رنگ لائیں کہ عاشی اس سے بہت مانوس ہو گئی تھی اور اس کے علاوہ کسی کے پاس جانے کو تیار نہیں ہوتی تھی خود ریاض حسین کے پاس بھی نہیں.....

زندگی یونہی لگی بندھی روٹین میں رواں دواں تھی جب اس کی زندگی میں داؤد مثلِ بہار بن کر آیا۔ اس کے ہاتھ تو جیسے ہفت اقلیم کے خزانے ہی لگ گئے..... وہ بے پناہ خوش تھی (ساری زندگی میں یہ واحد خوشی تھی جو ریاض حسین سے اسے ملی) ورنہ انہوں نے شادی کی رات جو کہا تھا کبھی اس سے روگردانی نہیں کی مگر اس کے ساتھ ہی اس نے عاشی پر پہلے سے بھی زیادہ توجہ دینی شروع کر دی تھی کہ کہیں ریاض یا کسی اور کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ اپنی اولاد کے آتے ہی ساحرہ عاشی کو بھول گئی ہے۔

اسی دوران تائی جان کا جذباتی سہارا بھی اس سے چھن گیا مگر پھر بھی وہ اسی ہمت اور محبت سے اپنے فرض کی ادائیگی میں جتی رہی..... ماہ و سال کی تلخیوں اور بدلتے موسموں کی سختیوں سے بے نیاز..... زندگی ایک مخصوص ڈھب پر چل رہی تھی۔

جب داؤد نے پرائمری پاس کر لی تو ساحرہ نے ایک انتہائی قدم اٹھایا۔ اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر اپنے اکلوتے بیٹے کا داخلہ اسلام آباد کے بورڈنگ میں کروا دیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں داؤد کی مسلسل موجودگی کے سبب عاشی کے معاملے میں اس سے کوئی کوتاہی نہ ہو جائے۔ اس نے اپنی ممتا کی قربانی دے دی کہ کہیں وہ اپنے سگے بیٹے کو سامنے پا کر نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی سوتیلی بیٹی کی حق تلفی نہ کر دے۔ اس نے عاشی کے لیے اپنے اس بیٹے کو خود سے دور کر دیا جس کے لیے بقول ریاض حسین اس نے عاشی کو ڈی گریڈ کیا تھا۔

وقت کسی خوفزدہ گھوڑے کی طرح اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ یونہی کتنے ہی سال حال سے ماضی کا سفر طے کرتے ہوئے فقط ایک یاد بن کر رہ گئے مگر ساحرہ کے لیے ریاض حسین کے ماتھے کی شکنوں میں کوئی کمی نہ آئی، یہاں تک کہ بچے جوانی کی دہلیز پر پہنچ گئے۔ اور تب ساحرہ نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ سرخرو ہو گئی ہے، اس نے ممتا کے تمام حق ادا کر دیے ہیں مگر ابھی قدرت کو اس کا اور امتحان مقصود تھا۔

عاشی ان دنوں انٹر پری میڈیکل سال دوم کی طالبہ تھی۔ اسے ڈاکٹر بننے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ دن رات ایک کر کے اس نے امتحانات اور پھر انٹری ٹیسٹ کی تیاری کی، مگر قسمت نے یاوری نہ کی کہ باوجود اتنی محنت کے وہ سلیکٹ نہ ہو سکی۔ اس ناکامی کو اس نے ایسا دل پر لگایا کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔

تین دن آئی سی یو میں رہنے کے بعد بالآخر وہ بچ تو گئی مگر دماغ کی ایک نس شدید متاثر ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے وارن کیا کہ اسے ٹینشن نہ دی جائے ورنہ اگلا اٹیک خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ شکر ہے کہ ویسا اٹیک تو پھر نہ ہوا، البتہ کبھی کبھی ہلکی نوعیت کے اٹیک ہونے لگے جس میں اس کے ہاتھ پاؤں مڑ جاتے تھے لیکن بقول ڈاکٹرز کے وہ خطرناک نہیں تھے، مکمل علاج اور اچھی دیکھ بھال سے رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جاتے..... مگر برا یہ ہوا کہ خاندان کی ایک خاتون نے عاشی کو اس حالت میں دیکھ لیا، پھر تو سارے خاندان میں خبر پھیل گئی کہ عاشی ذہنی مریض ہے اور وہ لڑکی جسے اس وقت جذباتی تعاون کی شدید ضرورت تھی بالکل ہی اکیلی پڑ گئی۔

ایسے میں وہ ساحرہ ہی تھی جس نے اپنے دن رات کا لمحہ لمحہ اسے سونپ دیا۔ گھر کی ساری ذمہ داری کے باوجود اس کی دواؤں اور خوراک کا بھرپور خیال رکھا۔

اتنی محبت اور توجہ سے اس کی دیکھ بھال کی کہ اپنی صحت کی بھی پروا نہ کی اور یوں عاشی چند ہی مہینوں میں بھلی چنگی ہو کر پھر سے کالج جانے لگی تھی۔ وہ ٹھیک تو ہو گئی مگر اس کی بیماری کی جو خبر چاروں طرف پھیلی تو پھر اس کے رشتے آنے بند ہو گئے یہاں تک کہ وہ چوبیس سال کی ہو گئی اور اس نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کرنے کے بعد بحیثیت لیکچرار ایک پرائیوٹ کالج بھی جوائن کر لیا لیکن کہیں معاملہ طے نہ ہو سکا۔

جو لوگ پہلے زور و شور سے کہتے تھے کہ "عاشی تو ہماری بہو بنے گی" اب وہاں مکمل خاموشی تھی۔ بلکہ زیادہ تر نے تو اپنے بیٹوں کی شادیاں بھی کر دی تھیں۔ ریاض حسین کا تو پتا نہیں مگر ساحرہ اس صورت حال سے بہت پریشان تھی۔

بالآخر کسی طرف سے کوئی راہ نہ نکلتے دیکھ کر یہ بیڑہ بھی اس نے خود ہی اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اپنی عزت نفس کو پس پشت ڈال کر خود اپنے بھائی بھاوج سے عاشی اور عامر کے رشتے کی بات کی (جنہوں نے کبھی بڑے مان سے کہا تھا کہ عاشی ہمارے عامر کی دلہن بنے گی) ابتدا میں تو وہ اس کی بیماری کی وجہ سے ہچکچاہٹ کا شکار ہوئے مگر جب ساحرہ نے انہیں ہر طرح سے اطمینان دلایا، یہاں تک کہ عاشی کی میڈیکل رپورٹس بھی دکھائیں جو کہ تمام کلیئر تھیں تو وہ رشتہ لانے کے لیے تیار ہو گئے۔

لیکن یہ بات اس نے گھر میں سب سے چھپائی اور اپنے بھائی بھاوج سے بھی کہہ دیا کہ زندگی میں کبھی عاشی سے اس بات کا تذکرہ نہ کیا جائے کیونکہ عاشی کی انا اور عزت نفس اسے بے حد عزیز تھی اور یوں کچھ ہی دن پہلے عاشی کی پچیسویں سالگرہ پر بڑی دھوم دھام سے اس کی منگنی عامر سے کر دی گئی تھی جو ایک تعمیراتی کمپنی میں انجینئر تھا۔

ماضی کے اوراق پلٹتے پلٹتے وہ ہانپنے لگی تھی مگر اپنی ایسی کوئی خطا، کوئی قابل گرفت بات نظر نہ آئی جس کی وجہ سے وہ مجرم ٹھہرائی جاتی۔ اس نے صرف عاشی کو جنم نہیں دیا تھا لیکن وہ سب کچھ کیا تھا جو ایک سگی ماں اپنی اولاد کے لیے کرتی ہے۔ اس کے منہ سے نکلا ہر لفظ ساحرہ نے اپنا فرض جان کر پورا کیا مگر صلہ کیا ملا ....؟

وہ شخص جس کے نام کی خاطر اس نے اپنی آنکھوں کے خواب تک مٹی کر دیے وہی اس سے بدگمان تھا .... جسے اس کی وفکر روح کے گھاؤ بھرنے تھے وہی سنگ اٹھانے میں پیش پیش تھا۔ اب کس سے وہ گزرے پچیس سالوں کا حساب مانگے .... ؟ کون اس کی گواہی دے گا .... کون اس کی کرچی کرچی ذات کو جوڑنے کے لیے اپنے ہاتھ زخمی کرے گا؟ کوئی نہیں ....

"کیا حاصل ہوا مجھے اپنی ذات رول کر .... اپنی خواہشات اور آرزوؤں کی قربانی دے کر .... کیا حاصل ہوا؟ رہی تو میں پھر بھی سوتیلی ہی نا! اس سے تو اچھا تھا میں سچ مچ کی ہی سوتیلی ماں بن جاتی .... کم از کم آج میرا دل یوں لہولہان تو نہ ہوتا۔"

اپنی بے وقعتی اور رائیگانی کا کرب اس کی سوچوں کو بے راہ کر رہا تھا جب اسے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا، اس نے بے اختیار مڑ کر دیکھا .... وہاں عاشی کھڑی تھی۔

"آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں ممی ....؟" وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی اور اس کے زانو پر سر رکھ دیا۔

"ہاں! وہ .... بس ایسے ہی ...." اس نے جلدی جلدی اپنے آنسو صاف کیے، تاریکی نے پردہ رکھ لیا تھا۔

"ممی ....!" طویل خاموشی کے بعد عاشی نے سر اٹھایا، نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

"ممی .... میں بہت شرمندہ ہوں۔ جو کچھ بابا نے آپ سے کہا۔ بہت غلط کہا .... انہیں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ ان کی جگہ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔" اس نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے، ساحرہ ساکت رہ گئی۔

"عاشی .... تم نے ...." اس کے لفظوں میں شک سرسرا رہا تھا، عاشی تڑپ کر سیدھی ہوئی۔

"نہیں ممی .... قسم لے لیں، میں نے یہ سب ارادتاً نہیں سنا۔ وہ تو میں بابا سے چائے کا پوچھنے آئی تھی وہ کھانے کے بعد پیتے ہیں نا، بس تبھی ...." وہ شرمندہ شرمندہ سی مجرموں کی طرح بول رہی تھی اور اپنا برسوں کا بھرم ٹوٹنے پر ساحرہ کی آنکھیں طوفانوں کی زد میں تھیں۔ سارے الفاظ جیسے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے تھے۔ وہ خاموش تھی۔

عاشی چند لمحے اس کے چہرے پر رقم تحریر کو پڑھتی رہی پھر ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگی۔

"ممی میں جانتی ہوں بابا نے ساری زندگی آپ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ تبھی آپ کو تسلیم نہیں کیا۔

وہ محبت .... وہ مقام جو آپ کا حق تھا آپ کو اس سے محروم رکھا۔ آپ کی ذات کا بھروسہ اور مان، جو صرف ایک شوہر اپنی بیوی کو دے سکتا ہے۔ کبھی آپ کو نہیں دیا .... پھر کیا جواز تھا آپ کا اس گھر میں رہنے کا ....! کوئی نہیں۔ مگر آپ نے پھر بھی اپنی ساری زندگی یہاں گزار دی، کس کے لیے؟ میں جانتی ہوں .... میرے لیے نا!"

اس نے مان اور محبت سے ساحرہ کی طرف دیکھا جو اس تاریکی میں بھی اس کے چہرے پر بہتے آنسو محسوس کر سکتی تھی۔

"آپ نے صرف خود کو میری ماں کہا ہی نہیں .... ثابت بھی کر کے دکھایا ہے۔ ہر وہ جگہ جہاں مجھے کسی غمگسار کسی اپنے کی ضرورت تھی وہاں ہمیشہ میں نے آپ کو پایا ہے ممی! کبھی بابا کو محسوس نہیں کیا۔ انہوں نے میری ہر خواہش کی تکمیل کی ہے، ہر ضرورت پوری کی ہے مگر کبھی مجھے محبت نہیں دی .... میرا مان نہیں بڑھایا۔ محبت مجھے آپ سے ملی ہے ممی، میرا مان آپ ہیں۔ آپ کی چاہت کی حد تو یہ ہے ممی کہ میرے مستقبل کے لیے آپ نے اپنی انا اور عزت نفس تک قربان کر دی۔"

ایک ٹرانس کی کیفیت میں اسے سنتی ساحرہ، اس کی آخری بات پر بری طرح چونکی تھی۔

"مگر تمہیں ....."

"میں نے ماموں کے ساتھ آپ کی گفتگو سن لی تھی۔" وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑی تھی۔

"اور پتا ہے ممی .... اس کے بعد میرے دل میں آپ کی عزت اور محبت پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ گئی۔ تو شاید میری سگی ماں بھی میرے لیے نہیں کر سکتی تھی جو آپ نے کیا ہے۔ میں چاہ کر بھی آپ کے احسانوں کا بدلہ نہیں دے سکتی ممی، لیکن ہاں .... اتنا یقین دلا سکتی ہوں کہ میں آپ سے بے انتہا محبت کرتی ہوں .... اس سے بھی کہیں زیادہ جو ایک سگی اولاد اپنی ماں سے کرتی ہے اور اگر کبھی کسی نے آپ کی ممتا پر انگلی اٹھائی تو میں آپ کی گواہی دوں گی۔ میں آپ کے حق کے لیے اس دنیا کے آخری شخص سے بھی لڑوں گی ممی .... چاہے وہ آخری شخص میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔"

وہ اس کے ہاتھوں پر سر رکھے بے تحاشا رو رہی تھی اور ساحرہ کا جلتا بلکتا سینہ جیسے ٹھنڈی میٹھی پھواروں کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ آج اس نے جن لفظوں میں اپنی ممتا کا یقین پایا تھا اس نے اس کے چاروں طرف پھول ہی پھول کھلا دیے تھے۔ جن کی خوشبو اس کی بے دم ہوتی سانسوں کے لیے آب حیات کا کام کر رہی تھی۔

وہ نادان تھی جو دنیا کی آنکھوں میں اپنے لیے صلہ تلاشتی رہی۔ بے وقوف تھی جو سرابوں کے پیچھے بھاگتی رہی تھی۔ اس کی قربانیوں کا اصل ثمر تو اس کی بیٹی عاشی تھی، اس کی محبت تھی۔ وہ عزت اور احترام تھا جو وہ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک جذب کے عالم میں اس کے سر پر بوسہ دیا اور اسے خود سے لپٹا لیا، جس نے اس کی برسوں سے پیاسی روح کو سیراب کر دیا تھا۔

عاشی کو سونے کے لیے بھیج کر وہ بھی مضبوط قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آ گئی جہاں ریاض حسین ابھی تک جاگ رہے تھے۔ وہ بغیر ان کی طرف توجہ دیے اپنے بستر کی طرف بڑھ گئی تھی تب ہی اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے شوہر کو نرم آواز میں بولتے سنا۔ جو غالباً سب کچھ سن چکے تھے۔

"آئی ایم سوری ساحرہ، مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی ...."

"پلیز ریاض .... اب اس سب کا کچھ فائدہ نہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ سو جائیں، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" اب ہر تلافی اس کے لیے بے وقعت تھی۔ اس نے دو ٹوک انداز میں ان کی بات کاٹی اور کروٹ بدل کر سو گئی۔

اس بات سے بے خبر کہ پچیس سال اس پر حکمرانی کرنے والے اس کے شوہر کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی کہ سود و زیاں کے اس کھیل میں تمام خسارے اس کے دامن میں بھر گئے تھے۔ ☆

یہ ایک راستہ

"بھائی! آپ کی کوئی پسند ہے تو بتا دیں۔ بعد میں نہ کہنا کہ پوچھا نہیں۔" افشاں نے کھانے کی ٹیبل پر سب کے سامنے یہ سوال کیا تو ایک لمحے کو تو میں گھبرا گیا بلکہ شرما گیا۔

"اور کیا تو کل کو یہ الزام نہ دینا کہ اکلوتے بیٹے کی پسند کا خیال نہیں کیا۔" اماں نے پیار سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم، وہ کیا کہتے ہیں، ظالم سماج ٹائپ والے ماں باپ نہیں ہیں۔" ابا نے بھی ٹکڑا لگایا۔ سب سوالیہ نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔

"توبہ ہے بھائی! اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے، یہی تو پوچھا ہے کہ رات کے کھانے میں کیا پکائیں۔" درخشاں بولی۔ یہ تھی تو افشاں کی جڑواں، مگر بوری آفت کی پرکالہ کسی کو بخشتی نہیں تھی۔ ایک لمحے کو تو میں بوکھلا گیا۔ مگر اس کی آنکھوں کی شرارت اور باقی سب کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ کر اسے گھورا جس کا اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔

"بتا دوں گا، ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" میں نے کچھ مول بات کی۔

"اس کا مطلب ہے آپ کسی کو پسند کرتے ہیں، کون ہے جلدی بتائیں۔"

"ہائے اللہ! آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔" افشاں پیچھے ہی پڑ گئی۔

"یہ قیمہ کریلے بہت مزے کے ہیں اماں! دل چاہ رہا ہے کھاتا ہی رہوں۔" میں نے بات بدلی۔

"ماں صدقے، تمہارے لیے ہی اسپیشل بنائے ہیں۔" اماں نے جواب دیا۔

"پتہ ہے مزے کے بنے ہیں اور آپ کے لیے ہی اماں نے بنائے ہیں۔ لیکن جو پوچھا جا رہا ہے اس کا جواب دیں سیدھی طرح سے۔" درخشاں نے دھموکا جمائی۔ باقی سب بھی مجھے دیکھنے لگے تو میں نروس ہو گیا۔

"تم تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہو، لیچڑ نہ ہو تو، ابھی تو جانے چھوڑو مجھے جانا ہے ضروری کام سے۔" میں نے جلدی

ناولٹ

سے کرسی چھوڑی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ کیا میں بات بات پر بوکھلا، گھبرا اور لڑکیوں کی طرح شرما جاتا ہوں تو ایسا ہے کہ میری ستائیس سالہ زندگی (اس میں سے بچپن نکال دیں) میں پہلی دفعہ مجھ سے ایسے سوال کیے گئے ہیں اور مجھ سے ایسی توقع کی گئی ہے کہ مجھے بھی کچھ پسند ہے یا نہیں اور وہ بھی کوئی لڑکی۔ ورنہ تو جب سے جوانی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا اکثر ایسے لیکچر ملتے کہ مجھے لگتا کہ گھر سے باہر جیسے میرا کوئی کام نہیں سوائے اس کے کہ میں لڑکیوں کو چھیڑوں یا تھرڈ کلاس عشق بازی میں ملوث ہو جاؤں۔ گھر سے نکلنے لگتا تو منجھلی آپا اپنی کراری آواز میں کہتیں۔

"کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے سے پہلے سوچ لینا کہ گھر میں چھ چھ بہنیں ہیں۔"

جی ہاں چھ بہنوں کا اکلوتا مسکین سا بھائی۔ بڑی آپا اماں ابا کی شادی کے پورے سات سال بعد پیدا ہوئیں (بعد میں تو لائن ہی لگ گئی) بہت منتوں اور دعاؤں کے بعد ہونے والی اولاد ان کے لیے دنیا کی خوب صورت ترین اور انمول چیز تھی۔ اگرچہ وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ اللہ انہیں لڑکا دے یا لڑکی کچھ تو دے مگر دل میں انہوں نے لڑکوں والے سب نام سوچ رکھے تھے۔ مگر ہوئی لڑکی۔ پھر بھی پہلی اولاد کی بات ہی اور ہوتی ہے اور وہ بھی اتنے سالوں بعد جب ابا کی گود میں آئی تو انہیں اتنی حسین لگی کہ انہوں نے اس کا نام "حسین" رکھ دیا۔ یوں بھی اس وقت نئے اور عجیب عجیب ناموں کا فیشن نہیں آیا تھا۔ اپنے نام کی وجہ سے آپا کو کافی مذاق کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو نام کے نیچے زیر لگانے کے باوجود نئی ٹیچر پہلی دفعہ تو ضرور حسین پڑھتی اور آپا کے بجائے ان کی پوری کلاس کورس میں کریکشن کرتی۔ دوسرا، نام تو ان کا حسین تھا مگر حسن میں ہاتھ ذرا تنگ تھا اب ہر ایک کی نظر ماں باپ جیسی تو نہیں ہو سکتی نا! لیکن تھیں بہت عقل مند اور سلیقہ شعار۔

چھوٹی عمر سے ہی گھر کے کافی کام انہوں نے سنبھال لیے (کیا کرتیں ہر سال دو سال بعد تو اماں کی گود میں کوئی نہ کوئی ہوتا) سلیقے اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے سارے خاندان میں ہر دلعزیز تھیں یہی وجہ تھی کہ سترھواں سال چڑھا تو خالہ نے اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا۔ ایک ایسی لڑکی جس نے چھوٹی عمر سے ہی سارا گھر اور آپا گیا انتہائی ذمہ داری سے سنبھال لیا ہو اور حسب توفیق پڑھائی بھی کی ہو تو کون اسے بہو نہ بنانا چاہے گا، ویسے بھی اس وقت بہو کے لیے یہی کوالیفکیشن کافی سمجھی جاتی تھی۔

رشتہ ہر لحاظ سے مناسب تھا پھر بھی اماں چاہتی تھیں کہ دو چار سال بعد شادی کی جائے مگر پھر منجھلی آپا کے بالوں کی طرح بڑھتے ہوئے قد کو دیکھ کر ہاں کر دی کیونکہ انہیں لگا کہ دو چار سال بعد منجھلی آپا کے ہوتے ہوئے بڑی آپا کو کوئی نہیں پوچھے گا۔

جی آپ ٹھیک سمجھے منجھلی آپا بلا کی حسین تھیں۔ وہ ہم سب میں ہی علیحدہ لگتیں۔ اگر گھر کے بجائے ہسپتال میں پیدا ہوتیں تو یہی سمجھا جاتا کہ غلطی سے بدل گئی ہیں لیکن ایسا نہیں تھا نام تو حسب معمول اماں ابا نے لڑکوں کے سوچ رکھے تھے مگر گود میں آئی وہ گلابی سی گڑیا جو سچ مچ بہت حسین تھی مگر حسین نام تو پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ ابا نے زیادہ سوچنے اور مشورہ کرنے کی ضرورت کبھی نہیں سمجھی تھی۔ سو جو نام اس کے ذہن میں آیا وہ رکھ دیا گیا یعنی "ذہین"۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئیں حسن نکھرتا گیا ان کی پیاری سی (بھولی بھالی صورت سب کو ہی اچھی لگتی۔

ذہن آپا کے پاس سب کچھ تھا سوائے ذہانت کے۔ حسن کی دولت سے جتنی مالا مال تھیں عقل سے اتنی ہی پیدل کہتے ہیں حسن اور ذہانت اکٹھے ہو جائیں تو قیامت ہیں..... مگر علیحدہ علیحدہ بھی ہوں تو کام چل ہی جاتا ہے۔

منجھلی آپا پر نظر تو پورے خاندان کی تھی مگر ہمارے تایا کے بیٹے جن کا گھر قریب ہی تھا اور اکثر آنا جانا لگا رہتا، آپا کی بے وقوفیوں کو ان کی معصوم ادائیں سمجھ کر

ایسے چاروں شانے چت ہوئے اور گھر میں وہ واویلا کیا کہ تایا تائی نے ہماری چوکھٹ ہی پکڑلی اور تب تک نہ ہلے جب تک اماں ابا نے ہاں نہ کر دی۔ تب تک چھوٹی آپا نے بھی گھر سنبھال لیا تھا ان میں اور منجھلی آپا میں دو سال کا ہی تو فرق تھا۔

چھوٹی آپا کی پیدائش سے پہلے کھلم کھلا بیٹے کی دعائیں مانگی گئیں نجن کی قبولیت کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ تیسری بیٹی کو بھی انہوں نے صبر شکر کے ساتھ قبول کیا۔ چھوٹی آپا کو "جبین" نام دیا گیا۔

چھوٹی آپا کو بڑی دونوں آپاؤں کے برعکس پڑھنے کا شوق تھا۔ انہوں نے بی اے، ایل ایڈ کیا آگے بھی پڑھنا چاہ رہی تھیں مگر اماں نے کہا بس بہت ہو گیا، اپنی پڑھائی کی ضد کی وجہ سے وہ آنے والے کئی رشتوں کو انکار کر چکی تھیں، لہٰذا اب ان کی ایک نہ چلی اور وہ بیاہ کر چھوٹے گھر چلی گئیں۔ ان کی شادی تک میں بھی کئی ذمہ داریاں اٹھا کے قابل ہو چکا تھا۔

میری پیدائش پر تو باقاعدہ منتیں مانی گئیں، خوب دعائیں کیں جو بالآخر میری شکل میں قبول ہو گئیں۔ ابا نے جب مجھے گود میں لے کر اپنے ذہن میں سالہا سال سے بنی ناموں کی لسٹ میں سے سرفہرست نام چننا چاہا تو اماں نے فوراً "بریک لگا دی۔

"بس صادق حسین! تینوں بیٹیوں کو اپنی مرضی کے جیسے تیسے نام دے دیے میں کچھ نہیں بولی مگر اس دفعہ نہیں۔" اماں کے لہجے میں بیٹے کی ماں ہونے کا غرور تھا۔

"کیوں نہیں بھئی لوکے، پہلے تم نے کبھی کہا نہیں، اس لیے میں سمجھا اس دفعہ بھی مجھے ہی کچھ سوچنا پڑے گا۔" ابا بہت خوش تھے اماں کی بات کیسے ٹالتے انہوں نے ان کو اتنی بڑے خوشی دی تھی۔

"میرا بھی کچھ حق بنتا ہے، میرے بھی کچھ ارمان ہیں۔" اماں نے کہا۔

"ہاں ہاں بتاؤ، کیا سوچ رکھا ہے تم نے؟"

"ارمان!"

"مان تو رہا ہوں کہ تمہارے بھی ارمان ہیں، نام کیا رکھنا ہے؟"

"کہہ تو رہی ہوں ارمان۔"

"اچھا، ٹھیک ہے، میرا نام تو ساتھ ضرور لگے گا نا!"

"کیوں نہیں چوہدری صاحب۔" اماں ابا نے اپنا معاملہ طے کر لیا لیکن ذہین آپا جو اس وقت چھ سات سال کی ہو چکی تھیں، نے ضد پکڑلی کہ علی نام رکھنا ہے، یہ ان کی کسی پکی سہیلی کے چھوٹے بھائی کا نام تھا۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ وہ اگر اپنے بھائی کا نام علی رکھ سکتی ہے تو میں کیوں نہیں۔ ان کی ضد پوری کرنی بھی ضروری تھی۔ تایا اپنی فیملی کے ساتھ مبارک دینے فوراً پہنچے۔

"چرہ کراؤ بھئی چھوٹے چوہدری کا۔ چوہدری ضرور لگانا نام کے ساتھ پتہ چلے چوہدریوں کا پتر ہے۔" تایا نے اضافہ کیا۔ یوں میرا نام چوہدری ارمان علی صادق قرار پایا۔ چھوٹا تھا تو کسی کو نام بتاتا تو وہ میرے دائیں بائیں دیکھنے لگتے کہ باقی لوگ کہاں ہیں۔ ذرا بڑا ہوا تو سابقہ لاحقہ ہٹا کر صرف ارمان علی بتانے لگا۔ خاندان اور محلے والے چھوٹے چوہدری صاحب کہتے، اماں، ارمان اور بہنیں اور یار دوست علی۔

میں ناز و نعم سے پلنے لگا جس طرح کہ تین بیٹیوں کے بعد اکلوتے بیٹے کو پلنا چاہیے تھا۔ اماں ابا نے سات سال بے اولادی کے گزارے تھے۔ اس کے بعد اللہ نے جب انہیں اولاد سے نوازا تو فل اسٹاپ لگانا انہیں ناشکری لگا اور شاید ایک بیٹے کے بعد ان کا سورا لل بھی بلند ہو گیا ایک اور کی خواہش کرنے لگے (ناشکرا انسان) میں تین سال کا تھا جب ضوفشاں پیدا ہوئی۔ اماں کے ارمان، تو مجھ پر پورے ہو چکے تھے لہٰذا نام ابا نے ہی رکھا۔ شکر ہے میرے بیچ میں آنے سے قافیہ تبدیل ہو گیا۔ ضوفشاں کی شادی بھی دو سال پہلے ماموں کے گھر ہو چکی تھی۔ افشاں اور درخشاں کی پیدائش سے پہلے بڑی آپا کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ اماں ابا دونوں ہی شرمندہ شرمندہ تھے۔ اس کے بعد جانے کیا ہوا لیکن بچہ کوئی نہیں ہوا۔

☆ ☆ ☆

کہتے ہیں محبت انسان کو اعتماد بخشتی ہے۔ میرے کیس میں تو الٹا ہے۔ یا یوں کہہ لیں بہت زیادہ محبت رہا سہا اعتماد بھی چھین لیتی ہے۔ بندے کو اتنا dependent بنا دیتی ہے کہ خود سے فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اردگرد ہر وقت جان لٹانے والے اور فکر میں گھلنے والے ہوں تو بندہ خود ہی بے فکرا ہو جاتا ہے۔ اماں ابا کا لاڈلا تو تھا ہی، بہنوں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میرے کپڑوں سے لے کر کالج میں سبجیکٹ چننے تک کا کام انہوں نے آپس میں صلاح مشورے سے کیا۔

یہ کھانا ہے، وہ نہیں کھانا، ہضم نہیں ہوگا۔

یہ پہننا ہے، وہ نہیں پہننا، سجے گا نہیں۔

یہ پڑھنا ہے وہ نہیں پڑھنا اسکوپ نہیں ہے۔

مجھے کسی بھی چیز کے بارے میں سوچنے کے لیے دماغ کو کبھی زحمت ہی نہیں دینی پڑی۔ دماغ بھی استراحت فرما فرما کر اسی کا عادی ہو گیا۔

میں تعلیم مکمل کر کے اچھی جاب کر رہا تھا۔ اماں ابا چار بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو کر کافی سکون میں تھے۔ ویسے تو چھوٹی دونوں بھی اس عمر کو پہنچ چکی تھیں جس عمر میں بڑی آپا کی شادی ہوئی تھی۔ چاہتا تو میں یہی تھا کہ سارے فرائض سے آزاد ہو کر ہی میرے بارے میں سوچا جائے مگر لگتا تھا کہ ایک دم سب کی زندگی کا مقصد صرف میری شادی ہی ہو گیا ہے۔ چلو مانا کہ خیال آ ہی گیا ہے تو کر دیں کسی سے بھی، میری پسند بھی پوچھی جا رہی ہے، پہلے تو کبھی کسی بارے میں پوچھا نہیں سب فیصلے گھر والے خود ہی کرتے رہے اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ان کا ہر فیصلہ میرے لیے بہتر ہی ثابت ہوا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے دیا جا رہا ہے، اس بات پر تو مجھے خوش ہونا چاہیے۔ لیکن ساری زندگی تو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے تک نہیں دیا، پسند کرنا تو دور کی بات ہے۔

بہنوں کے درمیان رہ رہ کر مجھے ہر لڑکی بہن ہی دکھائی دیتی۔ گھر میں اکثر ہی کسی نہ کسی بہن کی کوئی نہ کوئی سہیلی آئی رہتی فوراً "مجھے "گھوری" سے نوازا جاتا، جو کبھی اماں اور کبھی خود آپاؤں کی طرف سے ہوتی جس کا مطلب ہوتا کہ منظر سے ہٹ جاؤں، میں بادل نخواستہ کمرے میں چلا جاتا۔ سہیلیاں پورے گھر میں دندناتی پھرتیں اور مجھے پردے میں بٹھا دیا جاتا۔ میرے دوستوں کو تو آنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ چونکہ ابا اپنی دوستیاں باہر ہی بھگتا آتے اس لیے مجھے بھی ایسا ہی کرنے کا کہا گیا۔

"گھر میں جوان بہنیں ہیں۔ ان مسٹنڈوں سے باہر ہی مل آیا کرو۔"

ابا کا حکم تھا اور میں اپنے مسکین سے دوستوں پر مسٹنڈا ہونے کا الزام لگانے پر اعتراض بھی نہ کر پاتا۔ اس طرح کے حالات میں اور ہر وقت بہنوں کا ہوا سر پر رہنے کی وجہ سے میری پرسنالٹی میں بھی ایک طرح کا "بھائی پن" آ گیا۔ یونیورسٹی میں بھی لڑکیاں مجھے فوراً ہی بھائی بنا لیتیں تاکہ میں کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہو جاؤں۔ اس سب کے بعد بھی اگر گھر والے یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے کسی لڑکی سے عشق وشق ہو سکتا ہے اور کوئی لڑکی بھی مجھے پسند کرنے کی حماقت کر سکتی ہے تو میں کیوں اس کی نفی کروں۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا سونے سے پہلے اسی بارے میں سوچتا رہا۔

وہ سب لڑکیاں جو میری زندگی میں آ سکتی تھیں، انہیں دھیان میں لانے لگا۔ انہیں میں نے تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے نمبر پر ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں، ہما، شہلا، نرگس، سمرین سب ایک ایک کر کے ذہن میں آنے لگیں۔ کسی اور لڑکے کو تم ہی لفٹ کرواتیں لیکن مجھ سے بے تکلفی سے بات کر لیتی تھیں میں بھی ان کے کام بھاگ بھاگ کر کر دیتا۔

"علی بھائی! ذرا فوٹو اسٹیٹ تو کروا دیں۔"

"علی بھائی! میں چھٹی پر تھی نوٹس چاہئیں۔"

"علی بھائی! یہ، علی بھائی وہ، بھائی کا دم چھلا تو ضرور ساتھ ہوتا مگر بھائی کہنے سے کوئی بھائی بن تھوڑی جاتا ہے۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ شہلا اور نسرین تو منگنی شدہ تھیں اور باقی بھی اب تک شادی شدہ ہو چکی ہوں

گی۔ چار پانچ سال ہو رہے ہیں پڑھائی ختم کیے ہوئے۔ اب تک تو ان کے ایک دو بچے بھی ہو گئے ہوں گے۔ بلکہ اگر جڑواں ہوں تو تین یا چار بھی ہو سکتے ہیں۔ پر بچے تو وہی اچھے، میرے تو وہی ہوں گے ..... لاحول ..... میں بھی کیا سوچنے بیٹھ گیا ہوں خود کو ڈانٹا اور ان سب لڑکیوں پر لعنت بھیجی۔

دوسرے نمبر پر اہل محلہ تھیں، اس میں بھی کچھ ورائٹی نہیں تھی کچھ بیاہی جا چکی تھیں اور کچھ بہت چھوٹی تھیں۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ کال ہی پڑ گیا ہو۔ دو گھر چھوڑ کر دو منزلہ مکان میں رہنے والی نبیلہ بی اے کر کے کسی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ آفس آتے جاتے اکثر نظر آ جاتی، چادر میں لپٹی ہوئی، نظریں جھکائے پیدل ہی اسکول جاتی تھی۔ ویسے تو میں بھی نظریں جھکا کر ہی چلتا ہوں بظاہر مگر نظریں جھکی ہوتی ہیں بند تو نہیں اتنا تو آتے جاتے پتہ چل ہی جاتا ہے۔ اچھی لڑکی ہے۔ محلے داری، رشتہ داری میں بدل جائے تو کیا برائی ہے۔ مکے لانے لے جانے کا جھنجھٹ بھی نہیں ہوگا۔ اس کا بھی بھلا ہو جائے گا بے چاری پڑھ کر رشتے کے انتظار میں جاب کر رہی ہے۔ لیکن میں جاب چھڑوا دوں گا، خیر کرتی بھی رہے تو کوئی حرج نہیں ..... لاحول ولا ..... ذہن کو واپس ٹریک پر لایا۔

ہر طرح سے مطمئن ہو کر میں نے نبیلہ کو ٹاپ آف دی لسٹ رکھ لیا۔ ویسے تو محلے میں ایک اور بھی ہستی تھی ثمینہ، ہماری گلی کے کار نر والے گھر میں رہتی تھی۔ لیکن میں اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس سے چڑ تھی۔ اس کی اماں اور ہماری اماں بچپن کی گوڑی سہیلیاں تھیں۔ اتفاق سے شادی کے بعد ایک ہی محلے میں آ بسیں، اس لیے ہر وقت کا آنا جانا تھا۔ آج کیا پکانا ہے، سے لے کر بچوں کے رشتوں تک ایک دوسرے کے مشورے کے بغیر نہیں کرتی تھیں۔

ثمینہ عمر میں ضوفشاں سے چھوٹی اور افشاں درفشاں سے بڑی تھی اس لیے اس کی ان تینوں سے دوستی تھی لہٰذا ضوفشاں کی شادی کے بعد بھی اس کا آنا

طنز و مزاح سے بھرپور کالم

باتیں انشاء جی کی

ابنِ انشاء

قیمت: -/300 روپے

ڈاک خرچ: -/30 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

جانا لگا رہا۔ زیادہ تر تو اس کی آمد اس وقت ہی ہوتی جب میں گھر نہیں ہوتا تھا مگر پھر بھی کبھی آمنا سامنا ہو ہی جاتا۔ وہ ہر وقت کھی کھی کرتی رہتی۔ پہلے تو مجھے خوش فہمی ہوئی پھر پتہ چلا اس کی شکل ہی ایسی ہے' سنجیدہ بھی ہوئی تو لگتا ہنس رہی ہے۔

"علی بھائی! خیر تو ہے' اداس لگ رہے ہیں؟" کھی کھی کی۔

"ابھی تک جاب نہیں ملی۔" کھی کھی کی۔

"پھر انٹرویو میں رہ گئے؟" کھی کھی کی۔

"آج آفس نہیں گئے' طبیعت تو ٹھیک ہے۔" کھی کھی کی۔

لگتا حال نہیں پوچھ رہی' مذاق اڑا رہی ہے۔ لیکن میں اس کے بارے میں سوچ ہی کیوں رہا ہوں۔ اپنی گلی میں تو صرف نبیلہ ہی میرے جوڑ کی تھی دوسری گلیوں اور باقی محلے کا مجھے کچھ پتہ نہ تھا' کہا نا کوئی آ بھی جاتی تو مجھے پردہ کرا دیا جاتا تھا۔

تیسرے نمبر پر اپنے خاندان والی تھیں۔ ہونی تو یہ ترتیب الٹی چاہیے تھی یعنی خاندان کا نمبر پہلا ہونا چاہیے تھا مگر چار بہنوں کی خاندان میں شادیاں ہو چکی تھیں۔ ان کی شادیوں سے پہلے جن خالہ' ماموں' پھپھو' تایا سے قریبی تعلق اور رشتہ تھا' شادیوں کے بعد وہ صرف بیٹیوں کے سسرالی ہو گئے۔ کہیں پھپھو روایتی ساس بن چکی تھیں اور کہیں سہیلی جیسی کزن روایتی نند' آپاؤں کے منہ سے ان کے سسرال کی باتیں سن سن کر خاندان والوں سے سب کا ہی دل کھٹا ہو گیا تھا' اس لیے کسی کے متعلق سوچنا ہی فضول تھا۔ نیند بھی آ رہی تھی لہٰذا نبیلہ کو ہی فائنل کر کے خوابوں کی وادی میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"انھیں نا جانو! دیر ہو رہی ہے۔" نرم نرم انگلیاں بالوں میں پھرنے لگیں' آنکھ کھلنی کیا تھی مزید نیند آنے لگی۔

"اٹھ جائیں میں ناشتہ بنا رہی ہوں۔" بادل نخواستہ آنکھیں کھولیں تو وہ جا چکی تھی۔ ٹائم دیکھ کر بستر سے چھلانگ لگائی۔ جلدی سے تیار ہو کر کچن میں پہنچا۔ جہاں اماں بہو کی بلائیں لے رہی تھیں۔ ناشتہ تیار تھا۔

"جاتے ہوئے مجھے ذرا امی کی طرف چھوڑتے جانا۔" میں نے اس کے چادر میں لپٹے ہوئے وجود کو دیکھا اور کہا۔

"دو قدم پر تو گھر ہے۔ خود چلی جاؤ۔"

"بے شک ہو' اکیلی جاتی اچھی لگے گی۔" اماں اس سے پہلے بولیں۔

میں بھی تو یونہی چھیڑ رہا تھا اور نہ پل پل ساتھ گزارنا چاہتا تھا' چاہے دو قدم کا راستہ ہی کیوں نہ ہو۔ ناشتے کے بعد ہم دونوں اماں کو خدا حافظ کہہ کر نکلے۔ میں بائیک کو کک لگا کر اسٹارٹ کرنے لگا' وہ شرمائی ہوئی چادر کا کونا منہ پہ ڈالے پاس کھڑی تھی۔ کم بخت اسٹارٹ ہو کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے زور زور سے کک ماری تب جا کر اسٹارٹ ہوئی۔ وہ میرے پیچھے بیٹھی تو میں نے شوخی میں تیزی سے بائیک کو باہر نکالا' ساتھ ہی دھڑام کی آواز کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ میں بستر کے نیچے پڑا تھا اور کک مار مار کر میں میری ٹانگ سے بری طرح پٹا ہوا تھا۔

اس خوب صورت خواب کے ٹوٹ جانے پر افسوس ہوا۔ کتنی ہی دیر تک میں اس چادر میں چھپے چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بس ایک دھندلا سا عکس تھا لیکن مجھے یقین تھا وہ نبیلہ ہی تھی۔ سونے سے پہلے اسے ہی تو فائنل کر کے سویا تھا۔ میرے چہرے پر خود بخود مسکراہٹ آ گئی۔ اس خواب نے تو اس کے نام پر مہر لگا دی۔ بس میں آج ہی بات کرتا ہوں گھر والوں سے۔

تیار ہو کر ناشتہ کرنے پہنچا۔ صبح والی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ افشاں اور درخشاں کالج کے لیے تیار ہونے کے ساتھ ساتھ لڑنے کا کام بھی کر رہی تھیں۔ بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود ناشتہ اماں خود بناتیں۔ البتہ کالج سے واپسی پر دونوں بہنیں گھر سنبھال لیتیں۔ میں نے اطمینان سے ناشتہ کیا اور اس انتظار میں ہی رہا کہ کوئی مجھ سے کچھ پوچھے' دوبارہ وہ ذکر چھیڑے تو میں فٹ نبیلہ کا نام لے دوں' مگر ہر کسی کو جلدی تھی میں بھی خاموشی سے جاب پر چلا گیا۔ شام کو جب سب مل بیٹھیں گے تو کہہ دوں گا۔ سارا دن میں خواب کے خمار میں رہا' جیسے تیسے دن گزار کر گھر آیا۔ گھر میں غیر معمولی خاموشی کا گمان ہوا۔ افشاں کو چائے کا کہہ کر کپڑے بدلنے کمرے میں چلا گیا۔ ابا صحن میں اخبار پڑھ رہے تھے یا ظاہر کر رہے تھے میں بھی ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"لیں بھائی!" افشاں چائے کی بجائے ملک شیک کا گلاس لے آئی۔

"میں نے چائے مانگی تھی۔" میں منمنایا۔

"یہ اس سے اچھا ہے۔"

"مگر مجھے اس وقت چائے کی طلب....." اس نے میری بات پوری ہونے سے پہلے کاٹ دی۔

"سارا دن پتہ نہیں کچھ کھاتے بھی ہیں یا نہیں اور گھر آتے ہی کلیجہ چبانے کے لیے چائے چاہیے۔ یہ پئیں ٹھنڈک پڑے گی۔"

میں نے گلاس پکڑا اور مزید بحث کی بجائے منہ سے لگا لیا۔ "یہ چھوٹی دونوں بھی اس قابل ہو گئی ہیں کہ میرے متعلق فیصلے کرنے لگیں۔ میں ہرگز انہیں اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دوں گا۔" ویسے ملک شیک سے واقعی اندر ٹھنڈک سی پڑ گئی اور گرمی سے بے حال ہوتے حواس قابو میں آ گئے میں اپنا فیصلہ سنانے کے لیے تیار تھا۔

"اماں کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"لو آ گئی تمہاری اماں!" ابا نے دروازے سے کانوں کو ہاتھ لگاتے اماں کو دیکھ کر کہا۔

"السلام علیکم!" میں نے خوش دلی سے اماں کو سلام کیا۔

"توبہ توبہ۔" اماں نے جواب دیے بغیر توبہ جاری رکھی۔

"آپ یہاں پنکھے کے آگے آ جائیں۔ آج گرمی ہی تو بہت ہے۔" میں سمجھا اماں گرمی سے توبہ کر رہی ہیں۔

"اللہ یہ دن کسی کو نہ دکھائے توبہ۔" اماں نے پھر کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"آمین' لیکن ابھی تو ایسے کئی جھلسا دینے والے دن ہمارے نصیب میں لکھے ہیں۔"

میرے دماغ میں بھی گرمی چڑھی ہوئی تھی' جو مجھے اماں کا مختلف انداز نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ افشاں نے اماں کو بھی ملک شیک کا گلاس لا کر دیا' جسے انہوں نے غٹا غٹ چڑھا لیا۔

"تو کیا وہ خبر سچ ہے؟" افشاں نے خالی گلاس پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں' کیا زمانہ آ گیا ہے۔" اماں نے پھر کانوں کو ہاتھ لگانا جاری رکھا۔ ابا نے ایک گہری سانس بھری۔

"ہوا کیا ہے' کوئی مجھے بھی تو بتائے؟" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"یہ دو گھر چھوڑ کر جو امین صاحب ہیں نا' ان کی بیٹی نبیلہ....."

"ہاں ہاں" میں نے بے صبری سے کہا' دل رکنے لگا۔

"وہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔" دل سمجھو رک ہی گیا۔

"اسی کے ساتھ؟" افشاں نے پوچھا' اسے پہلے سے ہی ساری معلومات تھیں' اماں بھی شاید صرف کنفرم کرنے ہی گئی تھیں۔

"ہاں اسی کے ساتھ۔"

"کس کے ساتھ؟" میرے منہ سے پھسلا۔

"اپنے شوہر کے ساتھ۔" درخشاں نے کہا جو اماں کی آواز سن کر باہر آ چکی تھی۔

"شوہر؟" مجھے اس کے بھاگ جانے سے زیادہ اس بات کا صدمہ ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے مگر کب ہوئی یہ شادی' میں کہاں تھا؟

"ہاں شوہر ہی بنتا ہے' نکاح ہوا تھا۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ چچا نے مرتے وقت خواہش کی تو اس کے سامنے سادگی سے نکاح کر دیا۔ مگر ادھر اس کی آنکھیں بند ہوئیں ادھر ان کی آنکھیں پھریں۔ سنا ہے

دیورانی جٹھانی میں اندر اندر کافی حالات خراب تھے۔ نبیلہ کی ماں نے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔" درخشاں میری معلومات میں اضافہ کرکے ذرا رکی اور پھر بولی۔

"مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی، کسی کے ساتھ بھاگ جانے اور شوہر کے ساتھ چلے جانے میں کوئی فرق تو ہوگا۔"

"کوئی فرق نہیں، اس کی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔" اماں نے سختی سے کہا۔

"کون سا قانون اسے اس کے ساتھ جانے سے روک سکتا ہے۔" افشاں نے بھی رائے دی۔

"بھاڑ میں گیا قانون، ماں باپ کی عزت اچھال دی۔" اماں غصے سے بولیں۔

"ماں باپ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ نہ بنائیں اور اولاد کی خوشیوں کا خیال رکھیں تو یہ حالات ہی نہ پیدا ہوں۔" درخشاں کہہ کر فوراً" پٹن میں چلی گئی۔ مبادا اماں کا جوتا نہ پڑ جائے اختلاف رائے کی صورت میں۔

"کہہ تو ٹھیک رہی ہے، اپنا تماشا خود بنوا لیا ہے۔ سیدھے سادے عزت سے رخصتی کر دیتے۔" ابا جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھے تھے اپنی رائے دے کر اٹھ گئے۔

میں جو سو طرح کے طریقے اور الفاظ سوچ کر آیا تھا، اپنی پسند کا اظہار کرنے کے، خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ رات کے کھانے پر بھی نہ نکلا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ اماں بھوکا سونے دیتیں، میرے کمرے میں آکر نوالے منہ میں ڈال ڈال کر زبردستی کھلایا۔

کھاپی کر دماغ دوبارہ سوچنے کے لیے بحال ہوا۔ یونیورسٹی فیلو اور اہل محلہ تو نکل گئیں لسٹ سے۔ اب رہ گئیں صرف خاندان والیاں، جنہیں پہلے تو میں نے کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔ لیکن پہلے میں نے کبھی اس نظر سے دیکھا بھی نہیں تھا نا! یا یوں کہہ لیں کبھی دیکھنے نہیں دیا گیا ہر وقت تو کڑی نظروں کی حصار میں رہتا تھا۔ ویسے بھی ہمارے گھر کے برعکس باقی خاندان میں لڑکیاں کم کم ہی تھیں۔ کہیں ایک آدھ تھی اور کہیں سرے سے تھی ہی نہیں۔ لڑکے بہت تھے۔ اسی لیے تو بہنوں کے رشتے بہت آسانی سے خاندان میں ہی ہو گئے۔ بار بار ذہن میں وہ رشتہ دار آتے جو "آپاؤں" کے سسرالی بن چکے تھے۔ اس لیے ادھر تو سوچنے کی بھی ہمت نہ ہوتی۔ کیا تھا جو نبیلہ سے ہی بات بن جاتی۔ ایک تو شادی شدہ نکلی اوپر سے گھر سے بھاگ گئی۔ ویسے لوگ گھر سے بھاگتے ہی کیوں ہیں مطلب چل کے بھی تو جا سکتے ہیں یوں لگتا ہے کہ بھاگنے والا سب کی نظر بچا کر گھر کے دروازے تک آیا اور کہا "ریڈی ون ٹو تھری گو..... لاحول ولا.....

☆ ☆ ☆

رات سونے سے پہلے تک کچھ فیصلہ نہ ہو سکا۔ خواب میں میں لوگوں کو بھاگتے ہوئے ہی دیکھتا رہا۔ ہر گلی ہر سڑک پر ہر کوئی بھاگ رہا ہے۔ خود میں گھر کے دروازے پر بھاگنے کے لیے تیار کھڑا ہوں، کسی کا ہاتھ مجھے پیچھے کھینچ رہے ہیں۔ ناشتے پر پھر نبیلہ کا قصہ ہی زیر بحث تھا۔ کسی کی ہمدردیاں نبیلہ کے ساتھ تھیں تو کسی کی اس کے گھر والوں کے ساتھ۔ میں بور ہو کر آفس چلا آیا۔ سارا دن کام میں مغز مار کر تھکا ہارا گھر پہنچا تو سب پریشان تھے۔ یا اللہ خیر اب کون بھاگ گیا؟

"تیرے چاچے نیاز کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔" ابا نے بتایا۔

"کب، اب کدھر ہیں، ٹھیک تو ہیں۔"

"دو دن ہو گئے ہیں، اب بہتر ہے، تیرے تایا نے بتایا ہے۔ ادھر ہی ہے لالہ موسیٰ میں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں، اللہ بہتر کرے گا۔" میں نے ابا کو تسلی دی۔

"ہے تو چچیرا بھائی پر سگوں کی طرح ہے۔"

"ابا آپ کو جانا چاہیے ان کا پتہ کرنے کے لیے۔"

"مجھے جانا چاہیے تو کب ذمہ داریاں سنبھالے گا۔"

"جی میں....." میں منمنایا۔ پتہ تھا ابا سفر سے

گھبراتے ہیں اور وہ بھی گرمی کے موسم میں۔ یہ نہیں پتہ تھا کہ میرے سر ہی آپڑے گا۔

"ہاں، تم اب اماں کی گود چھوڑو، میری جگہ تم نے ہی خاندان کو سنبھالنا ہے۔"

"پر صادق حسین! اتنی گرمی میں میرا بچہ لالہ موسیٰ جائے گا۔" اماں نے تڑپ کر کہا۔ تو میں نے ممنون نظروں سے انہیں دیکھا۔

"تم اسے بڑا بھی ہونے دو گی یا نہیں، ویسے تو اس کی شادی کرنا چاہتی ہو، پہلے سوچ لو اتنی ذمہ داری اٹھانے کے بھی لائق ہوا ہے یا نہیں۔" ابا نے اماں کو سنانا شروع کیا تو مجھے دخل دینا پڑا۔ میری وجہ سے ہی تو لڑ رہے تھے۔

"چلا جاؤں گا ابا! یہ کون سا بڑا کام ہے۔" دل میں چھوٹے گھر برباد ہونے کا افسوس ہوا تھا ابا اور چاچا نیاز کی بے شک بچپن اور جوانی میں دوستی رہی ہو لیکن الگ شہروں میں رہنے کی وجہ سے اب صرف خوشی غمی پر ہی ملاقات ہوتی تھی، آخری بار وہ شاید صوفشاں کی شادی پر آئے تھے اکیلے ہی تھے کیونکہ بچوں کے کوئی امتحان چل رہے تھے پتہ نہیں کتنے بچے تھے ان کے، میں ان کی طرف کبھی بچپن میں ہی گیا تھا۔

اگلے دن اتوار تھا صبح صبح ابا نے جگا دیا۔ "ٹھنڈے ٹھنڈے نکل جاؤ، اچھا ہے۔"

تیار ہوتے ہوتے پھر بھی دیر ہو گئی۔ اماں نے بھی ہزار نصیحتوں کے ساتھ رخصت کیا۔

"بس کر، شام تک آجائے گا۔" آپا نے اماں کو تسلی دی۔ ابا کو بہت کہا کہ ان کو فون کر کے بتا دیں میرے آنے کے بارے میں مگر انہوں نے کہا کہ اچانک جاؤ گے تو زیادہ خوشی ہو گی۔ ویسے بھی بتانے سے اگلے تکلفات میں پڑ جاتے ہیں، یہ ان کی اپنی ہی منطق تھی حالانکہ اب تو بغیر اطلاع کسی کے گھر جانے کو خاصا غیر مہذب سمجھا جاتا ہے۔

صبح دس بجے میں ان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دروازہ کھولنے والی ہستی کو دیکھ کر لگا کہ بچے اب بچے نہیں رہے بڑے ہو گئے ہیں۔ دراز قامت، صاف رنگت اور حیران آنکھوں والی دوشیزہ سے تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں پڑی اس نے جلد ہی پہچان لیا۔ چاچا نیاز بھلے چنگے بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے فوراً" مجھے گلے لگا کر پیار کیا۔ چاچی بھی بڑی اچھی طرح ملیں۔

"شرمین، بھائی کے لیے پانی لا۔" چاچی نے وہیں سے آواز دی۔ جس کے جواب میں سولہ سترہ سالہ لڑکی ٹھنڈے مشروب کے ساتھ آئی۔ چاچا، چاچی سب گھر والوں کا پوچھنے لگے۔ نظریں مسلسل اس پری وش کو دیکھنا چاہ رہی تھیں، جو جانے کہاں غائب ہو گئی تھی کہ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں تو چاچا کا حال پوچھنے آیا ہوں۔

"آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، میں آپ کی خیریت پوچھنے ہی آیا ہوں۔"

"بس بیٹا! اللہ نے بچا لیا۔"

"ہوا کیسے؟" میں نے دلچسپی ظاہر کی۔

"میں رکشے میں جا رہا تھا کہ سائیڈ سے موٹر سائیکل اچانک کسی گلی سے نکلی اور دونوں کی ٹکر ہو گئی۔ غلطی رکشے والے کی نہیں تھی۔ رکشہ الٹ گیا سب کو ہی معمولی چوٹیں آئیں، انہوں نے پاؤں پر بندھی پٹی دکھائی، بازو پر بھی بینڈیج تھی جن پر پہلے میں نے غور نہیں کیا تھا۔ "تیرا ابا خود بھی آجاتا تو اچھا تھا، بڑا عرصہ ہو گیا ملے ہوئے۔"

"جی وہ خود ہی آنا چاہ رہے تھے لیکن....."

"اچھا کیا بیٹا تم آگئے، جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے انہیں کیا ضرورت ہے، گرمی میں خوار ہونے کی۔" چاچی نے حسرت سے کہا۔ ان کی دو بیٹیاں ہی تھیں بیٹا نہیں تھا۔ اماں نے بتایا تھا۔

"چائے پیں گے علی بھائی؟" شرمین نے آکر پوچھا۔

"نہیں، دل نہیں چاہ رہا۔" میں نے تکلف سے کہا۔

"کھانے میں تھوڑا ٹائم ہے، تب تک چائے سے کام چلائیں۔" اس نے بے تکلفی سے کہا تو میں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

شرمین اور سنبل دونوں چائے اور لوازمات لے کر آئیں۔ میں بظاہر چاچا کی باتیں سنتے ہوئے کن انکھیوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی خوب صورت اور شرمیلی سی مسکراہٹ تھی' وہ چائے رکھ کر واپس چلی گئی۔ پُر تکلف چائے کے دوران چاچا پرانی باتیں سناتے رہے۔ جو میں بے دھیانی سے سنتا رہا۔ چاچا کا کوئی فون آیا تو میں پانی پینے کے بہانے چھوٹے سے صحن میں ایک طرف بنے باتھ روم کی طرف چلا آیا۔ مقصد تو اس ستم گر کا دیدار تھا باتھ روم سے اشتہا انگیز خوشبوئیں آرہی تھیں۔ سنبل میری موجودگی سے بے خبر گنگناتے ہوئے چمچہ چلا رہی تھی اور میں اپنے آپ سے بے خبر اسے تکے جارہا تھا۔

"کچھ چاہیے تھا علی بھائی؟" شرمین نے پیچھے سے پکارا تو میں جو باتھ روم کے دروازے میں کھڑا تھا سائیڈ پر ہو گیا' تب ہی اس نے بھی مڑ کر دیکھا اور جلدی سے دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔

"دھیانی کے لیے آیا تھا۔"

"یہ لیں۔" اس نے پانی کا گلاس مجھے پکڑایا' جسے جلدی سے خالی کر کے واپس اسے تھمایا۔

"آپ کو بھوک تو نہیں لگی' بس ابھی کھانا تیار ہو جاتا ہے' ہماری آپی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے اور آج تو یہ ویسے بھی بہت دل لگا کر بنا رہی ہیں۔"

شرمین کی اس بات پر سنبل نے اسے گھور کر دیکھا اور میں نے چونک کر مجھے مزید وہاں کھڑے رہنا مناسب نہ لگا اور آکر چاچا کے پاس بیٹھ گیا لیکن ایک دم مجھے کچھ کلک ہوا۔ ہو نہ ہو' ابا نے مجھے جان بوجھ کر یہاں اکیلا بھیجا ہے تاکہ میں لڑکی دیکھ لوں اور ان سب کو بھی پتہ ہے ان کی باتوں اور سنبل کے شرمانے سے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔ ایک میں ہی بے وقوف ہوں' ورنہ ایکسیڈنٹ تو ایسا بڑا نہیں ہوا' فون پر بھی پوچھا جاسکتا تھا۔ ابا بھی نہ بس' بتا دیتے تو میں ذرا زیادہ اچھے حلیے میں آجاتا۔ مجھے ابا پر بہت پیار آیا۔ انہیں میرا کتنا خیال ہے۔ اب میں فوراً واپس جانا چاہتا تھا تاکہ گھر والوں کو اپنی مرضی اور پسند سے آگاہ کردوں۔ ایک بجے تک کھانا لگا دیا گیا ہمارے کھانا کھاتے ہی شرمین نے جلدی سے سب سمیٹا۔

"برتن دھو کر کچن دیکھ لو اور سنبل سے کہو' ذرا ریسٹ کرلے صبح سے لگی ہوئی ہے۔" چاچی نے شرمین کو ہدایت دی' ساتھ ساتھ کشن کے کور تبدیل کرنے لگیں۔

"میرے خیال سے میں اب چلتا ہوں۔" میں نے ان سے اجازت چاہی تو چاچا نے چاچی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بیٹا! میں تو کہتا ہوں آج رُک جاؤ۔"

"نہیں چاچا! پھر آؤں گا اماں ابا کے ساتھ۔" میں نے نظریں جھکا کر ذرا شرما کر کہا۔

"بچیاں بھی کہہ رہی تھیں کہ بھائی کو روک لیں۔" چاچی نے اضافہ کیا۔

"بھائی' نہیں۔" ایک چیخ بلند ہوئی اور اندر ہی رہ گئی۔

"میں جلدی چکر لگاؤں گا۔"

"جم جم آؤ بیٹا! اصل میں بات یہ ہے کہ ہم نے سنبل کی بات طے کردی ہے۔"

"جی۔۔۔؟" سمجھنے میں ذرا دیر لگی۔

"یہیں ایک فیملی میں' بہت اچھے لوگ ہیں لڑکا بھی پڑھا لکھا' سلجھا ہوا ہے' ہمیں ہر لحاظ سے مناسب لگا تو آج وہ لوگ آرہے ہیں رسم کرنے۔" چاچی خوشی خوشی بتانے لگیں۔

"اچھی بات ہے' مبارک ہو آپ لوگوں کو۔" بمشکل جو ٹوٹا پھوٹا کریہہ الفاظ منہ سے نکالے۔

"ویسے تو ہمارے ہاں منگنیوں کا رواج نہیں ہے۔ بس بزرگوں میں بات طے ہو جاتی ہے۔ تمہیں پتہ ہی ہے۔ لیکن زمانہ بدل گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ آنا چاہتے ہیں تو ہم نے انکار نہیں کیا۔ لیکن کوئی لمبا چوڑا فنکشن نہیں ہے صرف ان کے گھر کے لوگ ہوں گے اور ہم نے بھی کسی کو نہیں بلایا' بلکہ ابھی تک تو بتایا بھی نہیں کہ رسم ہو جائے تو سب کو اطلاع کریں گے۔" چاچا تفصیل بتا رہے تھے۔ ٹھیک ہے جو مرضی

کریں پر میرا اس سب سے کیا تعلق بلکہ اب کیا تعلق میں سوچ کر رہ گیا۔

"بیٹا تو ہے نہیں اوپر سے تمہارا چاچا پاؤں زخمی کر بیٹھے ہیں مجھے تو گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ پہلا پہلا موقع ہے ہم عورتیں کیا کیا دیکھیں گی۔" چاچی نے اس طرح کہا کہ میں کچھ بول ہی نہ سکا۔

"میں ابا کو فون کردیتا ہوں۔"

"انہیں میں نے فون کردیا ہے' اجازت بھی لے لی ہے۔" چاچا نے کہا۔

لو سب فیصلے کر لیے ہیں تو مجھ سے پوچھنے کا تکلف کیسا؟ ان حالات کے بعد دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک منٹ یہاں نہ رکوں پر مجھ سے پوچھتا کون ہے؟ کچھ دیر پہلے ابا پر آنے والا پیار غصے میں بدل چکا تھا۔ گھر بیٹھ کر سب صرف باتیں کر رہے ہیں اچھا بھلا رشتہ نکل گیا ہاتھوں سے۔

چاچی نے باز اور سے کچھ چیزیں منگوائیں۔ وہ لاکر دیں پھر ان کے ساتھ مل کر ڈرائنگ روم کی سیٹنگ ذرا تبدیل کی' مزید کرسیاں اندر رکھیں تاکہ زیادہ لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ بنے اور یہ سب کرتے ہوئے جو میرے دل پر گزر رہی تھی' میں ہی جانتا تھا کچن سے بدستور خوشبوئیں آرہی تھیں تو یہ سب اہتمام میرے لیے نہیں تھا۔

مہمانوں کو چار بجے آنا تھا قومی روایت برقرار رکھتے ہوئے وہ لوگ ساڑھے پانچ بجے پہنچے۔ لڑکے کے ماں باپ اور بہن بھائی ہی تھے خود لڑکا بھی ساتھ تھا' واقعی زمانہ بدل گیا ہے۔ میرا تعارف چاچا نے بڑی اچھی طرح کرایا۔ کولڈ ڈرنک سرو کرتے ہوئے میں نے لڑکے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ کافی معقول تھا۔ گھر والے بھی پڑھے لکھے اور مہذب لگ رہے تھے۔ اب واقعی مہذب تھے یا مہذب ہونے کی ایکٹنگ کر رہے تھے یہ سب تو کچھ عرصے بعد کھل ہی جانا ہے۔ رسم کے لیے سنبل کو اندر لایا گیا۔ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی میں نے حتی الامکان اپنی نظروں کو "برادرانہ" ہی رکھا۔ اس کے چہرے پر وہی شرمیلی سی مسکراہٹ تھی جو یقیناً "میرے لیے نہیں تھی" یہ خوش فہمی بھی دور ہو چکی تھی۔

لڑکے کی ماں نے انگوٹھی پہنائی' مٹھائی کھانے کھلانے اور تصویروں کا سیشن ہوا۔ لڑکے کے چھوٹے بھائی عاصم کو جلدی تھی پتہ چلا کہ اس نے تو ہمارے شہر ہی جانا ہے۔ میں نے اسی وقت اس سے بات کر کے اس کے ساتھ واپسی کا پروگرام بنا لیا۔ مغرب کے بعد کھانا لگا دیا گیا۔ کھانے کے فوراً بعد جب عاصم نے اجازت چاہی تو میں نے بھی چاچا چاچی کو راضی کرلیا' ویسے بھی اب میری وہاں ضرورت نہیں تھی۔

چاچی نے مٹھائی بھی ہمراہ کردی۔ عاصم کے پاس گاڑی تھی۔ پتہ نہیں اپنی تھی یا شوہارنے کے لیے کسی کی لایا تھا بہرحال میرا بھی مسئلہ حل ہو گیا' رات دس بجے میں اپنے گھر کے دروازے پر تھا۔ نکلنے سے پہلے فون کر دیا تھا اس لیے سب انتظار ہی کر رہے تھے۔ عاصم کو بھی مروتاً "اندر آنے کے لیے کہا مگر رات کافی ہو چکی تھی اس لیے وہ معذرت کرتے ہوئے چلا گیا۔

میں سخت تھک چکا تھا اماں ابا کو مختصراً "چاچا چاچی کے متعلق بتا کر کمرے میں جانا چاہتا تھا مگر افشاں چائے لے آئی۔ وہ دونوں تو منگنی کے جوڑے سے لے کر لڑکے کی صورت' تعلیم اور ساس نند کے حلیے بھی تفصیل سے جاننا چاہ رہی تھیں یا یوں کہہ لیں میرے زخموں پر نمک چھڑکنا چاہ رہی تھیں۔ مگر میں ہوں ہاں کر کے کمرے میں چلا آیا۔ تھکن کی وجہ سے جلد ہی نیند آگئی۔ ساری رات خواب میں جانے کس کس کی انگلی میں کون کون سی انگوٹھی پہناتا رہا۔

☆ ☆ ☆

اگلے کچھ دن یونہی گزر گئے۔ گھر والے بھی لگتا تھا میری شادی کا ایک دفعہ ذکر کر کے بھول چکے ہیں مگر ایسا نہیں تھا۔ رات ہی افشاں نے دوبارہ میری پسند پوچھی اور ساتھ ہی کہا کہ اگر میرے لیے اتنا ہی مشکل ہو رہا ہے تو وہ خوشی یہ کارِ خیر سرانجام دے سکتی ہیں۔ اب میں کیا اپنی پسند بتاتا کہ ایک شادی شدہ لڑکی اور دوسری

کی منگنی خود اپنے سامنے کروا کر آرہا ہوں۔ مگر میں ہمت نہیں ہارنا چاہتا تھا۔

یہ کام اپنی ماں بہنوں پر چھوڑنے کا مطلب تھا کہ ساری زندگی بغیر شادی کے گزارنا کیونکہ چھ کی چھ کا کسی ایک لڑکی پر متفق ہونا مشکل ہی تھا' سو دوبارہ سے اپنی لسٹ کھنگالنے لگا۔ سارا دن اسی طرح گزرا شام کو گھر آیا تو ذہین آپا آئی ہوئی تھیں۔ اگلے محلے میں ہی ان کا یعنی ہمارے تایا کا گھر تھا اس لیے وقت بے وقت ان کا ادھر پایا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

غیر معمولی بات یہ تھی کہ ان کے ساتھ ہمارے تایا کی سب سے چھوٹی بیٹی بھی تھی حنا۔ جس کی حیثیت منجھلی آپا کی اس گھر میں شادی کے بعد صرف ان کی نند کی رہ گئی تھی اور جس کا ذکر کم کم ہی ہوتا تھا۔ کافی دنوں بعد سامنا ہوا تھا۔ میں نے اسے اس نظر سے دیکھا تو ٹھیک ہی لگی۔ آپا گھر جانے ہی والی تھیں کہ میں نے انہیں گھر تک چھوڑ آنے کی خدمات پیش کیں انہوں نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا کیونکہ پہلی دفعہ میں نے انہیں آفر کی تھی اکثر تایا یا خود راشد بھائی آکر لے جاتے اور اب تو ان کے بچے بھی اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ کسی اور کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ میں ان کاموں سے بچا ہوا تھا' اس کی وجہ اماں تھیں ورنہ میری کیا مجال۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میں نے بہنوں کے آنے جانے کی ذمہ داری لے لی تو ساری زندگی یہی کرتا رہا ہوں گا' کیونکہ ایک شہر میں رہنے کی وجہ سے ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی آئی ہی رہتی تھی۔ اماں نے کہا بھی کہ ابھی تو تھکے ہارے آئے ہو مگر میں ساتھ چل پڑا۔

راستے میں جتنی دفعہ حنا سے بات کرنے کی کوشش کی جواب آپا نے دیا۔ میں بھی ڈھیٹ بنا رہا۔ حنا جب موقع ملتا ایک آدھ بات کر لیتی ورنہ زیر لب مسکراتی ہی رہی۔ ان کے گھر پہنچنے کے بعد آپا نے مجھے باہر ہی سے رخصت کرنا چاہا مگر میں تایا ابا سے ملنے اور پیاس کے بہانے اندر آگیا۔ تایا اور راشد بھائی تو گھر پر نہیں تھے۔ حنا میرے لیے کولڈ ڈرنک لے آئی۔ آپا کے سمیر اور عزیر نے انہیں دیکھتے ہی بھوک کا نعرہ لگایا تو وہ کچن میں چلی گئیں (اگرچہ ان کی آنکھیں اور کان ہماری طرف ہی لگے ہوئے تھے) یوں مجھے تنہائی میں حنا سے کچھ باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔

باتیں کیا کرنی تھیں کچھ موسم کا حال سنایا' کچھ ملکی حالات پر تبصرہ کیا۔ لوڈ شیڈنگ کو کوسا۔ حکومت کو چار گالیاں دیں۔ حنا بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتی رہی' اس "رومانٹک" گفتگو کے بعد وہاں سے آتے ہوئے میرا ووٹ حنا کے حق میں پکا ہو چکا تھا۔ ٹھیک ہے آپا کے تعلقات بہت خوشگوار نہیں جس کی وجہ سے تھوڑی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن ابا کی سگی بھتیجی ہیں وہ تو پوری طرح میرے ساتھ ہوں گے' ہم باقی سب کو منا ہی لیں گے (یہ سب سوچتے ہوئے میں بھول گیا کہ گھر میں سب سے کمزور ووٹ میرا اور آپا کا ہی رہا ہے۔)

میں تیز تیز چلتا ہوا واپس گھر کے راستے پر چل پڑا۔ اب مجھے دیر نہیں کرنی ابھی جا کر سب کو فیصلہ سناتا ہوں۔

گھر میں داخل ہوا تو اماں سامنے ہی سر پکڑ کر بیٹھی تھیں۔ افشاں انہیں پنکھا جھل رہی تھی۔ ابا بھی کرسی پر بیٹھے بظاہر اخبار پڑھ رہے تھے۔ سب کی نظریں دروازے پر ہی لگی ہوئی تھیں۔

"ایسے انتظار میں کیوں سب بیٹھے ہیں' خیریت ہے نا' چار قدم پر آپا کو چھوڑنے ہی گیا تھا۔"

"صرف آپا کو ہی چھوڑ کر آرہے ہیں یا اپنا دل بھی وہیں چھوڑ آئے ہیں؟" یہ بات درخشاں ہی کر سکتی تھی' منہ پھٹ کہیں کی' لیکن یہ کہہ کر اس نے میرے لیے آسانی پیدا کر دی۔

"وہ ایسا ہے اماں' آپا کہہ رہی تھیں۔۔۔۔ وہ۔۔۔"

"سوچنا بھی مت۔" اماں نے ہاتھ اٹھا کر مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ابھی تو میں نے کچھ کہا بھی نہیں۔

"تمہاری آپا کا فون آیا تھا۔ رو رہی تھی کہ آدھی زندگی نند بن کر عذاب دیا اور باقی کی زندگی اس کی بھابھی بنا کر تم اجیرن کرواؤ گے۔"

ذہین آپا تو خاصی ذہین نکلیں۔ اس کے بعد اماں نے مجھے اور ابا کو پچھلے کئی سالوں سے آپا پر ہونے والے مظالم کی داستان اشکبار ہو کر سنائی اور میرے لیے کہیں کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی کہ اس کے متعلق کچھ کہنے کی جرأت کر سکوں۔ خواب میں بھی آپا نے وہ باتیں سنائیں کہ میں کانوں کو ہاتھ لگاتا بیدار ہوا۔ یہ قصہ بھی تمام ہوا۔ اس کے بعد کم از کم بہنوں کے سسرال کی طرف سوچنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں لڑکیوں کے رشتوں کا مسئلہ ہے۔ یہاں ایک جوان جہان' برسرروزگار' خوبرو (آہم) لڑکا پسند سے شادی کرنا چاہ رہا ہے تو لگتا ہے دنیا سے لڑکیاں ہی ختم ہو گئی ہیں۔

☆ ☆ ☆

ابھی میں اگلے لائحہ عمل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ قدرت نے ایک اور موقع دیا۔ جبین آپا کے چھوٹے دیور یعنی ہماری منجھلی پھپھو کے آخری بیٹے کی شادی اچانک طے پا گئی جس پر سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی کیونکہ شادی ایسا موقع ہوتا ہے جب سارا خاندان اکٹھا ہوتا ہے۔ میرے لیے یہ بہترین موقع تھا اور میں اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ مہینے بعد شادی تھی۔ لڑکیوں خصوصاً" بہنوں کو تو خدا موقع دے بھائیوں کی جیب خالی کروانے کا۔ افشاں اور درخشاں نے بھی جوڑے بنوائے اور جانے کیا الم غلم خریدا۔ مہندی کے فنکشن پر ابا نے تو جانے سے انکار کر دیا۔ اماں کی بھی طبیعت خراب تھی مگر بند اور بیٹی کا سسرال ہونے کی وجہ سے چلی تو گئیں مگر سارا وقت آپا کے بیڈ روم میں لیٹی رہیں۔ یہ کوئی بڑا فنکشن نہیں تھا' پھپھا تو اس طرح کی رسموں کے حق میں ہی نہیں تھے' بس مجبوراً" اجازت دے دی۔ اسی لیے یہ تمکس گیدرنگ نہیں تھی۔ قاسم کے دوستوں نے گھر کے ساتھ ہی چھوٹے سے میدان میں کچھ پروگرام رکھا ہوا تھا' اس کے بعد اسے اندر خواتین میں لانا تھا۔ خاندان والد اور آپا کا بھائی ہونے کی وجہ سے میں آزادی سے گھر کے اندر باہر گھوم رہا تھا' کئی کاموں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھا لیا' مثلاً" کسی کے روتے بچے کو ذرا باہر کا چکر لگوا لایا وغیرہ وغیرہ۔

لڑکیوں کی سج دھج دیکھنے والی تھی۔ میں نے آپاؤں کی گھوریوں کی قطعاً" پروانہ کی اور اندر باہر آتے جاتے جی بھر کر لڑکیوں کو تاڑا۔ منہ آسمان کی طرف اٹھائے جان بوجھ کر ٹکریں ماریں کہ شاید کوئی خوب صورت حادثہ ہو جائے مگر بدقسمتی سے سب "حادثے" بڑی بوڑھیوں کے ساتھ ہوئے جنہوں نے جواب میں خاصی عزت افزائی کی۔ مگر میں نے اپنا کام جاری رکھا بات شروع کرنے کا اس کے علاوہ کوئی طریقہ مجھے سمجھ میں نہیں آیا آخر کار ٹکر ایک حسینہ سے ہو ہی گئی۔ سولہ سنگھار کیے ہوئے وہ غضب میں اور بھی حسین ہو گئی۔ وہ مجھے برا کہہ رہی تھی یا بھلا میں سن کب رہا تھا۔ میرا تو وہ حال تھا بقول شاعر

اتنے شیریں تھے اس کے لب کہ ارمان علی
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

پتہ نہیں کون تھی وہ' کوئی دور کی رشتہ دار یا رشتہ دار کی رشتہ دار یا رشتہ دار کی سہیلی بہرحال میرا گوہر مقصود مل چکا تھا۔

"راستہ چھوڑیں گے آپ؟" ناگواری سے کہا گیا۔

"آپ کہاں رہتی ہیں؟" ڈھٹائی سے پوچھا گیا۔

"ڈھٹے کھوہ میں۔" کہتے ہوئے وہ سائیڈ سے نکل گئی۔

شروع ہی سب ایسے ہی نخرہ کھاتی ہیں۔ میں ابھی افشاں یا آپا کو دکھا دیتا' باقی معاملات وہ خود طے کر لیں گی۔ رہ گئی بات اس کے غصے کی تو یہ تو اچھی بات ہے۔ اچھی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں' ہر کسی کو لفٹ تھوڑی کراتی ہیں۔ اتنے میں باہر لڑکے کو مہندی لگانے کا شور اٹھا تو مجبوراً" مجھے باہر جانا پڑا۔ قاسم کے دوستوں نے کافی ہلا گلا مچایا۔ میری قاسم سے کچھ خاص دوستی نہ تھی میں تو اس کا کزن اور اس کے بھابھی کا بھائی ہونے کی وجہ سے یہاں موجود تھا۔ خواتین دور سے تانک جھانک کر کے لطف اندوز ہو رہی تھیں' ان میں وہ ماہ وش

نظر نہیں آئی۔ ہلا گلا جاری تھا کہ خواتین نے قاسم کو اندر لانے کا شور مچایا۔

میں نے سجی ہوئی کرسی اٹھائی اور اندر لے آیا۔ اندر ہڑبونگ سی مچ گئی۔ میری نظریں جسے ڈھونڈ رہی تھیں وہ کونے میں کچھ دوسری لڑکیوں کے ساتھ بے نیاز کھڑی تھی۔ یہی موقع تھا کہ میں اپنی کسی بہن کو اسے دکھا دوں۔ جلدی سے ارد گرد نظر دوڑائی تو چھوٹی آپا ایک چار چھ مہینے کے بچے کو اٹھائے بے زار سی نظر آئیں۔ میں جلدی سے ان کے پاس آیا۔

"آپا، آپا.....!" شور میں بمشکل ان تک اپنی آواز پہنچائی۔

"ہاں کیا ہے۔ کیوں چلا رہے ہو۔ پتہ نہیں کیسی ماں ہے۔ اندر سلا کر بھول ہی گئی۔" آپا بچے کو بہلاتے ہوئے بولیں۔

"آپا! پہلے میری بات سُنیں، وہ اِدھر دیکھیں۔" میں ان کی سنی اَن سُنی کر کے بولا۔

"کیا دیکھوں، مجھے اس کی ماں کو ڈھونڈنے دو۔"

"اِدھر دیکھیں آپا! وہ جو پیلے جوڑے میں زبیدہ خالہ کے ساتھ کھڑی ہے۔"

"ہاں ہاں اسی کا تو بچہ ہے یہ، پر تمہیں کیسے پتہ، خیر یہ پکڑو اور اسے دے آؤ۔"

"کیا.....؟ یہ نہیں ہو سکتا یا اللہ! یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے۔"

"میں کہوں گا کیا؟" میں نے منمناتے ہوئے بچے کو پکڑنے سے انکار کیا۔

"قاسم کے سب سے قریبی دوست کی بیوی ہے یہ، کہنا بھی اپنا بچہ سنبھالیں۔"

"بھابھی.....!"

"نہیں....." اتنے میں اس نے خود ہی بچے کے رونے کی آواز سن لی اور دوڑی چلی آئی اور آپا سے لیتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کر کے دوبارہ اندر لے گئی۔ خواتین نے قاسم کو مہندی لگانی شروع کر دی تھی۔ ڈیک میں اونچی آواز میں گانے لگے ہوئے تھے، میرے دل کے کیسٹ (بلکہ سی ڈی) پر الیہ گانے چل رہے تھے۔ باقی کا ٹائم جیسے تیسے گزرا۔ فنکشن ختم ہوا تو جان چھوٹی سب کچھ سمیٹنے میں مجھے بھی مجبوراً ساتھ دینا پڑا۔ کافی لوگ چلے گئے تھے کچھ قریبی رشتہ دار اور عزیز و اقارب ہی رہ گئے تھے میں بھی اب گھر جانا چاہتا تھا۔ گھر والوں کو بلاتے اندر آیا تو سیڑھیوں کے دوسری طرف اندھیرے کونے سے اپنا نام سن کر رک گیا۔

"تمہارے تو نخرے ہی بڑے ہیں۔ کوئی تمہارے معیار پر ہی نہیں اترتا۔" ایک نسوانی آواز آئی۔

"کوئی ایسا ملے بھی تو۔" دوسری نے کہا۔

"وہ علی بھی تو ہے، بڑے پھیرے لگا رہا تھا اندر باہر۔" پہلی والی بولی۔

"کون، ارمان علی، وہ جو سانس بھی اماں سے پوچھ کر لیتا ہے کہ لوں یا رہنے ہی دوں۔" سب کا مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

"اماں!" میں نے بمشکل منہ پر ہاتھ رکھ کر دیوار کا سہارا لے کر کچھ کہنے سے خود کو روکا کہ ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

"مجھ پر تو لائن مارنے کی بھی کوشش کی ہے اس نے۔" یہ حنا تھی۔ ٹھیک ہی کہتی تھیں بجھلی آپا یہ تو نچا کر رکھ دیتی۔

"میں نے تو کوئی لفٹ نہیں کرائی۔" اس نے ادا سے کہا۔ "ہونہہ لفٹ نہیں کرائی۔ جھوٹی نہ ہو تو....."

مزید اپنے بارے میں گوہر فشانیاں نہیں سن سکتا تھا، ان کا بھی موضوع بدل گیا اور میں وہاں سے ہٹ آیا۔ گھر آ کر افشاں، درخشاں اور اماں زور و شور سے فنکشن پر تبصرہ کرتی رہیں۔ ابا پہلے ہی سو چکے تھے۔ میں بھی کمرے میں آ گیا۔ دل بہت اداس تھا آج تو حد ہی ہو گئی ایسا بھی کسی کے ساتھ ہوتا ہے، ہر دوسرا بندہ تو پسند کی شادی کر رہا ہے، ایک میں ہوں جسے پسند کرتا ہوں یا تو میرڈ نکلتی ہے یا انگیجڈ اور تو اور بال بچے دار بھی۔ ایک تو شادی شدہ اور غیر شادی شدہ سب ہی آج کل اس طرح تیار ہوتی ہیں کہ فرق کرنا مشکل ہو

جائے۔ ایسی بنی ٹھنی، سولہ سنگھار کیے ہوتی ہیں کہ بندہ کیا کرے۔ کیسے پہچانے.....

ویسے لڑکیاں "سولہ" سنگھار ہی کیوں کرتی ہیں اس سے کم یا زیادہ بھی تو کر سکتی ہیں۔ مثلاً" کاج جا رہی ہوں پانچ سنگھار ہی کافی ہیں یا آج بہت خاص موقع ہے بیس سنگھار کر لیتی ہیں۔ یوں بھی اب صرف سولہ سنگھار رہ ہی کہاں گئے ہیں، سولہ سو ہو گئے ہیں اور میرے جیسا بندہ جس کی تنخواہ سولہ ہزار سے کچھ ہی زیادہ ہو اپنی بیگم کے لیے کیسے سولہ سو سنگھار افورڈ کر سکتا ہے۔ کر بھی لے تو ان کے لیے اتنا بڑا ہی ڈریسنگ ٹیبل چاہیے ہو گا۔ اتنے بڑے ڈریسنگ ٹیبل کے لیے اتنا ہی بڑا کمرہ چاہیے ہو گا اور اور اتنے بڑے کمرے کے لیے اتنا ہی بڑا گھر چاہیے ہو گا اور اتنے بڑے گھر کے لیے..... لاحول ولا!

☆ ☆ ☆

اداس سے دن گزر رہے تھے۔ گھر والوں کے ساتھ بھی بس ضروری بات ہی ہو پاتی۔ آفس میں مصروفیت کا بہانہ چل جاتا تھا۔ میں تو بے زار اور مایوس ہو رہا تھا مگر کچھ دنوں سے گھر والے خاصے پُرجوش نظر آ رہے تھے۔ آپاؤں کی آمد بھی بڑھ گئی۔ زور و شور سے بحث جاری رہتی۔ مجھے بھی گھسیٹنا چاہا مگر میں نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ آخر ایک دن افشاں نے پکڑ لیا۔

"ادھر ہم آپ کی شادی کی باتیں کر رہے ہیں، ادھر آپ بے زار شکل بنائے پھر رہے ہیں۔"

"لڑکی بھی تقریباً فائنل ہو گئی ہے۔" درخشاں بولی۔

"کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "اپنی ہی مرضیاں کرنی تھیں تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔" میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔

"آج کل میں بات پکی کرنے جائیں گے ہم لوگ۔" افشاں مزے سے بولی۔

میں بھی کب تک ان کا سوگ مناتا جو اپنے اپنے گھروں میں خوش باش ہیں اور پھر یہ میرے اپنے ہیں، انہوں نے پہلے کبھی میرے بارے میں کوئی غلط فیصلہ کیا ہے جو اب کریں گے۔ میرا موڈ خود بخود اچھا ہو گیا اور بے چینی سے پوچھا۔

"کون ہے وہ؟"

☆ ☆ ☆

"اٹھیں نا جانو! دیر ہو رہی ہے۔" نرم نرم انگلیاں بالوں میں پھیرنے لگیں آنکھ کھلی کیا تھی، مزید نیند آنے لگی۔

"اٹھ جائیں میں ناشتہ بنا رہی ہوں۔" بادل نخواستہ آنکھیں کھولیں تو وہ جا چکی تھی۔ ٹائم دیکھ کر بستر سے چھلانگ لگائی۔ جلدی سے تیار ہو کر کچن میں پہنچا جہاں اماں بھوکی بلائیں لے رہی تھیں۔ ناشتہ تیار تھا۔

"جاتے ہوئے مجھے ذرا امی کی طرف چھوڑتے جانا۔" میں نے اس کے چادر میں لپٹے ہوئے وجود کو دیکھا اور کہا۔ "دو قدم پر تو گھر ہے، خود چلی جاؤ۔"

"بے شک ہو، اکیلی جاتی اچھی لگے گی۔" اماں اس سے پہلے بولیں۔ میں بھی تو یونہی چھیڑ رہا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم دونوں اماں کو خدا حافظ کہہ کر نکلے۔ میں بائیک کو کک لگا کر اسٹارٹ کرنے لگا۔ وہ شرمائی ہوئی چادر کا کونا منہ میں ڈالے پاس کھڑی تھی۔ میں نے زور زور سے کک ماری تب جا کر اسٹارٹ ہوئی۔ وہ میرے پیچھے بیٹھی تو میں نے تیزی سے بائیک کو باہر نکالا (گھبرائیں نہیں، میں بستر سے نیچے نہیں گرا کیونکہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے) گھر تو پاس ہی تھا مگر دوسری گلی سے لمبا چکر لگوا کر لایا۔

"آہستہ چلائیں، صبح صبح کسی کو ٹکر ماریں گے کیا؟" کھی کھی کھی۔

میں اس کی جلترنگ سی ہنسی میں کھویا اپنی گلی کے کارنر والے گھر کے آگے اسے اتار کر آفس چل پڑا۔

عالیہ بخاری

دیوارِ شب

خیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ جتنی کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو تالے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو دیدہ دلیر بر کار کرتا ہے۔ سالار تمام معاملوں الغور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اُٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاڈلی اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا دریا دلی حیران کن ہے۔ شہر آ کر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بالو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ نہ بکنے والی آرکی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھرم ساتھ ٹوٹ جانے کا نکتہ ہوتا ہے۔

ریحہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو فاقہ کاہل ہیں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ جتنی کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ریحہ کے لیے دُعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اور ان کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارت کی دُھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ریحہ جبکہ جویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زوبیہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ریحہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔

زرتاج بیگم کے بنگلے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ پہلے کی پہلی جمعرات کو یہاں سے غریب عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ افروز، سعیدہ اور بتول جیسی کتنی ہی عورتوں کے گھر اس امداد کے سہارے چل رہے ہیں۔ بوا عظمت، زرتاج بیگم کی خاص ملازمہ ہے، جو عرصۂ دراز سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

سلمان رفتہ رفتہ زوبیہ کی مامتا سے متاثر ہو کر اس کے زیر اثر آجاتا ہے۔ زوبیہ اپنی من مانیوں سے ہر جائز و ناجائز ہر طرح کی خواہشات منوا لیتی ہے۔ اظہار چچا، شاکرہ بیگم اور آپا گل سوائے تملق کے کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی تمام امیدیں زوبیہ کو ملنے والے بنگلے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔

اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے، جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید کوفت اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ ریحانہ اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چچا خاندان مع سوائے جویا اور زوبیہ کے اس حادثے سے خوب حظ اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ کر نہیں پاتی۔

دلاور نانی کے جوڑوں کے درد کی روز بدن بڑھتی جا رہی ہے جس پر نگینہ آئے دن ملنے کو رہتی رہتی ہے۔ شاہانہ موقع پر اس کی اشک شوئی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی صندل سے وابستہ ہیں۔ گنتی زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی باداس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمد پر رفعت اسے قدرے بے چین کرنے لگتی ہے۔

خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک۔ بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر گنتی کی چوڑی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابو شوکت سے اس کی اچھی دعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

زرتاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خود غرضی اور خود ستائشی کا شکار ہیں۔ بناعرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سکریٹریز بدلنے کی عادت ہے۔ حالیہ سیکریٹری بیل سے ان کا "تعلق" ہر کسی کی نظر میں ہے۔ نبیل جسے ڈرائیور رانجو کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زرتاج بیگم کی دی معاملات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا جز بز ہوتا ہے۔ زرتاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نبیل کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے وہ ہنسی میں اڑا دیتی ہے۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے بُرے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے پیسے کو محتاج ہونے لگتا ہے۔ بابو شوکت کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بابو شوکت اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر گنتی کی چوڑیاں اسے یاد کی ڈور سے باندھے ہوئے ہیں۔

گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آپا گل سے بحث کرتی ہے۔ آپا گل کی لایعنی باتوں پر وہ براہ راست اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی پختگی کا پختہ یقین ہے۔ دوسری طرف آپا گل کے شوہر اکبر اپنے اثر و رسوخ سے معاذ کو ملنے والی نوکری کسی اور کو دلوا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے جھاڑ کا ہم سمجھتے ہیں۔ سلمان، زوبیہ کے گھر میں شفٹ ہو چکا ہے اور شازونادر ہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جویا کا رشتہ آناً فاناً طے ہو جاتا ہے جس میں اظہار چچا، آپا گل اور شاکرہ بیگم کی کوششیں شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو طلاق کی دھمکی اپنا کام دکھاتی ہے۔ دو رجویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے تو وہ گم صم سا ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر دادی، چچا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زوبیہ، جویا کو آسانی سے کراچی چھوڑنے پر تیار نہ ہوتی ہے۔ زوبیہ آپا گل اور شاکرہ بیگم کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے۔

صندل کو بالی صاحب کی فلم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں اسے ماں نگینہ کے طور طریقے کھٹکتے ہیں۔ وہ اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

خیام کو ڈھونڈنے کی سالار اپنی سی کوشش کرتا ہے۔

خیام، بابو شوکت کے خاندان نا مخلصی، رانی کی حرکتوں سے تنگ آ کر فرار کی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔ پھر سالار کی آمد اسے مزید ہراساں کر دیتی ہے۔ بالآخر وہ بابو شوکت کا ٹھکانہ چھوڑ دیتا ہے۔

روزی کی اچانک گمشدگی نذتاج کو دنوں پریشان رکھتی ہے۔ اور عظمت بوا اس صدمے سے سنبھل نہیں پاتیں اور چپ چاپ نوکری چھوڑ جاتی ہیں۔ ایک نوکرانی کی یہ جسارت بیگم زرتاج کو مشتعل کر دیتی ہے۔ اس واقعہ میں نبیل کا ہی ہاتھ ہے۔ لیکن کسی کے ہاتھ کوئی ثبوت آنہیں پاتا۔ راجو ڈرائیور، روزی کی گمشدگی سے نیم دیوانہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ نبیل اسے جھوٹی تسلیوں سے بہلاتا ہے۔ نبیل اور بیگم زرتاج کا اطمینان اس وقت غائب ہوتا ہے جب کوھی میں سالار کی آمد ہوتی ہے۔ جو بیگم زرتاج کا سوتیلا بیٹا ہے۔ نذتاج بیگم کی تبیہہ اور بے بسی اسے معاملے کی سنگینی کا احساس دلاتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۳۲
بتیسویں قسط

ٹھیک آدھی رات کو اٹھنے والا ہنگامہ، قیامت سے کم نہیں تھا۔

وقت اتنا کم تھا کہ صبح کا انتظار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ زویا نے تو صرف آپا گل کو اطلاع دی تھی، وہ بھی سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں اور نیم غنودگی کے عالم میں انہوں نے زویا کی زبانی جو کچھ سنا، اگلے بہت سارے دنوں کے لیے نیند، سکھ، آرام سب ہی کچھ اڑانے والا تھا۔

"کس بات کا بدلہ لے رہی ہو جویا! اس طرح پیروں تلے ہماری عزت روندنے سے تو بہتر ہے کہ تم پہلے ہی انکار کر دیتیں۔"

ایک کبھی نہ ختم ہونے والی ہولناک بحث کے بعد، اختتامی پیراگراف پڑھا جا رہا تھا۔ مگر وہ تو جیسے قسم کھا چکی تھی۔

"میں نے انکار ہی کیا تھا، آپ بھول رہی ہیں۔"

"مگر پھر راضی بھی تو ہو گئی تھیں، منگنی ہوئی، اتنے عرصے بات طے رہی اور اب جب صرف چند دن رہ گئے، ہمارے سروں پر ذلت کا پہاڑ کھڑا کر دیا۔"

دوپٹے کا پلو منہ پر رکھ کر وہ ماحول کو جتنا سوگوار بنا سکتی تھیں بنا رہی تھیں مگر ان کی دردناک آہیں بھی اتنا ہی اثر ڈال سکیں، جتنا ان کے لمبے چوڑے لیکچر۔

وہ اسی طرح لاتعلقی سے بیٹھی رہی۔

"آپ جو سمجھیں، لیکن یہ کوئی ایسا ایشو نہیں ہے، ہزاروں شادیاں ملتوی ہو جاتی ہیں ایسی انوکھی بات نہیں۔"

"مگر اس کا کوئی جواز ہو تا ہے لوگوں کے پاس، ہم کیا جواب دیں، کیا اشتہار لگوائیں اخبار میں، کس ناگہانی حادثے کا، کس کی موت کا بہانہ کریں شادی ملتوی کرنے پر، تو نے تو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا جویا!"

ان کی آواز غصہ سے پھٹی جا رہی تھی، زویا نے سوائے آپا گل کے کسی کو بھی نہیں اٹھایا تھا مگر رفتہ رفتہ سب ہی اٹھ چکے تھے۔

شاکرہ بیگم، اظہار صاحب، حد تو یہ کہ آپا گل کے بچے بھی۔

"میں اسے جان سے مار دوں گا گل! بڑی مشکل سے عزت بنائی ہے، دوست، خاندان، سب جھک کر ملتے ہیں، اس کی وجہ سے خود پر کسی کو ہنسنے کی اجازت نہیں دے سکتا میں، بتا دے اس کو۔"

حالانکہ وہ سامنے بیٹھی ہی سب کچھ خود سن رہی تھی، مگر براہ راست مخاطب کرنے کے بجائے سب ایک دوسرے کو ہی سنا رہے تھے۔

"شاید اس طرح خود اپنے آپ سے نظر چرائے رکھنے میں آسانی ہوتی ہے، جس کی ان سب کو ضرورت بھی ہے۔"

اس سارے شور ہنگامے کے بیچ اطمینان سے بیٹھی اندازے لگاتی رہی۔
یہاں تک کہ اس پر طاری یہ سکون کی کیفیت ان کی نظر میں سخت مشکوک پڑنے لگی۔
"دیکھ رہی ہیں' کس طرح بیٹھی ہے' لگ رہا ہے ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں ہے' یا شاید سن ہی نہیں رہی ہے۔"

ٹھیک اس وقت جب اظہار چچا اسے جان سے مار دینے کی دھمکی چوتھی یا پانچویں بار دے رہے تھے' آپا گل نے غم سے نڈھال ہوتی شاکرہ بیگم سے سرگوشی کی۔
"آں' ہاں!" وہ چونک کر سیدھی ہوئیں۔
ہر بڑے جھگڑے میں ان کا آخری ہتھیار اختیاری بے ہوشی ہوتا تھا' بڑے بڑے مسئلے عموماً حل ہو ہی جاتے تھے سو اس وقت بھی' بے ہوش ہونے کی تیاری کر رہی تھیں کہ آپا گل کے اس نئے نکتے نے پروگرام تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کروایا۔
"ہاں' کہہ تو ٹھیک ہی رہی ہو' کچھ تو ہے۔" بہت غور سے انہوں نے جویا کا چہرہ دیکھا۔
"کچھ نہیں بہت کچھ' غور سے تو دیکھیں' آنکھیں کیسی بدلی بدلی سی ہو رہی ہیں' جویا کی' ضرور کچھ کرا دیا ہے کسی نے' عملیات کا اثر ہے' مان لیں میری بات!"
"ہائے!" شاکرہ بیگم نے چمنار کرسنے پر ہاتھ رکھا' لمحے بھر کے لیے تو سب ہی کی توجہ ان کی طرف ہوئی۔
"دماغ الٹ گیا ہے میری بچی کا' ظالموں کا کچھ اور بس نہیں چلا تو کیسے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے' سب سفلی علم کا چکر ہے' خود سے کچھ نہیں کہہ رہی' موکل کہلوا رہے ہیں اس سے۔۔۔"
"سب بکواس!" اظہار چچا بری طرح جھنجلائے۔ "تم لوگوں کی جہالت' جو نہ کرے وہ کم ہے' یہاں عزت داؤ پر لگی ہے' وہاں ایک نیا افسانہ شروع ہو رہا ہے' مخبر دار جو کسی نے ایک لفظ اس بارے میں منہ سے نکالا۔"
"مگر اس کی آنکھیں تو دیکھیں کیسی اجنبی۔۔۔"
آپا گل اپنے دعوے پر اتنی پُر یقین تھیں کہ ثابت بھی کر سکتی تھیں' مگر وہ ذرا بھی لحاظ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔
"خدا کے لیے چپ کر جاؤ تم لوگ' کچھ اندازہ ہے کہ کیا ہونا ہے اگر ہم نے اس کی بات مان لی' منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے ساری عمر کے لیے' کیا کیا باتیں نہیں بنیں گی زمانے میں۔ نہیں بالکل نہیں۔"
اپنی بات کے اختتام پر انہوں نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔
ہمیشہ کی طرح وہ کوئی راستہ شاید نکال چکے تھے' آپا گل اور شاکرہ بیگم دونوں ہی نے امید بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔
جویا کا سر جھکا ہوا تھا۔
اپنی بات کہہ دینے کے بعد' اس نے نہ کوئی صفائی دینے کی ضرورت سمجھی تھی اور نہ کسی کو قائل کرنے کی بس ایک اطلاع تھی' جو وہ دے گئی تھی۔
"اسے اس گھر سے اعجاز کے ساتھ ہی رخصت ہونا پڑے گا' نہیں تو۔۔۔" ایک چھوٹا سا وقفہ لے کر اظہار صاحب نے جان لینے کی دھمکی دینے کا ارادہ ملتوی کیا' وہ اس پر پچھلی بار بھی کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی۔
"یاد ہے میں نے کیا کہا تھا جویا!" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بالکل اس کے سر پر آ کھڑے ہوئے۔
"ادھر دیکھو میری طرف!"
اس کا جھکا ہوا سر ہلکے سے اٹھا اور نگاہ ان کے چہرے پر جمی۔
اور جو بے خوفی اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی' وہ بڑی معنی خیز تھی۔

اندر سے اٹھتے خوف کو دبانے کے لیے ہی' ان کا لہجہ اور بھی سخت ہوا۔ "تمہیں' تمہاری ماں کے ساتھ اس گھر سے نکال دوں گا میں' اس عمر میں اپنی ماں کے لیے آزمائش کھڑی کرو گی تم' سوچ لو اچھی طرح!" وہ یوں ہی ان کے چہرے کو دیکھے گئی۔
"آزمائش میں نہیں' آپ کھڑی کر رہے ہیں ان کے لیے' اس لیے سوچنا بھی آپ ہی کو چاہیے۔"
سرسری سے انداز میں کہہ کر وہ ان کے قریب سے گزرتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف جانے لگی تو وہ اور بھی زور سے چلائے۔
"میں تمہاری ماں کو طلاق دے دوں گا جویا! میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔"
وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔
"یہ بھی آپ کا مسئلہ ہے ابا! میں' بہر حال اعجاز سے شادی نہیں کروں گی کسی بھی قیمت پر نہیں۔"
اپنی بات کہہ کر' وہ سیدھی اوپر چڑھتی چلی گئی۔
نیچے لاؤنج میں چلتے ڈرامے پہ بڑا ہی پُر ہول سناٹا چھایا۔

☆ ☆ ☆

"زوبیہ' زوبی!"
اس نے بڑی بے تابی سے کمرے کا دروازہ بجایا تھا! ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی زوبیہ نے بہت ناگواری سے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر اطمینان سے اپنی تیاری میں مگن ہوئی۔
آنکھوں پر آئی شیڈ کی گہری تہہ اردگرد جمع ہوتی لگیوں کو اور بھی نمایاں کرتی تھی۔
خود کو مطمئن کرنا روز بہ روز مشکل تر ہو رہا تھا اور تیاری میں لگنے والا وقت اب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
ایسے میں اسے صرف زرتاج آنٹی ہی یاد آتی تھیں۔
"سچی بات یہ کہ مجھے کبھی خود کو کیری کرنا آیا ہی نہیں۔" ساری جھنجلاہٹ اسے خود پہ ہوتی تھی۔
"مانا کہ میری عمر بھی خاصی ہو رہی ہے لیکن وہ تو مجھ سے بھی بڑی ہیں۔"
کئی بار کی دہرائی سالوں کی گنتی' اس نے ایک بار پھر یاد کی تھوڑی سی مورل سپورٹ حاصل کرنی چاہی' لیکن ایک کھلی حقیقت بھی ساتھ میں منہ چڑانے لگی تھی۔
زرتاج بہر حال خوب صورت عورت تھی۔
اور یہ حسن محض ہوائی پارلرز سے مستعار لیا ہوا نہیں تھا' بلکہ قدرت کی دین تھا۔
بالکل ایسے ہی جیسے خود اس کے باپ یوسف کمال کو یہ نعمت حاصل ہوئی تھی۔
دونوں بھائی' بہن اپنی مثال آپ۔
اور دونوں ہی پر مرمٹنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو سدا جلتے کڑھتے ہی دیکھا تھا اور زرتاج آنٹی کو عشاق کے گھیرے میں۔
لیکن اس خاندانی حسن کا ایک حصہ بھی اگر اس کے حصے میں نہیں آیا تو یہ صرف اس کی بدقسمتی ہی تھی۔
وہ بڑی مایوسی سے اپنا چہرہ تکتی رہی۔
ہو بہو ماں کی شکل۔
گہری سانولی رنگت اور پھیلے ہوئے نقوش بھی اچھے لگ سکتے تھے اگر چہرے پر اتنی سخت کرختگی نہ ہوتی۔ وہ کبھی یہ نہ جان سکی کہ ایک مہربان مسکراہٹ اور آنکھوں سے جھلکتی نرمی کے آگے ہر حسین چہرہ ماند پڑ جاتا ہے۔
دروازے پر اس بار ہاتھ زور سے پڑا تھا اور ساتھ ہی سلمان کی پکار میں بے قراری بھی بڑھی۔ زیر لب بڑبڑاتے

ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا۔
"کچھ میٹر ہے تمہیں، کون پیچھے لگ گیا ہے تمہارے، ہو اس طرح پاگل ہوئے جا رہے ہو۔"
اس کی شکل دیکھتے ہی وہ حلق کے بل چلائی۔
"میں..... وہ۔"
حالانکہ اب تک وہ اس لب و لہجے کا مکمل طور پر عادی ہو چکا تھا اور اس کے لیے یہ کوئی ایسا ہتک والا معاملہ بھی نہیں رہا تھا پھر بھی اس وقت کچھ الگ سا محسوس ہوا تھا۔
"ایک خاص بات بتانی تھی تمہیں!"
"پیسے ختم ہو گئے ہوں گے تمہارے پاس!" بے نیازی سے کہتی ہوئی وہ دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ "لیکن کان کھول کر سن لو سلمان! اب میں تمہیں ایک روپیہ بھی نہیں دینے والی، صبر سے بیٹھ کر پہلی کا انتظار کرو، جب پاپا اپنے ملازمین کو پے کریں گے، تمہیں بھی چیک مل جائے گا۔"
"میں نے پیسے کب مانگے ہیں۔" وہ اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔
"اچھا، بڑی بات ہے! ہم کوئی اور بات بھی کر لیتے ہو کیا" وہ بڑے ہتک آمیز انداز میں مسکرائی۔
"آرام سے سن تو لو۔"
چند لمحوں میں ہی اس کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور لہجے میں وہی مخصوص مسکینیت اتر آئی تھی جو زوبیہ کی بخشی ہوئی تھی۔
"جویا کی شادی کینسل ہو گئی ہے، ابھی آپا گل کا فون آیا تھا۔"
"اس گھٹیا عورت کا نام لیے بغیر بھی تم مجھے یہ بات بتا سکتے تھے نا!"
برش ہاتھ سے رکھ کر وہ اس کی طرف پلٹی۔
"تمہیں جویا کی شادی کا سن کر حیرت نہیں ہوئی؟"
"مجھے اس کی شادی ہو جانے پر حیرت تھی، ختم ہونے پر نہیں۔" وہ اپنا بیگ کھول کر کچھ چیک کر رہی تھی۔
سلمان نے ایک نگاہ اس کی تیاری کو دیکھا تھا۔
"شادی ختم نہیں ہوئی، ملتوی ہوئی ہے، امی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اچانک!"
بہت سوچ سمجھ کر اس نے جملے ترتیب دیے تھے۔ حالانکہ آپا گل اسے رو رو کر جویا کے حتمی انکار کا قصہ بھی سنا چکی تھیں۔
اس نے پتا نہیں اتنی سی بات بھی دھنک سے سنی تھی یا نہیں۔ سلمان کو شبہ سا گزرا۔
"میں جا رہی ہوں، تم گھر پر ہی رہنا اور ذرا سر پر کھڑے رہنا ملازموں کے، پتہ چلا سارا وقت ٹی وی کے سامنے ہی بیٹھ کر گزار دیا۔ ایک تو تمہاری آرام طلبی سے اتنی عاجز آ چکی ہوں کہ....."
کندھے پر بیگ ڈال کر وہ جس طرح دروازے کی طرف بڑھی تھی، سلمان کا شبہ یقین میں بدلا تھا۔ زوبیہ نے یقیناً "نہیں سنا تھا۔
"امی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے زوبی! وہ ہسپتال میں داخل ہیں۔"
وہ تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔
"مر تو نہیں گئی ہیں، جو تم اس قدر پریشان شکل بنا کر کھڑے ہو گئے ہو، کچھ نہیں ہوتا انہیں، سب ڈرامے ہیں تمہاری ماں، بہن کے ہتھ سامنے سے۔"
"ہم تھوڑی دیر کے لیے انہیں چل کر دیکھ آتے ہیں۔ پلیز زوبی! میری خاطر بس تھوڑی دیر۔"

زوبیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا سلمان! اور خبردار جو تم بھی اس وقت گئے پہلے میں آجاؤں، پھر شام میں اگر گاڑی فارغ ہوئی تو چلے جانا۔"
"میں ٹیکسی سے چلا جاتا ہوں، وہاں ہاسٹل میں سب لوگ جمع ہیں۔"
اسے پتا تھا کہ زوبیہ کی مرضی کے بغیر وہ مل بھی نہیں سکتا اسی لیے جتنی خوشامد ممکن تھی، لہجے میں موجود تھی۔
"ٹیکسی کا کرایہ پتا ہے، یہاں سے وہاں تک کا اور تم ویسے بھی جا کر کرو گے کیا؟ ایک انجکشن تک کے تو پیسے نہیں ہیں تمہارے پاس، جاؤ گے تو شرمندگی ہی ہو گی بیٹھو آرام سے گھر میں۔"
اس بار وہ اپنی بات کہہ کر رکی بھی نہیں، وہ پیچھے جاتا تو اب کہ لازماً" وہ بری طرح ناراض ہوتی، اسے تجربہ تھا۔
زوبیہ کا موڈ بری طرح آف ہوا تھا۔
سلمان روز بہ روز ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا، وہ وقتی کشش، جسے کبھی وہ محبت سمجھ کر دیوانی ہوئی تھی کب کی سرے سے ختم ہو چکی تھی۔
"ذرا جو آنکھیں کھول کر ارد گرد ڈھنگ سے دیکھا ہوتا تو زندگی کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔"
زرتاج بیگم کے سیاہ آہنی بڑے سارے گیٹ سے گاڑی اندر لے جاتے ہوئے اس نے اپنی پھوپھی کی ذہانت کو دل سے سراہا۔
آج وہ لاؤنج میں ہی مل گیا اور اس سے بھی اچھی بات کہ اکیلا بھی تھا۔
سلمان کی دی ہوئی ہمدردی کو فت کا پل میں ازالہ ہوا۔
"کیسی ہو زوبیہ!" اس نے مسکراتے ہوئے اخلاقاً" ہی پوچھا تھا، لیکن وہ اس طرح خوش ہوئی جیسے کوئی بڑی فتح حاصل ہوئی ہو۔
"شکر ہے تم ملے تو، میں پہلے بھی آئی تھی۔"
"اچھا، مجھے نہیں پتہ چلا تمہارے آنے کا۔" وہ سادگی سے کہتا ہوا قدرے فاصلے پر بیٹھا۔
زوبیہ نے بطور خاص اس کی یہ احتیاط نوٹ کی۔
"کون بتاتا، یہاں ہے ہی کون تمہارا۔" ایک طے شدہ سی ہمدردی اس سارے گھرانے کو آج کل سالار کے ساتھ ہو چکی تھی۔ "تمہارے بارے میں تو سوچ کر ہی دکھ ہوتا ہے، بہت اکیلا پن سہا ہے تم نے، بہت زیادتیاں سہی ہیں کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی۔" اب جب کہ اس کی ذات سے جڑے یہ سارے قصے اتنے پرانے ہو چکے تھے کہ کسی کی بھی ہمدردی ہونے یا نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔
وہ سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے مسکرا دیا۔
"کوئی اور بات کرو زوبیہ! تمہارے شوہر نہیں آتے انہیں لاؤ نہ کبھی۔"
اس کے حلق میں کوئی کڑوی شے پھنسی تھی۔
"شوہر؟ سلمان میرے لیے مصیبت بن کر رہ گیا ہے سالار! وہ ایک لالچی اور ناکارہ شخص ہے معلوم نہیں کس طرح اس نے مجھے شیشے میں اتارا، جو میں اس سے شادی کر بیٹھی۔"
وہ پہلے بھی یہ سب سن چکا تھا، سو حیرت نہیں ہوئی۔
"تم اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔ گھر بڑی مشکل سے بنتے ہیں، تم دونوں مل کر ہی اپنے گھر کو بچا سکتے ہو، بیٹھ کر بات کیا کرو آپس میں، کچھ بہتری ضرور ہو گی۔" وہ عادتاً" پُرخلوص ہونے لگا۔
زوبیہ نے ایک گہری سانس اندر اتاری۔

"یہاں اگر خاصی محنت درکار ہوئی تب بھی وہ کرے گی۔" اس نے خود کو یاد دلایا۔
"میں بہت کوشش کر چکی ہوں سالار! مگر کچھ فائدہ نہیں' شاید کچھ گھر ٹوٹنے کے لیے ہی۔"
اپنے کمرے سے نکلتی ہوئی زرتاج نے بہت حیرت سے زویہ کو دیکھا۔
"اتنی جلدی دوبارہ۔" وہ سچ مچ پریشان ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اعجاز کے گھر والے کب کے آئے بیٹھے تھے اور گھر میں ٹھک ٹھاک ایمرجنسی کی صورتِ حال نافذ تھی۔
"ہماری مجبوری سمجھنے کی کوشش کریں آپ!" آپا گل نے بے چارگی سے ان کی طرف دیکھا۔
"وہی تو کر رہے ہیں' لیکن صاف بات تو یہ کہ ایسی کوئی مجبوری نظر نہیں آرہی' جو عین وقت پر شادی کے التوا کا سبب بنے۔"
اعجاز کی والدہ کے لہجے کی معنی خیزی' معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی خواہش کا نتیجہ تھی۔
"تو اور کیا' ایسی چھوٹی موٹی بیماریوں میں' اتنے بڑے اور اہم کام تھوڑی ٹالے جاسکتے ہیں' کارڈ بٹ گئے' تاریخ سر پر آگئی' ہمارے تو رشتے دار دوسرے ملکوں تک سے آرہے ہیں' ان کا تو لاکھوں روپیہ برباد ہو رہا ہے' اگر اب شادی نہ ہوتو۔" ان کے ساتھ آئی اعجاز کی بہنیں' بھابیاں سب ہی ایک زبان ہو کر بول رہی تھیں اور اکیلی آپا گل کے لیے ان سے مقابلہ کرنا ناممکن ہوا جا رہا تھا۔
"ہماری ماں بیمار ہیں' ہسپتال میں داخل ہیں آپ خود سوچیں اس حالت میں انہیں چھوڑ کر ہم کس طرح جویا کو رخصت کر سکتے ہیں۔ خدانہ کرے جو ان کی حالت زیادہ بگڑی تو۔"
"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' ہم نے خود پوچھا ہے ڈاکٹر سے ایسی کوئی حالت خراب نہیں ہے ان کی' اوور بلڈ پریشر تو آج کل کس کا بڑھا ہوا نہیں ہے' جو تم لوگ مسئلہ بنائے دے رہے ہو۔"
وہ کسی طرح قائل ہونے کے لیے تیار نہیں تھیں۔
"لڑکیوں کی شادی تو اہم فرض سمجھ کر ادا کی جاتی ہے' بڑے بڑے حادثوں کے بعد بھی سادگی سے رخصت کر دی جاتی ہیں بیٹیاں تو' اور شاکرہ آپا تو خیر سے ابھی زندہ سلامت ہیں۔"
آپا گل نے قہر بھری نگاہوں سے کہنے والی کی طرف دیکھا۔
"ساری کی ساری مل کر' میری ماں کو نظر لگا کر ہی چھوڑیں گی یقیناً۔" انہیں ایک ساتھ بہت سارے وہم ستانے لگے تھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک ایک کے ہوش ٹھکانے لگا دیں' لیکن یہ بڑا نازک وقت تھا۔ سوچ سمجھ کر' تحمل سے اس مرحلے کو طے کرنا تھا۔
"اللہ ہماری امی کو لمبی عمر دے' جویا کی شادی کے لیے ان کے بھی بہت ارمان ہیں' ہم ایسے میں کیسے شادی کر سکتے ہیں کہ وہی اس میں شریک نہ ہوں' یہ ناممکن ہے۔"
گروپ بنا کر آئی' وہ ساری خواتین ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگی تھیں۔
اعجاز کی والدہ بنفس نفیس تشریف لائی تھیں سو سب سے زیادہ بے عزتی محسوس کرنے میں بھی حق بجانب تھیں۔ "اور اگر ہمیں منظور نہ ہو تب۔۔۔!" انہیں خوش فہمی تھی کہ پچھلی ساری باتوں کی طرح ان کی یہ بات بھی مان لی جائے گی' سو اپنی بات کہتے ہوئے انہوں نے ایک تفاخرانہ نگاہ' رشتے دار خواتین پر ڈالی' جنہیں وہ پورا یقین دلا کر لائی تھیں کہ اپنی بات منوا کر ہی اٹھیں گی۔۔۔ لیکن ...
"تب بھی فی الحال ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے!" آپا گل نے شاید ہی خود کو کبھی اتنا بے بس محسوس کیا تھا۔

بریکنگ نیوز کے بعد والی سراسیمگی ڈرائنگ روم میں یہاں سے وہاں تک پھیلی۔
"تو گویا آپ کی طرف سے صاف انکار ہے!"
"میں نے یہ نہیں کہا!"
حالانکہ وہ یہی کہہ رہی تھیں' مگر الفاظ میں ابہام رہنا ضروری تھا' تاکہ سند رہے اور بہ وقت ضرورت کام آئے۔

"مطلب تو یہی ہے نا!" ایک کائیاں سی خاتون نے آگے بڑھ کر پورے یقین سے حتمی نتیجہ نکالا۔
آپا گل نے ایک گہری سانس لی۔
والدہ کی کمی' اس وقت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔
مہمان آئی خواتین میں ان چند لمحوں کی خاموشی سے اضطراب اور بھی بڑھا۔ رشتہ ختم ہونے کی سنسنی خیزی' بالکل قریب آکر بھی نہیں آپا رہی تھی۔
اعجاز کی والدہ بھابھی اور بہنوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں آگے کا لائحہ عمل طے کیا۔
"ٹھیک ہے پھر' اگر آپ کی مجبوری ہے تو پھر ہم بھی ایسے سنگ دل تو نہیں' کہ لیتے ہیں انتظار کچھ دن اور' آگے جو پروگرام ہو بتا دیجیے گا۔"
جو دشت اپنی آخری سانس لے رہا تھا' اسے پھر سے بچا کر وہ لوگ اٹھ کھڑی ہوئیں۔
آپا گل تو خود یقین نہیں آرہا تھا۔
رشتے دار خواتین سخت بے مزہ ہو کر واپس ہوئیں تھیں۔ "بے کار میں ہی اتنا وقت ضائع ہوا' پہلے ہی اتنا خرچا ہو چکا تھا' فیصل آباد سے کراچی آنا' وہ بھی پوری فیملی کو لے کر' آسان تھوڑی ہے۔"
نائی' چچی ٹائپ وہ خاتون باقاعدہ خفا ہو چکی تھیں لیکن ان کی شکایت پر کان دھرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی تھی۔
اتنا جہیز' اتنا مہنگا فرنیچر' اسپلٹ' کارپٹ پردے!
گھر کی شکل بدلی جا رہی تھی' ذرا سی جذباتیت کے پیچھے اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان۔
"ہم تو خود بیٹیوں والے ہیں اور پھر اس میں جویا کا کیا قصور' جو اسے سزا دی جائے۔"
ان کی ترجیحات میں جو چیز سب سے آخر میں کیا' سرے سے تھی ہی نہیں' اپنی شرافت کے سرٹیفکیٹ کے طور پر انہوں نے اس کا حوالہ دیا تھا۔
نیچے کی منزل میں ان سب کے جانے کے بعد' خاموشی چھا چکی تھی۔ زویا نے چائے کے سارے برتن سمیٹ کر کچن میں ڈھیر کیے اور تیزی سے اوپر آئی جویا کمرے میں استری اسٹینڈ پر کھڑی کپڑے استری کر رہی تھی۔
"تمہارے کالج کے پورے ہفتے کے کپڑے پریس کر دیے ہیں میں نے۔"
اسے دیکھتے ہی وہ بڑی خوش دلی سے کہہ رہی تھی۔ زویا نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔
کتنی مدت بعد وہ اپنے پرانے موڈ میں محسوس ہو رہی تھی۔ مطمئن فریش' سب کا خیال رکھنے والی۔
اس انتہائی پریشان کن حالات میں بھی' زویا کو اچھا لگا تھا۔
"وہ لوگ چلے گئے ہیں۔" پیچھے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے زویا نے اسے اطلاع دینا ضروری سمجھا' مگر وہ بنا کوئی تبصرہ کیے اسی طرح اپنا کام کیے گئی۔
"بڑی مشکل سے آپا گل نے انہیں شادی کرنے پر راضی کیا ہے۔" شاید اس کی بے نیازی سے چڑ کر ہی زویا نے اسے حالات کی سنگینی کا احساس دلانا چاہا تھا۔

"بے کار کی مشقت میں پڑیں آپا گل! سیدھے سیدھے رشتہ ختم کردینے کی اطلاع دینی چاہیے تھی' ان کا بھی وقت بچتا۔"

"اور جو پھر طوفان کھڑا ہوتا فوری طور پر' اس کو کنٹرول کرنا آسان ہوتا کیا؟"

"کوئی طوفان نہیں کھڑا ہونا تھا' انسان میں اپنی بات کہنے کی جرأت ہونی چاہیے اور پھر اس پر قائم رہنے کی' آگے سب خیر ہے۔"

لاپروائی سے کہتے ہوئے اس نے استری کا سوئچ بند کیا اور ہینگر اٹھا کر الماری کی طرف مڑ گئی۔

"اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ خاندان کو کبھی فیس کرنا پڑے تو پتہ چل جائے۔"

"طنز کررہی ہو؟"

"نہیں' جو حقیقت ہے' سو ہے۔"

"میں اس سے زیادہ تلخ حقیقت کو فیس کرچکی ہوں اور اس سے بڑے طوفان کو۔" الماری بند کرکے وہ سامنے صوفے پر آکر بیٹھی۔

"تو اب اس کا بدلا لیا ہے کیا گھر والوں سے؟"

پچھلے دو دن میں جتنے ہنگامے برپا ہوچکے تھے وہ یوں ہی بات بات پہ لہجہ تلخ کررہے تھے' زویا بھی نہیں بچ سکی تھی۔

"بالکل سچ کہہ رہی ہوں جویا! پہلی بار مجھے سمجھ نہیں میں آرہا کہ میں تمہارا ساتھ دوں یا گھر والوں کا۔"

"تمہیں جو ٹھیک لگتا ہے' وہ کرو۔ میں نے صرف اپنا حق استعمال کیا ہے اور بس!"

ایک وہی تھی جو اب اتنی پُرسکون تھی' جتنی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

سچی بات تو یہ کہ زویا کو تو وہ خاصی خوش اور خود غرض محسوس ہونے لگی تھی۔

"تمہاری بات کتنی بھی ٹھیک سہی' لیکن مان لو کہ طریقۂ کار بالکل غلط ہے' انکار کرنا تھا تو اس وقت کیا ہوتا جب رشتہ طے ہورہا تھا' اب یہ وقت نہیں تھا۔"

"میرے پاس یہی وقت باقی بچا تھا زویا! یہ نکل جاتا تو پھر تو کوئی ازالہ بھی ممکن نہیں تھا۔"

اس کی آواز دھیمی پڑی اور مسکراہٹ معدوم' زویا کو اپنی زیادتی کا احساس ہونے لگا۔

"سوری! میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی جویا! لیکن یہ سب کچھ جو ہورہا ہے' پریشان کن تو ہے نا!" وہ اٹھ کر اس کے قریب آکر بیٹھی۔

"میں مانتی ہوں اپنی غلطی' لیکن اگر مجھے پتا ہوتا کہ ابا صرف دھمکیاں دے سکتے ہیں تو یقیناً اس وقت بھی اپنی بات پر اڑ سکتی تھی' وہ تو شکر ہے کہ مجھے پتہ چل گیا کہ ابا کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

دروازے میں سے اندر آتی آپا گل نے بے اختیار ہی اپنا ماتھا چھوا۔ یہ یقین دہانی ان ہی کی کرائی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

شہر بھر میں پھیلے رشتے داروں کے توسط سے' یہ خبر ان کے گھر تک اس تیزی سے پہنچی کہ حد نہیں!

"جویا کی شادی ملتوی ہوگئی۔"

گھر آنے والے ہر فون پر' سلام کے بعد دوسرا جملہ یہی تھا۔

دونوں گھروں کے بیچ چلتی ٹینشن خاندان بھر کا پسندیدہ موضوع بنی ہوئی تھی' سو خیر سگالی کے اظہار کے طور پر سب ہی نے یہ اطلاع پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی اس روز اتنی بار بجی کہ اب تو دل گھبرایا جارہا تھا۔

"ہمارا کیا لینا دینا' جو ہر ایک ہمیں بتا رہا ہے' کسی کی شادی ہو یا نہ ہو' اس سے ہمارا کیا تعلق ہمارا واسطہ تو ختم ہو چکا ہے نا!"

امی ابھی نہ جانے کس کا فون بھگتا کر واپس آکر ٹھیک اس کے سامنے بیٹھیں۔

"خبریں دینے کا اتنا ہی شوق ہے لوگوں کو تو ٹی وی پہ نشر کروادیں' ہمیں بتانا کیا ضروری ہے۔"

ربیعہ نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔

امی کے چہرے پر سرخی پھیلی ہوئی تھی اور ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست!

"آپ پریشان ہیں کیا' جویا کی شادی نہ ہونے سے؟" اسے کچھ ایسا ہی لگا تھا تو پوچھ لیا۔

"مجھے کیا پریشانی ہونی ہے اور جویا کی شادی ملتوی ہوئی ہے' ختم نہیں ہوئی' وہ بھی شاکرہ بھابھی کی بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہیں وہ۔"

ربیعہ نے صاف محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے زیادہ خود اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہ رہی ہیں۔

جویا کے گھر والوں کے بعد وہی تھیں جنہیں اس شادی کی خوشی تھی۔

"کچھ زیادہ ہی طبیعت خراب ہوئی ہوگی' جب ہی عین وقت پر پروگرام کینسل ہوا ہے ورنہ اچھی بھلی تھیں وہ تو۔"

"وہ اب بھی اچھی بھلی ہیں' سنا ہے بیماری کا تو صرف بہانا ہے' اصل بات کچھ اور ہے۔"

امی بری طرح چونکی تھیں۔

"کیا ہے اصل بات اور تمہیں یہ کون اندر کی خبر دیتا ہے مجھے بھی تو پتہ چلے۔"

"انور ماموں نے بتایا ہے دادی کو' شادی کینسل کرنے کے لیے بہانہ بنایا گیا ہے' وہ خود دیکھ کر آئے تھے ہسپتال شاکرہ چچی کو' یوں ہی معمول کا چیک اپ ہو رہا تھا وہاں! خاندان میں تو ایک ہی بات اڑ رہی ہے کہ جویا نے عین وقت پہ انکار کردیا ہے شادی سے۔"

"خدا کی پناہ!"

ربیعہ کی آخری بات کے ساتھ ہی' خطرے کی گھنٹی ٹھیک سر پر بجی تھی۔

"ایسی اولاد بھی آزمائش ہے' جو ماں باپ کی اس طرح عزت داؤ پر لگادے' اس لڑکی نے تو کہیں کا نہیں چھوڑا۔"

پہلی بار ان کو اظہار چچا کے گھرانے سے تھوڑی ہمدردی ہوئی۔

"جویا نے کبھی ایسا کچھ نہیں کیا امی! اور اگر اب انکار اس نے کیا ہے تو ضرور کوئی وجہ ہوگی۔"

"پتہ ہے وجہ' مجھے نہیں سارے خاندان کو معلوم ہے' سارے میں چرچے ہیں کہ منگنی کے بعد جویا کا کیا حال ہوا تھا۔"

جویا کے معاملے کو لے کر وہ دن بہ دن اتنی سخت دل ہوتی جارہی تھیں کہ کچھ بھی سمجھانا ناممکن ہو رہا تھا۔ ربیعہ خاموش ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور سنو!" تب ہی انہیں کچھ اور خیال آیا۔

"معاذ سے یہ بات زیادہ ڈسکس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اسے خود سے پتا چلے تو ٹھیک ہے' ویسے تو تمہاری دادی اسے بتائے بغیر کہاں رہ سکتی ہیں' لیکن بہرحال تم احتیاط رکھنا۔"

حالانکہ دادی سے زیادہ خطرہ تو خود اس سے تھا' لیکن امی کو ایک دبا دبا سا گلہ تھا' جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا!

وہ کوریڈور سے گزرتی ہوئی کچن کی طرف جارہی تھی تو دادی نے اسے دیکھ کر پکارا۔
"جی!" ریحہ ان کے کمرے کے کھلے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔
"معاذ آگیا کیا؟"
دبا دبا سا جوش اس ایک چھوٹے سے سوال کے ساتھ بندھا تھا۔
ریحہ بے اختیار ہی مسکرا دی۔
"ابھی نہیں آیا دادی!"
"آج کچھ زیادہ دیر نہیں ہوگئی اسے، روز تو آجاتا تھا اس وقت تک۔"
"ابھی صرف پانچ بجے ہیں دادی! اور معاذ کا تو کچھ پتہ نہیں چلتا کب آئے گا، کام سے جلدی فارغ ہوتا ہے تو اسکول کا چکر لگا لیتا ہے، آپ چائے پئیں گی؟ بنا کر لاؤں۔" وہ چلتی ہوئی ان کے قریب آکر کھڑی ہوئی تو انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"دل کو بڑی فکر سی لگ گئی ہے، تمہیں کیا لگتا ہے شاکر واقعی بیمار ہوگی؟"
ان کی آواز دھیمی تھی، لیکن تجسس بے انتہا۔
"پتا نہیں، جب سب کہہ رہے ہیں کہ وہ ٹھیک ہیں تو پھر ظاہر ہے کوئی فکر والی بات تو نہیں ہے۔"
امی سے سنی گئی نصیحت اپنی جگہ، لیکن دادی کے ساتھ جو اظہار رائے کی آزادی تھی اس کا عزم ہی کچھ اور تھا۔
"لیکن کچھ تو ہوا ہی ہے ورنہ اس طرح... سنا ہے سارا جہیز بھی جا چکا تھا، بہت پیسہ خرچ کیا ہے اظہار نے اس بار بھی۔ خدا ہی جانتا ہے کہاں سے اتنا پیسہ آرہا ہے۔"
یہ ایک ایسی پہیلی تھی جس کا جواب جاننے کے باوجود بھی آج تک اسے دُہرایا جارہا تھا۔
"آپ شاکر چچی کو دیکھنے جائیں گی کیا؟"
اتنا بے تکا سوال وہ دادی سے ہی کر سکتی تھی۔
"نہیں!" انہوں نے پوری قطعیت کے ساتھ کہا۔ "اور تم بھی کہنا، وجہ کچھ بھی ہو، لیکن اظہار اور شاکر دونوں ہی کو بہت جلد احساس ہوگا کہ انہوں نے معاذ کو ٹھکرا کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔"
ریحہ نے محض ان کی تسلی کے لیے ہی اثبات میں ہلکے سے سر ہلا دیا۔
معاذ دادی کے لیے ہمیشہ ایک بیش قیمت خزانے کی مانند رہا تھا اور وہ یقین رکھتی تھیں کہ دوسرے بھی اسے کچھ ایسا ہی سمجھیں۔
مگر یہ کب ممکن رہا تھا۔
وہی تھا، جس کی حیثیت، اہلیت، سب ہی کچھ خاندان بھر میں مشکوک ٹھہری تھیں اور رہی سہی کسر جویریہ سے رشتہ ختم ہونے کے بعد پوری ہوگئی تھی۔
"میرے معاذ کی آہ لگی ہے، یہ تو شروعات ہیں۔ اظہار کے خاندان کو اپنی زیادتیوں کے حساب تو یہیں اس دنیا میں دینے ہیں اور وہ بھی بہت جلد۔" دادی اپنی خوشی اور خفگی دونوں ہی کبھی نہیں چھپاتی تھیں۔ اظہار صاحب کے لیے انہوں نے ایسا ہی کچھ اس وقت بھی کہا تھا، جب وہ باقاعدہ قطع تعلق کا اعلان کر کے گئے تھے مگر اس وقت ان کے لہجے میں کچھ اور ہی جلال تھا۔
ریحہ کا دل ہلکے سے کانپا۔
"کیا معاذ کے دل پر لگی چوٹ اتنی ہی گہری ہے کہ اس کی اثر انگیزی، لوگوں کی قسمتوں کو بدل رہی ہے۔"

اس کی فطری نرم دلی، کسی کے بھی برے انجام سے خوفزدہ کر رہی تھی۔
"اللہ ان لوگوں کے حال پر رحم کرے دادی! کیا پتا....."
"اللہ ان پر کبھی رحم نہیں کرتا، جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتے، تم جاؤ اپنا کام کرو، اور معاذ آئے تو اسے میرے پاس بھیجنا۔"
وہ "جی اچھا" کہہ کر باہر نکل آئی۔
"کیا معاذ نے کبھی جویا کو بددعا دی ہوگی۔" وہ کچھ سوچ میں ڈوبی۔ بیرونی سیڑھیوں پر آکر کھڑی ہوئی۔ "لیکن کیا کبھی معاذ نے جویا سے واقعی محبت بھی کی تھی یا نہیں؟"
سامنے احاطے میں شام کی نیلاہٹ گھل رہی تھی۔ تب ہی اس کی بائیک تیزی سے اندر آئی۔
"میرا ہی انتظار کر رہی تھیں نا!" بائیک کھڑی کر کے وہ اس کی طرف آتے ہوئے۔ پورے یقین سے پوچھ رہا تھا۔
ریحہ ٹھیک ٹھاک گڑبڑائی۔
اس طرح خاص طور پر منتظر ہونا، جبکہ سب ہی کچھ انتہائی ناقابل اعتبار ہوتا جارہا تھا، حتیٰ کہ سامنے کھڑا عزیز از جان بہن بھائی بھی۔ "نہیں تو، مجھے کیا پتا تھا کہ تم آنے والے ہو۔"
"جھوٹ مت بولو۔" معاذ نچلی سیڑھی پر ذرا رکتے ہوئے شاید مسکرایا تھا۔ ریحہ کو بس یوں ہی مسکراہٹ کا شبہ سا ہوا تھا۔
"اور اب پلیز یہ مت کہنا کہ تم مجھے جویا کی شادی کے کینسل ہونے کی خوش خبری سنانے کے لیے کھڑی ہو اور پتا نہیں یہ خوش خبری ہے بھی کہ نہیں۔"
"تمہیں کس نے بتایا؟"
اس کے بسمرے سے قطع نظر، ریحہ کو اس کے باخبر ہونے پر حیرت ہوئی تھی۔
"ہیں اس خاندان میں کچھ، جو بے چارے اس غلط فہمی میں تھے کہ میں یہ سن کر بہت خوش ہوں گا، اس لیے ثواب کمانے کے لیے انہوں نے مجھے مطلع کرنے میں جلدی کی۔" اپنی بات کہتا ہوا وہ اس کے قریب سے گزرتا ہوا برآمدے میں آکھڑا ہوا۔ ریحہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
"تو تم نہیں ہو کیا؟"
"میں لوگوں کی پریشانیوں پر چاہوں بھی تو خوش نہیں ہو سکتا۔"
"سنا ہے جویا نے خود انکار کیا ہے۔" ریحہ اس کے قریب آکر کھڑی ہوئی۔
"تو؟" اس کے ماتھے پر آئی شکن، ریحہ کو تھوڑا سا رعب میں لائی۔
"بتا رہی ہوں ایسے ہی۔"
"سن لیا، کچھ اور؟"
"دادی انتظار کر رہی ہیں، ان سے ملتے ہوئے جاؤ۔" اس نے جلدی سے اپنے ذمہ لگے پیغام کی ترسیل کی تو وہ بنا مزید کچھ کہے دادی کے کمرے کی طرف چلا گیا، وہ مایوس سی وہیں کھڑی رہ گئی۔
"اتنا سخت لہجہ، اتنی رد کھائی، کیا وہ اب واقعی جویا کے حوالے سے ایک لفظ بھی نہیں سنے گا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی یقین آنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

کھڑکی سے پردے سرکا کر گیتی نے پٹ کھولے تو روشن چمکتا ہوا دن کمرے میں اتر آیا۔
سامنے بڑا سا لان اور کھلے ہوئے کتنے ہی پھول، وہ خود بخود ہی مسکرا دی۔
زندگی میں آئی یہ تبدیلی اچھی لگنے لگی تھی، لیکن پھر بھی اپنا کمرہ اور پچھلا بستر آمدِ یاد آتا ہی تھا۔
"ناشتا اوپر ہی منگوالو، بار بار اوپر نیچے کہیں چڑھا جاتا۔"
نانی کے کہنے پر اس نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔
"صندل تو کہہ رہی تھی کہ آپ نیچے کا کمرہ لے لیں، مگر آپ نے خود ہی منع کر دیا۔"
"مجھے یہاں مستقل تھوڑی رہنا ہے، تمہارے لیے اوپر کا کمرہ بہتر تھا، اس لیے میں نے اسے منع کیا تھا۔"
چونکہ نانی کو ہی ہمیشہ اس کے اچھے برے کا پتا ہوتا تھا، سو وہ فرماں برداری سے سر ہلاتے ہوئے ان کے پاس آ بیٹھی۔
"آپ مستقل بھی تو رہ سکتی ہیں نانی! کتنا اچھا تو لگ رہا ہے یہاں، کیسی کھلی کھلی سی فضا ہے، صبح کتنی روشن لگتی ہیں یہاں اور رات کتنی پُرسکون، ٹیرس پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو دور، دور تک ستارے ہی ستارے آسمان پر۔"
"تمہیں اچھا لگ رہا ہے نا، بس یہ ہی کافی ہے۔"
نانی کو بڑا اطمینان حاصل ہوا تھا اس کی بات پر۔
"وہ تو آپ ہیں ابھی اس لیے اچھا لگ رہا ہے، آپ چلی جائیں گی تو پھر کہاں اتنا سکون ہوگا۔"
"کچھ دن لگے گا، پھر عادی ہو جاؤ گی، دیکھا نہیں آتے ہوئے کتنا گھبرا رہی تھیں، مگر اب سیٹ ہوتی جا رہی ہو۔"
"ہوں!" بات تھی بھی ٹھیک۔
نانی کا چند دن رکنا اس کے حق میں بڑا ہی بہتر ثابت ہوا تھا۔
ایک بالکل نئی دنیا، نئے صبح و شام، نیا ماحول۔
"اب سالار آئے تو تم یونیورسٹی میں داخلہ لے لو اس سے مشورہ کر کے یا پھر کچھ اور، جس میں باہر نکل کر کچھ کرنا پڑے۔"
ملازمہ ناشتا کی ٹرے پہنچا گئی تھی۔
نانی کو سالار ناشتا کرتے ہوئے ہی یاد آیا۔
"وہ تو پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں، آئیں گے بھی واپس یا نہیں۔" گیتی کی آواز دھیمی ہوگئی تھی۔
نانی ستارہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا، لیکن اس کا سر جھکا ہوا تھا۔
"کیوں نہیں آئے گا خیر سے، وہاں کاروبار کے، جائیداد کے مسئلے حل کرنے کے لیے رُکا ہوا ہے، اور کوئی بات نہیں۔" نانی کی تسلی میں فخر کا سامان بھی بندھا تھا۔
گیتی کو بے ساختہ سی ہنسی آگئی۔
"خیر اب اتنے بڑے آدمی بھی نہیں کہ لمبے چوڑے جھگڑے پیچھے لگے ہوں گے، ورنہ اتنے اطمینان سے یہاں نہ بیٹھے رہا کرتے۔"
"باپ کی طرف سے بہت جائیداد ملی ہے، مجھے خود افسر میاں نے بتایا تھا۔"
یہاں نانی کیا، نگینہ اور شاما بھی، سالار سے سخت مرعوب رہنے لگی تھیں، وجہ تسمیہ وہی نازک اور قیمتی بریسلٹ تھا، جو آج بھی نانی کی الماری کے کسی خفیہ خانے میں رکھا تھا اور یاد آنے پر گیتی آرا کے دل میں چبھن پیدا کرتا تھا۔
"کیا ضرورت تھی آپ کو افسر بھائی سے ان کے بارے میں پوچھنے کی، ہمیں کیا لینا دینا ان کی جائیداد سے۔"

نانی کی بات نے اسے اپنے طور پر شرمندہ کیا تھا۔
"معلومات تو رکھنی پڑتی ہیں اور اگر کوئی شخص اتنی اپنائیت سے ہم سے ملتا ہے وہ بھی بنا کسی غرض کے تو پھر تو یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ تاکہ کل کو کوئی بات ہو تو ہم اندھیرے میں تو نہ ہوں۔" نانی کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔
"کیسی بات؟"
کچھ بھی ہو سکتی ہے، یہاں کوئی لگے بندھے اصول قاعدے تھوڑی ہیں، جو کچھ بھی حتمی ہو۔
وہ ناشتا کر چکی تھیں اور اب چائے کا کپ سنبھالے بیٹھی تھیں۔
گیتی نے خاموش نظروں سے ان کے چہرے کو تکتے ہوئے ان کی بات کو سمجھنا چاہا، مگر وہ بات بدل چکی تھیں۔
"شاما کا بار بار فون آ رہا ہے، کیلی گھبرا رہی ہے وہاں، ایک طرح سے ٹھیک بھی ہے، اتنا بڑا گھر ایک دم ہی سنسان ہو گیا، کہاں دل لگ رہا ہوگا۔"
"میں نے تو کہا تھا کہ اسے بھی ساتھ لے چلیں، آپ ہی نہیں مانیں۔"
گیتی کو تھوڑا سا افسوس بھی ہوا کہ شاما کی ساری عمر کی خدمات بھلا کر، وہ سب اسے کیسے چھوڑے بیٹھے ہیں، لیکن نانی کی زندگی میں اس طرح کی جذباتیت کا بھی عمل دخل نہیں تھا۔
"وہاں استاد جی کے کھانے پینے کا دھیان کون رکھتا، اس عمر میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا، شاما کی تو خیر ہے اور ویسے بھی کل تو میں چلی ہی جاؤں گی واپس۔"
"کل! اتنی جلدی؟"
شاما سمیت وہ سب ہی کو بھولی۔
"اس میں حیرت کی کیا بات، دو دن کا کہہ کر آئی تھی، آج پورا ہفتہ ہو چکا ہے، میں تو آج جا رہی تھی، لیکن صندل نے ضد کر کے روک لیا، باقی صاحب نے کوئی پارٹی رکھی ہے گھر پر، سنا ہے شہر کے بڑے بڑے لوگ آ رہے ہیں، تم بھی اچھا سا تیار ہو جانا۔" وہ بری طرح چونکی۔
"میں، میں کیوں؟ میں تو صندل کی پارٹی میں بھی نہیں گئی تھی۔" آج پہلی بار اسے نانی نے کسی محفل کو اٹینڈ کرنے کے لیے کہا تھا، سو بڑا ہی عجیب سا لگا۔
"گھبرانے کی بات نہیں، شہر کے معزز لوگ ہیں سارے، اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ آ رہے ہیں، بیویاں، بیٹیاں ساتھ لے کر، باقی صاحب بتا رہے تھے کہ کئی لوگوں نے تو باقاعدہ سفارش ڈلوائی ہے تقریب میں آنے کے لیے کہ ہماری بیٹیوں کو بے حد شوق ہے صندل سے ملنے کا، یہ بھی اللہ کا ہی کرم ہے، جو اس نے عزت بنائی۔" شکر گزاری ان میں بے حد تھی۔
ایسی باتوں پر بھی بڑی عاجزی سے شکر کرتیں، جو گیتی کی نگاہوں میں سراسر جائز بھی نہیں ہوتیں۔ مگر یہ ان کا بے حد ذاتی معاملہ تھا اور اس کا سلسلہ بھی کہیں اور ہی ملتا تھا۔
"لیکن مجھے تو کوئی شوق بھی نہیں ہے پارٹیوں کا، پھر مجھے کیوں؟" گیتی کے لیے یہ نیا حکم نامہ بڑے کٹھن مرحلے کی تمہید بنتا جا رہا تھا۔
"سمجھا کرو، ملو جلو گی نہیں تو کیسے زندگی بسر ہوگی، نئے لوگ، نئی لڑکیاں، دوستی کرو لوگوں سے، انہیں بھی پتا چلے کے صندل کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔"
اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر ان کی دل آزاری کے خیال سے چپ ہو رہی۔

یہاں عزت کا موجہ معیار، محض گھر دل لینے سے نہیں حاصل ہو جاتا، یہاں چھان پھٹک کا عمل مستقل مزاجی سے جاری رہتا ہے، نادیر کہ انسان خود ہی ریزہ ریزہ نہ ہو جائے۔

وہ نہیں ہونا چاہتی تھی، سو اسی لیے ایک کونے میں منہ دے کر ساری زندگی بسر کر لینے کی خواہش مند تھی۔ مگر یہ بات نانی کو بتانا ضروری بھی نہیں تھا۔ باہر سبزہ زار پر رات کی پارٹی کے انتظامات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

گیتی نے دن میں کتنی ہی بار ٹیرس پر سے جھانک کر اس ساری چہل پہل کو دیکھا اور پہلے سے زیادہ متاثر ہوتی رہی۔

گہری ہوتی رات میں گاڑیوں کی ایک لمبی سی قطار یہاں سے وہاں تک لگتی چلی گئی۔

جدید طرز کے مغربی لباس، گہرے میک اپ، فیشن کی دوڑ میں آگے نکلنے کی دھن میں عجیب و غریب حلیے، گیتی نے حیرت سے ان عورتوں کو دیکھا جن کا تعلق طبقہ "امراء" سے تھا۔

☆ ☆ ☆

آج وہ پھر کئی دن بعد یہاں آ سکا تھا۔

بچوں کے آنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا، سو ابھی اس کے حساب سے یہاں سناٹا ہی ہونا چاہیے تھا۔

لیکن کوئی اور تھا، جو اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بڑی تحویت سے مصروفِ عمل تھا۔

معاذ ہلکے سے مسکرا دیا۔

بائیک کھڑی کر کے بے آواز قدموں سے چلتا ہوا وہ جب تک اس کے قریب پہنچا وہ مکمل بے خبری کے عالم میں ہاتھ میں لیے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر کرسیاں چمکائے گئی۔

"آپ!" معاذ کی آہٹ پر وہ بری طرح چونکی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟"

"کچھ نہیں بس ایسے ہی..."

اعترافِ جرم کے انداز میں اس نے نگاہیں جھکائیں اور ہاتھ میں تھامے ہوئے کپڑے کو گول مول کرتے ہوئے مٹھی میں دبایا۔

معاذ نے اس کے سرخ پڑتے ہوئے چہرے پر پھیلی شرمندگی کو دلچسپی سے دیکھا۔

"یہ سب تم نے کیا ہے؟"

ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے خود بھی ایک نگاہ ترتیب سے رکھی صاف ستھری کرسیوں پر ڈالی تھی۔

سامنے میز پر دھلا ہوا میز پوش اور ایک پرانے پلاسٹک کے مگ میں یکمیں سے توڑ کر ڈالی گئی گلاب کی ٹہنیاں۔

ماحول میں ایک دم ہی جیسے ترتیب اور حسن جھلکنے لگا تھا۔

"لڑکا بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔" وہ تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا، زری نے اس سے بہت پاکر نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

وہی نرم سی مسکراہٹ اور سارے وجود کو منور کرتا ایسا روشن احساس جو اس کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا تھا۔

"لیکن یہ سب تمہارے کرنے کے کام تھوڑی ہیں، یہاں سب ہیں، کوئی نہ کوئی کرے گا نا! میں خود جب روزانہ آتا تھا تو یہ میری ہی ڈیوٹی تھی۔"

زری کے دل پر چوٹ سی پڑی۔

"آپ کیوں کرتے تھے؟"

(بھلا یہ کام اس کے کرنے کے تھے؟ اتنی آن بان والے اتنے قابل کہ...)

زری کی محدود معلومات میں، معاذ کی قابلیت کے اظہار کے لیے کوئی موزوں لفظ بھی نہیں تھا۔ وہ خیال کے اتنے اونچے پیڑ پر بیٹھا تھا کہ گردن اٹھا کر دیکھو تو گردن ہی درد کرنے لگے۔

"کیوں ہتم بھی تو کرتی ہو۔" وہ لاپروائی سے کہتا ہوا اس کے دونوں بھتیجوں سے ہاتھ ملانے لگا۔

"اور مجھ سے کہیں زیادہ اچھا کرتی ہو، مجھ سے تو کبھی سیدھی لائن بھی نہیں بنتی کرسیوں کی۔" وہ اپنے ہی اوپر ہنس پڑا۔

"میرا آپ کا کیا مقابلہ، اور یہ آپ کے کرنے کے کام تو ہیں بھی نہیں، آپ تو بڑے بڑے کام کرنے کے لیے ہیں، یہ تو مجھ جیسی جاہل اَن پڑھ کے لیے ہیں، اور ادھر ہماری گلی میں تو سب ہی لڑکیاں یہ سارے کام بڑے اچھے کرتی ہیں۔"

معاذ کی تھوڑی سی اپنائیت میں وہ حوصلہ پکڑ چکی تھی۔

"تم سے بھی اچھی لڑکیاں ہیں وہاں۔" وہ کچھ شرارت کے موڈ میں آیا تھا۔

"نہیں اب ایسی اچھی بھی نہیں۔" اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا، کیا ضرورت تھی دوسری لڑکیوں کا ذکر بھی کرنے کی۔ "آپ بس مجھے منع نہیں کریں۔"

"معاذ!" سامنے کھڑے سے نکلتے ہوئے ریحان نے اسے آواز دی تو وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف چلا آیا۔

"تمہارے والنٹیرز میں تو اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔"

"شکر ہے اللہ کا۔" ریحان مسکرا دیا۔

"ویسے یہ لڑکی بے چاری بڑی ہیلپ فل ہے، منع کرنے کے باوجود خود ہی خاموشی سے کئی کام نمٹا جاتی ہے،

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی، قیمت: 400 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل، قیمت: 180 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبیں، قیمت: 350 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری، قیمت: 200 روپے
☆ امر بیل، عمیرہ احمد، قیمت: 450 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
شائع ہو گئے ہیں
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کہتی ہے میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ کچھ کام کروں' ہم لوگوں کو آسانی بھی ہو گئی ہے اس کے آنے سے۔" ریحان بتانے لگا۔

"چلو' اچھا ہے' اگر چند لوگ اور اس طرح ساتھ دینے کے لیے آجائیں تو ہم کافی کچھ کر سکتے ہیں' منع مت کرو اسے' جب وہ اپنی خوشی سے کر رہی ہے۔" وہ کہتا ہوا سامنے میز پر رکھا رجسٹر چیک کرنے لگا۔

"بیگم زرتاج نے بھی چیک بھجوا دیا ہے۔" ریحان کو یاد آیا' "ایک اور والنٹیر" رجسٹر پر نگاہ جمائے وہ خوش دلی سے بولا۔

"ہاں لیکن' اتنا بے غرض بھی نہیں' وعدہ کی گئی رقم کا آدھے سے بھی آدھا اماؤنٹ اور ہماری طرف سے شکریہ کا ایک پریس ریلیز بھجوانے کی ہدایت بھی ساتھ آئی ہے۔"

ریحان کے لہجے میں تلخی شامل ہونے لگی' معاذ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں دل جلا رہے ہو' یہاں یہ ہی سب ہوتا ہے اور بیگم زرتاج کے ساتھ ہمیں پہلے بھی تجربہ ہو چکا ہے' یاد ہے جب آئی تھیں یہاں۔"

"ہاں' وہ کوئی بھولنے والی بات ہے۔"

ان دونوں ہی کو بیک وقت نبیل کا پرزور غصہ یاد آیا تھا' جب وہ ساجد کے پہچان جانے پر اس پر چڑھ دوڑا تھا۔

"وہ بچہ اب نظر نہیں آتا' تمہاری ملاقات ہوتی ہے کیا؟" ریحان کسی اور ہی سوچ میں گم ہونے لگا۔

"بڑا آدمی بن گیا ہے ساجد' کہہ رہا تھا بہت اچھا کما رہا ہوں' یہ بچے وہی تو داخل کرا کر گیا تھا یہاں۔"

"ہوں' ہوں۔"

"تمہیں کیسے یاد آگیا آج۔" معاذ دوبارہ اپنے رجسٹر پر جھکا۔

"زرتاج بیگم کا جب بھی ذکر ہوتا ہے' وہ مجھے یاد آتا ہے' یاد ہے اس نے نبیل کو کتنا پریشان کر دیا تھا' بہت دعوے سے اس بچے نے کہا تھا وہ نبیل کو اچھی طرح جانتا ہے۔" ریحان دونوں ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے معاذ کی طرف جھکا۔

"بچہ ہے نا' اسے اندازہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کے منہ لگنا' صرف مصیبت مول لینا ہے' میں نے سمجھا دیا تھا اسے۔" وہ بدستور اپنے کام میں مصروف رہا۔

"تم کب سے مصیبت مول لینے سے گھبرانے لگے۔" ریحان کی نگاہ اس پر جمی تھی۔

"عقل مند ہوتا جا رہا ہوں شاید۔" پین سائیڈ میں رکھتے ہوئے وہ ہنس پڑا۔ "سمجھا کر دیا رہ نبیل جیسے لوگ اپنی حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے اتنا ڈرتے ہیں جیسے موت ان کے سامنے آ کھڑی ہو' مجھے یقین ہے کہ ساجد ٹھیک کہہ رہا تھا' لیکن نبیل خوامخواہ اس بچے کا دشمن ہو جاتا اور یہ بہت گھٹیا کلاس کے لوگ ہیں' کچھ بھی کر سکتے ہیں' فاصلہ ہی بہتر ہے۔" رجسٹر بند کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اگلے ہفتے ہم لوگ یہ کلاس' یہاں سے شفٹ کریں گے' ان شاء اللہ' میں تو سوچ رہا تھا کہ وہ افتتاح بھی بیگم زرتاج سے کروائیں' بہرحال کچھ نہ کچھ تو سپورٹ کرتی ہیں۔"

معاذ نے بڑی گمبھیر سی سنجیدگی خود پر طاری کرنی چاہی' لیکن مسکراہٹ بے اختیار ہونٹوں پر آگئی۔

"میں مار بیٹھوں گا مجھے معاذ! بیگم زرتاج کیا میری چڑ بنا لی ہے' کوئی اور نہیں رہا کیا پورے شہر میں۔" ریحان بری طرح جھنجلایا۔

جواباً" وہ بڑے زور سے ہنسا تھا۔

سامنے قدرے فاصلے پر بیٹھی زری کچھ نہ سمجھتے ہوئے محض اس لیے مسکرائی کہ وہ ہنسا تھا۔

☼ ☼ ☼

سالار نے ہاتھ میں تھمے سیل فون کو بے بسی سے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ گھر پر وہاں کوئی بھی نہیں ہو۔" مستقل ناکامی کے باوجود بھی دل ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور کوئی نہ سہی' لیکن کیتی کو تو ہونا ہی چاہیے تھا' دل کو طرح طرح کے واہمے گھیر رہے تھے۔

"شاید اسے خود واپس چلا جانا چاہیے۔"

بے ساختہ آنے والا خیال اتنا زور آور تھا کہ وہ حمیدی صاحب کے بتائے' سارے ضروری کام لپیٹ کر ایک طرف رکھنے کے لیے تیار ہوا۔

"اور اس بار وہ ان کی ایک نہیں سنے گا۔"

پورا پکا ارادہ کر کے وہ اپنے کمرے سے نکلا اور جب لاؤنج کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا' تو نیچے کھڑی زرتاج نے بھی اس کی فکرمندی کو نوٹ کیا۔

"سنو!" وہ اسے مخاطب تو نہیں کرنا چاہتی تھیں' لیکن ایک چھوٹا سا پیغام' بڑی معنی خیزی کے ساتھ آیا رکھا تھا۔ سالار نے رُک کر ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"یوسف بھائی کا فون آیا تھا' آج رات کے کھانے پر بلایا ہے انہوں نے تمہیں' تمہارا نمبر شاید بزی تھا کافی دیر سے۔"

"آپ منع کر دیجیے گا انہیں' میں نہیں جا سکوں گا۔" مختصر سا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا تو وہ تیزی سے پیچھے آئیں۔

"میرا خیال ہے وہ نہیں مانیں گے' انہوں نے کچھ اور لوگوں کو بھی بلایا ہے تم سے ملوانے کے لیے۔"

"میں نے کہا نا' میں نہیں جا سکوں گا۔"

پہلی بار اس کے لہجے کی رکھائی' زرتاج کے لیے اطمینان بخش ٹھہری۔

"شکر ہے' جو وہ اس کے بھائی کے گھرانے کے ساتھ مل کر اس کی مخالفت میں گروپ نہیں بنا رہا۔"

"میرا خیال ہے کہ تم انہیں خود کہہ دو' میری بات پر وہ یقین نہیں کریں گے۔" اپنے اطمینان کو بخوبی چھپا کر وہ یوں ہی میز پر سے اخبار اٹھاتی ہوئی قریبی صوفے پر جا بیٹھیں۔

سالار نے بہت بے زار سا ہو کر سر کو ہلکے سے جھٹکا۔ سارے کے سارے منافق اور مفاد پرست لوگ' پتا نہیں کیوں وہ یہاں چلا آیا اور آیا بھی تھا تو اتنے دن رکنے کی ضرورت کیا تھی' خیام سے مل کر چلا جانا تھا واپس۔

اسے سب سے زیادہ غصہ خود پر آنے لگا تھا۔ زرتاج نے اخبار کی اوٹ سے اس کے چہرے پر پھیلی بے زاری کو بخوبی نوٹ کیا تھا۔ وہ پریشان تھا۔

وجہ جانے بوجھے بغیر ہی' زرتاج کے دل کو بڑی کمینی سی خوشی نے گھیرا۔

سالار نے وہیں رُک کر یوسف کمال کی دعوت کو نمٹا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنی ساری الجھنوں اور کوفت کے باوجود وہ اخلاقیات نبھانے والا انسان تو بہرحال تھا ہی۔

زرتاج نے اسے بڑی وضع داری سے فون پر معذرت کرتے سنا۔

دوسری طرف سے اصرار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

زرتاج کو اس کا اندازہ سالار کی باتوں سے ہو رہا تھا۔

"بہت سوچ سمجھ کر جال پھیلانے میں مصروف ہوا ہے سارا خاندان اور وہ چلی تھیں اس زوبیہ سے تعلقات

بڑھانے۔"

ان کی سلطنت کو جیسے چاروں طرف سے خطرات لاحق ہو رہے تھے اور ایسے میں نبیل بھی جا کر لاہور بیٹھا تھا۔ اسے یک دم ہی وہ یاد آنے لگا۔

ان کی اچھی بھلی من چاہی زندگی میں مداخلت 'دوریاں' کیا کچھ نہیں جمع ہوتا جا رہا تھا۔

وہ شاید واقعی اداس ہونے لگی تھیں کہ ان کی خوش نصیبی ایک بار پھر ان کا ساتھ دینے کے لیے چلی آئی۔

"میں واقعی شرمندہ ہوں' لیکن میری مجبوری ہے کمال صاحب! مجھے آج رات کی فلائٹ سے واپس جانا ہے' بہت ضروری کام ہے' ورنہ ضرور رُک جاتا ایک دن' آپ پلیز پھر کبھی رکھ لیجیے گا۔" زرتاج کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا' جو اس نے ابھی بھی سنا۔

"پہلے ہی میں خاصا لیٹ ہو چکا ہوں اب مزید ایک دن بھی نہیں' آپ پلیز خیال نہ کیجیے گا۔" وہ بمشکل ہی فون بند کر پایا۔

سامنے ملازم آ کر کھڑا ہوا تھا۔

باہر حمیدی صاحب منتظر تھے۔

سو وہ سنتے ہی تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ زرتاج کے کندھوں سے بڑا بھاری بوجھ ہلکا ہوا اور دل ایک اچانک ملنے والی خوشی سے سرشار' کتنے دن کی کوفت اور ٹینشن مٹنے کو تھی' ایک بار تو ان کا دل چاہا کہ وہ یہاں سے وہاں تک دوڑتی چلی جائے یا پھر بہت زور زور سے چلائیں۔

کچھ تو ایسا کریں کہ ہر ایک جان جائے کہ وہ آج کتنی خوش ہیں۔

سالار واقعی جا رہا تھا۔

اب جبکہ وہ بھولتی جا رہی تھیں کہ وہ یہاں سے جا سکتا ہے تو وہ واپسی کا پروگرام بنا بیٹھا۔ اور وہ بھی اتنا ارجنٹ۔

انہوں نے دل میں اپنے بھائی سے کہے سالار کے الفاظ دُہرائے اور ہنس پڑیں۔

"زویہ کو پتا چلے گا تو کیسی جھنجلائے گی۔" زرتاج کو سوچ کر ہی مزہ آیا تھا۔

کاش' وہ خود زویہ اور اس کی ماں کے تاثرات دیکھ پاتیں۔

پچھلے چند دن سے وہ ان کی دور اندیشی پر حیرت' بھرے خوف میں مبتلا رہیں اور آج۔۔۔

وہ بے ساختہ ہی ہنستی چلی گئیں۔

لاؤنج سے گزرنے والی ملازمہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پھر حدِ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے جلدی سے لاؤنج سے نکل گئی۔

زرتاج نے ایک نگاہ سامنے لگے بڑے سارے وال کلاک پر ڈالی۔

ابھی دن کے صرف ساڑھے بارہ بجے تھے۔

سالار کو آج ہی کسی وقت نکل جانا تھا تو پھر نبیل کی واپسی بھی آج ہی ممکن ہو سکتی تھی۔

کتنے دن سے وہ وہاں بیٹھا تھا اور زرتاج کے ہر اصرار کے باوجود' مستقل ٹال مٹول کیے جا رہا تھا۔

مگر اب وہ اس کی ایک نہیں سنے گی۔

بہت پُرجوش سا ہو کر زرتاج نے نبیل کا نمبر ملایا تھا۔ مگر وہ شاید ابھی تک سو کر بھی نہیں اٹھا تھا۔ تب ہی اس کا فون بند مل رہا تھا۔

زرتاج کے جوش و خروش کو بریک سا لگا۔

نبیل ہی تھا' جو اس خبر کو سننے کا سب سے زیادہ حق دار تھا۔ کتنی پریشانی اٹھائی تھی اس نے سالار کے ہاتھوں۔

بلکہ پریشانی بھی کیا' کھلی ذلت۔

زرتاج بہت دل سے نبیل کی وسیع القلبی کی معترف ہوئیں اور یہ سب وہ محض ان کی خاطر ہی تو جھیل رہا تھا۔

نبیل ان کا محبوب شوہر' انہیں شدت سے یاد آنا شروع ہوا تھا۔ وہ بھولنے لگیں کہ ابھی کچھ دن پہلے تک وہ اس سے اچھی خاصی نالاں رہنے لگی تھیں۔

اگر وہ واپسی کی سیٹ کنفرم کروا کر نبیل کو اطلاع دیں گی تو یہ زیادہ خوب صورت سرپرائز ہوگا اس کے لیے۔

ایک بھرپور سی مسکراہٹ جیسے زرتاج کے چہرے پر مستقل ہی ٹھہری تھی۔ ان کی کوئی پریشانی کبھی چند دن سے زیادہ ان کے آگے نہیں ٹک سکی تھی۔

ایک ہی لمحے میں انہیں کچھ گزرے ہوئے مشکل پل یاد آئے۔ کبھی ان کی اپنی فراست کام آئی اور کبھی قدرت سے ملا تعاون۔

غرور سے تنی گردن اور وہی مخصوص تیور' اپنے ریشمی بالوں کو سمیٹتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہی ہوئی ہی تھیں کہ باہر برپا ناانوس سا ہنگامہ مچا۔

ایک ساتھ دوڑتے ہوئے کئی بھاری قدموں کی آوازیں اور بے معنی سا شور۔

زرتاج کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔

"لاؤنج کا دروازہ بند کرو اندر سے فوراً۔" وہ بہت زور سے چلائیں۔

بھلا خیال انہیں دن دہاڑے پڑنے والے ڈاکے کا ہی آیا تھا' مگر تب ہی باہر کی طرف کھلنے والا لاؤنج کا دروازہ پورا کھلتا چلا گیا۔

یہ اس کے اپنے وفادار ملازم تھے' جو اس طرح بے تابی سے اندر داخل ہوئے تھے۔

"سالار صاحب کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی ہے بیگم صاحب! گاڑی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ پورا برسٹ مارا گیا ہے۔"

"صاحب کی حالت بہت خراب ہے' اسپتال لے کر گئے ہیں' پولیس کو بھی اطلاع۔۔۔"

بہت سارے لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے۔

وہ بہت کچھ سمجھنا بھی چاہ رہی تھیں' مگر ایک ساتھ ناممکن ہوا جا رہا تھا۔

"کتنا ناقابلِ یقین تھا یہ سب۔" زرتاج نے خود کو کمپوز رکھنے کی پوری کوشش کی۔

"بڑا پکا کام کیا ہے قاتلوں نے' سو فیصد کرائے کے لوگ تھے' کسی نے دشمنی نکالی ہے سالار صاحب سے۔"

ان ہی میں سے کسی نے زور سے کہا تھا۔

زمین' حقیقتاً" زرتاج کے پیروں تلے سے سرکی تھی۔ سالار سے دشمنی کون نکال سکتا تھا۔

اس کے گھر کے نوکر بھی بتا سکتے تھے اس سوال کا جواب۔

"بھلا وہ کہاں تک اس کے عیبوں کی پردہ پوشی کر سکیں گی۔" چکراتے ہوئے سر کو تھامتے زرتاج واپس صوفے پر بیٹھیں۔

ایک ملازمہ ان کے لیے پانی کا گلاس لینے دوڑی۔

"اور بے چارے حمیدی صاحب تو موقع پر ہی ختم ہو گئے۔" ایک اور اطلاع۔

زرتاج کی پھیلی ہوئی آنکھیں' ان کی طرف اٹھی تھیں۔ محض لمحوں میں بساط الٹی تھی۔

"کاش! نبیل نے صرف ایک بار اس حرکت کا انجام سوچ لیا ہوتا۔"

ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ آخری بات زرتاج کے ذہن میں یہ ہی آئی تھی۔

(اگلی قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عطیہ عمر

روٹی پیڑے اور ارمان

اماں نے دل کھول کر افشاں کی تعریف کی۔

"ماشاء اللہ! تم نے اپنا گھر بہت سلیقے، طریقے سے سنبھالا ہوا ہے۔ ہر ایک چیز صاف ستھری، چمکتی، دمکتی اپنی اپنی جگہ پر دھری ہے۔ بچے بھی صاف ستھرے، خود بھی صاف اور پھر اتنا اچھا کھانا، بہترین ذائقہ، اچھے طریقے سے سجا ہوا کہ چکھے بغیر ذائقہ محسوس ہو۔ تم تو اپنی ساس کی چہیتی بہو ہو گی۔"

مسکراتے، چمکتے چہرے کے ساتھ اماں کی تعریف وصولتی افشاں نے ان کے آخری فقرے پر جتاتی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔ جس کا مطلب اماں تو نہیں سمجھی ہوں گی، مگر عمارہ خوب جانتی تھی کہ افشاں اکثر اسے اپنے سسرالی قصے سناتی رہتی تھی۔

دوسرے روز، صبح ناشتے کے لیے عمارہ نے اماں کے لیے پراٹھا بنایا۔ پیالے میں تازہ گھر کا جما ہوا دہی نکالا۔ دودھ پتی کا بڑا مگ بنا کر ٹرے سجائی، اور اپنی چائے کی پیالی لے کر اماں کے پاس آ بیٹھی۔

اماں کا میکہ، سسرال گاؤں میں تھا۔ نوعمری میں خوب محنت بھی کی اور اچھا کھایا، پیا بھی۔ آج بھی وہ آج کل کے کئی جوانوں سے زیادہ صحت مند اور چاق و چوبند تھیں۔ عمارہ کے پاس آتیں تو عمارہ کے منع کرنے کے باوجود اس کے کئی کام کر ڈالتیں۔

"بیٹی، بوڑھی ہوں، مگر خدانخواستہ اپاہج نہیں۔ یونہی فارغ بیٹھنا مجھے پسند نہیں۔ شادی سے پہلے میرا میکہ بھی بھرا پرا تھا۔ ابا ان کے تینوں بھائی، سب کے بال بچے، خود ہم لوگ ہیں پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔

میری اماں، اللہ ان کی مغفرت کرے، فجر کی اذان سے پہلے اٹھتی تھیں۔ میری تائی، چاچیاں بھی اسی وقت اٹھتیں۔ نوکر خالص بھینس کے دودھ کی بالٹیاں گھر کے اندر رکھ جاتے۔ میری اماں اور چاچیاں اس دودھ کو سنبھالتیں۔ مکھن، لسی، دہی، دودھ خوب وافر مقدار میں گھر میں موجود رہتا۔ ابا، تایا، چچا، کھیتوں، کھلیانوں، باغوں کی نگرانی کرتے جب بیج بویا جاتا تو اللہ بخشے، میری دادی کو، اپنے بیٹوں، بھوؤں، پوتے پوتیوں کو صلواۃ حاجت پڑھنے کو کہتیں کہ دعا کرو اللہ ساتھ خیریت سے برکت والی فصل تیار کرے۔ پھر جب فصل گھر میں آتی گوداموں اور منڈی میں بھیجی جاتی، تب پھر ہم سے شکرانے کے نفل پڑھنے کو کہتیں۔ عشر تو خیر دیا ہی جاتا تھا، اس کے علاوہ بھی تمام مزاروں، نوکروں کو نئے جوڑے اور انعام دیے جاتے۔ غریب، عزیز رشتے داروں کو اناج بھیجتیں۔ ہر کام، ہر فیصلہ مل جل کر کر لیا جاتا۔ نہ شور، نہ ہنگامہ، نہ میرا، نہ تیرا۔ شادی کے بعد بھی یہی ماحول میرا نصیب رہا کہ تایا کے بڑے بیٹے سے میری شادی ہوئی۔ اللہ کا شکر ہے اس نے بہت نعمتیں عطا کیں۔ صحت، تندرستی، مال، اولاد، سکھ چین تو شکر ادا کرنا تو ہمارا فرض ہے نا۔۔۔ بے عیب صحت مند اعضاء کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کا صحیح استعمال کیا جائے۔ اب تم اور کاموں میں مصروف ہو، میں نے ہانڈی بنا دی۔ خوامخواہ فارغ بیٹھی یا لیٹی رہتی تو کیا فائدہ ہوتا؟ حرکت میں برکت ہے۔ بوڑھا جسم تو ویسے بھی بیماریوں کی پوٹ ہے۔ جتنا چلتا پھرتا رہے اتنا ہی اچھا ہے۔"

عمارہ ہنسی۔

"اماں جی! افشاں کی ساس تو بہت سخت گیر ہیں۔ پانی تک ہل کر نہیں پیتیں۔ آپ حالانکہ خود اس قدر لذیذ اور عمدہ کھانا بناتی ہیں کہ جو بھی کھالے، اس کا ذائقہ ہمیشہ اس کی زبان پر رہتا ہے، مگر پھر بھی آپ میرے بنائے کھانوں پر نکتہ چینی نہیں کرتیں، کوئی کمی بیشی ہو تو بہت آرام سے مشورے دیتی ہیں، مگر افشاں کی ساس اس کے ہر کام میں کیڑے نکالتی ہیں۔"

"عمارہ پتر! تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ افشاں کی ساس کو بھی تحمل اور برداشت سے کام لینا چاہیے اور افشاں بھی ساس کا مشورہ اس کی بات صرف اس لیے رد نہ کرے کہ ساس نے کہا ہے، اب تم بتاؤ کہ میرا مشورہ مانتی ہو تو تمہیں فائدہ ہوتا ہے اور مجھے خوشی اور فخر کا یہ احساس ہوتا ہے کہ میری بہو مجھے، میرے مشوروں کو اہمیت دیتی ہے اور خود افشاں ہی تو کہہ رہی تھی کہ میری ساس کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔ تو پھر وہ بے چاری گھر کے کام کیا کرے گی جبکہ میں تو اللہ کے فضل سے صحت مند ہوں اور ہمیشہ سے کام کاج کرنے کی عادی ہوں۔"

عمارہ کی شادی خاندان سے باہر ہوئی تھی۔ فہد اس کے بڑے بھائی توصیف کا کلاس فیلو اور دوست تھا۔ پڑھنے میں تو بہترین تھا ہی، عادات و اطوار کا بھی بہت اچھا تھا۔ توصیف کے ساتھ کئی بار اس کے گھر آیا اگرچہ عمارہ لوگ بھائیوں کے دوستوں سے بے تکلف نہیں تھیں، تو صیف اور جلیل، بھائی کے دوست بالائی منزل پر ہی رہتے تھے۔ مگر پھر بھی کہیں آتے جاتے فہد کی نظر عمارہ پر پڑی۔

فہد کے لیے بھی اماں لڑکی دیکھ رہی تھیں۔ جونہی فہد نے اپنی نوکری لگنے کی اطلاع دی۔ اماں نے مختلف لڑکیوں کے بارے میں اس کی رائے لینی شروع کی۔ تو فہد آہستہ سے بولا۔

"اماں، آپ غلط مت سمجھیے گا۔ میں شادی آپ کی مرضی سے ہی کروں گا، لیکن اگر آپ توصیف کی بہن

عمارہ کو دیکھ لیں، پھر جیسے آپ کہیں گی۔"

اماں، روایتی ماؤں کی طرح اولاد پر اپنی مرضی تھوپنے کے خلاف تھیں۔ ان کا گھرانہ مذہبی اور اخلاقی اقدار کی مقدور بھر پابندی کرتا تھا، پھر ابا کی شہر میں ملازمت کے باعث عمر کا ایک بڑا اور اہم حصہ شہر میں گزرا۔ اماں کے فطری تحمل، رواداری نے شہری ماحول سے مزید جلا پائی۔ لیکن ان کی طبیعت کی سادگی اور فراخ دلی ہمیشہ ان پر غالب رہی۔

وہ پہلے فہد کے ساتھ عمارہ کے گھر گئیں۔ ان کے گھر کا ماحول، طریقہ، سلیقہ جانچا، عمارہ سے ملیں تو انہیں فہد کی پسند مناسب لگی۔

"زندگی تو فہد کو گزارنا ہے، اگر بیوی اسی کی پسند کی ہو تو کیا مضائقہ ہے؟" انہوں نے سوچا اور اگلی بار، طاہرہ، اور دیگر قریبی عزیزوں کے ساتھ باقاعدہ رشتہ مانگنے آ گئیں۔

فہد تو صیف کا دوست تھا۔ دیکھا بھالا لڑکا تھا۔ ان لوگوں نے رسمی سی مہلت مانگی اور پھر جلد شادی ہو گئی۔

آج عمارہ کی شادی کو چار برس ہو رہے تھے۔ اس کا دو سال کا بیٹا تھا۔ اچھی پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ سعد بھائی' زمین کی آمدنی تین برابر حصوں میں تقسیم کر کے دونوں بھائیوں کو بھیج دیتے۔ چھوٹا حسان ڈاکٹر تھا۔ پچھلے سال ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی بھی ڈاکٹر تھی۔ شادی کے فوراً بعد میاں بیوی کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی۔ تو وہ وہاں چلے گئے حسان اور فہد نے یہ فیصلہ کیا کہ سعد بھائی کو زمینوں کی آمدنی میں سے ان کے کام اور محنت کا بھی حصہ دینا چاہیے۔

اپنے تینوں بیٹوں کو افہام و تفہیم اور سمجھ داری سے معاملات سنبھالتے دیکھ کر اماں بہت خوش تھیں۔

یوں تو وہ طاہرہ اور سعد کے ساتھ ہی رہتی تھیں' لیکن فہد اور عمارہ کے اصرار پر ان کے ہاں بھی آتی جاتی رہتیں۔ اس سال حسان اور اس کی بیوی نے انہیں رمضان المبارک اپنے ہاں مدینہ میں گزارنے کے لیے مدعو کیا۔ اور کہا کہ کوشش کریں گے ویزا کی مدت حج تک بڑھ جائے۔ تاکہ وہ حج ادا کر کے ہی واپس آئیں۔

اس پروگرام سے اماں بہت خوش تھیں۔ فہد اور عمارہ نے اصرار کیا کہ سعودی عرب جانے سے پہلے ڈیڑھ' دو ماہ ان کے پاس گزار کر جائیں۔ یوں آج کل اماں ادھر تھیں۔

فہد اور عمارہ آج کل ایک متوسط علاقے کی ایک عمارت کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔

فہد کو فلیٹ میں رہنا پسند نہ تھا' مگر مجبوری کے باعث یہاں آنا پڑا۔ کیونکہ ویسے کوئی خرابی نہ تھی۔ مناسب کرایہ' صاف ستھرا علاقہ اور سب سے بڑھ کر فہد کا آفس بھی قریب ہی تھا۔

پھر سعد بھائی اور اماں نے بھی سمجھایا کہ کرائے کے مکان کے لیے اتنا تردد مت کرو اور کچھ بچت کرو۔ تاکہ بے شک چھوٹا سہی' لیکن اپنا مکان بنا لو تاکہ روز روز کی خانہ بدوشی سے جان چھوٹے۔

عمارہ اور فہد کو یہ مشورہ پسند آیا۔ فہد کی زمینوں سے آنے والی آمدن' پینک میں ہی رہتی تھی۔ ان میاں بیوی کی گزر اوقات تنخواہ میں سے با آسانی ہو رہی تھی۔ بلکہ تھوڑا بہت پس انداز بھی ہو جاتا تھا۔

چنانچہ پچھلے دنوں ہی فہد نے ایک پلاٹ دیکھا تھا۔ اماں اور سعد بھائی آئے تو انہیں دکھا کر خرید بھی لیا۔

کچھ دنوں بعد وہ پلاٹ فہد کے نام ہو گیا' تو عمارہ' مٹھائی کا ڈبہ لے کر افشاں کے گھر گئی۔ افشاں نے خوش دلی سے مبارک باد دی اور بولی۔

"جلد ہی تمہارے گھر آوں گی' مبارک باد دینے۔ خالہ جی کو بھی تو مبارک باد دینی ہے۔"

اماں اور عمارہ شام کی چائے پینے کے لیے بیٹھی ہی تھیں کہ افشاں آ گئی۔ فہد اپنے حصے دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔ عمارہ کو اطمینان سا ہوا۔ دراصل افشاں بلند آواز سے باتیں کرنے کی عادی تھی۔ پھر ہر وقت ہی اپنے سسرال کا کوئی نہ کوئی دکھڑا روئی رہتی اور اس کی اس بات سے فہد بہت چڑتا تھا اسے ایسی عورتیں بہت بری لگتی تھیں' جو ہمہ وقت سسرال کی برائیاں کرتی رہتی ہوں۔

عمارہ' افشاں کی تواضع کے لیے کچھ لینے کچن میں چلی گئی۔ افشاں' اماں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ عمارہ نے پلیٹ افشاں کی طرف بڑھائی۔

"یہ پنجیری لو افشاں! اماں خود بنا کر لائی ہیں۔"

"بہت خوش قسمت ہو عمارہ! کہ تمہاری ساس اتنی مہربان اور مددگار قسم کی ہیں۔ کل بھی تم بتا رہی تھیں نا کہ خالہ نے چنے کی دال گوشت پکایا۔ بھئی ہماری ساس تو ہر وقت ہائے وائے کرتی رہتی ہیں۔ کچھ مدد کرنا تو دور کی بات کیے کرائے پر پانی پھیرنا اور ہر کام میں کیڑے نکالنا ان کا مشغلہ ہے۔"

اماں کہنے لگیں "بیٹی! اللہ کا شکر ہے کہ میری صحت کافی اچھی ہے۔ ورنہ میری عمر کے لوگ تو کئی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان بے چاروں کے لیے تو زندگی گزارنا ہی مشکل ہو رہا ہوتا ہے' پھر اس عمر میں وہ کیا کام کر سکتے ہیں۔"

"خالہ جی! میں یہ نہیں کہتی کہ وہ میرے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹائیں' لیکن کم از کم میرے مسائل کو تو سمجھیں۔ اب دیکھیں نا' یہ مہنگائی کا دور' تین بچے ابھی تو چھوٹے ہیں اور پھر بھی ان کے کئی خرچے ہیں' کل بڑے ہوں گے تو ان کی تعلیم' شادی بیاہ' کتنے ہی مسئلے ہیں' ہمیں کچھ ان کے لیے بھی بچا کر رکھنا ہے۔ فلیٹ بک کروایا ہوا ہے۔ آخر کب تک کرائے کے گھروں میں دھکے کھاتے پھریں گے' وہ قسط دینی ہوتی ہے' لیکن امی کی کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ بس ان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ عدنان اپنی خون پسینے کی کمائی بہن بھائیوں پر لٹاتے رہیں۔ دس سال ہو گئے ہیں شادی کو' بس یونہی کس مس کر ترس ترس کر زندگی گزارتے۔"

اماں نے خاموشی سے اس کی باتیں سنیں' پھر پوچھنے لگیں عدنان کے والد "کیا حیات ہیں اور باقی بہن بھائی اس سے بڑے ہیں یا چھوٹے۔"

"یہی تو مصیبت ہے خالہ! عدنان سب سے بڑے ہیں۔ ان کے والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی امی اسکول ٹیچر تھیں۔ ہیڈ مسٹریس کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئیں۔ عدنان سے چھوٹا ایک بھائی اور بہن ہے۔ خدا خدا کر کے چار سال پہلے فیضان کی تعلیم مکمل ہوئی اور جاب ملی۔ ورنہ اس کی تعلیم کا ہی بہت خرچ تھا۔ اس کی شادی پر بھی عدنان نے بہت خرچ کیا۔ اس کی شادی کے بعد بڑی مشکل سے میں الگ گھر میں آ سکی اور سال بھر پہلے اپنا فلیٹ بک کروایا ہے۔ اب چھوٹی بہن کی شادی ہے۔ اماں کہتی ہیں کہ عدنان فرنیچر دے۔ ابھی تو شکر ہے زیور انہوں نے بنوا رکھا ہے۔ فیضان کی اتنی اچھی جاب ہے۔ ایک ہی بچہ ہے' وہ بھی صرف سال بھر کا۔ تو اس کا بھی کچھ فرض بنتا ہے یا نہیں' صرف ہم نے ہی عمر بھر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ میں نے تو صاف کہہ دیا' آج تک ہم سب کچھ کرتے آئے ہیں' اب فیضان ذمہ داری سنبھالے۔ وہ ناراض ہو گئیں کہ شادی کا باقی سب خرچ تو وہی اٹھا رہا ہے اور بڑا بھائی کیا صرف فرنیچر بھی نہیں دے سکتا۔ عدنان تو ویسے ہی فرماں بردار بیٹے ہیں۔ فوراً" وعدے کرنے لگے۔

"امی' آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ افشاں تو یونہی فضول بول رہی ہے۔ آپ بے فکر رہیں' میں نے بیس ڈالی ہوئی ہے۔ پورے تین لاکھ کی وہ فرزانہ کے لیے ہی ہے۔ میرا خیال ہے' فرنیچر بھی آ جائے گا اور کچھ چھوٹے خرچ اور بھی نکل آئیں گے۔"

امی تو خوش ہو گئیں۔ لگیں دعائیں دینے۔ "جیتا رہے میرا بچہ اللہ خوش رکھے۔ وہ تو شکر ہے کہ فرزانہ کے سسرال والے اچھے ہیں۔ کوئی فرمائش نہیں کر رہے۔ فرنیچر بھی ہم صرف بیڈ روم کا ہی بنوا رہے ہیں۔"

افشاں حسب عادت زور زور سے بولتے ہوئے تفصیل بتا رہی تھی۔ عمارہ اور اماں خاموشی سے سن رہی تھیں۔ پھر افشاں ہی قدرے توقف سے دوبارہ گویا ہوئی۔

"میں تو ہمیشہ عمارہ سے کہتی ہوں کہ تم بہت خوش قسمت ہو۔ تم لوگوں پر سسرال کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ بلکہ آبائی زمین سے اضافی آمدن بھی ہوتی رہتی ہے۔ ورنہ اس دور کی یہ کمر توڑ مہنگائی' روز مرہ اخراجات پورے کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو افشاں! واقعی اللہ کا شکر ہے' ہمارے ہاں اس طرح کے کچھ مسائل نہیں۔ تینوں بھائی اپنی اپنی جگہ سیٹ ہیں۔ ویسے جب موقع اور ضرورت ہوتی ہے' ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔"

عمارہ کے کہنے پر اماں نے دونوں کو باری باری دیکھا اور پھر کہنے لگیں۔

"تم دونوں پڑھی لکھی ہو میں نے تو بس قرآن پاک

ترجمہ، تفسیر کے ساتھ پڑھا اور پھر دادی، نانی، ماں، ساس کی نصیحتوں، تجربوں سے جو کچھ تھوڑا بہت علم، تجربہ ملا۔ اس سے یہی سیکھا ہے کہ ہر جان دار اپنے نصیب کا کھاتا ہے کہ رزاق تو بس ایک ہی ہے جس سے بڑھ کر کوئی انصاف کرنے والا نہیں ہے اور یہ کہ والدین، بہن بھائیوں، بیوی، بچوں، عزیز رشتے دار، پڑوسی، ہر ایک کے حقوق اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیے۔ سب سے حسن سلوک کا حکم دیا اور بیٹا، اتنی عمر ہونے کو آئی، میں نے تو یہ بات جانی ہے کہ سکھ، چین، دولت یا حسن کے بل بوتے پر نہیں ملتا۔ یہ محض اللہ کے فضل سے ملتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ کر بھلا، ہو بھلا۔ ہماری دادی اللہ ان کی مغفرت کرے، بتاتی تھیں کہ ان کے والدین بھی کھیتی باڑی کرتے تھے۔

دادی کے بچپن میں ایک بار سخت قحط پڑا۔ آسمان سے ایک بوند بھی بارش نہ برسی۔ نہریں، کنوئیں خشک اور کڑوے ہو گئے۔ لوگ درختوں کے پتے اور چھال ابال کر کھا رہے تھے۔ دادی کی اماں کا میکہ نہری علاقے میں تھا۔ وہاں کے حالات بہتر تھے۔ وہاں بارش بھی برسی تھی۔ اس لیے فصل بھی ہوئی۔ پھر دادی کی اماں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ ان کے بھائی کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ اس دور میں نہ ٹیلی فون تھے نہ آنا جانا، اتنا آسان تھا۔ دادی کی اماں کا سسرال بارانی علاقے میں تھا، جو قحط اور خشک سالی کی زد میں آیا ہوا تھا۔ دادی کے میکے میں اترتی پڑتی بیٹی کے حالات کی خبر پہنچی۔ دادی کے بڑے بھائی بہن کی خیر خبر لینے آئے۔ تو اپنے ساتھ گندم، چاول کی ایک بوری، ایک گڑ اور خالص گھی کے کنستر لے کر آئے۔ کپڑے کے تاجر تھے، بہن، بہنوئی اور بچوں کے تین تین، چار چار جوڑے بھی ساتھ تھے۔ کچھ نقد رقم بھی۔ بہن کے ہاتھ پر رکھی۔

دادی کہتی تھیں کہ کتنے مہینوں سے ہم نے گندم کی روٹی نہیں کھائی تھی۔ اس روز اماں نے گندم پیس کر روٹی پکائی، ماموں کی لائی ہوئی دال میں سے دال پکائی، خالص گھی کا تڑکہ لگایا، ہمارے قریب ہی چچا اور اکلوتی پھوپھی کا گھر تھا۔ اماں نے ابا کو بھیج کر سب کو بلا لیا۔ اور ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ میری بڑی بہن نے اماں سے کہا۔

"اماں! آپ نے پھوپھی اور چچا کے گھر والوں کو کیوں بلایا۔ اتنے سارے لوگ کھائیں گے تو گندم اور چاول جلد ختم ہو جائیں گے۔ اگر صرف ہم کھائیں گے تو زیادہ دن یہ سب چیزیں چلیں گی۔ اماں کہنے لگیں "نہ پتر" کھلانے والا تو ایک ہی ہے۔ اور سب کھانے والے اپنا اپنا حصہ کھاتے ہیں۔ اگر میرے اللہ نے میرے بھائی کے ذریعے یہ رزق ہم تک پہنچایا تو ہمیں بھی چاہیے کہ اللہ کی دی گئی نعمت کا شکر ادا کریں اور شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے قریبی مستحق لوگوں کو اپنے دسترخوان پر بٹھا کر کھلائیں اور شکر سے نعمت بڑھتی ہے گھٹتی نہیں" پھر اماں نے ایک ایک جوڑا سب کا رکھ کر باقی سب کپڑے بھی دادی چاچا اور پھوپھی کے گھر بھیج دیے۔ دادی بتاتی تھیں کہ جب تک وہ گندم اور چاول موجود رہے، ہماری اماں، میری پھوپھی اور چاچا کے خاندان کو بھی اپنے دسترخوان پر کھلاتی رہیں۔ دادی بتاتی تھیں کہ بعد کے دنوں میں اللہ کا ایسا فضل ہوا اور اتنی برکت شامل حال ہوئی کہ میرے ابا کے جیسی اچھی فصل پورے علاقے میں کسی کی نہ ہوتی تھی۔

اپنی دادی کا یہ قصہ سنانے کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے کو دینے کے لیے انسان کے پاس دولت کا وافر ہونا ضروری نہیں، بڑے بڑے دولت مند دیکھے ہیں کہ دوسروں کو چند روپے بھی دینا انہیں مشکل لگتا ہے اور افشاں! بیٹا، تمہاری ماں کے برابر ہوں، ناراض مت ہونا، اپنے شوہر اور سسرال کا پردہ رکھنا اچھی بیوی، بہو کی نشانی ہوتی ہے۔ ہر گھر میں چھوٹی موٹی رنجش ہو جاتی ہے، کوئی کیسا ہی عزیز دوست ہو یا رشتے دار ان تک یہ باتیں پہنچانا اپنی بے عزتی کے برابر ہے۔"

افشاں جو پہلے دلچسپی سے اماں کا قصہ سن رہی تھی، آخر میں اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ آہستہ سے

کہنے لگی۔

"سوری خالہ! میں اپنے سسرال والوں کی برائیاں نہیں کر رہی، یونہی ایک بات کہی تھی۔ جب دو سرے زیادتی کرتے ہیں تو دل تو دکھتا ہی ہے۔ پھر اگر کسی قریبی دوست سے بھی دل کی بات نہ کہیں تو آخر کب تک اندر ہی اندر جلتے کڑھتے رہیں۔"

اماں خاموش رہیں۔ افشاں کچھ دیر بعد چلی گئی۔ تو اماں، عمارہ سے کہنے لگیں، "اللہ اس کو ہدایت دے اسے یہ احساس ہی نہیں کہ غیبت کر رہی ہے۔ بیٹا! وہ انسان بہت بڑا بے وقوف ہے، جو اپنے آپ کو ہمیشہ درست سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ کبھی اپنی غلطی کی اصلاح نہیں کر سکتا اور اس کی غلطیاں بڑھتے بڑھتے ایک روز اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی ہیں۔"

☆ ☆ ☆

پھر گلے ہفتے افشاں ان کے گھر ہی نہیں آئی۔ اماں نے عمارہ سے کہا۔

"جاؤ اس کا حال پوچھ آؤ۔ تمہاری پڑوسن ہے۔ اس کا تم پر بہت حق ہے۔ اگر میری بات بری لگی ہے اور اس لیے نہیں آ رہی تو میری طرف سے معذرت کر لینا۔"

عمارہ کو افشاں کی حرکت ناگوار گزری تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ افشاں اس حد تک بدتہذیب ہو گی کہ ایک بزرگ، ماں کے برابر عورت کی نصیحت پر برا مان کر ناراض ہو جائے گی۔ عمارہ نے تو یہ سیکھا تھا کہ بڑوں کی کوئی بات ناگوار گزرے، کتنی بھی غلط کیوں نہ ہو، ان کو پلٹ کر جواب دینا تو بدتمیزی ہے ہی، منہ سجا لینا، بات نہ کرنا، سامنے نہ آنا بھی بدتہذیبی ہے۔ اماں کے کہنے پر وہ افشاں کے گھر پہنچی، تو وہ کچن میں کڑھی بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"کیا بتاؤں عمارہ! ہفتے بھر سے کڑھی کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ لیکن جب بھی بنانے کا ارادہ کرتی ہوں، کسی نہ کسی وجہ سے ارادہ ختم کرنا پڑتا ہے، لیکن آج تو میں نے پکا ہی لی۔ بہت دل لگا کر بنا رہی ہوں۔ اچھی مزے کی بنے گی۔ تمہارے گھر بھی لے کر آؤں گی۔"

"کھانا تو خیر تم بہت اچھا بناتی ہو، کڑھی بھی انشاء اللہ مزے کی ہی ہو گی، لیکن تم اتنے روز سے ہمارے گھر کیوں نہیں آئیں، کیا ناراض ہو؟"

"نہیں بھئی، تم سے کیا ناراضی لیکن عمارہ! تمہاری ساس تو کچھ زیادہ ہی ہدایت پیکیم ہیں۔ تمہارا ہی حوصلہ ہے، جو ان کے ساتھ گزارا کر رہی ہو۔ ویسے شکر ہے، تمہارے ساتھ نہیں رہتیں۔"

"نہیں بھئی، ایسی کوئی بات نہیں اماں ہرگز فضول میں دخل اندازی نہیں کرتیں۔ لیکن غلط بات پر ٹوکتی ضرور ہیں اور میرا تو یہ تجربہ ہے کہ اماں کی ہر بات، مشورے میں دم ضرور ہوتا ہے۔ اور ان کی بات مان کر ہمیشہ فائدے میں ہی رہی ہوں۔"

"چلو بھئی، مانا کہ تم بہت فرماں بردار بہو ہو اور تمہاری ساس بہت عقل مند، لیکن کچی بات کہ مجھ میں ان کا لیکچر سننے کی ہمت نہیں۔"

افشاں ہنسی تو عمارہ سنجیدگی سے بولی۔ "اماں کا اندازہ درست تھا کہ تم ان کی بات سے ناراض ہو۔ وہ تم سے معذرت کر رہی تھیں۔ کیونکہ وہ کہتی ہیں، تم ہماری پڑوسن ہو، تمہارے بہت حقوق ہیں۔"

پھر عمارہ گھر آ کر دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ لگاتار ڈور بیل کی آواز پر دروازے پر گئی تو وہاں افشاں کا شوہر عدنان کھڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں اور کپڑے کی مدد سے ایک پتیلی پکڑ رکھی تھی۔

"بھابی! یہ کڑھی لے لیں۔ افشاں کہہ رہی ہے کہ میں نے بھی چکھی نہیں، نمک شاید کم ہو گا، تو ڈال لیں۔ ہم لوگ فیصل آباد جا رہے ہیں۔ افشاں کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔"

عمارہ نے آ کر اماں کو بتایا تو وہ کہنے لگیں۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون، چلو بیٹا، چل کر افشاں کو تسلی دیں۔ اس کی تیاری میں کچھ مدد کر دیں۔"

افشاں کے گھر گئے تو وہ روتی ہوئی پیکنگ میں مصروف تھی۔ عمارہ نے کہا۔ "جو سامان لے کر جانا

ہے' وہ بتاؤ بیگ میں تیار کرتی ہوں۔ تم جلدی سے نہا کر کپڑے تبدیل کرو۔"

"ہاں افشاں! جلدی کرو۔ دو گھنٹے بعد فلائٹ ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ اس فلائٹ میں سیٹیں مل گئیں۔ ورنہ بہت مشکل ہو جاتی۔ جنازے پر نہ پہنچ سکتے۔"

عدنان نے کہا تو افشاں اور زور زور سے رونے لگی۔

"ہائے ابو! ابھی کل تو میری آپ سے بات ہوئی تھی۔ اچھے بھلے تھے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں آخری بار باپ سے بات کر رہی ہوں۔"

فہد بھی آگیا تھا۔ اماں کے کہنے پر عمارہ جلدی سے اپنے گھر سے اسپیکٹی لے آئی اور بچوں کو کھلانے لگی۔

افشاں اور عدنان تیار ہو گئے تو فہد انہیں ایئرپورٹ چھوڑنے گیا۔ عمارہ اور اماں ان لوگوں کو رخصت کرنے نیچے گاڑی تک آئیں۔

روتی ہوئی افشاں کو خوب پیار کر کے تسلی دلاسا دے کر گاڑی میں بٹھا رہی تھیں کہ قریب ہی ایک ٹیکسی آکر رکی' اس میں عمارہ کے پرانے گھر کی ایک پڑوسن تھیں۔

مسز یوسف۔ تقریباً" اماں کی ہی ہم عمر تھیں اور اماں سے ان کی خوب دوستی بھی تھی۔ ابھی بھی اماں سے ہی ملنے آئی تھیں۔

عمارہ سے پوچھنے لگیں "یہ مسز ثریا یعقوب کی بہو تھی نا افشاں یہ کہاں جا رہی ہے اور رو کیوں رہی تھی؟"

عمارہ نے بتانے کے بعد پوچھا۔" آپ کیا اس کی ساس کو جانتی ہیں؟"

"ہاں بھئی' ثریا میری سہیلی ہے پرانی اور کولیگ بھی میں نے تو قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی' لیکن ثریا نے مدت ملازمت پوری کی کہ اسے ضرورت تھی۔ بہت حوصلہ مند خاتون ہے۔ جوانی سے بیوگی کاٹ رہی ہے۔ اب تو خیر بچے جوان ہیں۔ بیٹی کی بھی اب شادی ہونے والی ہے۔ بیٹوں کو پڑھایا لکھایا' شادیاں کیں' اچھے وقتوں میں شوہر نے مکان بنا کر ثریا کے نام کیا تھا۔ وہ تو نہیں بیچنا چاہتی تھی مگر شاید بہوؤں' بیٹوں کے کہنے پر بیچ کر دونوں بیٹوں کو حصہ دیا۔ بیٹی کا حصہ اس کی شادی کے اخراجات کے لیے رکھا تھا جو عدنان نے اپنا پلاٹ بک کرواتے ہوئے ادھار مانگا تھا کہ فرزانہ کی شادی پر دے دوں گا۔ اب اللہ کرے کہ دے دے۔ میں نے تو ثریا کو منع کیا تھا کہ بیٹی کا حصہ بیٹے کے حوالے مت کرو۔ مگر وہ کہنے لگی کہ بیٹے کو ضرورت ہے' جب بیٹی کا وقت آئے گا تو میرا بیٹا بہن کا حق ضرور ادا کرے گا۔"

مسز یوسف ایک سانس میں اپنی سہیلی کی داستان حیات سناتی چلی گئیں۔ اماں اور عمارہ ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ دونوں کو ہی افشاں کا واویلا یاد آیا تھا۔ جو فرزانہ کے فرنیچر کے لیے تھا۔

اماں نے عمارہ سے کہا کہ "افشاں! جو کڑھی دے گئی ہے' اگر چاہو تو اس میں سے کچھ رکھ لو' ورنہ یہ کڑھی بلڈنگ کے گیٹ کیپر کو دے دو۔ بے چارہ غریب آدمی ہے' ایک وقت کا کھانا مل جائے گا۔"

رات کو نماز عشاء کے بعد اماں اور عمارہ حسب معمول بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ اماں کہنے لگیں۔

"بیٹی! جب سے افشاں کڑھی ہمیں دے کر خود باپ کے جنازے میں چلی گئی' وہ کڑھی جو اس نے اتنے شوق سے پکائی' لیکن ان میں سے کھا نہ سکی۔ تب سے میں ایک ہی بات سوچ رہی ہوں کہ پیٹ بھرنے کی خاطر انسان کیا کچھ کرتا ہے۔ حرام' حلال' جائز' ناجائز ہر طریقہ استعمال کرتا ہے' لیکن اس کے پیٹ میں وہی کچھ جائے گا' جو اس کا نصیب ہو گا۔ پھر کاہے کو ہم تیرا میرا کرتے ہیں' روٹی' کپڑا اور مکان کے جھمیلے میں رازق کو بھولے رہتے ہیں' قبر اور کفن دوسروں کا دیکھتے ہیں' اپنا یاد نہیں آتا' کیوں؟"

اماں نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے' عمارہ بھی نم آنکھوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

☆

انیسہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں بلکہ انہوں نے تولیٹ کر ندرت پر دوسری نظر بھی ڈالنا گوارا نہیں کیا اور کمرے سے باہر نکلتی چلی گئیں۔

ندرت اپنی اتنی چاہنے والی پھوپھی سے ایسی بات سن کر چند لمحے تو بس ہکا بکا رہ گئی پھر جیسے اس نے خود کو سنبھالا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نیارے کو سامنے میز پر رکھ دیا اور خود بھی تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کا تمتمایا ہوا چہرہ اور ضبط گریہ سے سرخ ہوتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر سب ہی کچھ نا کچھ کہنا چاہ رہے تھے جب ہی تو اس کے نکلنے کے ساتھ ہی پہلے کمرے میں بھنبھناہٹ سی شروع ہوئی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں سب نے اپنے اپنے پاروں میں نشانیاں ڈھونڈ کر پارے ہاتھ سے رکھ دیے اور سیر حاصل تبصرے شروع ہو گئے۔

لوگوں کے اپنے اپنے انداز تھے' کسی کو ندرت سے دلی ہمدردی تھی تو کوئی انیسہ کو حق پر سمجھ رہا تھا۔ البتہ یہ بات دل ہی دل میں سب مان رہے تھے کہ بات نفسی ہی سہی اور کھری کھوٹی نہ ہو' بھلا یوں ندرت کے منہ پر برملا کہنے کی جرات اور کسی میں تو خیر تھی ہی نہیں۔

رضیہ مہدی

سیلی سیلی سیٹیاں

مڈل کلاس گھرانوں میں ندرت جیسے امیر کبیر رشتے داروں کی آؤ بھگت کوئی غیر معمولی بات تو ہے نہیں۔ اول تو وہ کسی کے گھر کبھی جاتی ہی نہیں تھی' کبھی بھولے بھٹکے کہیں ملاقات ہو جاتی تو لوگ پیٹھ پیچھے یہی کہتے تھے کہ بھرم دکھاتی ہے۔ مگر اس کے سامنے بچھ بچھ جاتے تھے۔ دور و نزدیک کے سب ہی رشتے دار اس سے تعلق پر فخر محسوس کرتے تھے اور ملنے والوں کو بڑے فخر سے بتاتے تھے کہ وہ ہماری رشتے دار ہے۔

وہ جو گ ندرت کو جانتے تھے' وہ خوب جانتے تھے کہ اس کے مزاج کوئی اب آکے شاہانہ نہیں ہوئے ہیں' اسے تو یہ سرخاب کے پر بچپن سے ہی لگے ہوئے تھے۔

مگر ٹھہرے ندرت کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس کی پیدائش سے بھی پہلے وقار اور دبا کے گھر میں جھانکنا ہو گا۔

وقار کو بیٹی کی آرزو اپنے پہلے بیٹے کی آمد سے بھی پہلے سے تھی۔

"پہلی تو بیٹی ہی ہونی چاہیے۔" وہ اتنے یقین سے کہتے کہ دیبا ہنس پڑتیں۔ ان کے دل میں پہلی دفعہ بیٹے کی خواہش تھی مگر انہوں نے میاں کی خواہش کے آگے سپر ڈال دی تھی اور یہی دعا کرتی تھیں کہ بیٹی ہو۔

دوسری اور تیسری دفعہ بھی بیٹے ہی دنیا میں آئے۔ صحت مند اور خوبصورت بیٹوں کو پا کر ماں کی خوشی کا تو ٹھکانہ ہی نہیں رہا مگر وقار ہر مرتبہ مایوس سے ہو جاتے۔ یوں دیبا کی خوشیاں بھی ماند پڑ جاتی تھیں۔

"پروردگار بیٹیاں انہیں دیتا ہے، جنہیں بہت چاہتا ہے۔" وہ سرد آہ بھر کر کہتے۔

"توبہ کریں وقار! بیٹے کیا وہ محبت کے بغیر ہی جھولیوں میں ڈالتا ہے۔ وہ تو سب سے محبت کرتا ہے، چاہے نعمت سے نوازے یا رحمت سے۔" انہیں میاں کی باتیں پریشان کرتی تھیں۔

چوتھی دفعہ دیبا کی حالت بہت خراب تھی، وہ دل میں ٹھان چکی تھیں کہ اب چاہے بیٹی ہو یا بیٹا بس اب ان ہی کی پرورش کرنی ہے۔ بھلا اس دور میں بچوں کی پرورش آسان ہے پھر اپنی صحت بھی گرتی جا رہی ہے۔ وہ وقار کو سمجھاتیں۔

"ہاں ٹھیک ہے، بس ایک بیٹی ہو جائے تو پھر بس۔" وہ ہمیشہ ہنس کر کہتے۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ بیٹوں کو چاہتے نہیں تھے مگر بیٹی کی خواہش جو اب حسرت بنتی جا رہی تھی، اتنی طاقتور تھی کہ وہ اس سے کنارہ کش نہیں ہو سکتے تھے۔

قدرت نے اس مرتبہ پھر انہیں بیٹے سے نوازا اور یہ پہلی مرتبہ تھی کہ وہ خاموش بیٹھے رہے۔ بیٹے کے کان میں اذان بھی خود دینے نہیں بڑھے۔ ہارے ہوئے انسان کی طرح خاموش۔ دیبا کو میاں کا مضمحل چہرہ افسردہ کر رہا تھا مگر انیسہ، بہن تھیں، چھوٹی اور لاڈلی بہن خوب ہی لڑیں۔

"حد کرتے ہیں بھائی جان آپ! اتنے پیارے سے بیٹے کو دیکھ کر بھی آپ خوش نہیں ہوئے۔ دیکھیں تو ذرا اسے، وہ گلابی گلابی سا گڈا واقعی بہت خوبصورت لگ رہا تھا، وہ ایک نظر ڈال کر رہ گئے۔

"مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے، ایسی جو میرا رب مجھ سے ناراض ہے۔" وہ افسردگی سے بولے۔

سب نے سمجھایا اور انیسہ لڑتی رہیں۔

"آپ ناشکرے ہیں، لوگ تو بیٹوں کی تمنا کرتے ہیں۔"

"وہ شاخ ہے نہ پھول اگر تتلیاں نہ ہوں
وہ گھر بھی کوئی گھر ہے جہاں بچیاں نہ ہوں"

انہوں نے بہن کو شعر کی صورت جواب دیا۔

"آپ مانیں یا نہ مانیں مگر آپ بھائی جان! اتنے اچھے ہیں کہ خدا کی خاص عنایت ہے آپ پر۔ ماشاء اللہ سب بیٹے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔" وہ محبت سے بھائی کو سمجھا رہی تھیں۔

"نہیں میری پیاری بہن! کوئی خطا مجھ سے ضرور ہوئی ہے۔ بیٹی تو وہ ہے کہ خدا نے اپنے محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیٹی سے نوازا۔ یہ دولت ہر ایک کے لیے نہیں۔"

بہن ان کی اس دلیل پر ان کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

چاروں بیٹے نہ صرف شکل و صورت میں اچھے تھے بلکہ جوں جوں بڑے ہو رہے تھے لوگ ان کے اخلاق و آداب کو بھی سراہنے لگے تھے۔ ماں کی تو خیر جان تھی ان میں، باپ بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے مگر جب ادھر ادھر عزیز رشتہ دار، دوست احباب کی کوئی چھوٹی سی بیٹی سامنے آجاتی تو وہ اپنے دل میں محبت سے کچلی ہوئی آرزو کو مزید دبانہ پاتے۔ چاہے وہ بچی ان کے پیارے پیارے بچوں کے سامنے ذرا نہ اچھی لگ رہی ہوتی مگر وہ اپنے بیٹے کو گود سے اتار دیتے اور فوراً بچی کو گود میں لے لیتے۔ جب تک سامنے رہتی، اس کے ماں باپ سے زیادہ اس کے ناز اٹھاتے۔

دیبا یہ وارفتگی دیکھتیں تو ان کے دل میں یہ احساس جاگ اٹھتا۔ کیا تھا جو ایک بیٹی انہیں بھی عطا ہو گئی ہوتی۔

بہنیں دوست سب ہی سمجھاتے، وہ بظاہر سمجھ بھی

جاتیں مگر پھر میاں کی آرزو جس کا اب وہ زبانی اظہار نہیں کرتے تھے مگر ان کی ایک ایک ادا گواہی دیتی تھی کہ وہ آرزو اب حسرت بن چکی ہے۔

چھوٹے بیٹے کی آمد کے بعد سے دیبا کو کچھ ایسی پیچیدگیاں ہو گئی تھیں کہ مسلسل تکلیف رہتی تھی۔ وہ اب اپنے رب کی منشاء پر راضی رہنا چاہتی تھیں۔

وہ وقار کی دلی کیفیت سے آگاہ تھیں مگر اکثر انہیں سمجھاتی تھیں۔ انیسہ نند کم اور دوست زیادہ تھیں۔ وہ بھی اپنے بھائی کی آرزو سے بخوبی واقف تھیں اور وقتاً فوقتاً ان سے لڑتی بھی رہتی تھیں۔

"میں کسی کو کچھ کہتا ہوں کیا؟" وہ ان کے لڑنے سے خود ہی الجھ جاتے تھے۔

"بھول کہیں کے، آپ اللہ نے بغیر مانگے ہی آپ کی جھولی مرادوں سے بھر رکھی ہے۔" وہ ہنس کر کہتیں۔

"ہاں تم نے دیکھ لیا، سب وقت کے ساتھ ادھر ادھر ہو جائیں گے۔ گھر کی رونق تو لڑکیوں کے ہی دم سے ہے۔"

"ان لوگوں سے پوچھیے جو آج کے دور میں بیٹیوں کی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہو پا رہے۔ ان کے تحفظ کا خیال، ان کا غیر یقینی مستقبل سب انہیں چین سے جینے نہیں دے رہا ہے۔"

"کچھ بھی ہو بیٹیاں بیٹیاں ہوتی ہیں، ماں باپ سے جتنی محبت بیٹی کرتی ہے، بیٹا سوچ ہی نہیں سکتا۔" ان کے پاس ڈھیروں مثالیں تھیں۔

"آپ تو ایسا نہ کہا کریں بھائی جان! آپ نے تو خود امی اور ابا کی اتنی خدمت کی ہے، مجھ سے کہیں زیادہ۔"

"لڑکیاں مرنے کے بعد بھی بھلاتی نہیں، دعاؤں کا تحفہ بھیجتی رہتی ہیں۔" وہ اپنی ضد پر قائم تھے۔

"یہ کیا بات کہی آپ نے۔" وہ ان کی اس نئی دلیل پر چونکیں۔

"تو اور کیا، بیٹے بھول بھال جاتے ہیں۔ بیٹیاں ماں باپ کے جانے کو اپنے دل پر لیتی ہیں۔"

"حد کرتے ہیں بھائی جان آپ بھی۔" وہ ہنس پڑتیں۔

اتفاق یہ تھا کہ خود ان کے بھی دو بیٹے تھے ورنہ وہ تو دل میں ٹھانے بیٹھی تھیں کہ بیٹی ہو گی تو بھائی جان کی گود میں ڈال دوں گی۔

پھر شاید قدرت کو رحم آگیا۔ دیبا کو خود بھی یقین نہیں آرہا تھا کیونکہ چھوٹا بیٹا اب سات سال کا ہو رہا تھا اور وہ مسلسل کسی نہ کسی مسئلے کا شکار رہتی تھیں مگر انہیں لگا یہ اور کچھ بھی نہیں ہے، وقار کی دعائیں ہیں ان کی آرزو ہی رنگ لانے والی ہے۔ اگرچہ انہوں نے میاں سے اظہار نہیں کیا مگر ان کے دل نے گواہی دے دی تھی کہ اس مرتبہ بیٹی ہو گی۔

کچھ وہ اس دفعہ کمزور بھی بہت تھیں پھر گھر اور بڑھتے ہوئے بچوں کی ذمہ داریاں گو وقار ان کا بیحد سے زیادہ خیال رکھ رہے تھے مگر وہ اپنی گرتی ہوئی صحت سے پریشان تھیں۔

ساری تیاری ہی انہوں نے بیٹی کی کی تھی اور جب بیٹی نے دنیا میں آنکھیں کھولیں تو جہاں دیبا کو لگا انہوں نے بہت بڑی فتح پائی، وہیں وقار کی خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ کتنا کچھ خرید لائے وہ کہ اسپتال کا کمرہ بھر گیا۔

انیسہ ان کی دیوانگی پر بھی ہنس رہی تھیں اور کبھی ٹوک رہی تھیں۔ "بس کریں بھائی جان آپ، ایسا لگ رہا ہے پورا جہیز ہی بنا ڈالیں گے آج آپ۔ توبہ توبہ اتنے کھلونے۔ کیا وہ کل سے کھیلنا شروع کر دے گی۔" وہ ہنسے گئیں۔

دیبا کو وقار کے چہرے پر کھیلتی مسکراہٹ سچی خوشی کی آئینہ دار لگ رہی تھی۔ وہ بار بار مالک کا شکر ادا کر رہی تھیں۔ خود وقار نے بار بار اپنے رب سے معافی مانگی۔

"مجھ عجلت پسند کو معاف کر دے مالک، بھلا تیری مصلحت کی کہاں سمجھ۔"

چاروں بھائیوں کو اپنی یہ چھوٹی سی بہن بہت اچھی لگ رہی تھی۔

دیبا بیٹی کی آمد کے بعد مسلسل بیمار رہنے لگی تھیں اور دن بہ دن کمزور سے کمزور تر ہوتی جارہی تھیں۔

وقار بہت احسن طریقے سے اپنے گھر کی ذمہ داریاں بھی سنبھال رہے تھے۔ وہ ہمیشہ سے بہت نرم طبع، بہت زیادہ خیال رکھنے والے، بڑی محبت سے رہنے والے تھے اب تو ان کی دلی خواہش بھی پوری ہو چکی تھی۔ وہ بیوی کی بیماری میں بیٹی سے اور بھی قریب ہوتے گئے۔ اس کے کسی بھی کام کو کرنے میں انہیں کبھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ گو وہ بیٹوں سے بھی بہت قریب تھے مگر دیبا جانتی تھیں کہ ان کی جان بیٹی میں ہے۔

بہت زیادہ توجہ اور محبت نے ندرت کو بچپن ہی سے ضدی اور حساس بنا دیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اس کی ہر بات منہ سے نکلے اور پوری ہو جائے۔

دیبا وقار کو سمجھاتی رہتی تھیں۔ "بیٹی ذات ہے، اس کی آپ ہر بات منہ سے نکلنے سے پہلے ہی مان لیتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں۔ بہت ضدی ہوتی جارہی ہے۔"

"نہیں بھئی، ابھی بہت چھوٹی ہے، تمہیں بلاوجہ ایسا لگتا ہے۔" وقار اپنا انداز بدلنے کو بالکل تیار نہیں تھے۔

کبھی کہتے۔ "مجھے اس کی ضدیں اس کی فرمائشیں ہی تو اچھی لگتی ہیں۔"

وہ کیا کہتیں، انہیں اچھی طرح سمجھتی تھیں کیونکہ جب وہ بیٹی دیتا ہے تو جہاں ماں کے دل میں اس کی محبت اتارتا ہے، وہیں اسے اتنی سمجھ داری بھی عطا کرتا ہے کہ جو بیٹی کی تربیت کے لیے ازحد ضروری ہے۔

دیبا، ندرت کے کردار کو بھی اس کی شکل و صورت کی طرح سنورا ہوا دیکھنا چاہتی تھیں۔

انیسہ بھی جب آتیں، بھائی کو یہی سمجھاتی رہتی تھیں۔

دیبا ایک تو اپنی صحت سے بھی عاجز تھیں، آئے دن کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا کہ وہ نڈھال سی پڑی رہتیں۔ اس پر وقار کی محبت کا حصار اپنی بیٹی کے گرد اتنا مضبوط تھا کہ ندرت اس سے نکل کر ماں کی بات سننے، سمجھنے پر تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ جوں جوں بڑی ہو رہی تھی، دیبا کو خوف سا آرہا تھا کہ وہ بیٹی کو ویسا اٹھتا ہوا نہیں دیکھ رہی تھیں جیسا کہ دیکھنا چاہتی تھیں۔

وقت بے وقت کی اس کی فرمائشیں ماں کو اور پرسکون کرتی تھیں، اس پر باپ ہر جا و بے جا بات ماننے کو مستعد نظر آتے تو دیبا ان سے خفا ہو جاتیں۔

"بھلا کوئی تک بھی ہو رات کے دو بجے آئس کریم کھانی ہے تمہیں اور وہ بھی صدر کی دکان سے لینی ہے کچھ جانتی ہو نارتھ ناظم آباد اور صدر کا فاصلہ۔" وہ بیٹی پر غصہ اتارتیں مگر بیٹی ان کے غصے کے جواب میں مسکراتی کہ اس کے پاپا تو گاڑی نکال رہے ہوتے۔

"وقار! یہ صحیح نہیں ہے۔" وہ جھنجلا جاتی تھیں۔

"ارے بیوی! اپنے بچوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشات اگر ہم پوری نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟"

"مگر وقار۔۔۔"

"اوں ہوں، کوئی اگر مگر نہیں۔ تم نہیں جانتیں، میں اس کو نہیں خود کو خوش کرتا ہوں۔"

دیبا یہ باتیں انیسہ سے ضرور شیئر کرتیں پھر دونوں مل کر وقار کو سمجھانے کی مہم پر ڈٹ جاتیں مگر وہاں پر بیٹی کی محبت کا راج بڑی مضبوطی سے قائم تھا۔ وہ دونوں کی ایک نہ سنتے۔

باپ کی حد درجہ محبت نے ندرت کو تھوڑا سا مغرور بنا دیا تھا۔ وہ دیکھتی تھی کہ پاپا بھائی جان، بھیا بھائی اور عدیل کو تو کبھی کبھار ڈانٹ بھی دیتے ہیں ان کی فرمائشوں کو ٹال بھی دیتے ہیں مگر اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کے لیے منع کرنا تو دور کی بات، وہ تو ذرا سی دیر ہو جانے پر بھی پریشان ہو جاتے تھے۔

ایک بات البتہ تھی کہ وہ پڑھائی میں اپنے بھائیوں کے مقابلے میں بہت اچھی تھی، ابھی تک ہر کلاس میں سب سے آگے رہتی تھی۔ اسٹادوں میں مقبول تھی اور وقار جب بھی اسکول آتے، ہر طرف سے ندرت کی تعریفیں سنتے تھے۔ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ دوسری تمام ایکٹیویٹیز میں بھی ہمیشہ ممتاز رہتی

تھی۔

وقار اپنی پیاری بیٹی پر فخر کرتے تھے اور اکثر بیٹوں سے تقابل کرتے انیسہ کو بتاتے رہتے تھے۔ "دیکھ لینا یہ ہمارا نام روشن کرے گی۔"

سب کچھ ٹھیک تھا، زندگی۔۔۔ خوشیوں بھری زندگی آرام سے گزر رہی تھی مگر دیبا کی صحت روز بروز کرتی جارہی تھی اور پھر وہ ہو گیا جس کے بارے میں وقار اور بچوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک دن دیبا یوں سوئیں کہ سوئی ہی رہ گئیں۔ صبح اپنے اتنے چاہنے والے شوہر اور پیارے بچوں کی پکار بھی انہیں نہ جگا سکی۔

وقار کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی، ان کی اتنی محبت کرنے والی ایسی صابر سی بیوی یوں چپ چاپ چلی گئی کہ ان کے گھر ہی میں نہیں، دل میں بھی سناٹے اتر آئے۔

گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا اور مکمل ذمہ داری سے گھر سنبھالنا اور بات، وہ دن بہ دن دونوں محاذ پر لڑتے لڑتے کمزور ہوتے جارہے تھے پھر بھی بساط بھر کوشش تھی کہ بچے خوش رہیں، انہیں کوئی مشکل نہ ہو۔ چاروں بچے اپنی اپنی پڑھائیوں میں مصروف رہتے تھے مگر باپ کو بہت زیادہ الجھا ہوا اور پریشان دیکھ کر اپنی خدمات پیش۔۔۔ کر دیتے تھے۔

"پاپا لائیے، یہ ہم کر دیں۔"

مگر ندرت کو کچن اور گھر سے بالکل سروکار نہیں تھا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہتی تھی۔ وقار خود بھی کبھی کسی کام کے لیے آواز نہیں دیتے تھے اور وہ بھی کبھی احساس نہیں کرپاتی تھی کہ اس کے پاپا گھر اور باہر دونوں کی ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے کتنے کمزور ہوتے جارہے ہیں۔ وہ تو اپنے اسکول پھر کالج اور ساتھ ساتھ غیر نصابی دلچسپیوں میں گم رہتی تھی۔

انیسہ جب بھی آتیں، ندرت کو ضرور سمجھاتیں۔

"پاپا کا خیال رکھا کرو بیٹا!"

"رکھتی تو ہوں۔" وہ جھنجلتی۔

"خاک خیال رکھتی ہو، بھیا دن بہ دن کمزور اور بوڑھے ہوتے جارہے ہیں۔"

"ارے تو کیا وہ میری وجہ سے بوڑھے ہو رہے ہیں۔" وہ ہنس پڑتی۔

وہ اپنی ذات میں مگن تھی اور کمرے تک ہی محدود رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رشتے میں قربت کے باوجود تعلق میں ضرور فرق آرہا تھا اور وہ بھائیوں سے بھائی بہن کی عمومی محبت کے خوبصورت احساس سے بہت دور تھی۔

کبھی کبھی انیسہ بھائی سے کہہ بھی دیتی تھیں۔

"آپ تو کہتے تھے بیٹی گھر کی رونق ہوتی ہے اور یہاں تو۔۔۔ میرا تو جی گھبراتا ہے اب یہاں آتے ہوئے۔ بس آپ کی وجہ سے آتی ہوں۔"

"ابھی چھوٹی ہے، سمجھ جائے گی آہستہ آہستہ۔" وہ بیٹی کی طرف داری میں بات کو ٹال جاتے۔

نبیل، عدیل، عقیل اور سجیل ہوتے تو پھوپھی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔

"ارے پیاری پھوپھی جان! ہم ہیں نا۔"

وہ اپنے بھتیجوں سے خوش تھیں اور بھتیجی سے نالاں۔

بیٹے بڑے ہو رہے تھے اور اپنی اپنی تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھ رہے تھے۔ وقار نے بڑے مان چاؤ سے ان کی شادیاں کیں۔ بہوئیں گھر میں آئیں تو ایک مرتبہ پھر گھر کی رونق لوٹ آئی۔ ندرت نے شادیوں میں شرکت کی تو مگر وہ مان چاؤ، وہ لاڈ و پیار کے مظاہرے جو عموماً بہنوں کی طرف سے بھائیوں کی شادی پر ہوتے ہیں، وہ کسی کو نظر نہیں آئے۔ وہ ہمیشہ مصروفیت میں سے بس اتنا وقت نکال پاتی کہ تقریب میں شریک ہو جائے۔ ساری تیاری انیسہ نے کی۔ البتہ لڑکوں نے ہر دفعہ انہیں اپنی ڈھیروں خدمات پیش کیں اور انہیں کے تعاون سے سب کام ہو سکے۔ انیسہ دیکھ رہی تھیں کہ بہت دنوں بعد بھائی کے چہرے پر سچی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور ان کے تھکے تھکے سے وجود میں خوشیوں نے جیسے جان سی ڈال دی تھی۔

ندرت نے اپنے اور بھابھیوں کے درمیان بھی

ایک فاصلہ ہی رکھا۔ اس کے اندر دن بہ دن اپنے خاص ہونے کا احساس قوی ہوتا جارہا تھا۔ وہ الگ ہے' سب سے الگ' سب سے منفرد' آئینہ اسے یہی سبق مسلسل پڑھاتا رہتا تھا۔

ندرت نے Lums سے ڈگری لی اور فوراً ہی اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب بھی مل گئی۔ وقار چاہتے تھے اب ندرت کی شادی کردیں۔

"ابھی نہیں پاپا! ابھی مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے۔"

اور وقار نے ہمیشہ کی طرح سپر ڈال دی۔ "ٹھیک ہے بیٹا' جیسا تم چاہو۔"

"بھائی جان! آپ حد کرتے ہیں۔" انیسہ نے سنا تو ناراض ہونے لگیں۔ "آپ اسے کچھ کہتے کیوں نہیں' بلاوجہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو۔" پھر ہر اچھے رشتے پر ان پر دباؤ ڈالتیں مگر وہ بیٹی کی خوشی میں خوش تھے۔ عدیل اور سجیل بھی ناراض ہوتے تھے۔

پھر ندرت کو اپنے ایک آفس کولیگ جواد کی صورت میں اپنا مسٹر رائٹ آخر مل ہی گیا تو اس نے پاپا سے کہہ دیا۔

"آپ انہیں فوراً" ہاں کردیں' میں اپنی فرم کی طرف سے اسٹیٹ جارہی ہوں۔" وقار کو جواد کچھ اکھڑ اور مغرور سا لگا۔

عدیل' عقیل اور سجیل کو بھی وہ اچھا نہیں لگا۔

"وہ پاپا کے سامنے یوں ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ کیا بتائیں پھپھو!" سب ہی کچھ نہ کچھ بتانا چاہ رہے تھے۔

"ادب' تہذیب تو شاید اسے چھو کر بھی نہیں گزری ہے۔" یہ بھی بجھی بجھی سی آواز نبیل کی تھی۔ اس کی سب سے زیادہ بنتی تھی بہن سے مگر آج وہ بھی اس کے فیصلے کی تائید نہیں کررہا تھا۔

"ہائے ہائے کتنے اچھے اچھے رشتے ٹھکرائے ہیں ندرت نے۔" عدیل کی بیوی عافیہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

بہرحال شادی ہونا تھی ہو کر رہی۔ وقار نے چاروں بیٹوں سے بڑی دھوم دھام سے ندرت کو رخصت کیا۔ بھائیوں نے بھی دل کھول کر حصہ لیا۔ یوں ندرت کی شادی تمام خاندان میں مثال سی بن گئی۔ اتنا اچھا انتظام' ایسا اعلا جہیز' اتنی خوبصورت چیزیں جیسے کسی شہزادی کی شادی ہو۔ کہیں کوئی کمی نہیں' سب تعریف کررہے تھے۔ خود ندرت اس دن اتنی شاندار لگ رہی تھی کہ سب نظر نہیں ہٹا پارہے تھے' دولہا بھی اس کی مناسبت کا ہی تھا۔ وہی خوبصورت خدوخال' وہی روپ اور وہی اکڑی گردن' کسی نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

ندرت شادی کے بعد بہت جلد حسب خواہش معہ اپنے میاں کے امریکہ سدھاری اور بھول ہی گئی کہ پاپا اس کے دیکھے بنا۔ کھانا کھاتے ہیں نہ آرام کرتے ہیں۔ سب گھر میں تھے اور بہت خیال بھی رکھ رہے تھے مگر ایک اس کے جانے سے وقار بے کل سے تھے' انہیں کسی پل چین نہیں تھا۔ کھانا پینا ہی نہیں' نیند بھی ان سے روٹھ گئی تھی۔

بہوئیں اور بیٹے اپنی بھرپور توجہ ان پر مرکوز کیے ہوئے تھے اور انہیں ہر طرح کا آرام دینے کی کوشش کررہے تھے مگر وقار اپنے دل سے مجبور تھے' دل تو ہر طرف بیٹی کا راج تھا۔ راج دلاری' منتوں مرادوں سے مانگی ہوئی پیاری بیٹی' نظروں سے اوجھل کیا ہوئی کہ انہیں لگا ان میں جان ہی نہیں رہی۔ وہ چاہتے تھے روز فون پر ہی اس کی آواز سن لیں مگر اکثر وہ مصروف ہوتی۔ اس کا سیل یا تو بزی ہوتا یا بند۔ جب بات ہوتی تو وہ نثار ہوتے رہتے۔

"بیٹی! تمہاری آواز سننے کو بھی جی ترستا ہے۔"

"پاپا! یہاں کی زندگی وہاں جیسی نہیں' یہاں کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔"

"میرے لیے بھی نہیں۔" وہ دل میں سوچ کر رہ جاتے۔

وہ اپنے احساس کو کسی سے شیئر نہیں کرتے تھے مگر ان کی افسردگی کسی سے چھپی نہیں رہ پاتی تھی۔

ان کی نرم خوئی' سادہ دلی اور حد درجہ خیال رکھنے کی عادت نے بہوؤں کو ان سے بہت قریب کردیا تھا۔ وہ کبھی کبھی آپس میں تائید کرتی تھیں کہ ندرت ایسی

کیوں ہے' وہ بھی پاپا کے ساتھ بھلا کوئی پاپا جیسے شخص کو بھی نظرانداز کرسکتا ہے وہ جو ہمیں اتنا مان دیتے ہیں۔ انہوں نے ندرت کو تو پتا نہیں کتنا چاہا ہوگا۔ ابھی تبھی اس کے ذکر پر ان کی آنکھیں کیسے روشن روشن سی ہوجاتی ہیں۔"

وقار سمجھتے جارہے تھے' بیٹوں اور بہوؤں کے خیال رکھنے کے باوجود بظاہر ایسا کوئی مرض بھی نہیں تھا مگر وہ اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ گھنٹوں خلا میں جیسے کچھ ڈھونڈتے رہتے۔ کھانے سے دلچسپی ہی نہیں رہی تھی' نتیجہ یہ تھا کہ دن بہ دن کمزور ہوتے جارہے تھے۔

انیسہ جب بھی آتیں' بھائی کی حالت پر کڑھتی رہتیں پھر سمجھانے بیٹھ جاتیں۔

"آپ اپنا خیال نہیں رکھ رہے بالکل۔ دیکھیں تو آپ کا گلشن کیسا باغ و بہار ہورہا ہے۔ اتنے لائق اتنے تابعدار بیٹے' ایسی پیاری پیاری بیٹیاں بہوؤں کے روپ میں۔ ننھے ننھے چاند ستارے پوتے پوتیاں پھر آپ مجھے خوش خوش کیوں نظر نہیں آتے؟"

"حد کرتی ہو تم بھی انیسہ! میں اپنی جنت میں خوش ہوں مگر اب بچوں کی طرح کھلکھلانے کے دن تھوڑی ہیں میرے۔ اب گرتی ہوئی عمر ہے اور یہ تو سب ہونا ہی ہے۔" وہ اپنی افسردگی چھپا کر بولتے۔

وہ لاکھ خاموش رہتے مگر انیسہ بہن تھیں اور بھائی کے دل کے تمام رازوں سے واقف بہنیں اور بیٹی سے ان کی حد درجہ محبت تو کوئی ایسا چھپا راز بھی نہیں تھی۔ گھر کا ہر بچہ جانتا تھا کہ پاپا کی جان کس میں ہے۔ بس انجان تھی تو خود ندرت۔ کبھی بھولے بھٹکے فون آجاتا تو بہت وقت نہیں ہوتا تھا اس کے پاس۔

بالآخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا' اندر کے روگ نے مہلک مرض کی صورت اختیار کرلی اور پتا چلا کینسر ہے' وہ بھی آخری اسٹیج پر۔ سب پریشان ہوگئے۔ ندرت کو بھی فوراً" اطلاع دی گئی۔

پھر سب نے دیکھا کہ اسپتال میں داخل ہونے کے باوجود اور مرض کی شدت سے لڑتے لڑتے نڈھال ہونے کے باوجود جوں ہی ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہوتا وہ تیار ہو کر بیٹھ جاتے۔ سب ہی ملنے آتے تھے مگر ان کی نظریں جسے کھوج رہی ہوتی تھیں' اس سے کوئی واقف نہیں تھا۔ بھائی بار بار فون کررہے تھے' وہ بھی وہاں سے فون کرتی تھی اور پاپا کی خیریت معلوم کرلیتی تھی مگر ایک ضروری انٹرنیشنل کانفرنس ہورہی تھی جہاں اس کی شرکت ضروری تھی۔

انیسہ نے سنا تو سلگ سی گئیں۔ "باپ سے بھی زیادہ کوئی اہم ہے دنیا میں اور باپ بھی ایسا۔" وہ رونے لگیں۔

پھر وقار سب کو روتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔ جاتے ہوئے بھی ادھ کھلی آنکھوں میں کسی کا انتظار صاف نظر آرہا تھا اور ندرت سوئم میں پہنچی۔ تب ہی انیسہ اس کے پاس آئیں تو ندرت بھی وہ بھی سب کی طرح گلے مل کر اداس پرسہ دیں گی مگر انہوں نے تو بس اتنا کہا اور اس کے پاس سے گزر گئیں۔

"ندرت! تمہارا وقت بہت قیمتی ہے' تم نے زحمت کیوں کی۔ یہاں اب ایسا کوئی نہیں جو تمہارا منتظر ہو' وہ چلا گیا۔" ان کی آواز کپکپانے لگی۔ "وہ چلا گیا جو تمہیں دیکھ کر جیتا تھا اور تمہارا انتظار کرتے کرتے مر گیا۔ کاش کوئی بیٹی کبھی تمنا نہ کرے۔"

سب کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے' انیسہ کے جانے کے بعد ندرت بھی وہاں سے جاچکی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ جہاں بہت سی بیٹیاں ایسی ہیں جو واقعی ماں باپ پر سے جان نچھاور کرنے کو تیار ہیں وہاں کچھ ندرت جیسی بیٹیاں ہوتی ہیں جو یوں ہی خالی ہاتھ اور خالی دامن رہ جاتی ہیں۔

دل ٹھہرنے دے تو آنکھیں بھی جھپکتے جاویں
ہم کہ تصویر بنے بس تجھے تکتے جاویں

تیری بستی میں ترا نام پتہ کیا پوچھا
لوگ حیران و پریشاں ہمیں تکتے جاویں

کیا کرے چارہ کوئی جب ترے اندوہ نصیب
منہ سے کچھ بھی نہ کہیں اور سسکتے جاویں

کوئی نشے سے کوئی تشنہ لبی سے ساقی
تری محفل میں سبھی لوگ بہکتے جاویں

مژدۂ وصل سے کچھ ہم ہی زخود رفتہ نہیں
اس کی آنکھوں میں بھی جگنو سے چمکتے جاویں

کبھی اس یارِ سمن بر کے سخن بھی سنیو
ایسا لگتا ہے کہ غنچے سے چٹکتے جاویں

ہم نوا سنجِ محبت ہیں ہر اک رُت میں فراز
وہ قفس ہو کہ گلستاں ہو، چہکتے جاویں

احمد فراز

اُس نے ہر ایک درد مجھے دان کر دیا
یوں زندگی کا راستہ آسان کر دیا

اک خواب مر گیا تو کسی اور خواب نے
کچھ دیر اور جینے کا سامان کر دیا

جانا نہیں تھا اُس کو مگر ذکر چھیڑ کر
بیٹھے بٹھائے مجھ کو پریشان کر دیا

سورج لہو میں اس لیے نہلا دیا گیا
آتے ہی اُس نے صبح کا اعلان کر دیا

رہتا ہے سنگ و خشت میں کس تمکنت کے ساتھ
اُس آئینہ صفت نے تو حیران کر دیا

میرے لیے تو یہ بھی فضیلت کی بات ہے
اُس نفع ساز نے مرا نقصان کر دیا

طالب انصاری

روز کب تیری دید ہوتی ہے
ایک ہی دن تو عید ہوتی ہے

کوئی بدلی امڈ ہی پڑتی ہے
جب بھی گرمی شدید ہوتی ہے

اصل کی نقل بھی نہیں بچتی
اتنی قطع و برید ہوتی ہے

ہائے قاصد کی دل شکن صورت
جیسے خط کی رسید ہوتی ہے

زندگی جب بھی مسکرا کے ملے
اس کی سج دھج جدید ہوتی ہے

ہائے وہ ہاتھ جن سے پی کے عدم
تشنگی کچھ مزید ہوتی ہے

عبدالحمید عدم

شہکارِ ازل

ہائے اک آفتِ جاں کی وہ غزالی آنکھیں
جیسے کھلتا ہو کنول
دل جسے دیکھتے ہی
خود بخود جاتا ہے مچل
دو کٹوروں میں چھلکتا ہوا
رنگیں بادل
گویا چھم چھم کا عمل
لہریں لیتا ہوا پلکوں پہ وہ گہرا کاجل
نین نقشے میں حسیں تاج محل
ایک شاعر کی غزل
یعنی شہکارِ ازل!

ناصر زیدی

PAKISTANIPOINT .COM WWW.

سائرہ غلام نبی

ایسی ماں کے مسلسل

سوا سیر،

جج: "تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟"
مجرم: "آپ کی بیٹی سے شادی، ایک موبائل نوکیا این سیونٹی تھری، پانچ کروڑ روپے، امریکہ کا ویزا، دو سال کا ہنی مون، چھ سات بچے، جو آپ کو نانا کہیں اور مجھے پاپا اور میں ان کی شادی کروا دوں، اس کے بعد آپ جو فیصلہ کریں وہ مجھے منظور ہوگا۔"
جج: "ہاہاہا۔ میری کوئی بیٹی ہی نہیں ہے۔ ٹانگ دوا سے۔"

ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

تصدیق،

پولیس نے ڈاکوؤں سے مقابلے کے بعد جنگل کا محاصرہ ختم کیا تو ڈی ایس پی نے انسپکٹر سے پوچھا۔
"ہماری لفری پوری ہے نا؟"
انسپکٹر نے اثبات میں جواب دیا تو ڈی ایس پی پھر ذرا تشویش سے بولے۔
"تم نے اچھی طرح گنتی کر لی ہے نا؟"
"جی ہاں۔ میں نے خوب اچھی طرح گنتی کر لی ہے۔" انسپکٹر نے وثوق سے کہا۔
"شکر ہے۔" ڈی ایس پی صاحب نے اطمینان کی سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں نے جس بھاگتے سائے کو گولیاں ماری تھیں وہ ڈاکو ہی تھا۔"

لائبہ، ایمن۔ مظفر آباد آزاد کشمیر

انجام،

ایک صاحب نے اپنے دوست سے پوچھا۔
"شبانہ کے ساتھ آپ کی محبت کا اِن دِنوں کیا عالم ہے؟"
دوست نے بتایا۔ "محبت کا وہ معاملہ تو کوئی چھ ماہ ہوئے ختم ہو چکا ہے۔"!
ان صاحب نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا۔
"پھر تو تم اس کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہ ہو گے۔"
"صورت تو روز دیکھنی پڑتی ہے۔" دوست نے جواب دیا۔ "میری اس سے شادی جو ہو گئی ہے۔"

اقصیٰ، عذرا ناصر۔ کراچی

مصروفیت،

گھر میں سیٹھ صاحب نے اپنے ایک نوکر کو آواز دی۔
"رشید! تم کہاں ہو؟"
"صاحب جی! میں یہاں لاؤنج میں ہوں۔" رشید کی آواز آئی۔
"کیا کر رہے ہو؟" سیٹھ صاحب نے پوچھا۔
"کچھ نہیں صاحب جی!" رشید نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
تب سیٹھ صاحب نے دوسرے نوکر کو آواز دی۔
"نذیر! تم کہاں ہو؟"
"صاحب جی! میں لاؤنج میں ہوں۔" نذیر کی آواز آئی۔
"تم کیا کر رہے ہو؟" سیٹھ صاحب نے غصے سے پوچھا۔
"میں رشید کا ہاتھ بٹا رہا ہوں صاحب جی!" نذیر نے منمناتے ہوئے جواب دیا۔

بینش، کرن۔ گوجرہ

بلاعنوان،

ایک شخص مر گیا۔ مرنے کے بعد وہ جہنم میں گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک برطانوی جہنم ہے جہاں لوگوں کو آگ،

بجلی کے جھٹکوں اور اسٹیل کے ناخنوں سے اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ چینی، جرمن اور امریکی جہنموں کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ تب اس نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق پاکستانی جہنم میں جانا چاہتے ہیں۔ اس نے فرشتے سے اس کی وجہ پوچھی۔ فرشتے نے جواب دیا۔
"کیس نہیں ہے اس لیے روسٹ نہیں ہو سکتا۔ بجلی نہیں ہے اس لیے۔ بجلی کے جھٹکے نہیں دیے جا سکتے۔ اسٹیل کے ناخن چوری ہو گئے اور کوڑے مارنے والے گورنمنٹ کے ملازم ہیں۔ وہ حاضری لگا کر چلے جاتے ہیں۔"

عائشہ۔ کراچی

بچت،

اسکاٹ لینڈ کے باشندوں کی کنجوسی ضرب المثل ہے۔ ایک کاشت کار گیہوں فروخت کرنے شہر گیا۔ گیہوں فروخت کرنے کے بعد وہ پوسٹ آفس پہنچا تاکہ بیوی کو ٹیلی گرام بھیجے۔ اس نے ٹیلی گرام کی عبارت لکھی۔
"گیہوں خاصے منافع پر فروخت کر دی ہے۔ کل آ رہا ہوں، تمہارے لیے تحفہ لے کر۔"
مگر یہ عبارت پوسٹ آفس والے شخص کو دیتے ہوئے اسے کچھ خیال آیا اور وہ خود سے مخاطب ہوا۔
"منافع کے بارے میں لکھنے کی کیا ضرورت ہے، وہ خود جانتی ہے کہ میں نقصان میں تو بیچوں گا نہیں۔" لہٰذا اس نے یہ الفاظ کاٹ دیے۔ اس نے دوبارہ ٹیلی گرام پڑھا۔ "گیہوں فروخت کر دیا۔" یہ لکھنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں اسی کام کے لیے شہر آیا ہوں۔ اس جملے کو بھی قطع کرنے کے بعد اس نے پھر کچھ سوچا اور خود سے بولا۔
"تمہارے لیے تحفہ لے کر۔" کیوں...؟ یہ کوئی ہتھوڑا یا سا لگرو کا موقع تو نہیں ہے۔ اسے بھی کاٹ دیا جائے۔
اس کے بعد اس نے ٹیلی گرام کے پیسے جیب میں ڈالے اور خوشی خوشی پوسٹ آفس سے باہر آ گیا۔

سعدیہ، مریم۔ اورنگی ٹاؤن

موقع،

ایک شخص نے ابراہم لنکن سے کہا۔
"اگر مجھے موقع دیا جائے تو میں ملک کی خاطر مرنے میں بے حد خوشی محسوس کروں گا۔"
لنکن نے اسے کرنل فیلڈ ٹنگ کے نام ایک سفارشی خط دیا۔ جس میں لکھا تھا۔
"حامل ہذا مجاذ پر جانے اور اپنے ملک کی خاطر مرنے کی تمنا رکھتا ہے۔ کیا آپ اسے موقع دے سکتے ہیں؟"

عابدہ نثار۔ کراچی

گھر کی مرغی،

کل بازار میں تم جس حسین اور اسمارٹ لڑکی کے ساتھ گھوم رہے تھے، وہ کون تھی؟" ایک شخص نے اپنے آفس کے ساتھی سے پوچھا۔
"اگر تم وعدہ کرو کہ یہی الفاظ تم میری بیوی کے سامنے نہیں دُہراؤ گے تو بتا دیتا ہوں۔" ساتھی نے کہا۔ "ٹھیک ہے وعدہ رہا۔" اس شخص نے کہا۔
"وہ میری بیوی ہی تھی۔" آفس کے ساتھی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

صبا حنیف۔ ایبٹ آباد

فیشن،

دادی اماں نے فیشن کے شوق میں بال کٹوا دیے۔ انہوں نے بالوں کو سنوارتے ہوئے جھٹکا دیا اور اپنی پوتی سے پوچھا۔
"کیا اب میں تمہاری بوڑھی دادی اماں لگتی ہوں؟"
"ہرگز نہیں۔ اب تو آپ دادا ابا لگتی ہیں۔" پوتی نے جواب دیا۔

نادیہ اسلم بگڑ۔ ٹھٹھہ پور

صاحب علم،

ایک صاحب فلم کی کہانی لے کر ڈائریکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈائریکٹر نے مسودہ دیکھتے ہی واپس کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں جناب! یہ کہانی بلیک میں بالکل نہیں چل سکتی۔"
"مگر آپ نے تو اسے دیکھا ہی نہیں پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ نہیں چل سکتی۔" نئے مصنف نے حیرت سے کہا۔

"آپ نے اس کا عنوان رکھا ہے "دیدۂ بینا" یہ عنوان ہی چلنے والا نہیں۔"

ڈائریکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا "اب مجھے اور آپ کو تو پتا ہے کہ اس کا مطلب ہے "بینائی آنکھ" مگر جاہل پبلک کو کیا پتا۔"

شبنم شمشاد۔ یزمان

حدود،

شام کے جھٹکے اندھیرے میں انسپکٹر خیر دین نے کانسٹیبل اللہ دتہ کو ایک سڑک پر موبائل سے اتارا اور اشارے سے بتایا۔

"تمہاری ڈیوٹی اس بلڈنگ سے اس سگنل تک ہے۔"

اس نے کافی دور دھندلاہٹ میں جھلملاتی ہوئی ایک لال بتی کی طرف اشارہ کیا۔ "صبح تھانے میں آکر رپورٹ کرنا۔"

لیکن کانسٹیبل اللہ دتہ صبح تو کیا ایک ہفتہ تھانے نہیں پہنچا۔ لیکن اس وقت جب دسویں دن اسے گمشدہ قرار دینے پر غور کیا جا رہا تھا، وہ آن پہنچا۔ اس کی وردی پھٹ چکی تھی۔ جوتے ٹوٹ گئے تھے۔ سر سے پاؤں تک وہ خاک میں اٹا ہوا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے پر وحشت طاری تھی۔

سیلوٹ مار کر رپورٹ دیتے ہوئے اس نے بتایا۔

"سر! وہ جو لال بتی آپ نے مجھے دکھائی تھی وہ ٹرک کی بتی تھی اور ٹرک پشاور جا رہا تھا۔"

تحریم، عائشہ۔ کراچی

پیشہ ورانہ اخلاق،

ہندو پریس میں ایک خبر چھپی کہ کل شام جب مہاتما گاندھی برلا مندر میں پرارتھنا کر رہے تھے تو وہاں ایک بڑا سانپ نکل آیا تھا۔ اس بات کو مہاتما جی کی عقیدت مندانہ کرامت اور روحانی فضیلت کے طور پر خوب اچھالا گیا۔ یہاں تک کہ ایک پریس کانفرنس میں ایک ہندو صحافی نے قائداعظم کو بھی گھیرا۔

"سر! مہاتما جی کی پرارتھنا میں ایک سانپ کے عقیدت مندانہ آنے کی خبر آپ نے پڑھی ہوگی؟"

قائداعظم نے جواب دیا۔ "جی ہاں پڑھی ہے۔"

"تو آپ کا کیا خیال ہے، ایسا ہو سکتا ہے کہ سانپ آئے اور مہاتما جی سے کچھ تعرض نہ کرے۔"

"جی ہاں، یہ بھی ممکن ہے۔" قائداعظم نے اطمینان سے جواب دیا۔

صحافی نے حیرت سے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یعنی کیسے؟"

"پیشہ ورانہ اخلاق کی بات ہے۔" یہ کہہ کر قائداعظم آگے بڑھ گئے۔

فرحت غلام نبی۔ فیصل آباد

قدر،

ایک نئی نویلی دلہن نے اپنی دوست سے کہا۔

"واقعی لوگ درست کہتے ہیں۔ شادی کے بعد عورت کی قدر نہیں رہتی۔ اب یہی دیکھ لو جب سے شادی ہوئی ہے، اسلم نے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔"

سہیلی نے تشویش سے پوچھا۔ "پھر تو تمہیں اسلم سے طلاق لینے کے متعلق سوچنا چاہیے۔"

دلہن نے جواب دیا۔ "لیکن میں اسلم سے طلاق کیسے لے سکتی ہوں۔ کیونکہ میری شادی اس سے ہوئی ہی نہیں۔"

ناہید عارف۔ کراچی

رونے دو،

بچہ کافی دیر سے رو رہا تھا۔ شوہر نے بیوی سے کہا۔

"تم اسے لوری دے کر سلا کیوں نہیں دیتیں؟"

بیوی بولی۔ "لوری دے کر سلانے لگی تھی تو پڑوس سے آواز آئی بہتر ہے کہ بچے کو ہی رونے دو۔"

نادیہ غلام نبی۔ گجرات

شگفتہ جاہ

ماؤں سے حسین شہزادے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے روایت ہے کہ ایک مسلمان نے خواب میں دیکھا کہ اہل کتاب کے ایک آدمی (کسی یہودی یا عیسائی) سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا۔

"تم (مسلمان) اچھے لوگ ہو، اگر شرک نہ کرو، جو اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہیں۔"

اس آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خواب سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قسم ہے اللہ کی! میں بھی تمہاری یہ بات محسوس کر رہا تھا۔ تم یوں کہا کرو۔ جو اللہ چاہے، پھر جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں۔"

(ابن ماجہ)

فوائد و مسائل:۔

1۔ "جو اللہ تعالیٰ پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ چاہے گا صرف وہی ہوگا۔ دوسرے شخص کی مشیت اللہ کے تابع ہے۔ بیک وقت دونوں (خالق و مخلوق) کی مشیت کو ایک قرار دینا واقعی شرک ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاح کے بعد شرک کا شائبہ ختم ہو گیا۔ اسی لیے یہ روایت بعض کے نزدیک حسن اور بعض کے نزدیک صحیح ہے۔

2۔ ایسے الفاظ سے اجتناب کرنا چاہیے جن کا ناٹا مناسب مفہوم بن سکتا ہے۔

3۔ شرعی مسائل خواب سے ثابت نہیں ہوتے لیکن اگر خواب میں کوئی ایسا اشارہ ملے جو قرآن و حدیث کے تعلیمات کے منافی نہ ہو تو اس پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

4۔ صحابہ اکرامؓ اپنے خواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سناتے تھے تاکہ اس کی تعبیر مل جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ خواب کی یہ بات ماننے کے قابل ہے یا نہیں۔

مہمان نوازی،

ایک دن امیر المومنین حضرت علیؓ رونے لگے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ آپؓ نے فرمایا۔

"اس لیے رو رہا ہوں کہ سات دن سے کوئی مہمان میرے گھر نہیں آیا ہے۔"

دنیا،

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔

"جب دنیا تمہارے پاس آئے تو خرچ کرو کیونکہ وہ تم کو ہی پہنچے گی اور جب وہ تم سے منہ موڑے تب بھی خرچ کرو کہ آخر کار وہ رہنے والی نہیں ہے۔"

اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی علامت،

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کی سورۂ سبا میں قوم سبا کا ذکر کیا ہے، جو حضرت عیسیٰؑ سے تقریباً ایک ہزار برس بعد بیشتر ہوئی ہے اور جس نے انجینئرنگ کے میدان میں بہت زیادہ ترقی کر رکھی تھی۔ وہ قوم بند بنانے اور ڈیم بنانے میں اتنی مہارت رکھتی تھی کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی اس میدان میں اتنی ترقی نہیں ہو سکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو ہر قسم کی نعمت فراوانی سے عطا کر رکھی تھی۔ سرسبز و شاداب علاقے، لہلہاتی فصلیں، اعلا درجے کے پھل اور پھول، عمدہ قسم کے گھنے باغات، موسم نہایت خوشگوار، آب و ہوا حد درجہ صحت افزا، نہریں اور دریا بہ کثرت، مزروعہ، کھیڑے مکوڑوں سے صاف

ستھرا علاقہ اور پاکیزہ آبادی، غرض ہر طرح سے وہ قوم شاداں و فرحاں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے صرف ایک مطالبہ کیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بن کر رہنا۔ اس کی ناشکری کسی طرح بھی نہ کرنا۔ انبیائے کرام علیہ السلام ان کو اس چیز کی تلقین کرنے کے لیے آتے رہے۔ کچھ عرصہ تک تو اس قوم نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدے کو نبھایا لیکن آہستہ آہستہ وہ ناشکری اختیار کرتی گئی اور انبیائے کرام علیہ السلام کی تبلیغ و تلقین کو نظر انداز کرنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس دریا کو جس سے ان کے علاقے میں سرسبزی و شادابی پائی جاتی تھی، ان کے لیے تباہی کا ذریعہ بنا دیا۔ اور ایک زبردست سیلاب بیل عرم بھیج کر ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ سورۂ توبہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

"ہم ہر سال ایک دو مرتبہ انہیں تنبیہ کرتے رہتے ہیں کہ شاید یہ سنبھل جائیں اور سیدھے راستے پر آجائیں لیکن یہ لوگ عجیب ہیں کہ ذرا بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے اور توبہ نہیں کرتے، اسی پچھلی روش پر قائم ہیں۔"

صدقہ کی فضیلت،

شہر ثمر قند میں ایک شخص بیمار ہوا تو اس نے نذر مانی کہ اللہ تعالیٰ اس کو شفا عطا فرمادے تو جمعہ کے دن کی کمائی ماں باپ کے لیے صدقہ کیا کرے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو شفا عطا فرمادی تو ایک مدت تک اپنی نذر کو پوری کرتا رہا لیکن ایک جمعہ کو اسے کوئی چیز صدقہ کرنے کے لیے میسر نہ آئی۔ آخر اسی پریشانی کی حالت میں کسی عالم سے دریافت کیا تو اس نے بتایا۔

"تم گھر سے نکل کر تربوز کے چھلکے تلاش کرو اور ان کو دھو کر دیہاتی گدھوں کو کھلا دو اور اس کا ثواب اپنے والدین کو بخش دو۔"

چنانچہ اس شخص نے عالم کے قول پر عمل کیا تو شب خواب میں اپنے والدین کو خواب میں دیکھا کہ انہوں نے بیٹے سے معانقہ کر کے بتایا۔

"ہمارے پیارے بیٹے نیکی کے سب طریقے تو نے ہمارے لیے استعمال کیے، یہاں تک کہ تو نے تربوز بھی ہمیں کھلایا جس کی ہمیں خواہش تھی۔ بس اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہوا۔" (قلیوبی)

اللہ تعالیٰ پر اعتماد،

ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید کی پولیس نے کچھ رہزنوں کو گرفتار کیا۔ اتفاقاً ان میں سے ایک چور چھوٹ کر بھاگ گیا۔ چونکہ پوری تعداد کی رپورٹ سرکار کو ہو چکی تھی تو پولیس والوں نے اپنے بچاؤ کے لیے یہ ظلم کیا کہ کسی غریب راہ گیر کو پکڑ کر تعداد پوری کر دی۔ ان سب کو حوالات کا مجرم ہوا اور معلوم ہونے پر ظالموں کے ورثا اپنے قیدیوں کو چھڑا کر لے گئے۔ بس نہیں ایک غریب مسافر رہ گیا تھا۔ جس نے داروغہ جیل کو ایک رقعہ دے کر کہا۔

"براہ کرم آپ چھت پر سے اس رقعہ کو ہوا میں اڑا دیجیے۔"

داروغہ جیل نے اس غریب کی عرض داشت کو پورا کیا۔ یعنی اس رقعہ کو بالاخانہ سے ہوا میں اڑا دیا جس میں لکھا تھا۔

"عبد ذلیل، رب جلیل سے التماس کرتا ہے کہ جن کے سفارشی موجود تھے وہ سب رہائی پا کر چلے گئے مگر میں کہاں جاؤں اور تیرے سوا کس کو سفارشی لاؤں۔"

اسی رات کو ہارون رشید نے خواب میں دیکھا کہ فلاں مظلوم مسافر کو فوراً رہا کرو" چنانچہ صبح ہوتے ہی ہارون الرشید نے دس ہزار درہم، دس طرح کی خلعت اور دس گھوڑے دے کر اس مظلوم مسافر کو رہا کر دیا اور منادی کرا دی کہ خدا پر بھروسہ رکھنے والے کو ایسا ہی بدلہ ملتا ہے۔

(خیر الموانس)

کام کی بات،

دوست کمزور ہو جائیں تو دشمن خود بخود طاقت ور ہو جاتے ہیں۔ اندرونی انتشار بیرونی خلفشار کی راہ ہموار کرتا ہے۔

(واصف علی واصف)

شکر پارے،

- ہمارا بدترین دشمن وہ ہے جو دوست بن کر زندگی میں داخل ہوا ہو اور ہمارا بدترین دوست وہ ہے جو دشمن بن کر جدا ہو۔
- سب سے زیادہ خطرناک دشمن وہ انسان ہے جو مسافر سے ذوق سفر چھین لے۔
- سورج دور ہے لیکن دھوپ قریب۔
- سب سے بڑی قوت، قوت برداشت ہے۔

(واصف علی واصف)

نمرہ، اقراء۔ کراچی

سجدہ اور جدید سائنس،

نماز میں جب سجدہ کرتا ہے تو اس کے دماغ کی شریانیں کی طرف خون زیادہ ہو جاتا ہے۔ جسم کی کسی بھی پوزیشن میں خون دماغ کی طرف زیادہ نہیں جاتا۔ صرف سجدے کی حالت میں دماغی اعصاب، آنکھوں اور سر کے دیگر حصوں کی طرف خون متوازن ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے دماغ اور نگاہ بہت تیز ہو جاتے ہیں۔

صائمہ یاسمین۔ کمووال

انسان کی تکمیل،

حضرت بابا فرید الدینؒ کہتے ہیں۔ انسان کی تکمیل تین چیزوں سے ہوتی ہے۔

- خوف، امید، محبت۔

نادیہ اسلم گجر۔ ٹھٹھہ پور

سکون،

سکون حاصل کرنے۔ کی کوشش چھوڑ دو سکون دینے کی فکر کرو تو سکون مل جائے گا۔ اللہ کے فیصلوں پر تحقیر نہ کرنا، سکون مل جائے گا۔ بے سکونی تمنا کا نام ہے۔ جب تمنا تابع فرمان الٰہی ہو جائے تو سکون شروع ہو جاتا ہے۔ اپنی زندگی میں آپ کو جو چیز سب سے اچھی نظر آئے، اسے تقسیم کرنا شروع کر دو، سکون آ جائے گا۔

(واصف علی واصف)

عائشہ نور۔ گوجرہ

کامیابی کی شرط،

لوگوں کو یہ معلوم ہونا شروع ہو گیا ہے کہ زندگی میں کامیابی کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ہم حیوانات کی طرح حلیم، صابر اور محنت کش ہوں۔

صائمہ جیمی۔ کراچی

بدذات یہودی،

ہٹلر نے اپنی کتاب "میری جدوجہد" میں لکھا ہے۔ "میں دنیا کے سارے یہودیوں کو ختم کر سکتا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر کچھ کو چھوڑ دیا تاکہ دنیا کو بتا سکوں کہ میں نے انہیں کیوں مارا تھا۔"

نادیہ اسلم گجر۔ ٹھٹھہ پور

واصف علی واصف کی نظر میں،

- تاج محل جوانی کے غم کی تحریر ہے اور یہ اتنی دل پذیر ہے کہ انسان غم بھول جاتا ہے۔
- وصال صرف ذات تک ہے جبکہ فراق ساری کائنات تک۔
- عذاب کا لمحہ وہ لمحہ ہے جب کرنیں سورج کو چاٹنے لگیں، جب شاخیں درخت کو کھا جائیں، جب اعضاء اپنے وجود سے کٹ جائیں۔
- نہ جوانی ہمارا قصور ہے نہ بڑھاپا ہماری غلطی۔ یہ زندگی کے موسم ہیں۔ ان موسموں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔
- محبت مجبور کو مختار بنا دیتی ہے۔ عشق مجبوریوں کے حصار سے آزاد ہوتا ہے۔

(قطرہ قطرہ قلزم سے اقتباس)

کرن شفیق۔ فیصل آباد

سرمایہ،

چور اور لٹیرے رات کو وہ سب کچھ لے گئے جو میرا تھا۔ بہر کیف ایک بار پھر جانے والوں۔ وہ چاند سورج چھوڑ گئے ہیں اور ایک محبت کرنے والی بیوی اور وہ دوست جنہیں مجھ سے ہمدردی ہے اور جن میں سے چند میری مدد کر سکتے ہیں اور مجھ میں جو روں کو معاف

کرنے کی جو طاقت ہے وہ بھلا کون چرا سکتا ہے۔ اتنی ساری نعمتوں کے درمیان بھی اگر میں غم کروں تو پھر ظاہر ہے کہ مجھے غم سے عشق ہے۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

عمل،

لفظ کسی بھی تعلق یا رشتے میں بہت اہم ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی بڑے بڑے لفظ بھی بے جان اور کھوکھلے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور ایک چھوٹا سا عمل بہت جان دار اور مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

ندا، فضہ۔ کراچی

پچھتاوا،

ایک بادشاہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ جنگل میں شکار کھیلنے گیا۔ بادشاہ ایک ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے بہت دُور نکل گیا۔ ہرن جھاڑیوں میں غائب ہو گیا اور بادشاہ جنگل میں تنہا رہ گیا۔ ہرن کے تعاقب کی کشمکش میں بادشاہ کا گھوڑا جھاڑیوں میں اُلجھ کر زخمی ہو گیا اور آگے چلنے کی سکت نہ پاتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے گھوڑے کو وہیں چھوڑا اور آگے چل پڑا۔ شدید گرمی میں پیاس کی شدت نے بادشاہ کو نڈھال کر دیا۔ بادشاہ نے پانی کو تلاش کرنے کے لیے اپنے پالتو عقاب کو ہوا میں اُڑایا۔ کچھ دیر بعد عقاب ناکام واپس آیا۔ چلتے چلتے بادشاہ ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ پہاڑ سے پانی قطرہ قطرہ گر رہا ہے۔

بادشاہ نے فوراً اپنا مشکیزہ پانی کے نیچے بھرنے کے لیے رکھ دیا۔ ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد بالآخر وہ مشکیزہ بھر گیا۔ بادشاہ نے بے تابی سے جیسے ہی پانی سے بھرا مشکیزہ پینے کے لیے منہ سے لگایا، عقاب نے پنجہ مار کر اچانک مشکیزہ گرا دیا اور سارا پانی زمین پر گر گیا۔ بادشاہ کے غصے کی انتہا نہ رہی مگر اپنے قیمتی اور پالتو عقاب کا خیال رکھتے ہوئے درگزر کر گیا اور دل پر پتھر رکھتے ہوئے بادشاہ نے ایک بار پھر مشکیزہ بھرنے کے لیے رکھ دیا۔ طویل انتظار کے بعد مشکیزہ ایک بار پھر بھر گیا۔

بادشاہ بے تابی سے آگے بڑھا اور مشکیزہ اُٹھایا اور منہ کی طرف لایا مگر یہ دیکھ کر بادشاہ کے غصے کی انتہا نہ رہی کہ عقاب نے پنجہ مار کر مشکیزہ پھر گرا دیا۔ بادشاہ نے فوراً ترکش نکالا اور تیر مار کر عقاب کو ہلاک کر دیا اور مشکیزہ ایک بار پھر بھرنے کے لیے رکھ دیا۔ اور یہ دیکھنے کے لیے پہاڑی پر چڑھا کہ آخر یہ پانی آ کہاں سے رہا ہے۔

جیسے ہی بادشاہ نے پہاڑی کی چوٹی پر قدم رکھا تو یہ دیکھ کر بادشاہ کی حیرت اور رنج والم کی کوئی انتہا نہ رہی کہ پہاڑ کی چوٹی پر ایک اژدہا مرا پڑا ہے اور سورج کی گرمی سے اس کی چربی قطرہ قطرہ پگھل کر نیچے گر رہی تھی۔

صبا کوثر۔ سمنی آباد

اللہ سے محبت کی تین علامات،

٭ تنہائی میں بھی اُس سے حیا کرنا۔
٭ مال کی کمی کے باوجود اُس کی راہ میں خرچ کرنا۔
٭ نیکی کی دعوت دینا۔

ندا، فضہ۔ کراچی

شیخ سعدیؒ کا فرمان،

٭ جاہلوں کا طریقہ ہے کہ جب ان کی کوئی دلیل مقابل کے آگے نہیں چل سکتی تو جھگڑا شروع کر دیتے ہیں۔
٭ فتنہ انگیز سچائی سے مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے۔
٭ دُشمن سے ہمیشہ بچو اور دوست سے اس وقت جب وہ تمہاری تعریف کرنے لگے۔
٭ جواہلوں سے دغا نہیں کرتا، عقل مندوں کے نزدیک وہ دوستی کے قابل نہیں۔
٭ چالاکی درباریوں کے لیے وصف ہے درویشوں کے لیے خامی۔
٭ جو دوسروں کے غم سے بے غم ہے۔ آدمی کہلانے کا مستحق نہیں۔

بشریٰ۔ ملک۔ ماڑہ ملک۔ فیصل آباد

شاعری سچ بولتی ہے

طاہرہ گھمن

شاعری دل کے موسموں کی ترجمان۔ اور ترجمانی بھی نہایت خوبصورت۔

بہت سے لوگوں کی طرح ہمیں بھی شعر و شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ اسی لیے تو سوچا چلو ہم بھی محفل میں شریک ہو جائیں۔

سب سے پہلے بات کروں گی خوشبو کی شاعرہ کی۔ ان کی شاعری کو جب بھی پڑھا تو نئی خوشبو کا احساس ہوا۔ ان کا شعر تو مجھے بہت پسند ہے۔

؎ کو میں آنکھیں بند کیے لیتی ہوں اب تم رخصت ہو
دل تو جانے کیا کہتا ہے لیکن دل کا کہنا کیا

اور اُن کی یہ غزل، صرف چند اشعار۔

؎ سکوں بھی خواب ہوا نیند بھی ہے کم کم پھر
قریب آنے لگا دُوریوں کا موسم پھر

تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سُنوں
اُلجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر

بہت عزیز ہیں آنکھیں مری اسے لیکن
وہ جاتے جاتے کر گیا ہے پُرنم پھر

؎ ایسا نہ ہو کبھی کہ پلٹ کر نہ آ سکوں
ہر بار دُور جا کے صدائیں مجھے نہ دو

کب مجھ کو اعتراف محبت نہ تھا فرازؔ
کیا میں نے یہ کہا ہے سزائیں مجھے نہ دو

احمد فرازؔ کی شاعری تو ہر نسل کی ہی پسندیدہ ہے مجھے ان کی یہ غزل بہت پسند ہے۔

؎ زلف راتوں سی ہے رنگت ہے اُجالوں جیسی
پر طبیعت ہے وہی بھولنے والوں جیسی

اک زمانے کی رفاقت پر بھی رم خوردہ ہے
اُس کم آمیز کی خُو بُو ہے غزالوں جیسی

ڈھونڈتا پھرتا ہے یوں لوگوں میں شباہت اُس کی
کہ وہ خوابوں میں بھی لگتی ہے خیالوں جیسی

اُس کی باتیں بھی دل آویز ہیں صورت کی طرح
میری سوچیں بھی پریشاں میرے بالوں جیسی

اُس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فرازؔ
سونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

مجھے آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے فیض کی یہ غزل کیوں پسند ہے، یا تو اس لیے پسند ہے کہ اس میں دو خوبصورت ناولز کے نام آتے ہیں یا پھر یہ ناولز اس لیے پسند ہیں کہ ان کے نام اس غزل سے لیے گئے ہیں۔

؎ نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا

میرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

اُدھر ایک حرف کی کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کر اُڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کر مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یاد گار بنا دیا

امجد اسلام امجد نے جس خوبصورتی سے "محبت" کو بیان کیا ہے۔ شاید ہی کسی اور شاعر نے بیان کیا ہو

راہ گزر کا، موسم کا، نا بارش کا محتاج
وہ دریا، جو ہر اک دل کے اندر بہتا ہے
کہا جاتا ہے ہر اک شعلہ وقت کا آتش دان
بس اک نقش "محبت" ہے جو باقی رہتا ہے

اور ان کی ایک نظم کے یہ چند مصرعے مجھے بہت پسند ہیں۔

اس موسم میں جتنے پھول کھلیں گے

ان میں تیری یاد کی خوشبو ہر سو روشن ہوگی
پتہ پتہ بھولے بسرے رنگوں کی تصویر بناتا گزرے گا
اک یاد جگاتا گزرے گا
تیری یاد کی سُن گن لینے چاند میرے گھر اُترے گا
آنکھیں پھول بچھائیں گی
خوشبو مجھ کو دان کرو اور اپنے دل میں آنے دو
یا میری جھولی کو بھر دو یا مجھ کو مر جانے دو

یہ نظم جو میری دوست انیسلانے میری ڈائری میں لکھی تھی۔ آج جب یہ نظم پڑھتی ہوں تو اسکول اور پھر کالج میں اٹھے گزارے ہوئے تمام دن بہت یاد آتے ہیں۔

کاسۂ دل،

کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں
جو ذہنوں میں رُک جاتے ہیں
کچھ گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں
جو ساون بن برساتی ہیں
جیون کے کورے کاغذ پر اک
امر کتھا لکھ جاتی ہیں
اور خود انمٹ ہو جاتی ہیں
یادیں تو وضدی ہوتی ہیں
یادیں تو تقاضا کرتی ہیں
یہ گھڑیاں پورا کرتی ہیں
اور بکھرے بکھرے انسان کو تم
یونہی یکجا کرتی ہیں

جیون میں اگر کچھ وقت ملے
ان سُندر سُندر گھڑیوں کو
اک بار اکٹھا کر لینا
تم کو دُکھ جو ملتا ہے
کوئی اُس کا مداوا کر لینا
یہ کاسۂ دل یونہی بھر لینا

صفیہ انور کی ایک نظم "محبت ہم سفر میری" میں نے کہیں پڑھی تھی، مجھے بہت اچھی لگی۔ یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گی۔

کٹھن ہے زندگی کتنی
سفر دُشوار کتنا ہے
کبھی پاؤں نہیں چلتے
کبھی رستہ نہیں ملتا
ہمارا ساتھ دے پائے
کوئی ایسا نہیں ملتا
فقط ایسے گزاروں تو
یہ روز و شب نہیں کٹتے
مجھے پھر بھی میرے مالک
کوئی شکوہ نہیں تجھ سے
میں جاں پر کھیل سکتا ہوں
میں ہر دُکھ جھیل سکتا ہوں
اگر تو آج ہی کر دے
محبت ہم صفر میری
آخر میں ایک چھوٹی سی نظم۔
محبت ہے تو چلتے ہیں
سمندر کی مسافت پر
پھر اس کے بعد دیکھیں گے
کنارا کون کرتا ہے

خالدہ جیلانی

کہتا کیوں میرے دل کا حال

مان جٹ ——— عبدالحکیم

ہر لمحہ مجھے رہتی ہے اک تازہ شکایت
کبھی تجھ سے، کبھی خود سے، کبھی اس زندگی سے
وہ بے کیفی کا عالم ہے کہ دل یہ چاہتا ہے
کہیں روپوش ہو جاؤں اچانک خامشی سے

سمیرا بانو ندیم ——— اسلام آباد

جو سر ذرا بھی اُٹھ گیا وہ لمحۂ حرم ہوا
جو سر سدا جھکا رہا، فقط اُسے امان تھی
میں زندگی کی سیج پہ ہدف تھا اک کھلا ہوا
بجھے ہوئے تھے تیر سب جڑی ہوئی کمان تھی

رضوانہ شکیل ملک ——— لودھراں

دلوں کی جگمگاتی بستیاں تاراج کرتے ہیں
یہی جو لوگ لگتے ہیں نہایت عام سے پہلے

شہلا رجانہ ——— ٹوبہ ٹیک سنگھ

اشعار میرے یوں تو زمانے کے لیے ہیں
کچھ شعر فقط اُن کو سنانے کے لیے ہیں
یہ علم کا سودا، یہ رسالے، یہ کتابیں
اک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہیں

سمیہ آزاد ——— چکوال

جو حیراں ہیں تمہارے ضبط پہ کہہ دو قتیل اُن سے
جو دامن پر نہیں گرتا وہ آنسو دل پر گرتا ہے

عفت جبیں ——— فیصل آباد

میں رو دیا شدت سے کہ مجھے یاد آئیں
کبھی کبھی تیری مجبوریاں، کبھی کبھی تو

مسرت حسن ——— سعودی عرب

دیے جلائے تھے ہم نے وفا کے رستے میں
نہ جانے آ گئے کیسے ہوا کے رستے میں
میں آج بھی وہیں بیٹھا ہوں نقش پا کی طرح
جہاں گیا تھا وہ مجھ کو جُدا کے رستے میں

صبا سلیم ——— ٹنڈو جان محمد

عمر بھر جلتے رہے بجھتے رہے
ہم کو جینے کا ہُنر آیا نہیں

نمرہ اقرار ——— کراچی

کیا سے کیا کر گئے غم، خیر تمہیں کیا اس سے
کیسے پتھر ہوئے ہم، خیر تمہیں کیا اس سے
گئی رُت لوٹ بھی آئی ہے، بچھڑنے والے
یہ بھی جاتے ہیں بہم، خیر تمہیں کیا اس سے

نجمہ نورین ——— عزیز والا گاؤں

تم بھی اگل ہو اُس شخص پہ مرتے ہو فراز
ایک دُنیا کی نظر جس پہ جمی رہتی ہے

شافیہ اسلم ——— ہری پور

میرا اب بھی مان لے تو مقدر کی حقیقت کو!
جو ہے وہ بھی ضروری ہے، جو گزر گیا وہ بھی ضروری تھا

شازیہ رانا ——— بہاول پور

ایک دُنیا کو مری دیوانگی خوش آ گئی
یار مکتب کی کتابوں کے حوالوں میں رہے
عشق میں دُنیا گنوائی ہے، نہ جاں دی ہے فراز
پھر بھی ہم اہلِ محبت کی مثالوں میں رہے

شہناز شازے سیال ——— خانیوال

سفر اکیلے ہی کاٹ لو گے، میں نے پوچھا تو رو دیا وہ
سوال کتنا عجیب سا تھا جواب کتنا عجیب سا تھا

شبنم ششاد ——— بزمان

جو درد کے صحرا میں اکیلا بھی بہت ہے
اس کے لیے دیوار کا سایہ بھی بہت ہے
بنیادی اندھیروں میں بھلا کیسے بچاتا
اک شخص تیرے ہجر میں جاگا بھی بہت ہے

پریتی مان ——— عبدالحکیم

تمہارا ساتھ تسلسل سے چاہیے مجھ کو
تھکن زمانوں کی لمحوں میں کب اُترتی ہے

سونیا دباج ـــــــــ کراچی

نقطے تھے انتظار کے جن سے بنا ہے دل
مرکز میں جس کا آپ وہی دائرہ ہے دل
باقی ہیں راہِ عشق میں گو بے شمار موڑ
"سانول" مہار موڑ کہ اب تھک گیا ہے دل

فوزیہ ندیم ـــــــــ گھاردو

ہر ایک راہ پہ انگلی پکڑ کے چلتا رہا
بچھڑ گیا ہے مگر پھر بھی اپنی ذات سے وہ
زباں کی نوک پہ ہے ذائقہ جدائی کا
اسی لیے ہے گریزاں مذاکرات سے وہ

نازیہ ـــــــــ ہری پور

بے سمت ہواؤں نے ہر لہر سے سازش کی
خوابوں کے جزیرے کا نقشہ بھی نہیں بدلا
ہے شوق سفر ایسا اک عمر سے یاروں نے
منزل بھی نہیں پائی رستہ بھی نہیں بدلا

فوزیہ مجید ـــــــــ چاند پور

رہی میری نگاہوں کی حکومت اس کے چہرے پر
ٹھہر سکتی نہیں کوئی بھی رنگت اس کے چہرے پر
دعائے وصل تو دونوں کی عادت بن گئی ورنہ
نہ خواہش میرے سینے میں نہ حسرت اس کے چہرے پر

دیا حسین ـــــــــ سکھر

آگ در کار تھی اور نور اٹھا لائے ہیں
سیج ہتھیلی پہ عبث طور اٹھا لائے ہیں
کیا ازل ہی سے یہی قحط بصیرت تھا کہ لوگ
دیکھ کر، دیدۂ بے نور اٹھا لائے ہیں

آرزو کنول ـــــــــ بھٹھہ

راتگاں ساعتوں سے کیا لینا
زخم ہوں، پھول ہوں، ستارے ہوں
موسموں کا حساب کیا رکھنا
جس نے جیسے بھی دن گزارے ہوں

بینش امتیاز ـــــــــ بھلوال

اکثر اوقات چاہنے پر بھی
فاصلوں میں کمی نہیں ہوتی
بعض اوقات جانے والوں کی
واپسی سے خوشی نہیں ہوتی

امبرین ـــــــــ سیالکوٹ

آیا وہ بام پر تو کچھ ایسا لگا منیر
جیسے فلک پہ رنگ کا بازار کھل گیا

ندرت احتشام ـــــــــ پشاور

کوئی صورت نہیں ہے اس جیسی
اس کو دیکھو ہزار میں بیٹھا

عالیہ ـــــــــ گھاردو

میں وہ دل ہوں داستان الم کا
جسے روئے کی صدیوں شادمانی

فوزیہ بشیر ـــــــــ بنوں

ہر آدمی نہیں شائستہ رموزِ سخن
وہ کم سخن ہو مخاطب تو ہم کلام کریں

ارم ارمغان ـــــــــ کراچی

وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا
جو پچھلی رات سے یاد آ رہا ہے

عندلیب وہاج ـــــــــ اٹک

مہک اٹھی پھر دل کی کتاب
یاد آئے وہ کب کے بھولے
دھیان میں پھرتے ہیں ناصر
اچھی آنکھوں والے بھولے

عارفہ عروج ـــــــــ خیرپور میرس

مری بھری ہوئی آنکھوں کو چشم کم سے نہ دیکھ
کہ آسماں مقید ہیں ان خیالوں میں

سونیا جہاں ـــــــــ ایبٹ آباد

تو کس خیال میں ہے منزلوں کے شیدائی
انہیں بھی دیکھ جنہیں راستے نے نگل لیا

فرح اقبال ـــــــــ پشاور

تجھے یقین نہیں آتا تو مسترد کر دے
ورق نہ پھاڑ تمناؤں کے صحیفے سے
سماعتوں کا سفر اور کیا عطا کرتا
سجا رہا ہوں سبھی دستکیں قریشے سے

زہرہ مشتاق ـــــــــ حیدر آباد

جس شاخ پر گلوں کی سکونت نہیں رہی
جو رخزاں سے وہ بھی سلامت نہیں رہی

شعاع کے نام

ادارہ

طیبہ عاطف ..... چشتیاں

1 - شعاع سے وابستگی کو تو بہت عرصہ ہو گیا۔ یہ 1997ء کی بات ہے جب میں نائنتھ کلاس میں تھی اور مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے میں نے شمو بخاری کی کہانی پڑھی تھی نانی کی نواسی والی، مشعل نام تھا اور ہیرو کا نام جرار تھا۔ البتہ کہانی کا نام میرے ذہن میں نہیں تو جناب! تب سے لے کر اب تک زندگی میں کتنے ہی نشیب و فراز آئے لیکن شعاع ساتھ زندگی میں آکسیجن کی طرح میرے ساتھ رہا ہے۔ جتنی ڈانٹ رسالے پڑھنے کے لیے میں نے کھائی ہے اتنی شاید ہی کسی نے کھائی ہو۔ امی کہا کرتی تھیں کہ "جتنا ٹائم تم ان رسالوں کو دیتی ہو اتنا قرآن پاک پڑھ لیا کرو تو تمہاری آخرت سنور جائے۔" لیکن میرے جیسے مستقل مزاج کہانیاں پڑھنے کے حوالے (کورس کے علاوہ) سے صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں (آہم) لیکن مزے کی بات یہ ایک دفعہ میں نے امی کو بھی عمیرہ احمد کا ناول "حاصل" پڑھنے کے لیے دیا تو تب سے عمیرہ احمد تو میری امی کی فیورٹ رائٹرز میں شامل ہو گئیں۔

لیکن اس کے باوجود بھی مجھے رسالے پڑھنے پہ ڈانٹ پڑتی تھی اور غلط نہیں پڑتی تھی کیونکہ میں سارے کام چھوڑ چھاڑ کے رسالہ لے کر بیٹھ جایا کرتی تھی اور تب بھی رسالہ خریدنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی کیونکہ امی کہا کرتی تھیں کہ تمہارے پاس اگر ہر ٹائم ہوں گے تو جو تھوڑا بہت کام کرتی ہو وہ بھی چھوٹ جائے گا لیکن اب میں سارے رسالے خود خرید لی ہوں اور بہت سنبھال کر رکھتی ہوں۔

2 - روز مرہ کی روٹین میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے آج کل میری صبح فوزیہ یاسمین کی آواز کے ساتھ ہوتی ہے جب وہ مجھے ناشتے کے لیے بلاتی ہیں چونکہ ابھی "تیمور" میرا چھوٹا سا بیٹا صرف ساڑھے تین ماہ کا ہے اٹھنے کے بعد اگر وہ بھی ساتھ اٹھ جائے تو اسے ساتھ لے کر ناشتہ کرتی ہوں پھر کچن کی صفائی میرے ذمے ہے 'وہ کرتی ہوں ساتھ ساتھ تیمور کی مصروفیت بھی ہوتی ہے۔ دوپہر تک اسے نہلا کر سلا دیتی ہوں اور پھر روٹیاں میں نے بنانا ہوتی ہیں' وہ بناتی ہوں۔ پھر ظہر کی نماز اور کھانے کے بعد فری ہوتی ہوں۔ اس ٹائم میں شعاع یا کوئی کتاب جیسا کہ آج کل "شہاب نامہ" پڑھ رہی ہوں پڑھ لیتی ہوں اور اگر تیمور اٹھ جائے تو سب کام چھوڑ' تب صرف اسے ہی سنبھالتی ہوں آج کل تو اکثر یہی ہوتا ہے کہ جب تک میں فارغ ہوتی ہوں وہ اٹھ جاتا ہے اور شام پانچ بجے تک سو جاتا ہے۔ عصر کی نماز کے بعد تب ٹائم ہو تو مطالعہ کر لیتی ہوں یا اگر چھوٹے موٹے کام کر رہی ہوں تو رات میں ہی پڑھتی ہوں سو بارہ ساڑھے بارہ تک اسے سلانے کے بعد میرا سارا ٹائم اپنے لیے ہوتا ہے۔ اس میں کچھ پڑھنا ہو یا لکھنا ہو یا موبائل Messeging کرنی ہو تو اپنی فرینڈز کو Poetry ٹائپ کر کے Send کر دیتی ہوں اور پھر کتابوں کے ساتھ ہی مجھی کتاب پڑھتے پڑھتے ہی سو جاتی ہوں۔

3 - بہت سی اپنی تحریریں ہیں جو میرے دل پر نقش ہیں عمیرہ احمد کی ہر تحریر اور ہر تحریر کا ایک ایک ڈائیلاگ مجھے پسند ہے میرے دل پہ اثر کرتا ہے۔ "زندگی گلزار ہے" سے لے کر "من و سلویٰ" تک ان کی ساری تحریریں مجھے پسند ہیں۔ اس کے علاوہ راحت جبیں کا "سرخ گلابوں کا موسم" اور "اے وقت گواہی دے" ماہا ملک کا ناول "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" میں شاہ عالم کا کردار بہت یادگار ہے۔ نمرہ احمد کی "قرار قرم کا تاج محل" جو میں نے عاطف (شوہر) کو پڑھنے کے لیے دی تھی انہیں بھی بہت پسند آئی۔ نگہت سیما کی "رقص طاؤس" نگہت عبداللہ کی "دل پھولوں کی بستی" بہت پسند ہیں اور ہاں میمونہ خورشید علی کا "تیری راہ میں رل گئی دے" میں ذوبار یہ حسن کا کردار بہت مزے کا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کردار میں اپنی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس ٹائم مجھے یاد نہیں، آ رہا

جب پڑھ رہی ہوتی ہوں تب کبھی ایسا لگتا ہے لیکن کبھی مکمل شخصیت کسی کردار میں نہیں دکھائی دی اور شاید اسی لیے ہی مجھے یاد بھی نہیں۔

4 - خوبیاں اور خامیاں مل کر ہی انسان کی شخصیت مکمل کرتی ہیں سو ہر عام اور خاص انسان کی طرح مجھ میں جو خوبیاں اور خامیاں ہیں ان میں سر فہرست تو میری سب سے بڑی خوبی اور خامی بھی یہ ہے کہ حساس بہت ہوں۔ خوبی اس لیے کہ دوسروں کی تکلیف بہت جلدی محسوس کر لیتی ہوں اور خامی اس لیے کہ چھوٹی چھوٹی باتیں بہت دل پر لیتی ہوں خاص طور پر رویے مجھے بہت ڈسٹرب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نرم دل ہوں۔ دوسروں کی زندگی میں مداخلت نہیں کرتی میری نظر میں یہ بھی ایک خوبی ہے۔ اپنی غلطی کا بہت جلدی احساس ہو جاتا ہے۔ اگلے بندے سے Excuse کروں نا کروں دل میں بہت شرمندہ ہوتی ہوں اور اللہ جی سے فوراً معافی مانگ لیتی ہوں۔ صاف گو ہوں منہ پھٹ ہونے کی حد تک complicated ہوں اتنی کہ کبھی بھی خود بھی اپنے آپ کو سمجھ نہیں پاتی۔

اپنے متعلق تعریفی اور تنقیدی دونوں طرح کے کمنٹس بہت سنتی رہتی ہوں میری ماں جی کہتی ہیں "طیبہ میری بہت فرماں بردار بیٹی ہے" ہائے یہ جملے مجھے اندر تک سرشار کر دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتی ہیں کہ "اپنے کھانے پینے کے معاملے میں بہت لاپروا ہو" اپنے کھانے پینے کا خیال رکھا کرو۔" ثناء نے میسج کیا تھا کہ "تم میری بہت ہی سویٹ اور سب کا بہت خیال رکھنے والی آپی ہو۔" صبا نے میری تعریف اس طرح سے کی ہے کہ "تمہارا بیٹا بہت خوب صورت ہے۔" (ویسے میں بھی تو بہت خوب صورت ہی ہوں صبا جی!) میری دوست فائزہ نے میری ڈائری میں لکھا تھا "تمہارے بارے میں پہلی بات یہ کہ تم اسٹریٹ فارورڈ ہو اور جھوٹ بولنے سے گریز کرتی ہو۔"

عطیہ جب کہتی ہے "آپی تم بہت خاص ہو میرے لیے" "تب بہت اچھا لگتا ہے۔ اکثر لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں بہت مغرور ہوں تب مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ خاکسار کے پاس غرور کرنے کے لیے کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہے۔ ہاں البتہ ریزرو رہتی ہوں۔

5 - ساون مجھے زیادہ پسند نہیں ہاں بارش اچھی لگتی ہے سردیوں کی تب بہت اداس بھی ہو جاتی ہوں پتہ نہیں کیوں بارش مجھے اداس کر دیتی ہے۔ ساون کے حوالے سے کوئی خاص واقعہ تو یاد نہیں البتہ ایک دفعہ یونیورسٹی لائف میں ساری ونگ کی لڑکیوں کو باری باری بلا کر انہیں لان میں لے جا کر پانی کی بالٹی ان پر انڈیل دی تھی اور پھر سب لوگ بارش میں کافی دیر بھیگتے رہے تب بہت مزہ آیا تھا۔

6 - پسندیدہ اقتباس یوں تو بہت سے ہیں لیکن یہاں عمیرہ احمد کے ناول "امربیل" سے ایک اقتباس میں نے اپنی ڈائری میں لکھا ہوا تھا۔ سو حاضر ہے "زندگی میں ایک چیز ہوتی ہے۔ جس چیز کو تم نہ بدل سکو اس کے ساتھ کمپرومائز کر لیا کرو۔ اپنی کسی بھی خواہش کو جنون مت بنایا کرو۔ زندگی میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیں مل نہیں سکتیں۔ چاہے ہم روئیں چلائیں یا بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑیں کیونکہ وہ کسی دوسرے کے لیے ہوتی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی میں ہمارے لیے کچھ ہوتا ہی نہیں بلکہ کچھ نہ کچھ ہمارے لیے بھی ہوتا ہے۔"

پسندیدہ شعر۔

کچھ انسان نہیں ہے کشمکشِ ذات کا کرب
ہے آگہی کے بعد غمِ آگہی بہت

کتابوں میں سب سے پہلے قرآن پاک پھر نسخہ ہائے وفا (فیض احمد فیض) شفیق الرحمٰن کی "حماقتیں" "مشتاق احمد یوسفی کی "آبِ گم" "امجد اسلام امجد کی "شہر در شہر" میری آل ٹائم فیورٹ کتابیں ہیں۔

☆ ☆ ☆

شازیہ علی عمران..... کبیر والا

1 - شعاع سے وابستگی کو تقریباً "دس سال ہونے والے ہیں۔ شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی شعاع سے دوستی ہوئی جو اب تک برقرار ہے۔ شعاع سے ہی میں نے خوابوں کی دنیا سے نکل کر زندگی کے حقائق سمجھنے کا فن سیکھا زندگی برتنے کا ڈھنگ سیکھا غرض شعاع نے ایک بہترین دوست کی طرح ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ ہوش سنبھالتے ہی کیونکہ میں نے لفظوں سے ناتا جوڑ لیا تھا اور خود کو محض کاغذ قلم

تک محدود کر لیا تو کچھ عرصہ ڈانٹ پھٹکار کے بعد سب کو میری ترجیحات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑا۔ اس لیے کوئی دلچسپ واقعہ پیش نہیں آسکا۔

2 - شادی شدہ زندگی کی مصروفیات میں تین اور تلے کی بیٹیوں ایمان علی، زہرہ علی اور فاطمہ علی کی تھکا دینے والی مصروفیات کا اضافہ ہو چکا ہے۔ صبح اٹھتے ہی اسکول جانے کی تیاری اور ساتھ ساتھ بچوں کو ناشتہ کرواتی ہوں۔ تینوں بیٹیاں علی الصبح بیدار ہو جاتی ہیں۔ پونے سات بجے وین اسٹاپ پر آجاتی ہے۔ 45 منٹ کے سفر کے دوران میرین پبلک اسکول کی کچھ ٹیچرز خواتین، شعاع یا کرن سے محظوظ ہو رہی ہوتی ہیں اور کچھ خوش گپیوں میں مگن۔ رابعہ کے ہاتھوں میں سفر کے دوران ہمیشہ سورۂ یٰسین اور اسکول میں بریک اور فری پیریڈز میں کوئی ضخیم ناول ہوتا ہے اسکول سے لوٹنے کے بعد باقی کا وقت اپنی بیٹیوں کے ساتھ گزارتی ہوں۔ جو میری غیر موجودگی میں امی اور بھابھی کو بے حد زچ کر چکی ہوتی ہیں۔ میرے ہزبینڈ علی عمران ملتان سے گھر ویک اینڈ پر آتے ہیں۔ رات کو بچوں کو سلانے کے بعد کچھ دیر ٹی وی دیکھنا، عائشہ کو میسج کرنا اور پھر شعاع پڑھنا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

3 - میری پسندیدہ رائٹر نگہت سیما ہمیشہ ایسے کردار سامنے لاتی ہیں جو معاشرتی برائیوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ عمیرہ احمد رازِ حق سے آشنا کرواتی ہیں تو نسیم نبوی درونِ سندھ رسموں اور رواجوں کی ڈوروں میں الجھے رشتے سلجھاتی ہیں۔ افسانوں کے کردار بلاشبہ ہمارے اردگرد بکھرے ہوئے ہیں جن سے متاثر ہو کر ہماری رائٹرز شاہکار تخلیق کر ڈالتی ہیں۔ نگہت سیما کے کرداروں میں مجھے ہمیشہ اپنا عکس جھلکتا نظر آتا ہے۔

4 - چند ایک خوبیاں بھی ہیں۔ کسی کی ذاتیات میں دخل نہیں دیتی۔ دوستی نبھانے کی قائل ہوں۔ بے حد حساس ہوں اور سب کا دکھ اپنے اندر محسوس کرتی ہوں۔ سیلاب کی تباہ کاریوں کے بعد اپنے وطن کی ناگفتہ بہ حالت، سیاکوٹ تشدد کے بعد قتل ہونے والے معصوم بھائیوں کی اذیت، غیر ملکی امداد دینے والوں کا ہمارے حکمرانوں پر عدم اعتماد، سیاسی اکھاڑ پچھاڑ، بڑھتی مہنگائی، قومی کرکٹ ٹیم کا خود کو فروخت کرنا اور ارزاں ہوتی انسانیت دیکھ کر پاگل ہونے لگتی ہوں (خدا جانے یہ میری خوبی ہے یا خامی) اور مجھے غصہ بہت جلد اور بہت زیادہ آتا ہے اور رونا بھی، اور بھی بہت سی خامیاں ہیں۔ لیکن اب مجھے خود کو اتنا برا بھی پیش نہیں کرنا ہے۔

5 - حالیہ بارشوں نے ہمارے ملک میں جو تباہی پھیلائی ہے تو اب بادل دیکھ کر خوف آنے لگتا ہے کہ کیا خبر کون سا دریا بپھر جائے۔ کون سے ناقص بند میں شگاف پڑ جائے اور وہ در جنوں بستیاں اجاڑ ڈالے۔ البتہ ماضی کے دریچوں سے جھانکتی ہر بارش کی یاد بے حد خوب صورت ہے۔ ہر بار میں کوئی بوند اور ہر بوند میں کوئی یاد مچھی ہے۔ جیسے ہی کالے بادل اٹھتے تھے کڑھی چاول تیار۔ دوستوں کو فون اور بھیگے موسم میں علی عمران کو پہروں سوچتے رہنا بھی نہیں بھول سکتا (میری لو میرج ہوئی ہے جناب!)

6 - پسندیدہ کتاب "عشق کا عین" "عشق مجازی سے عشقِ حقیقی میں بدلنے والے جذبے کی داستان۔ علیم الحق حقی کی شاندار کاوش ہے اور محسن نقوی، احمد فراز کی تقریباً ساری شاعری مجھے بے حد پسند ہے۔

ثمینہ نورین..... ڈسکہ کلاں، ضلع سیالکوٹ

میں تین بھائیوں اور چھ بہنوں کی "اکلوتی" بہن ہوں، یعنی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن ہوں۔ میرے علاوہ سارے بہن بھائی شادی شدہ ہیں۔ بی اے، بی ایڈ کر کے فارغ ہوں اور بھتیجے، بھتیجیوں کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا رہی ہوں۔

1 - شعاع سے وابستگی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی اور جب پیدائش اور عمر کا ذکر آئے تو مجھے کہتی ہے کہ "ہمشیرہ پاکستان سے تھوڑی ہی چھوٹی ہے۔ رقبے میں بھی اور عمر میں بھی" (مجھے خود مجھ سے دو سال بڑی ہے) بہرحال ہوش سنبھالتے ہی گھر میں ڈائجسٹ دیکھے تھے۔ بڑی بہنیں پڑھتی تھیں اور ان کو دیکھ کر ہی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تھا جو آج تک ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود جاری و ساری ہے (ہمشیرہ پاکستان سے تھوڑی نہیں بلکہ بہت زیادہ چھوٹی ہیں رقبے میں بھی اور عمر میں بھی) اگر اپنی عمر پندرہ سال بتاؤں گی تو مجھ پھر کہے گی کہ ہاں بے چاری کی ذہنی عمر پندرہ سال ہے۔ بہرحال میں کی دہائی چل رہی ہے۔

شعاع کے حوالے سے دلچسپ واقعہ نہیں بلکہ واقعات

ہیں۔ جن میں سے سب سے دلچسپ کچھ یوں ہے کہ گھر میں بہت سی پرانی سینڈلز اور چپلیں جمع ہو گئی تھیں۔ نسرین باجی نے کہا کہ چلو ان کو بیچتے ہیں۔ 50 روپے کے سارے جوتے فروخت ہوئے اور ان کا ہم نے "علم" خرید لیا یعنی پرانے ڈائجسٹ خریدے اور سب کو کہا کہ جوتے بیچ کر علم خریدا ہے۔ اور بھائی نے اگلے ہی دن گھر میں جتنا بھی پرانا اور نیا علم موجود تھا وہ بیچ دیا یا پھینک دیا ہمیں آج تک اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ (اف! علم کی بے قدری)

2 - دن کا آغاز صبح کی نماز کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر تک سوتی ہوں اور آٹھ ساڑھے آٹھ بجے اٹھ کر ناشتہ بناتی ہوں۔ ناشتے کے بعد بھابھیوں کے ساتھ صفائی ستھرائی کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا وغیرہ تیار کیا جاتا ہے اور 3 سے 4 بجے تک فارغ ہو جاتے ہیں یہی وقت میرے لیے شعاع کا ہوتا ہے اور میرے ساتھ امی بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ (ڈانٹ بھی سب سے زیادہ امی سے ہی پڑتی ہے شعاع پڑھنے پر) شام کو اٹھ کر چائے وغیرہ بناتی ہوں اور پیتی ہوں۔ کبھی کبھی تو اتاول کرتا ہے کہ کوئی چائے بنا کر دے دے لیکن وہی "اکلوتا پن"۔ مغرب کے بعد ابو کو کھانا وغیرہ دے کر ٹی وی دیکھتی ہوں اور تقریباً دس بجے تک رات کا کھانا کھا لیا جاتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر شعاع پڑھتی ہوں اور تقریباً 12 بجے تک نماز سے فارغ ہو کر سونے کے لیے لیٹتی ہوں تو سب بہنوں، بہنوئیوں اور دوستوں کو SMS کرتی ہوں۔ جواباً ان کے SMS موصول ہوتے ہیں۔ "آداب سو بھی جاؤ اور ہمیں بھی سونے دو۔" ماجدہ کہتی ہے کہ "مجھے یہ بتاؤ کہ تم سوتی کس وقت ہو؟" وغیرہ وغیرہ۔

3 - پسندیدہ کتابوں میں سرفہرست "قرآن پاک ہے جو کہ دل و دماغ اور روح و جسم کو تر و تازہ کر دیتا ہے۔ ہر مشکل گھڑی میں یا مصیبت کے وقت اللہ ہی یاد آتا ہے اور قرآن پاک کی تلاوت کرنے سے دل کو بے تحاشا سکون اور تسلی محسوس ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد "تحفۂ خواتین" ہے۔ جو کہ حقیقت میں خواتین کے لیے تحفہ ہے۔ بے شمار مسائل کی آگاہی اس کتاب سے ملتی ہے۔ عمیرہ احمد کا "پیر کامل" ایسا ناول ہے جسے فراموش کرنا ناممکن ہے۔ کراچی سے پروین باجی نے ایک کتاب "برمودا تکون اور دجال" کے نام سے بھیجی تھی۔ بے تحاشا خوف محسوس ہوا اور ایسا لگا جیسے ابھی دجال باہر نکل کر قیامت کی نشانیوں کو سچ کر دکھائے گا۔

4 - خوبیوں کی بات آئی تو نجمہ بولی کہ میں نے اس شب برأت میں فیصلہ کیا تھا کہ جھوٹ نہیں بولنا۔ نسرین باجی ابھی تک خاموش ہیں اور بھابھی رضیہ اپنے کمرے میں چلی گئیں کہ کچھ بولنا نہ پڑے۔ میرے خیال میں کیئرنگ ہوں خود بھی خوش رہتی ہوں اور دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ خامیوں میں یہ ہے کہ سست الوجود ہوں۔ کہتی ہوں کہ آج کا کام کل پر مت ٹالیں بلکہ اسے پرسوں پر ٹال دیں۔ غصہ جلدی آتا ہے لیکن محسوس نہیں ہونے دیتی۔ چھوٹے بچوں سے پرتشدد پیار کرتی ہوں کہ وہ رونا شروع کر دیتے ہیں (بقول نسرین باجی) بس اتنی ہی خامیاں کافی ہیں۔ آخر میں جملے میں یہ ہے کہ ساری بہنیں یہ کہتی ہیں کہ تحسینہ تم ہمیں سب سے زیادہ یاد آتی ہو۔" (آخر لاڈلی اور سب سے چھوٹی بہن جو ہوئی۔)

5 - ساون کے مہینے میں نجمہ کی یاد آتی ہے جو اگہ مزے مزے کے کھانے بنا کر کھلاتی تھی۔ اسے کھانے پکانے کا شوق بہت ہے۔ ساون کے حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ تو نہیں ہے لیکن بارش بہت اچھی لگتی ہے۔ بس دل کرتا ہے کہ کالی یا چائے کا بڑا سا مگ ہو ہاتھ میں شعاع ہو اور کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔

6 - شاعری واقعی سچ بولتی ہے۔ ماجدہ اور صدف Poetry msgs ہی کرتی ہیں جو کہ میری ڈائری کی زینت بنتے رہتے ہیں پسندیدہ شعر

میرے ہاتھوں سے اور میرے ہونٹوں سے چوما جاتی نہیں
کہ میں نے اسم محمدؐ کو لکھا بہت اور چوما بہت

لطائف تو بے تحاشا پسند ہیں اور ڈائجسٹ میں سب سے پہلے لطائف ہی پڑھتی ہوں۔

اقتباس

عمیرہ احمد کے ناول من و سلویٰ سے ہے کہ "دنیا میں آپ کی Entry جیسے مرضی ہو۔ Exit ہمیشہ شاندار ہونی چاہیے۔" اور "جو چیزیں اللہ نہیں دیتا اسے انسانوں سے نہیں مانگنا چاہیے۔"

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مشروم اینڈ چکن لزانیہ

ضروری اجزا :

لزانیہ شیٹ 8 عدد
(تھوڑا سا نمک اور تیل ڈال کر ابال لیں)
مرغی (بغیر ہڈی کے) ایک پاؤ (ابال لیں)
شملہ مرچیں ایک عدد (چوکور کاٹ لیں)
مشروم ایک پیالی (چوپ کر لیں)
موزریلا چیز ایک پیالی
ٹماٹو سوس بنانے کے لیے
تیل کھانے کے چار چمچے
لہسن کے جوے (چوپ کر لیں) 10 عدد
ٹماٹر (گرائنڈ کر لیں) 10 عدد
نمک حسب ذائقہ
لال مرچ (کٹی ہوئی) چائے کا آدھا چمچہ
چینی چائے کا ایک چمچہ

وائٹ سوس کے لیے
مکھن کھانے کے چار چمچے
میدہ کھانے کے چار چمچے
دودھ تین پیالی
نمک حسب ذائقہ
سیاہ مرچ (تازہ کٹی ہوئی) چائے کا آدھا چمچہ
اوریگانو پاؤڈر چائے کا آدھا چمچہ

ترکیب :

پین میں تیل گرم کر کے لہسن ڈال کر فرائی کر لیں۔ ہلکا

سنہری مائل ہو جائے تو ٹماٹر، نمک، لال مرچ کٹی ہوئی اور چینی ڈال کر پکائیں۔ ٹماٹروں کا پانی خشک ہو جائے تو اتار لیں۔

پین میں مکھن گرم کر کے میدہ ڈال لیں اور ہلکا سا بھون کر پین کو چولہے سے ہٹا لیں پھر اس میں دودھ ڈال کر مکس کریں۔ دوبارہ چولہے پر رکھ کر نمک، اور سیاہ مرچ ڈال کر گاڑھا ہونے تک پکائیں۔

اوون پروف سرونگ ڈش کو تیل سے چکنا کر کے اس میں آدھی لزانیہ شیٹس بچھا دیں اور ٹماٹو سوس پھیلائیں۔ گوشت، مشروم اور شملہ مرچ پھیلائیں۔ وائٹ سوس پھیلا کر لزانیہ شیٹس سے کور کر کے اوپر موزریلا چیز اور اوریگانو پاؤڈر چھڑک کر پہلے سے گرم اوون میں 180c پر رکھ کر دس سے پندرہ منٹ تک بیک کر لیں۔

بیکڈ پوٹیٹو بالز

ضروری اجزا :

آلو (ابلے ہوئے)	دو عدد (میش کر لیں)
میدہ	ڈیڑھ پیالی
بیکنگ پاؤڈر	چائے کا ایک چمچہ
نمک	چائے کا آدھا چمچہ
مکھن	آدھی پیالی
(چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں)	
انڈے	دو عدد (پھینٹ لیں)
دودھ	تین چوتھائی پیالی
پیاز	تین عدد
(چھوٹے سائز کی، باریک کاٹ لیں)	
سیاہ مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
مکھن	سجاوٹ کے لیے
میدہ	کوٹنگ کے لیے

ترکیب :

ایک پیالے میں میدہ اور بیکنگ پاؤڈر کو ایک ساتھ چھان کر رکھیں۔ اس میں مکھن ڈال کر ہاتھوں سے خوب اچھی طرح ملا لیں۔ دودھ میں انڈے ڈال کر خوب پھینٹیں۔ اس کے بعد میدے میں ڈال کر اچھی طرح ملا کر نرم آٹا گوندھ لیں۔ پھر اس میں تلے ہوئے آلو، نمک، پیاز، سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر ملا لیں۔ ایک کٹنگ بورڈ پر میدہ چھڑکیں۔ اس کے اوپر گوندھے ہوئے میدے کو سوکھے میدے سے کوٹ کر کے دو انچ موٹائی والا لمبا سا رول بنا لیں۔ تیز چھری سے اس رول کے گول گول ٹکڑے کاٹ لیں۔ ایک بیکنگ ٹرے میں تیل لگا کر اسے چکنا کر لیں اور اس میں ٹکڑے سیٹ کر کے رکھ دیں۔ بیکنگ ٹرے کو پہلے سے گرم اوون میں 220c پر رکھ کر تیس منٹ تک بیک کریں۔ اس کے بعد بیکنگ ٹرے کو اوون سے نکال کر ٹکڑوں کو سرونگ ڈش میں رکھیں۔ مزیدار پوٹیٹو بالز تیار ہیں۔ اس کے اوپر حسب پسند مقدار میں مکھن لگائیں۔ چائے یا کافی کے ساتھ مزہ دیں گے۔

ہرا مسالا ران روسٹ

ضروری اجزا :

ران	ایک عدد
لہسن، ادرک پیسٹ	کھانے کے دو چمچے
تیل	ایک چوتھائی پیالی
ہرا مسالا (کٹا ہوا)	کھانے کے چار چمچے
(ہرا دھنیا، ہری مرچیں اور پودینہ)	
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	کھانے کا ایک چمچہ
ٹماٹر	آدھا کلو
آلو (سلائس کاٹ لیں)	آدھا کلو

ترکیب :

ران میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے مگر گہرے کٹس لگا کر اس پر لہسن، ادرک پیسٹ، سیاہ مرچ پاؤڈر اور کٹا ہوا ہرا مسالا ڈال کر خوب اچھی طرح لگائیں۔ بیکنگ ڈش میں کٹے ہوئے ٹماٹر رکھیں۔ اس پر آلو رکھیں اور ان پر ران رکھ کر پہلے سے گرم اوون میں 180c پر رکھ کر 30 سے 40 منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پھر ران کو پلٹ دیں اوون کا درجہ حرارت کم کر کے 150c تک کر دیں۔ ران کو اچھی طرح گل جانے تک روسٹ کریں۔ اب اسے المونیم فوائل میں لپیٹ کر 15 منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ سرونگ ڈش میں بیک کیے ہوئے آلو اور ٹماٹر رکھیں اور ران کو المونیم فوائل سے نکال کر آلو اور ٹماٹر کے اوپر رکھ کر ٹماٹو کیچپ اور املی سوس کے ساتھ سرو کریں۔

ہاٹ چلی چکن پزا

ضروری اجزا :

پزا بنانے کا آٹا

میدہ	چار پیالی
چینی	کھانے کا ایک چمچہ
خمیر	کھانے کے دو چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھی پیالی
گرم پانی	آدھی پیالی
دودھ	ایک چوتھائی پیالی
ٹاپنگ کے لیے	
مرغی کا گوشت	آدھا کلو (بغیر ہڈی کا)
کٹی لال مرچ	کھانے کا ایک چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	کھانے کا ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سرکہ	کھانے کے دو چمچے
(مرغی کے گوشت میں کٹی ہوئی مرچ، نمک، ادرک، لہسن پیسٹ، سرکہ اور آدھی پیالی پانی ڈال کر پکائیں)	
موزریلا چیز	ایک پیالی
چیڈر چیز	ایک پیالی
کٹی ہوئی لال مرچ	کھانے کا ایک چمچہ
اورینگانو	چائے کا آدھا چمچہ
پزا سوس	ایک پیالی

ترکیب :

میدے میں تیل، نمک مکس کر لیں۔ گرم پانی میں خمیر اور چینی مکس کر کے پانچ سے دس منٹ رکھیں اور میدے میں ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ دودھ ڈال کر میدہ گوندھ لیں۔ کسی ڈھکن میں آٹا رکھ کر ڈھکن لگا کر رکھیں، جب آٹا پھول کر ڈبل ہو جائے تو ایک پزا ٹرے میں آٹا پھیلائیں۔ اس پر پزا سوس لگائیں۔ موزریلا چیز اور گوشت رکھ کر چیڈر چیز چھڑکیں۔ اس پر اورینگانو، لال مرچ چھڑک کر 180c پر بیس سے پچیس منٹ تک بیک کریں۔ اوپر سے کٹی لال مرچ چھڑک کر سرو کریں۔

اسپائسی سوفٹ رول

ضروری اجزا :

قیمہ (چنبنا پکا ہوا)	ایک پیالی
میدہ	ڈیڑھ پیالی
خمیر	چائے کا ڈیڑھ چمچہ
شکر	چائے کا ایک چمچہ
دودھ (نیم گرم)	کھانے کے دو چمچے
تیل	حسب ضرورت
انڈا	ایک عدد
نمک	ایک چٹکی
بیکنگ پاؤڈر	چائے کا آدھا چمچہ

ترکیب :

شکر، دودھ، خمیر کو ایک پیالی میں ڈال کر اسے بیس سے پچیس منٹ کے لیے ایک طرف رکھ دیں۔ میدے کو چھان کر اس میں نمک اور بیکنگ پاؤڈر ملا لیں اور اسے خمیر والے آمیزے سے گوندھ لیں (حسب ضرورت نیم گرم دودھ یا پانی ملایا جا سکتا ہے) گوندھی ہوئی ڈو کو گیلے کپڑے سے ڈھانپ کر تقریباً پون گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ جب خمیر اچھی طرح اٹھ جائے تو پیڑے کاٹ کر لمبائی میں موٹا سا بیل لیں۔ اس پر قیمہ رکھ کر ایک سرے کو دوسرے سرے پر چوڑائی کے رخ پر موڑ لیں۔ ایک چکنی کی ہوئی بیکنگ ڈش میں رول رکھ کر اس پر چھری یا کانٹے سے نشانات بنائیں اور بیس سے پچیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر اس پر پھینٹے ہوئے انڈے برش کی مدد سے لگائیں اور پہلے سے گرم اوون میں 250c پر رکھ کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے بیک کر لیں۔ رول کی اوپری سطح سنہری مائل ہونے لگے تو اوون سے نکال لیں۔ مزیدار اسپائسی سوفٹ رول تیار ہیں۔ املی کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

کچھ اپنا دین کچھ اپنائیتیں

معروف ڈرامہ نگار

عبدالقادر جونیجو

شاہین رشید

ابتدائی زندگی

میں یکم نومبر 1945ء کو صحرائے تھر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ والدہ ہاؤس وائف جبکہ والد صاحب پولیس افسر تھے۔ مادری زبان سندھی ہے۔ سندھی گھرانے اور اردو بولنے اور پڑھنے والوں سے چونکہ تعلق رہا تو مجھے اردو بولنے اور لکھنے پر عبور حاصل ہو گیا۔ ویسے مجھے پنجابی زبان بہت پسند ہے بلکہ اپنے ملک میں بولی جانے والی ساری زبانوں سے پیار ہے۔

بچپن

میرا بچپن بہت شاندار گزرا ہے۔ میں نے کھیتوں کھلیانوں کی صاف ستھری فضاؤں میں پرورش پائی۔ فصلوں کی اور پھولوں کی مہک اور سبزے اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے میری صبح کا آغاز ہوتا تھا اور یہ تمام مناظر آج بھی آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ میں نے ایک آزاد ماحول میں زندگی گزاری۔ میرے والد ایک پولیس آفیسر تھے تو گاؤں میں ان کا بڑا رعب، بڑا دبدبہ تھا مگر میرے والد نے کبھی اپنے عہدے کا غلط استعمال نہیں کیا۔ والد کی وجہ سے اکثر میں تھانے ان کے ساتھ چلا جاتا تھا، جہاں یہ قیدیوں کے ساتھ وقت گزارتا اور ان کی باتیں سننا مجھے اچھا لگتا۔ ان کی کہانیاں سنتا اور ان کی کہانیاں سن کر مجھے بہت کچھ سمجھنے اور سیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ چونکہ بچپن کا دور تھا تو مجھے یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا..... اور میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ میں بھی بڑا ہو کر اپنے والد کی طرح پولیس آفیسر ہی بنوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن جب میں نے اپنے والد سے اس شوق اور خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا کہ۔

"بیٹا! زندگی میں کچھ بھی کر لینا لیکن پولیس کی نوکری نہیں کرنا۔"

میں اپنے بچپن کو اس لیے بھی خوب صورت کہوں گا کہ میں نے قدرتی فضاؤں میں من کے سچے اور زبان کے کھرے لوگوں کے ساتھ اپنا وقت گزارا۔

ماحول + تعلیم

میں نے جیسا کہ بتایا گاؤں کے کھیت کھلیانوں میں بچپن گزارا، ماحول تو پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن ان لوگوں کے درمیان رہ کر عملی زندگی گزارنے کے بہت سے طریقوں سے آشنا ہوا۔ اپنے والد سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ ان سے کہانیاں سنتا تھا تو کہانیاں لکھنے اور پڑھنے لکھنے کا شوق اجاگر ہوا۔ جب گاؤں کے پرائمری اسکول سے تعلیم کا آغاز کیا۔ جیسے ہی پڑھنے کے قابل ہوا کہانیوں کی کتابیں پڑھنے لگا۔

میں نے میٹرک کا امتحان ہائی اسکول ڈیپلو سے پاس کیا اور اس کے بعد "شاہ لطیف کالج" میں داخلہ لیا۔ پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا لہٰذا فرسٹ ایئر سائنس میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوا اور اس کامیابی کی خبریں اخبارات میں بھی آئیں میری تصویر کے ساتھ جس کی وجہ سے مجھ میں پڑھنے کا مزید شوق پیدا ہوا۔ مگر چونکہ گھر کے مالی حالات بہت زیادہ اچھے نہیں تھے، اس لیے باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے تو اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا لیکن پرائیویٹ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے گریجویشن کیا اور پھر باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے سندھ یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ایم اے کیا۔ میں نے تمام امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے۔ مجھے پڑھے لکھے لوگ ہمیشہ بہت متاثر کرتے تھے۔

پریکٹیکل لائف

میری ابتدائی نوکری پولیس کے محکمے میں ہی تھی، والد صاحب کی نصیحت کے باوجود پہلی نوکری اسسٹنٹ سب انسپکٹر کی تھی۔ مگر پھر جلد ہی میں نے اس نوکری کو خیرباد کہہ کر پرائمری اسکول ٹیچر کی حیثیت سے نوکری شروع کی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پولیس کی ٹریننگ کے لیے ہالا شہر جانے لگا تب میرے والد صاحب نے سختی سے منع کیا کہ پولیس کی نوکری نہیں کرنی۔

پرائمری اسکول کا ٹیچر بنا تو میری اچھی کارکردگی کی وجہ سے مجھے تعلقہ ڈگری اسکول میں مڈل کلاس کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔ پہلی نوکری جو پولیس میں کی وہ 1962ء میں کی۔ مجھے یاد ہے کہ جب سندھ یونیورسٹی کے شیخ ایاز وائس چانسلر بنے تو انہوں نے مجھے یونیورسٹی میں بلوایا کیونکہ انہیں پتا تھا کہ میں نے اس یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ایم اے کیا ہے۔

شیخ ایاز صاحب نے مجھے سندھیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں پبلی کیشن آفیسر کی جاب دی۔ یہ میرے لیے بہترین جاب تھی۔ کیونکہ میری ڈیوٹی غیر ملکی اسکالرز کے ساتھ تھی۔ اسی یونیورسٹی میں رہ کر میں نے آہستہ آہستہ ترقی کی۔ پبلی کیشن آفیسر سے ترقی کر کے ڈپٹی ڈائریکٹر بنا اور پھر ڈائریکٹر بنا۔

یہ مدت ملازمت 2005ء تک رہی۔ یکم اکتوبر 2005ء کو ریٹائر ہوا تب سابق وزیر اعلیٰ سندھ جناب ارباب غلام رحیم صاحب نے تین سال کے لیے سندھ لینگویج اتھارٹی کا چیئرمین بنا دیا۔ اس عہدے سے مئی 2008ء کو ریٹائر ہوا۔

لکھنے کی طرف رجحان

بچپن میں جب والد صاحب سے اور حوالات میں قیدیوں کی کہانیاں سنتا تھا تو کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ نہ صرف لکھنے کا شوق تھا بلکہ پڑھنے کا بھی شوق تھا اور بہت کم عمری میں قرۃ العین حیدر کا مشہور ناول "آگ کا دریا" پڑھا میں نے ان کی نقریباً ساری ہی کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کے علاوہ سینئر رائٹر شوکت صدیقی، کرشن چندر، جوش، فراق، غالب، فیض احمد فیض، احمد فراز اور دیگر کئی شاعر اور رائٹرز کو پڑھا..... اور انہی کو پڑھ پڑھ کر لکھنے کا شوق ہوا۔ یوں 1964ء میں، میں نے پہلا افسانہ لکھا اس افسانے میں، میں نے وہی کچھ لکھا جو کہ میں نے اپنے اردگرد دیکھا..... کہتے ہیں کہ اگر پہلی چیز ہی کامیاب ہو جائے تو پھر حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے۔ مزید لکھنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ چنانچہ میرے پہلے افسانے کو ادبی حلقوں میں اور عام لوگوں میں بہت پذیرائی ملی۔ اس افسانے کو پڑھ کر ریڈیو پاکستان کے ایک پروڈیوسر نے مجھے بلایا کہ آپ ریڈیو کے لیے ڈراما لکھا کریں اس طرح ریڈیو سے ڈرامے

لکھنے کی شروعات ہوئی۔

ریڈیو کے ڈرامے مقبول ہوئے تو ٹی وی کے مراد علی مرزا نے ٹیلی ویژن کے لیے لکھنے کی پیشکش کی۔ میں نے کہا کہ یہ تو مشکل کام ہے تو انہوں نے کہا کہ ایسا نہیں' آپ دیکھیں گے کہ ٹی وی کے لیے ڈراما لکھنا بہت آسان ہے۔ اور انہی کے اکسانے پہ میں نے ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھنا شروع کیا یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ میرے لکھے ہوئے ڈراموں کو بہت زیادہ شہرت ملی۔ "دیواریں" کے نام سے میں نے پہلا ڈرامہ سیریل 1983ء میں لکھا اس کا موضوع عورت پر ظلم تھا' اس کے بعد 1985ء میں کارواں لکھا میں آپ کو یہ بات بتاؤں کہ یہ ڈرامہ ہندوستان کے شہر پونا کے انسٹی ٹیوٹ میں پڑھایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں فن اور فنکار کی بہت قدر۔ ہوتی ہے۔ میرے اس سیریل کا موضوع فن کی کمرشلائزیشن کے خلاف تھا۔ "کارواں" بے حد مقبول ہوا تو پھر 1987ء میں "چھوٹی سی دنیا" لکھا۔ میں نے ہمیشہ ڈیڑھ دو سال کے گیپ سے سیریل لکھا مجھے یہ جان کر خوشی ہوتی تھی کہ ناظرین میرے ڈراموں کا انتظار کیا کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ پھر لوگوں کے اصرار پر میں نے گیپ کو تھوڑا کم کیا اور 1988ء میں "سیڑھیاں" لکھا۔ "چھوٹی سی دنیا" کے بارے میں بتاؤں کہ اس کا کردار "جانو جرمن" آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ یہ ہلکا پھلکا مزاحیہ ٹائپ کا ڈراما تھا۔ تو بس پھر لکھنے کا عمل تسلسل کے ساتھ چلتا رہا اور کافی کچھ لکھا میں نے اور میرے لکھے ہوئے ڈرامے جو بہت زیادہ مقبول ہوئے ان میں "دکھ سکھ' جال' دھول' پرانده' تھوڑی خوشی تھوڑا غم اور دراڑیں خاص طور پر شامل ہیں ان کے علاوہ طویل دورانیے کے کھیل وغیرہ بھی لکھے۔

مجھے یاد ہے کہ 1983ء میں جب میں نے پہلا سیریل "دیواریں" لکھا تو میں بہت خوفزدہ تھا کہ پتہ نہیں اس کا کیا رسپانس ملے گا۔ تو ابتدائی اقساط میں میں لوگوں سے ملنے سے گھبراتا تھا لیکن آہستہ آہستہ جب مجھے اچھا رسپانس ملنے لگا تب لوگوں کا سامنا کرنے کی میری ہمت ہوئی۔

آج کے دور میں رائٹرز خواتین و حضرات خوب کما رہے ہیں لیکن ہمارے دور میں ایسا نہیں تھا اور نہ ہی ہم پیسوں کی خاطر لکھتے تھے۔ ہمیں زیادہ یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ ہم نے لکھا کیسا ہے اور معیار پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔

لکھنے سے مجھے تسکین ہوتی ہے۔ سکون ملتا ہے۔ میں اب تک تقریباً گیارہ کتابیں لکھ چکا ہوں۔ یہ سب کتابیں سندھی زبان میں ہیں۔ لیکن دلچسپ بات دیکھیں کہ ڈرامے میں نے اردو میں لکھے ہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ مجھے دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔

مشاغل

مشاغل تو میرے لکھنے پڑھنے کے ہی ہیں یا فیملی کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے چلے جاتے ہیں۔ ہاں البتہ کم عمری میں مجھے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس دور میں انڈین فلمیں سینما ہاؤسز میں دکھائی جاتی تھیں تو میں بھی دیکھ لیتا تھا۔ "مدر انڈیا" مجھے بہت اچھی لگی تھی اور آرٹ موویز مجھے آج بھی پسند ہیں۔ میوزک سے بھی لگاؤ ہے۔ غزلیں زیادہ شوق سے سنتا ہوں۔ اقبال بانو' فریدہ خانم' لتا جی اور ٹینا ثانی مجھے بہت پسند ہیں۔

شادی

میری شادی 1973ء میں آرائیں فیملی میں ہوئی۔ شادی کے لیے تو میں یہی کہوں گا کہ یہ ایک طرح سے جوا ہے۔ خواہ آپ اپنی پسند سے کریں یا والدین کی پسند سے۔ اگر آپ اپنی پسند سے کریں تب بھی پرکھ شادی کے بعد ہی ہوتی ہے اور گھر والوں کی پسند سے کریں تب بھی۔۔۔ میری شادی میری پسند سے ہوئی' اللہ کا شکر ہے کہ میں اس امتحان میں کامیاب رہا۔ گھریلو زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ ماشاء اللہ چار بچے ہیں میرے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے' چاروں بچے اعلا تعلیمیافتہ ہیں۔

ایوارڈز

یوں تو ماشاء اللہ کافی ایوارڈز ملے ہیں لیکن میں اپنی خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جنہیں دو مرتبہ صدارتی ایوارڈ "پرائڈ آف پرفارمنس" مل چکا ہے۔ پہلا ایوارڈ غلام اسحٰق خان کے دور میں ملا اور اسی سے میں نے وصول کیا جبکہ دوسرا مشرف دور میں ملا۔ صدارتی ایوارڈ ملنا میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔

مجھے اپنے وطن اپنی مٹی سے بہت پیار ہے اور میں یہیں سے جڑا رہنا اور جینا چاہتا ہوں۔

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اکتوبر 2010 کے شمارے کی ایک جھلک

اکتوبر 2010 کا شمارہ شائع ہوگیا ہے

- "پچھتاووں کے سوا" صاف دل اور سچے لوگوں کو زندگی میں کامیابی ضرور ملتی ہے، آسیہ رزاقی کا مکمل ناول،
- "بیلی راجپوتاں کی ملکہ" ماضی کے دریچوں سے جھانکتی ایک خوبصورت داستان، نمرہ احمد کا ناول،
- "کالی چوڑیاں" محبت جب ضد کی شکل اختیار کرلے تو انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے، نایاب جیلانی کا مکمل ناول،
- ثروت نذیر اور عالیہ بخاری کے ناولٹ،
- "اس کارِ ہنر میں" مصنفین سے سروے،
- سائرہ غلام نبی، کا شفہ حسین، کنیز نبوی اور مصباح گل کے افسانے،
- معروف ٹی وی فنکارہ "نیلم منیر" سے باتیں،
- مشہور ایتھلیٹ "نسیم حمید" سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر دلچسپیاں،

خواتین ڈائجسٹ اکتوبر کا شمارہ آج ہی خریدلیں۔

وینا ملک

ڈھٹائی

وینا ملک کو دھما کے کرنے کی عادت ہو چکی ہے اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرتی ہیں۔ چاہے اس کے لیے انہیں کتنوں کی جان سولی پر لٹکانی پڑے۔ اب محمد آصف کا معاملہ ہی لیں جو ان دنوں اسپاٹ فکسنگ کے معاملے پر آئی سی سی کی جانب سے معطلی کا شکار ہیں۔ اس معاملے پر تیل چھڑکنے میں وینا نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ پاکستان انٹرنیشنل کرکٹ کونسل کرائم یونٹ کے آفیشل حسن رضا نے اس سلسلے میں وینا سے طویل بات چیت کی ہے، جس میں وینا نے انہیں حقائق سے آگاہ کیا۔ وینا جو منگنی کے بعد زیادہ ہی پھرتیاں دکھا رہی ہیں۔ اپنی دوستیوں کے حوالے سے کہتی ہیں۔

"وینا جنون کا دوسرا نام ہے۔ جس کام کی ٹھانی اسے کر گزری۔ ہر کہ ہوا آصف ان سے دوستی ڈنکے کی چوٹ پر کی۔ (یہ کیوں نہیں کہتی ڈنڈے کے زور پر کی) میں دوسری ہیروئنوں کی طرح چھپ چھپ کر کچھ نہیں کرتی (ڈھٹائی اسے کہتے ہیں) ہر کہ آج بھی میرا اچھا دوست ہے جذبات میں آکر الٹی سیدھی حرکتیں کر جاتا ہے، جبکہ آصف کو میں کسی گنتی میں نہیں رکھتی۔ (پھر رونا کس بات کا ہے بی بی!) اسے ہیرو بنانے میں سارا میرا کردار ہے۔ مجھ سے دوستی سے پہلے وہ منشیات کا عادی شخص تھا۔"

واضح رہے وینا ملک نے بھارتی فوٹو گرافر دھرج ڈکشت کے آصف کے ساتھ میچ فکسنگ میں ملوث ہونے کا انکشاف کیا تھا، جس پر بھارتی فوٹو گرافر مبینہ طور پر سات پاکستانی کھلاڑیوں کے ساتھ وینا ملک کے میچ فکسنگ میں ملوث ہونے اور ساتھ کو نقصان پہنچانے کا مقدمہ درج کر دیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ ذاتی لڑائیوں کا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

کارروائی

ہمارے گلوکار بہت باصلاحیت ہیں۔ اسی لیے پڑوسی ملک میں ان کی خاصی ڈیمانڈ ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ بھارت میں تعصب اور ہندو انہ سوچ ہر چیز پر غالب آجاتی ہے۔ اب راحت فتح علی خان کی ہی مثال لیں۔ جنہیں انتہا پسند ہندوؤں کی حرکتوں سے بچنے کے لیے مراٹھی زبان سیکھنی پڑ رہی ہے۔ بصورت دیگر مذکورہ چینل کے خلاف کارروائی کرنے کی دھمکی دی گئی ہے۔ واضح ہے کہ راحت فتح ان دنوں بھارتی چینل کے لیے منصفی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ (بھارت میں اگر کیریئر بنانا ہے تو یہ سب تو برداشت کرنا پڑے گا) اور یہ زبان سیکھنے کے لیے انہوں نے آشا بھونسلے کا انتخاب کیا ہے ممکن ہے اس طرح ان کا مقصد آشا کی ہمدردیاں حاصل کرنا ہو، جو انتہا پسند کیمپ کا حصہ بھی رہ چکی ہیں۔ آخر بھارت میں رہنے کے لیے پاپڑ تو

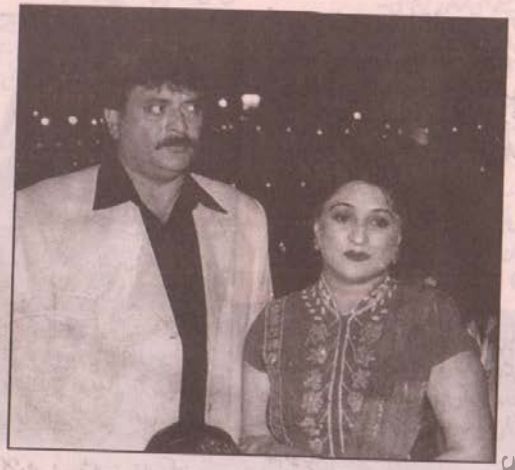

بیلنے پڑتے ہیں اور پاکستانیوں کے لیے ان کا ازلی تعصب مثالی ہے۔

قدر دان

شبیر جان کا شمار بہترین اداکاروں کی صف میں کیا جاتا ہے، جو ہر طرح کے کردار میں جان ہی ڈال دیتے ہیں۔ یہ مقام انہوں نے بہت محنت سے حاصل کیا ہے۔ اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے وہ کہتے ہیں "جب میں نے شوبز میں قدم رکھا۔ اس وقت میں شادی شدہ تھا اور میرے چار بچے تھے۔ گزارا بہت مشکل سے ہوتا تھا زیادہ تر خرچہ والدین ہی اٹھاتے تھے بلکہ خاندان میں جس کی استطاعت ہوتی میری مدد کر دیتا۔ اب اللہ کا احسان ہے کہ میرے شوق کو میرا پیشہ بنا دیا اور مجھے اس پیشے سے رزق اتنا دیا کہ اب میں اداکاری کی بدولت ہی بہترین کما رہا ہوں۔ میں ایک پُرسکون اور آرام دہ گھرانے کا سربراہ ہوں۔ ماشاء اللہ اب میرے سات بچے ہیں میرا گھر کسی جنت سے کم نہیں ہر فرد دوسرے کا خیال رکھتا ہے۔

میری دوسری بیگم فریدہ شادی سے پہلے بھی پارلر کا بزنس کرتی تھی۔ اس نے ہمیشہ سے باوقار طریقے سے کام کیا۔ میں ایک حد تک عورت کی آزادی کا قائل ہوں، بس وہ اپنی نسوانیت کا خیال رکھیں۔ اسی لیے مجھے اپنی بیگم کا کام کرنا برا نہیں لگا۔ (اس معاملے میں بیگم واقعی خوش قسمت ہیں) انہوں نے تھوڑی بہت ایکٹنگ بھی کی، اس فیلڈ پر ہر کوئی ان کا نام عزت سے لیتا ہے۔ مجھے فریدہ پر فخر ہے اور آج میں سب کے سامنے اعتراف کرتا کہ مجھے سُدھارنے اور میری خراب عادات پر قابو پانے میں فریدہ کا بڑا ہاتھ ہے۔" (اسے کہتے ہیں بیوی کا سچا قدر دان!)

دوڑ

انتھک محنت اور لگن کامیابی کی بنیادی شرط ہے۔ روسی اسٹار ماریہ شراپوا نے ٹینس کی دنیا میں یہ مقام اسی بدولت حاصل کیا ہے۔ اس وقت ان کا شمار دنیائے ٹینس کی امیر ترین کھلاڑی کے طور پر ہوتا ہے۔ 2009ء میں انہوں نے 245 ملین ڈالر کمانے کے ساتھ ساتھ ایک ملین ڈالر انعامی رقم کمائی۔ ماڈلنگ اور دوسرے ذریعوں سے حاصل رقم اس کے علاوہ ہے۔ انہوں نے ومبلڈن ٹینس چیمپئن بننے کا اعزاز 17 سال کی عمر میں حاصل کیا تھا اور اس کے بعد کبھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ بڑے بڑے اداروں اور اشتہاری کمپنیوں نے اپنی مصنوعات کے لیے ان سے معاہدہ کیا۔ جس میں سب سے بڑا معاہدہ نائیک کمپنی سے

گلوکاروں کا کمال ہے) مستقبل میں میرا ارادہ لائٹس ڈیزائننگ میں آنے کا ہے۔ مجھے روشنیاں بہت دلچسپ محسوس ہوتی ہیں اور ان کی بہتر انداز میں آرائش کی گنجائش بھی بہت ہے۔ عنقریب میں اپنا یہ شوق بھی پورا کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔" (صلاحیتوں کا درست استعمال اسے کہتے ہیں)

☆ ☆ ☆

کچھ ادھر ادھر سے

☆ امریکا عافیہ کو رہا کرنا بھی چاہے تو بھی پاکستانی حکام عافیہ کی رہائی نہیں چاہتے۔ عافیہ کی گرفتاری میں اہم کردار ادا کرنے والے یہ حکام خوف زدہ ہیں کہ عافیہ رہائی کے بعد بہت کچھ بے نقاب کر سکتی ہے۔ (برطانیہ کی نومسلم صحافی مریم ریڈلی)

☆ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے بارے میں مشہور یہودی دانش ور نوم چومسکی نے کہا تھا "یہ جس جگہ جائے گی۔ سسٹم تبدیل کردے گی۔" شاید مشرف گویہی نظر آنے لگ گیا۔ (عبداللہ طارق سہیل)

☆ چند قدم دور سرحد پار بھارت میں جب بستیوں پر ہندو بلوائی حملہ کرتے ہیں گھر جلاتے ہیں۔ عورتوں کی آبرو ریزی کرتے ہیں تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ پنجابی سندھی، پٹھان یا کشمیری ہے۔ مسلمان ہے تو بس واجب القتل ہے

کیا۔ جنوری 2010ء میں ماریہ شراپووا نے اس کمپنی سے مزید 8 سال کا معاہدہ کیا ہے، جس کے مطابق انہیں 701 ملین ڈالر کی رقم ملے گی۔ ماریہ اب دنیا بھر کے فنکاروں، ایتھلیٹس، موسیقاروں کی فہرست میں 76 نمبر پر آگئی ہیں۔ لیکن پیسے کی دوڑ میں بدستور آگے ہیں۔ اس دوڑ میں سرینا ولیمز دوسرے اور رویس ولیمز تیسرے نمبر پر ہیں۔

آرائش حسن

مغربی حسیناؤں کے پاس کم عمر نظر آنے کا جانے کیا نسخہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر سے کئی سال چھوٹی نظر آتی ہیں۔ اداکارہ منوگ کی عمر اس وقت 42 سال ہے لیکن وہ 30 سال کی لڑکی محسوس ہوتی ہیں۔ اپنی خوب صورتی کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ "میں نے کبھی آرائش حسن کے لیے مشورہ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں اپنی بہن ڈینی سے بالوں کی دیکھ بھال کے لیے کبھی کبھی ٹپس لے لیتی ہوں۔" "قدرت نے اسے بہت فیاضی سے نوازا ہے۔ اس کے بال بے حد خوب صورت ہیں جو کبھی سیدھے سلکی لگتے ہیں تو کبھی گھنگھریالے۔" شوبز کی دنیا میں مجھے سب سے زیادہ حیران لیڈی گاگا نے کیا۔ جو اپنے مخصوص کپڑے اور انداز میں کہیں پر بھی بہادری سے جا سکتی ہے کم از کم میں ایسی ہمت نہیں رکھتی۔ (یہ مغربی

تقسیم سے پہلے بھی تھا اور آج بھی۔

تبھی کہیں ہم اسی بحث میں الجھے ہوئے ہیں یہ ملک تو سیکولر ہونا چاہیے تھا یہ تو پنجابی، سندھی، بلوچ، پٹھان، سرائیکی اور مہاجر قوموں کا مجموعہ ہے۔ (اور یا مقبول جان ایکسپریس نیوز)

☆ کوئی قوم ہماری طرح بے حس نہیں کہ آمر کے آنے پر شہروں، گلیوں اور قصبوں میں مٹھائیاں بانٹتا پھرے جشن منائے جب ہمیں خود اپنے حاکم چننے کا اختیار ملا تو ہم نے امیدواروں کی لسٹ میں سب سے کم ووٹ اس کو دیے جو نیک، ایمان دار اور پارسا تھا۔ (اور یا مقبول جان ایکسپریس نیوز)

☆ عوام عدم اعتماد کی وجہ سے حکومت کے فنڈ میں دلچسپی نہیں لے رہے۔ حکومت پر عوام کے عدم اعتماد کی دوسری وجوہات کے ساتھ ساتھ ایک وجہ مشرف دور میں ہونے والے گھپلے بھی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ زلزلہ زدگان کے لیے یہ ساری امداد اور جو امداد باہر سے آئی مشرف اور اس کے ہم جماعتوں نے اپنے نیفے میں اڑس لی اور زلزلہ زدگان دانے دانے کو ترستے رہے۔ (عبداللہ طارق سہیل)

لیجنڈ

ماضی اگر شاندار ہو تو کئی برس گزرنے کے باوجود ذہن کے پردے پر زندہ و جاوید رہتا ہے۔ خصوصاً "ہمارے کئی فنکار اپنے بہترین کام کی بدولت پر ستاروں کے دلوں میں آج بھی بستے ہیں۔ ماضی کی خوب صورت اداکارہ زیبا بیگم آج بھی اپنی نوجوانی کا عکس محسوس ہوتی ہیں۔ ممتاز صحافی محمود الحسن کے پاس تصاویر کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ زیبا بیگم کی موجودہ اور ماضی کی تصاویر انہوں نے بنائی ہیں۔ وہ اپنے یادگار دور کے حوالے سے کہتی ہیں۔

"میں نے کئی سو فلموں میں کام کیا جن میں سے 75 فلمیں محمد علی صاحب کے ساتھ ہیں۔ تاہم میری جوڑی محمد علی اور وحید مراد کے ساتھ بے حد پسند کی گئی۔ اگرچہ وہ دور گزر گیا لیکن میرے لیے اس دور کی یادیں آج بھی سرمایۂ حیات ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ پہلے بھی میرا پسندیدہ پرچہ تھا اور آج بھی ہے۔ اس میں قارئین کو پڑھنے کے لیے معیاری مواد ملتا ہے۔ ہر عمر کی لڑکیوں اور خواتین کو زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرتا ہے۔" یہ باتیں انہوں نے فردوس مارکیٹ، علی زیب روڈ لاہور میں واقع اپنی رہائش پر ممتاز صحافی محمود حسن سے گفتگو کے دوران کیں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ——— حیا
میک اپ ——— روز بیوٹی پارلر
ٹرانسپرنسی ——— موسیٰ رضا

امت الصبور

تاریخ کے جھروکے سے

طب جدید کا بانی، حکیم جالینوس

طب کی ابتدا "بابل و نینوا" میں 5000 قبل مسیح سے بھی پہلے ہوئی۔ کیوں کہ علمائے تاریخ کا خیال ہے کہ انسانی وجود کا ظہور سب سے پہلے جنوب مغربی ایشیا "ایشیائے کوچک" میں ہوا اور بابل و نینوا اولین علاقے تھے۔ جہاں تہذیب نے باقاعدہ طور پر پرورش پائی۔ بابل و نینوا کے کھنڈرات سے جو زمانہ قدیم کی کتابیں برآمد ہوئیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں وہاں علاج کا طریقہ جھاڑ پھونک اور تعویذوں تک محدود تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہاں یہ رواج عام ہوگیا کہ مریض کو کسی چوراہے پہ لٹا دیتے تھے اور جو راہ سے گزرتا، اس سے مریض کا حال کہا جاتا اور پھر اس کا علاج کیا جاتا۔ ان لوگوں میں سے اگر کوئی مریض کا علاج بتا دیتا تو اس کا علاج اس طرح کیا جاتا طریقہ علاج تانبے یا چاندی کی تختیوں پر لکھ کر انہیں ایک طبی دیوتا کے گلے میں ڈال دیا جاتا تھا۔

لندن کے عجائب خانہ میں آسوریہ کی ایک کتاب نامکمل حالت میں موجود ہے۔ جو حضرت مسیح سے سات سو قبل کی لکھی ہوئی ہے۔ وہ ایک کتاب اور مستند کتاب کی نقل ہے جسے جواسہ کے طبی مدرسے کے بعض اساتذہ نے مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں اکثر طویل نسخہ جات اور ایک ایک مرض کے کئی کئی نسخے لکھے ہوئے تھے۔ مصر میں بعض قدیم شہروں کی کھدائی سے کتابیں اور تحریریں برآمد ہوئی ہیں۔ ان سے قدیم مصریوں کے تمدن، معاشرت اور علمی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔

قدیم مصریوں کا یہ عام عقیدہ تھا کہ مرض اور موت قدرتی ولا علاج ہیں۔ انہوں نے طب کا بھی ایک دیوتا معین کر رکھا تھا۔ جس کا نام "امحوطب Imhotep" یعنی رب الشفاء تھا۔

قدیم چینی اطباء نبض شناسی اور تشخیص الامراض میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ لیکن تشریح و جراحی سے نا واقف تھے۔ لیکن آج چینی طب انتہائی عروج پر ہے۔

قدیم یونانیوں کا رب الشفاء یعنی طب دیوتا (اسقلی بیوس) تھا۔ جس کے مجسموں کی مندروں میں پرستش کی جاتی تھی۔ اسقلی بیوس یونان کا مشہور حکیم تھا۔ حکیم جالینوس نے اسقلی بیوس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک الہامی طبیب تھے اور الہامی طب کا مرتبہ ہمارے قیاس و فن سے بڑا ہے۔ اسقلی بیوس حضرت ادریس علیہ السلام کے شاگرد تھے۔ جو استاد الحکماء علم و حکمت اور طب کے بانی جانے جاتے تھے۔ اسقلی بیوس نے نوے سال کی عمر میں انتقال کیا۔

اسقلی بیوس نے عالم نزع کے وقت اپنے بیٹوں کو ہدایت کی کہ علم و طب اپنے خاندان سے باہر نہ جانے دیں۔ طویل عرصے تک یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہا۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ جب اسقلی بیوس کی اولادوں میں لائق طبیبوں کی شدید کمی ہوگئی۔ اسی خاندان کے آخری طبیب حکیم بقراط نے یہ پہچ کر کہ حکمت و طب دنیا سے ختم نہ ہو جائے اپنے خاندان کے لوگوں کی عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے طب کی کتابیں تصنیف کرنی شروع کر دیں۔ اسی طرح یہ فن اس خاندان سے باہر نکلا۔ آج دور جدید میں اسے بلاشبہ ایک اعلا و ارفع مقام حاصل ہے۔

یونان میں اس سے پہلے اسقلی بیوس نے باضابطہ علاج شروع کیا۔ عوام میں اس سحر انگیز علاج کی شہرت ہوگئی۔ اہل یونان اسے طب کا موجد اور رب الشفاء تسلیم کرتے تھے۔ اسقلی بیوس کے علم طب کی باقاعدہ تدوین بقراط کے زمانے میں ہوئی۔ بقراط نے دیگر علوم کی طرح علم طب کو یکجا کر کے تدوین کیا۔ حکیم بقراط کا سن پیدائش 490 قبل مسیح ہے۔

حکیم جالینوس نے طب یونانی کو ایک مکمل علم کی شکل میں ترتیب دیا۔ اس نے تشریح اعضاء کی طرف خصوصی

توجہ کی اور فن جراحی میں بھی بہت اضافہ کیا۔ دواؤں کی تحقیق میں بھی گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اور مرکبات کو ترتیب دیا۔ درحقیقت موجودہ طب اسلامی اور طب جدید کی بنیاد حکیم جالینوس ہی پر ہے۔

اہل ہنود کی ابتدا برہماجی سے بیان کرتے ہیں۔ برہماجی کے بعد رکھشن اندر مہاراج وغیرہ نے اس میں مہارت حاصل کی۔ 320 قبل مسیح میں چرک سنگھتا" مرتب ہوئی پھر دھنوتری اور شسترت کی شہرت ہوئی شسترت کے بعد واگ بھٹ 200 ق م نے "واگ بھٹ" نامی کتاب لکھ کر شہرت حاصل کی۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد اسلامی طب کا زیادہ چرچا ہوا۔ پھر بھی اس زمانے میں آیورویدک کا رواج رہا۔ اس زمانے میں مادھوا چاریہ، شارنگ وغیرہ کی کتابیں زیادہ مقبول ہوئیں۔ عربی اور فارسی میں شسترت اور چرک کا ترجمہ کیا گیا۔

ابن مبارک نے اپنی مشہور کتاب "المنقذ" کو آیورویدک سے اخذ کیا۔ جس طرح طب یونانی کا سرچشمہ اپنے مرکز یونان سے نکل کر عرب پہنچا اور اس نے وہاں کی آب و ہوا فضا اور ماحول کو متاثر کیا اور ساتھ ہی خود ان اثرات کو قبول کیا۔

اس طرح طب بغداد بھی پہنچا۔ وہاں اس نے ارتقاء کی وہ منزلیں طے کیں جو اسے دمشق میں بھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ اب اس نے یورپ پر اپنا اثر ڈالا۔

مسلمانوں نے اپنے عروج کے ساتھ طب کی طرف بھی توجہ دی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یونانی کتب کے ترجمے کیے گئے۔ جرجس، حنین بن اسحاق ماسرجویہ، موسیٰ بن خالد، ابو یوسف الیطریق نے ان کتابوں کے عربی تراجم کیے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اسلامی اطباء زیادہ تر یونانی اطباء کے پیروکار تھے۔ اس کے بعد تیسرے دور میں مسلمانوں نے مختلف طب کے امتزاج سے ایک نئی طب کی بنیاد ڈالی۔ اس نئی طب میں یونانی، عربی، ایرانی اور ہندی طب کو جمع کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ نئے نئے امراض تحقیق کیے۔ نئی دوائیں تلاش کیں، نئے اصول علاج وضع کیے اور نئے طریقہ پر ادویہ کو ترتیب دیا۔

اسلامی طب کے مشہور اطباء میں ابن البطری، ابوالحسن طبری، علی بن عباس، بوعلی سینا۔ نجیب الدین سمرقندی، ابوبکر محمد بن زکریا رازی قابل ذکر ہیں، سب سے پہلے چیچک اور خسرہ پر ایک کتاب لکھی گئی۔ اس سے پہلے ہارون نامی حکیم نے چیچک کے متعلق نامکمل کتاب لکھی۔ اسلامی دور کا سب سے مشہور جراح ابوالقاسم الزہراوی اندلس میں گزرا ہے۔ انہوں نے "التعریف" کے نام سے نہایت بیش قیمت کتاب لکھی تھی۔

بعد ازاں برامکہ ایرانی حکمران اور وہاں کے ماہرین فن نیز خاندان مغلیہ اور دوسرے نامور مسلمان حکمران اور اہل علم نے کاوشیں کی۔ طب کی تدوین و ترکیب ابوبکر محمد بن زکریا رازی، ابوالولید محمد بن رشد نے کی، کہا جاتا ہے کہ طب یونانی محض تجربہ ہے۔ اور طب نبوی کا تعلق وحی سے ہے۔ تجربہ اگرچہ قریب الیقین ہوتا ہے۔ وہ وحی کے رتبے کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت سی خواتین ایسی گزری ہیں، جنہوں نے گراں قدر طبی خدمات انجام دی ہیں۔ مدینہ طیبہ میں ام سلیم، ام مطاع، ام عطیہ، لیلیٰ،

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	200/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
بھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	200/-
مین سے مورت	غزالہ عزیز	200/-

ناول منگوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ -/30 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔

فون نمبر: 2216361

اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ طباعت کے لیے معروف و مشہور تھیں۔ پہلا عرب طبیب حارث بن کلاہ ہے۔ جس نے اپنی آخری عمر میں پیغمبر اسلام کا زمانہ پایا۔ جس طرح کلام پاک میں اللہ تبارک تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "کوئی چیز ایسی نہیں جو کتاب روشن میں موجود نہ ہو۔" اسی طرح انسانی حیات کا کوئی گوشہ اور پہلو ایسا نہیں جس کے بارے میں احادیث میں ہمیں واضح ہدایات نہ ملتی ہوں۔ بیماری و علاج کا نظریہ اسی نہج پر استوار ہے کہ طب کی تاریخ میں علاج معالجے و مریض کی شفاء اللہ کی ذات پر ایمان اور اعتقاد سے وابستہ ہے۔ (سید محبوب احمد چشتی)

نادیہ امان فرام ڈیرہ اسماعیل خان

☆ ☆ ☆

نظام عثمان علی خان..... آخری تاجدار دکن!

میر عثمان علی خان بہادر، ریاست حیدر آباد دکن کے ساتویں اور آخری تاجدار تھے۔ حیدر آباد پر سات نسلوں سے حکمرانی کرنے والے ان کے شاہی خاندان کا ایک لقب "آصف جاہ" بھی تھا۔ اس اعتبار سے یہ "آصف جاہ ہفتم" تھے۔ حیدر آباد دکن کے حکمرانوں کا ایک اور لقب نظام بھی تھا۔ اس سے مراد تھی "نظم و نسق چلانے والا۔"

یوں میر عثمان علی خان حیدر آباد دکن کے ساتویں نظام تھے۔ 6 اپریل 1886ء کو پیدا ہوئے۔ وہ میر محبوب علی خان کے دوسرے بیٹے تھے۔ 1887ء میں بڑے بھائی کے انتقال کے باعث وہ میر محبوب علی خان کے جانشین قرار پائے اور 18 ستمبر 1911ء کو ان کی باقاعدہ تاجپوشی ہوئی۔ 1937ء میں مشہور امریکی جریدے ٹائم نے اپنے سرورق پر ان کی تصویر شائع کی اور انہیں دنیا کا دولت مند ترین شخص قرار دیا۔ اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا۔ وہ ہندوستان کی خوش حال ترین ریاست کے فرمانروا تھے جس کا رقبہ برطانیہ سے زیادہ تھا۔ 1940ء میں ان کی دولت کا تخمینہ 2 ارب امریکی ڈالر لگایا گیا تھا۔ "کوہ نور" جیسے ہیرے کے اولین مالک بھی وہی تھے۔ ان کے پاس ہیروں کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ محل کے احاطے میں ہیروں سے بھرے دو ٹرک ان کی خواب گاہ کے قریب اتنے عرصے تک کھڑے رہے کہ ان کے ٹائر گل گئے۔

اپنی ریاست اور عوام کے لیے انہوں نے اپنے خزانے سے بہت کام کرائے۔ ان کی وجہ سے حیدر آباد میں بجلی اور ریلوے کا نظام آیا، ایئرپورٹ اور سڑکیں تعمیر ہوئیں۔ "نظام ساگر" کے نام سے ایک بہت بڑی جھیل تیار کی گئی۔ مسلمانوں کے لیے عالمی معیار کی پہلی بڑی درسگاہ "جامعہ عثمانیہ" قائم کی، انہوں نے اپنا ذاتی بینک بھی قائم کیا۔ جو اب حیدر آباد دکن کا اسٹیٹ بینک ہے۔ کئی محلات ان کی ملکیت تھے جن میں سے "چومحلا" نامی ایک ہی محل درحقیقت چار محلوں کا مجموعہ تھا لیکن وہ تیرہ برس کی عمر کے بعد سے اپنے انتقال تک "کنگ کوٹھی پیلس" میں ہی رہے۔ جو ان کے والد نے ایک نواب سے خریدا تھا۔

حیدر آباد کا جنرل اسپتال، آج کی اسٹیٹ لائبریری، دارالعلوم دیوبند، بنارس ہندو یونیورسٹی، جامعہ نظامیہ، آندھرا پردیش ہائی کورٹ، حیدر آباد کا اسمبلی ہال، میوزیم یہ سب انہی کی تعمیر کرائی ہوئی عمارتیں اور انہی کے قائم کردہ ادارے ہیں۔ انہوں نے اپنے 37 سالہ دور حکومت میں حیدر آباد دکن کو ایک مثالی ریاست بنادیا۔ انہوں نے عوام کے لیے جو کچھ کیا شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے انتقال (24 فروری 1967ء) پر خلقت سیلاب کی طرح امنڈ آئی۔ ان کے جنازے کا جلوس انڈیا کی تاریخ کا اب تک کا سب سے بڑا جلوس تھا۔ اپنے محل کے سامنے ہی واقع مسجد کے احاطے میں ان کی تدفین ہوئی۔ 1948ء میں انڈیا نے حیدر آباد دکن پر قبضہ کرلیا اور نظام کی بیشتر دولت و جائیداد، حکومت کے اقدامات، ورثاء کے آپس کے جھگڑوں اور وقت کے نشیب و فراز کے باعث بکھر گئی اور رفتہ رفتہ معدوم ہوگئی۔

انہیں اردو اور فارسی پر عبور تھا۔ ان زبانوں میں شاعری بھی کرتے تھے۔ انگریزی بھی روانی سے بول لیتے تھے۔ ان کی 7 بیویاں اور 42 کنیزیں تھیں۔ بچوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ دنیا ان کے صرف دو بیٹوں اعظم جاہ اور معظم جاہ کے ناموں سے واقف ہے۔ ان کا پوتا مکرم جاہ ترکی کے شہر استنبول میں دو بیڈ روم کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔ تاریخی کھنڈرات کی سیر کرنا اور ان کے مختلف گوشوں میں گم صم بیٹھے رہنے اس کا مشغلہ ہے۔

(شاہدہ شبیر رانا۔ رحمان گڑھ)

☆

ادارہ

خوب صورتی کے لیے

چہرہ تر و تازہ اور جوان رکھیے

لٹکا ہوا جھرّیوں بھرا بے رونق چہرہ بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ چہرے کے عضلات بالکل ایلاسٹک بینڈ کی طرح ہوتے ہیں۔ چہرے کی ورزش سے یہ اپنی اصلی حالت پہ دوبارہ واپس جاتے ہیں۔ ہر ورزش دی ہوئی ہدایت کے مطابق دس مرتبہ کی جائے۔ ہوسکے تو اس سے زیادہ بھی کر لی جائے۔

ابتدا میں روزانہ ایک بار ورزش سے سلسلہ شروع کیجئے اور پھر رفتہ رفتہ کم از کم دس مرتبہ ہر ورزش کے معمول پر آجائیے۔ یہاں تک کہ آپ روزانہ دس سے پندرہ منٹ یہ ورزشیں کرنے لگیں۔

بہترین نتائج کے لیے یہ ورزشیں کم از کم تین مہینوں تک دن میں دو مرتبہ کیجئے۔ یہ ورزشیں سہولت اور آرام سے کیجئے کیونکہ ان کا مقصد مقابلہ نہیں بلکہ چہرے کے عضلات کی بحالی ہے۔ جب بھی موقع ملے، جہاں بھی ملے صاف ہوا میں آٹھ سے دس مرتبہ گہرے سانس لینے کے بعد مشق کرتے رہیے۔

ان ورزشوں سے پہلے چہرے پر کوئی اچھا موسچرائزر یعنی جلد کو نم رکھنے والی چیز لگانا چاہیے۔ مثلاً "عرق گلاب میں چند بوندیں گلیسرین یا شہد کی ملائی جائیں یا پھر دودھ، کریم یا تیل وغیرہ کو چہرے پر روئی یا انگلیوں سے لگانے کے بعد ورزشیں کی جائیں۔

ورزشیں

1- اپنا جبڑا دائیں بائیں گھمائیے۔ جہاں تک ممکن ہو اسے حرکت دے کر دور لے جائیے۔ یہ ورزش لگی ہوئی ٹھوڑی کے لیے بہت مفید ہوتی ہے۔

2- اپنے ہونٹوں کو اندر سکیڑ کر منہ کو خوب کھولیے۔ ہونٹوں کو دانتوں کی طرف کھینچیے۔ اس انداز میں رہتے ہوئے اپنا منہ کھولتے اور بند کرتے رہیے۔ گویا آپ بغیر دانتوں کے چبا رہے ہوں۔ اس سے بالائی ہونٹ کی لکیریں سمٹتی جائیں گی۔

3- آنکھیں خوب زور سے بند کر کے منہ سکوڑیے۔ ایک لمحے کے بعد بھنوؤں کو حرکت دیجئے پھر آنکھیں جتنا ممکن ہو پوری طرح کھول دیجئے۔ اس ورزش سے آنکھوں اور ان کے اطراف کے عضلات مستحکم ہوتے ہیں اور آنکھوں کے کونوں میں جھریاں جنہیں "کوّے کے پنجے" بھی کہتے ہیں، آہستہ آہستہ ختم ہوجاتے ہیں۔

4- انگلیاں آنکھوں کے بیرونی کونوں پر رکھ کر عضلات کو کنپٹی کی طرف انگلیوں سے کھینچیے۔ اس سے بھی آنکھوں کے کونوں کی جھریاں ختم ہوتی ہیں۔

5- دونوں ہاتھ چہرے پر رکھیے۔ ہاتھوں کو حرکت دیے بغیر انگلیوں سے آنکھوں کے نیچے کے عضلات کو کھینچیے اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیں۔

6- اپنے انگوٹھوں کو آنکھوں کے نیچے یعنی گال کی ہڈیوں پر ہلکے دباؤ کے ساتھ گھمائیے۔ اس سے آنکھ کے اطراف دوران خون میں اضافہ ہوگا۔

7- ایک یا تمام انگلیاں چہرے پر دباؤ کے ساتھ پھیریئے۔ اس سے کھنچاؤ دور۔ ہو جائے گا۔ جب بھی چہرے پہ کھنچاؤ اور دکھن محسوس ہو، یہ عمل دہرائیے۔

8- ہونٹ سکیڑ کر جتنا ممکن ہو، مچھلی کا سا منہ بنا کر باہر نکالنے کی کوشش کیجئے۔ اس کے ساتھ آنکھیں زور سے بند کریں اور اپنے گال اندر کی طرف کھینچ لیجئے۔ اس ورزش سے پورے منہ کے عضلات تن جائیں گے۔ اس کے بعد منہ ڈھیلا چھوڑ دیں۔

9- اپنا منہ جس قدر ممکن ہو، کھولیے اور اسے جہاں تک ممکن ہو، ہر سمت میں گھمائیے۔ گردن کے پٹھے بھی ساتھ ساتھ کھینچیں۔ اس سے جبڑوں کے علاوہ گردن کے عضلات بھی درست حالت میں آجائیں گے۔

10- ہونٹ سکیڑ کر منہ کو ادھر ادھر دھیرے دھیرے کھینچیے اور منہ کے اندر گویا چوسنے کی سی کیفیت پیدا کیجئے۔ اس سے پچکے ہوئے گال بھرنے لگتے ہیں۔

11- پورا منہ زور سے کھول کر جس قدر ممکن ہو زبان باہر نکال دیں اور آنکھیں پوری طرح کھول لیں اور سانس "ہاہ" کی آواز سے منہ سے باہر خارج کردیں۔ اس کے بعد چہرے کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔

ورزش کے بعد گہرے سانس لیں، چہرے کے عضلات کو پُرسکون کریں اور پانی کے چھینٹے چہرے پر ماریے۔ ان ورزشوں سے چہرہ خوب صورت اور جوان ہو جاتا ہے۔ چہرے کی ورزشیں کرتے وقت جسم میں پانی کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔

ماسک اور فیشل

جلد کی خوب صورتی میں اضافہ، داغ دھبے دور کرنے اور جھریاں اور لکیریں ختم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل ماسک استعمال کرسکتے ہیں۔

خربوزے کے گودے کا ماسک لگائیں۔

پسی ہوئی ہلدی، دہی میں ملا کر اس کا ماسک لگائیں اور خشک ہونے پر دھولیں۔

جھریوں کے لیے خاص طور پر شہد کو ہلکا گرم کرکے اس کا ماسک جھریوں پر لگائیں پھر تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ دھولیں۔

مردہ کھال اتارنا

کسی بھی اچھے تیل مثلاً" زیتون یا سرسوں وغیرہ سے جسم کا اچھی طرح مساج کریں اور بعد ازاں نیم گرم پانی سے غسل کریں اور جسم کو جھانویں کی مدد سے دھیرے دھیرے رگڑیں تاکہ مردہ کھال اتر جائے۔

گرم پانی میں شیمپو ملا کر ہاتھ پاؤں کو اچھی طرح ڈبو دیں۔ چند منٹ بعد جھانویں سے رگڑ دیں۔ بعد میں خشک ہونے کے بعد خوب اچھی طرح مساج کریں۔

فیشل

فیشل ایک بہترین علاج ہے جو چہرے کی جلد سے مردہ خلیات کو ہٹا کر چہرے کو ایک نئی رونق اور تازگی بخشتا ہے۔ فیشل گھر پر بھی کرسکتے ہیں۔

چہرے پر کسی اچھی کولڈ کریم سے خوب اچھی طرح مساج کریں۔ حتیٰ کہ چہرے پر ہلکی سرخی آجائے۔ اب کسی برتن میں کھولتا ہوا پانی ڈالیں۔ چاہیں تو خوشبو کے لیے پودینے کی چند پتیاں ڈال دیں۔ گردن اور چہرے کو تولیے سے ڈھانپ کر بھاپ لینا شروع کریں۔ برتن سے چہرہ [illegible] فٹ ہو جب خوب اچھی طرح پسینہ آجا[illegible] منہ پونچھ لیں۔ اس کے بعد جلد کی مناسبت [illegible] ونی ماسک لگائیں پھر چہرہ دھولیں۔

سن باتھ

سن باتھ سے شمسی توانائی جلد کے ذریعے جسم میں داخل ہو کر توانائی پیدا کرتی ہے اور جلد کی قدرتی چمک میں اضافہ کرکے اسے خوب صورت بناتی ہے۔ دھنک رنگ کی سات شعاعیں جسم میں جذب کرنے کے لیے بغیر کلف لگے ہلکے کپڑے جس میں ہوا اور روشنی گزر جاتی ہو، استعمال کرتے ہیں۔ سن باتھ صبح کے وقت کھلی فضا میں کرتے ہیں۔ اس عمل میں دس منٹ تک سورج کی شعاعوں میں ٹہلتے ہیں جس سے جلد کی توانائی میں اضافہ ہوتا ہے اور جلدی غدود بہتر کام کرنے لگتے ہیں۔ تیز دھوپ میں سن باتھ نہیں لیا جاسکتا، اس سے جلد کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔

WWW.PAKISTANIPOINT.COM